ظہیرالدّین بابر
ایک اہم اور دلچسپ
تاریخی ناول
پریمقل قادروف

ازبک زبان میں لکھا گیا ایک اہم تاریخی ناول جس کے دنیا کی
کئی زبانوں میں تراجم ہو کر کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں
ظہیر الدّین بابر
ایک اہم اور دلچسپ
تاریخی ناول
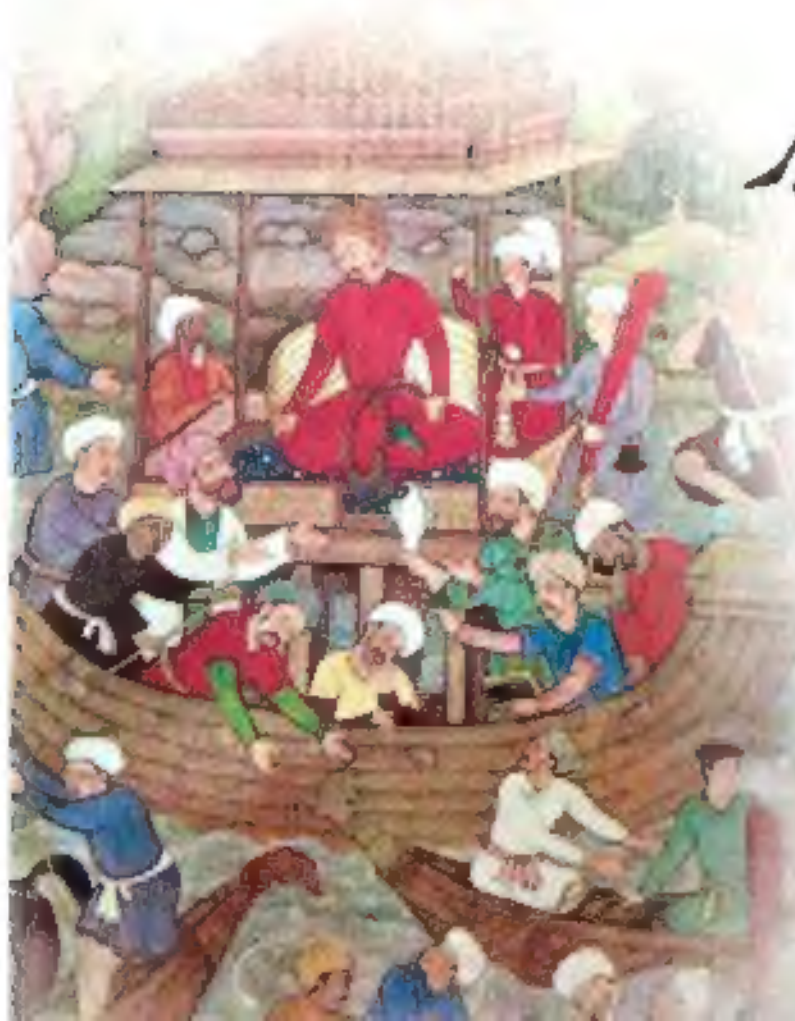
پریمقل قادروف اکتوبر 1928 ، کوزکمانستان کے ایک پہاڑی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ماسکو انسٹی ٹیوٹ آف لٹریچر سے علوم زبان کے طالب علم کی حیثیت سے گریجوایشن کی اور 1951ء میں سنٹرل ایشین اسٹیٹ یونیورسٹی کی فیکلٹی آف اورینٹل اسٹڈیز سے وابستہ ہو گئے۔

پہلی کتاب "Student" 1950 میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ بھی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ تاریخی ناول "ظہیر الدین بابر" انھوں نے ازبک زبان میں تحریر کیا تھا جس کے 6 ایڈیشن شائع ہوئے۔ 5 مرتبہ یہ ناول کثیر تعداد میں رشین زبان میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ اس کے ہندی، اردو، بنگالی، ترکی، قازق، ترکمان اور دیگر کئی زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں۔ 2000ء - 1990ء پریمقل قادروف ازبکستان کی ادبی مجلس برائے سائنس و تعلیم و ثقافت کے ڈپٹی چیئرمین اور چیئرمین بھی رہے۔ 1988 میں آپ کو People's Writer of Uzbekistan کے طور پر "El-yurt" ایوارڈ سے نوازا گیا۔

اشاعت چہارم

ظہیر الدّین بابر

(ایک اہم اور دلچسپ تاریخی ناول)

پریمقل قادروف

نیشنل بک فاؤنڈیشن

اسلام آباد

فہرست

پیش لفظ — پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق جاوید — iv

پہلا حصہ
چہرۂ خوابیدہ

- قوا — 01
- آخسی — 15
- اندجان — 23
- قوا — 41
- اوش — 53
- سمرقند — 84
- اندجان — 100
- سمرقند — 127
- دوبارہ سمرقند میں — 153
- تاشقند، اتچپا اور اسفرہ — 178

دوسرا حصہ
گردشِ فلک

- ہرات اور مرد — 209
- قندز... اور ایک بار پھر سمرقند — 247
- کابل — 275
- نئے کنارے لاہور، پانی پت، دہلی — 305
- آگرہ — 330
- فتح پور سیکری — 358
- ایک بار پھر آگرہ — 371
- اختتامیہ — 383

پیش لفظ

2014ء کے بعد نیشنل بک فاؤنڈیشن کے نئے سلسلۂ اشاعتِ کتب کے تحت ایسی تمام کتابیں زیورِ طبع سے آراستہ کی جارہی ہیں جو قارئین کے لیے دلچسپی کی حامل ہیں۔ کتابوں کی اشاعت کے نئے منصوبوں کے ساتھ ساتھ این بی ایف کی طرف سے پہلے سے شائع کردہ کتابوں کے نئے ایڈیشن بھی نئے انداز اور تزئینِ نو کے ساتھ شائع کیے جارہے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان اہم کتب سے استفادہ کر سکیں۔

ظہیر الدین بابر مُغل بادشاہت کے بانی اور عظیم شہنشاہ تھے جنھیں بے مثال کارناموں کے باعث تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی۔ انھوں نے نہ صرف اپنے وسائل سے کئی گنا بڑی فوج کو شکست سے دوچار کیا بلکہ ہندوستان کو ایک مضبوط وحدت میں بھی منتقل کیا۔ ظہیر الدین بابر عادل بادشاہ تھا، وہ بھیس بدل کر عوام میں گھومتا اور ان کے مسائل سے آگاہی حاصل کرتا۔ وہ دلکش شخصیت، لطیف مزاج اور نفیس طبیعت کا آدمی تھا۔ اس نے لوٹ مار اور مظالم سے ستائی ہوئی قوم کو امن وامان کی زندگی سے سرفراز کیا اور اپنی رعایا میں تمیزِ آقا و بندہ ختم کی۔ اُس کے حُسنِ سلوک کو نہ صرف اپنوں بلکہ غیروں نے بھی سراہا۔ وہ علوم وفنون کا دلدادہ اور خود ایک بلند پایہ مصنف تھا۔ ''تزکِ بابری'' جو اس کی خود نوشت ہے، ایسی اعلیٰ پایہ کتاب ہے جس کے کئی زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں اور جو آج بھی ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہے۔

اس عظیم بادشاہ کی سوانح کو پر یمقل قادر وف نے ناول کے اسلوب میں پیش کیا ہے جو اپنے عمدہ اور خوبصورت اندازِ بیان کے سبب قارئین میں مقبولیت کا باعث ہے۔

نیشنل بک فاؤنڈیشن نے ''ظہیر الدین بابر'' کا پہلا ایڈیشن 1990ء میں شائع کیا تھا، بعدازاں اسے 2010ء میں دوبارہ زیورِ طبع سے آراستہ کیا گیا۔ مقبولیت اور عوام میں پسندیدگی کے باعث اب اس کا تیسرا ایڈیشن نئے گیٹ اپ کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن نے ہر اچھی اور مفید کتاب کی اشاعت اور اسے عمدہ طریقے سے ارزاں نرخوں پر قارئین کے لیے پیش کرنے کو اپنا مشن بنا رکھا ہے۔ کسی بھی کتاب کا تیسرا ایڈیشن شائع ہونا یقیناً اس کی کامیابی کی دلیل ہوتی ہے۔ یہ تازہ ایڈیشن جہاں اپنی مقبولیت کا آئینہ دار ہے وہیں کتاب کلچر کو عام کرنے کے ہمارے مشن کی کامیابی کا عکاس بھی ہے۔

(۲)

اس کتاب کا چوتھا ایڈیشن پیش کرتے ہوئے مجھے مسرت محسوس ہورہی ہے کہ قارئین ہماری کاوشوں کو مسلسل پسند کر رہے ہیں چنانچہ اس بار اس کی قیمت -/300 روپے سے کم کر کے -/280 روپے کر دی گئی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ استفادہ کر سکیں۔

ڈاکٹر انعام الحق جاوید

(پرائڈ آف پرفارمنس)

مینیجنگ ڈائریکٹر

پہلا حصہ

چشمۂ خوابیدہ

قوا

ا

ہجری سن ۸۹۹ چل رہا تھا.....

فرغانہ کی گرمیوں کے تپتے ہوئے آسمان پر دن میں کالے کالے بادل منڈلاتے رہے تھے، وادی میں سخت اُمس محسوس ہو رہی تھی لیکن شام ہوتے ہوتے تیز موسلا دھار بارش ہوئی اور آسمان صاف ہو گیا۔ سرخ مٹی کے ٹیلوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے دریا قوا سائے میں اچانک طغیانی سی آ گئی اور پانی ارغوانی ہو گیا۔ لگ رہا تھا جیسے دھارے میں خون کے جھاگ اٹھ رہے ہوں۔

دریا کنارے بید مجنوں کے درختوں میں سے ایک کی شاخوں تلے ایک نوجوان اور ایک لڑکی دنیا کی نظروں سے چھپے کھڑے ہوئے تھے۔

"ارے رابعہ، مجھ پر بھروسا رکھو نا" نوجوان نے مضطرب لہجے میں چپکے چپکے کہا، "جب تک میں زندہ ہوں، تمھیں کسی مصیبت سے ڈرنے کی کیا ضرورت۔"

"خدا آپ کو ہمیشہ زندہ و سلامت رکھے، طاہر جان..... لیکن ہمارے وطن پر تو ہزاروں لاکھوں دشمن ٹوٹ پڑے ہیں۔ کیا انھیں روکا جا سکتا ہے؟ اور پھر روکے گا بھی کون؟ ذرا ادھر تو دیکھیے، اور بھی پناہ گزین بھاگے چلے آ رہے ہیں..... کتنی زیادہ تعداد ہے ان قسمت کے ماروں کی!....."

طاہر نے لڑکی پر سے نظریں ہٹا کر اس سمت دیکھا۔

قوا سائے کے اس پار دور تک دلدلی علاقہ پھیلا ہوا تھا جس پر سرکنڈے کی گھنی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ ختم ہوتی ہوئی بارش میں دریا کے لمبے چوبی پل کی ہلکی سی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ پل پر انسان، گھوڑے اور بھیڑیں چیونٹیوں کی سی قطار میں رینگتے معلوم ہو رہے تھے، اور پر تک لدے پھندے اراب دھندلے دھندلے دکھائی دے رہے تھے۔

دشمنوں کے لشکر نے سمرقند کے حکمران کی سرکردگی میں مرغیلان پر دھاوا بول دیا تھا اور یہ مصیبت زدہ لوگ اپنے سامان اور بیٹیوں، بیویوں کی عزت آبرو کو لٹنے سے بچانے کی کوشش میں قوا سے ہو کر اندجان کی طرف بھاگ رہے تھے۔

"بھاگنا تو ہمیں بھی پڑے گا!" رابعہ نے گہری ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔ "امی جان نے میرے جہیز کا صندوق مسیلے میں چھپا دیا ہے..... آپ میری فکر نہ کیجیے۔ آج شام کو خود مجھے اندجان کے قلعے میں پہنچا دیں گے۔"

اندجان کا قلعہ طاہر کی نگاہوں میں پھر گیا۔ اس نے سوچا کہ محمود اپنی بہن کو قلعے میں تو پہنچا دے گا پر اس کے بعد کیا ہوگا؟ وہاں کے مطلق العنان اور بے حد طاقتور بیگ * کوزہ گر کی حسین بیٹی کے لیے کچھ کم خطرناک ثابت ہوں گے کیا؟

"نہیں!" طاہر نے بلند آواز سے کہا۔ "تمھیں میرا ذرا بھی خیال ہو تو وہاں نہ جاؤ!"

طاہر کی ہتھ کرگھے کی بھنگی دھاری دار قمیص کے اوپر کمر میں خنجر لٹکا ہوا تھا۔ وہ لڑکی کے چہرے اور شوخی سے معمور رہنے والی آنکھوں کو جن میں اس وقت خوف اور تشویش کروٹیں لے رہے تھے، دیر تک تکتا رہا۔

"جانے کو تو میرا بھی جی نہیں چاہتا لیکن ہو بھی کیا سکتا ہے؟! اتنا تو خطرہ ہے یہاں!"

لڑکی نے طاہر سے ملاقات کے لیے گھر سے نکلتے وقت عجلت میں باپ کی سیاہ اونی چوغے ہی کو سر پر ڈال لیا تھا۔ بارش میں بھیگ جانے کے بعد یہ چوغہ خاصا وزنی ہو چکا تھا اس لیے اس نے اسے سر سے کھسکا کے شانوں پر لٹکا لیا۔ اتنے میں اس کے کرتے کے گلے کا بند کھل گیا اور طاہر کی نگاہیں اچانک کرتے کے گریبان سے جھانکتے سرخ و سفید مثلث پر جم کر رہ گئیں۔ سبز صدری سترہ سالہ رابعہ کی نرم و نازک پتلی کمر اور ابھرے ہوئے سینوں پر بالکل کسی، چپکی ہوئی سی تھی۔

طاہر نے رابعہ کے ساتھ ہی ساتھ پروان چڑھتے ہوئے وادی شباب میں قدم رکھا تھا۔ دونوں کے خاندان عرصے سے ایک دوسرے کے پڑوسی تھے لیکن طاہر کو اب کہیں جا کر پہلی بار صحیح معنوں میں احساس ہوا کہ کتنی نازک و حسین ہے رابعہ، اس کی اپنی رابعہ اور جیسا کہ ظاہر تھا، کتنی ہوس ہو سکتی تھی دوسری سرزمینوں کے بیگوں اور بھاڑے کے سپاہیوں کو اس کی جیسی نازک حسیناؤں کی!

موسم بہار میں دونوں کے والدین نے ان کی منگنی کی رسم ادا کر دی تھی۔ طاہر کو رابعہ اس موقعے پر بھی اتنی زیادہ خوبصورت نہیں معلوم ہوئی تھی! شادی میں اب بس رمضان شریف کے گزرنے ہی کی تو دیر رہ گئی تھی۔ دونوں کو یقین تھا کہ جلد ہی ساتھ رہنے لگیں گے اور وہ راحت کے خوابوں سے پیدا ہونے والی پرسکون اور بے فکر زندگی گزار رہے تھے۔ لیکن ہوا اس کے بالکل برعکس: جنگ کی تیز آندھی تو ان کے دروازوں کو جھنجھوڑنے لگی۔

دفعتاً طاہر نے رابعہ کو کھینچنے کی کوشش کی، چوغہ زمین پر گر گیا اور فوراً ہی طاہر کو احساس ہوا کہ وہ کانپ رہی ہے، سر سے پاؤں تک کانپ رہی ہے۔

"اتنی بزدل تو تم کبھی بھی نہیں تھیں، رابعہ" طاہر نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تمھیں ہو کیا گیا؟"

"میں نے بڑا ڈراؤنا خواب دیکھا ہے، طاہر جان! طاہر جان! پروردگار ہمیں بلاؤں سے محفوظ رکھ!"

"ڈراؤنا خواب؟..... میرے بارے میں؟ بتاؤ نا کیا دیکھا۔"

"اسے زبان پر لانے کی تاب نہیں۔"

"خوابوں میں انسان کیا کیا نہیں دیکھتا..... جو دیکھا ہو بتاؤ بھی!..... ہونے والی بات ہو کر رہے گی!....."

"میں نے ایک سیاہ سانڈ کو دیکھا، اس کے خنجر جیسے سینگ تھے جن پر اس نے آپ کو اٹھا لیا..... نہیں، نہیں!" اور اس نے اپنا جسم طاہر سے بالکل سٹا دیا۔ "جب بھی خیال آتا ہے، رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں!"

طاہر خوابوں میں یقین رکھتا تھا اور وہ بھی کسی بلا کے اندیشے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے رابعہ کو اپنی

---

* بیگ۔ حکمرانوں کے عہدے دار، جاگیردار۔ سیاہ اور بائی حاشیے نوٹ اڈیٹر کے ہیں

بانہوں سے آزاد کر دیا۔

"ذرا تفصیل سے بتاؤ نا..... مجھے سانڈ نے سینگوں پر اٹھا لیا..... تو کیا خون بھی دیکھا تھا تم نے؟"

"ہاں، ہاں..... دیکھا کہ خون کا فوارہ پھوٹ نکلا!"

طاہر نے اطمینان کی سانس لی۔

"اگر ایسا ہوا تو ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ خواب میں خون دیکھنا اچھا شگون ہے۔ ابا جان ہمیشہ یہی کہتے ہیں۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو! طاہر جان، میں..... اگر آپ اندجان نہ جائیں گے تو میں بھی نہ جاؤں گی۔ کچھ ہوتا ہی ہے تو ہونے ہی دو..... کم از کم ہم ساتھ تو ہوں گے....."

بارش کے قطرے بید مجنوں کی پتیوں سے چھن چھن کر نیچے گر رہے تھے۔ پھوار کبھی کبھی لڑکی کی لمبی لمبی پلکوں پر بھی پڑ جاتی تھی۔ طاہر کو لگا کہ رابعہ رو رہی ہے۔

"ارے رابعہ، میرے لیے کیوں کڑھتی ہو۔ میں ٹھہرا معمولی کسان۔ سورج نکلتے اور آسمان صاف ہوتے ہی بیلوں کو لے کر کھیت پر چلا جایا کروں گا۔ فصل کاٹوں گا۔ مجھ سے کسی کو کیوں پرخاش ہو گی؟ میں کسی کا دشمن ہوں؟ رہے دشمن تو مجھے ان سے کیا سروکار؟..... ارے ہاں..... مجھے یاد آگیا: اندجان کے قلعے میں تو تمھاری سگی پھوپھی رہتی ہیں۔ تم ان ہی کے ہاں چلی جاؤ۔"

"اندجان میں تو آپ کے بھی ایک رشتے دار رہتے ہیں نا..... ہم لوگ ساتھ ہی کیوں نہ چلیں؟"

طاہر خیالوں میں کھو گیا۔

ہاں، ماموں جان فضل الدین اندجان ہی میں تو رہتے ہیں۔ میر عمارت ہیں۔ قوامیں بھی ان کی شہرت ہے: دریا پر یہ سامنے والا چوبی پل ان ہی کے نقشے کے بموجب تو تعمیر کیا گیا تھا۔ جب اندجان میں ان کی نگرانی میں تعمیر کیا جانے والا دیوان خانہ جسے گل بوٹوں اور نیلگوں چکنے ٹھیکروں کی پچی کاری سے آراستہ کیا گیا تھا، مرزا عمر شیخ کو پسند آگیا تھا تو ماموں جان کتنے مشہور ہو گئے تھے! طاہر یقینی طور پر سن چکا تھا عمر شیخ نے خوش ہو کے انہیں ایک بار گھوڑا اور اشرفیوں سے بھری ایک تھیلی عطا کی تھی اور یہ کہ وہ قلعے میں نہیں بلکہ شہر کے باہر بڑے عیش و آرام سے اکیلے رہتے ہیں۔

فضل الدین ماموں جب قوامیں رہتے تھے تو اسے پڑھنا لکھنا سکھایا کرتے تھے۔ اب وہ ان کے ہاں پناہ لینے کے لیے پہنچ جائے تو یقیناً اسے اپنے سائے میں رکھ سکتے ہیں لیکن ضعیف والدین کو اس کے اس فیصلے کا علم ہو گا تو جانے کیا کہیں۔ وہ اکلوتا بیٹا ہے، ہو سکتا ہے کہ والدین اسے جانے ہی نہ دیں اور اچانک اندجان جانے کا اصل سبب بتانا کچھ اچھا نہیں لگتا..... تو کیا وہ محمود سے کہے کہ اس معاملے میں ابا جان سے بات کر لیں؟

"اچھی بات ہے، رابعہ، ہم ساتھ ساتھ اندجان چلیں گے۔ ابا جان کو راضی کرنا البتہ ٹیڑھی کھیر ہے..... تمھارے محمود بھائی گھر پر ہیں کیا؟"

"کہیں گئے تھے لیکن کہا تھا کہ افطار کے وقت تک لوٹ آئیں گے۔ کیا بات ہے؟"

"ان سے کہنا کہ روزہ افطار کرنے کے بعد ہمارے ہاں آجائیں، مجھے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

"ٹھیک ہے، کہہ دوں گی۔"

رابعہ نے اپنا چہرہ طاہر کے چوڑے چکلے سینے میں چھپا دیا اور اس سے چمٹ کر بولی: "خدا کرے ہم کبھی بھی جدا نہ

"یہ اور یہ کس کا ہے؟"

وہ شخص خاموش رہا، جواب فضل الدین نے دیا

"میرا ذریعہ ہے، طاہر جان۔ میں اپنے سارے سامان کے ساتھ یہاں آیا ہوں۔"

"کیا؟" طاہر حیرت ظاہر کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کے لیے ماموں کا استقبال یقیناً باعث مسرت تھا لیکن۔ کیا ہو گیا؟ وہ تو آس لگائے بیٹھا تھا کہ اندجان جا کے ان کے ہاں رہے گا۔ لیکن وہ خود ہی یہاں آ گئے اور خالی نہیں بلکہ تمام اسباب کے ساتھ۔ اس کا مطلب تو یہ تھا کہ اندجان کا راستہ اس کے لیے بند ہو چکا ہے۔ لیکن رابعہ پر کیا گزرے گی؟

"ارے طاہر، یہ تم منہ سکوڑے کیا کھڑے ہوئے ہو۔ داب سے سامان اتروالو نا" اس کی ماں نے کہا۔ "تمہارے ماموں تو صاف لگ رہا ہے کہ بارش میں کافی پریشان ہو چکے ہیں۔"

"ہمشیرہ محترمہ، یہ کہنا کہ پریشان ہو چکا ہوں، بہت ہی ناکافی ہوگا۔ ہر قدم قدم پر کیچڑ میں دھنس جاتا تھا، بس جوں توں گھسٹتے رہے، رینگتے رہے۔ میں تو عاجز آ گیا ایسی زندگی سے اور پھر راستے میں قیامت کی بھیڑ بھاڑ تھی، کوئی شمار تھوڑا ہے پناہ گزینوں کا۔"

طاہر سامان اتارنے میں کوچواں کی مدد کرنے لگا۔ اف! قاس کا ہاتھ گھوڑے سے لگا اور فوراً ہی گرم گرم چکنی مٹی میں سن گیا۔ گھوڑا کیچڑ میں بری طرح لت پت تھا۔ اف، کتنی مصیبت جھیلنی پڑی تھی بیچارے مسافروں کو! لیکن آخر ایسے میں جبکہ قوا کے سارے لوگ حملے سے جان بچانے کی فکر میں اندجان کو بھاگ رہے تھے، ماموں کو یہاں آنے کی کیا پڑی تھی؟ طاہر کوچوان کے پکڑے ہوئے بورے کو، جس میں کوئی کالی وزنی چیز رکھی ہوئی تھی، زمین پر اتارنے کی کوشش کرنے لگا

"ارے رے، ذرا ہولے ہولے، بڑا وزنی ہے۔ دونوں مل کر اتارو" ماموں نے کہا۔

بورے میں چھوٹا لیکن بہت وزنی آہنی صندوق رکھا ہوا تھا جسے فضل الدین نے کسی زمانے میں قوا کے آہن گروں سے بنوایا تھا۔ اس میں نہ پانی رس سکتا تھا اور نہ آگ اسے نقصان پہنچا سکتی تھی۔ میر عمارت اس میں اپنے نقشے بھی سنبھال کر رکھتا تھا اور ساتھ ہی ایک دوسرے فن کے بہترین نمونے یعنی تصاویر بھی۔ فضل الدین نے تین سال سمرقند اور چار سال ہرات میں تعلیم حاصل کی تھی وہاں اس نے فن تعمیر کے ساتھ ہی ساتھ جانداروں کی جیتی جاگتی تصویر بنانے کی فنی باریکیوں پر بھی عبور حاصل کر لیا تھا۔ ہرات میں رزمیوں کے قلمی نسخوں کو گل بوٹوں ہی سے نہیں بلکہ تصویروں سے بھی آراستہ کیے جانے کا عام رواج تھا اور بہزاد نے اپنے قلم اور رنگوں سے علی شیر نوائی اور حسین بیقرا کی جو تصویریں بنائی تھیں ان کی بدولت سے کافی شہرت حاصل ہوئی تھی۔ لیکن سمرقند اور وہاں سے بھی زیادہ فرغانہ میں انسانی چہرے کی نقاشی کا تختہ مشق ہونا مستحق جرم تصور کیا جاتا تھا۔ تعلیم دی جاتی تھی کہ اللہ جانداروں کا واحد خالق ہے اور فانی انسان کو اس معاملے میں پروردگار سے مقابلے کی جرأت بھی نہ کرنی چاہیے۔ اس بنا پر فضل الدین اپنی بنائی ہوئی تصویروں کو آہنی صندوق میں محفوظ رکھتا تھا۔

طاہر نے صندوق کو اکیلے ہی اٹھا کر گھر کے اندر پہنچا دیا۔ فضل الدین نے موٹا بھورا چکمن* اور پوری طرح بھیگے ہوئے جوتے دہلیز ہی پر اتار دیے اور چرمی پاتابے پہن کر صاف پانی کی نالی سے منہ ہاتھ دھوئے۔ بارش سے چکمان کے نیچے اس کا کرتا بھی بھیگ گیا تھا لیکن گرمی زوروں پر تھی اس کے مدنظر اس نے کرتا نہ بدلا

---

* چکمان۔ ایک قسم کا چوغہ

سفر نے اسے اس بری طرح ہلکان کر دیا تھا کہ اس نے ستاوے کو چھوا تک نہیں، سرد سے کی دو قاشیں کھائیں، چائے کے چند پیالے پیے اور بس۔ کھانے پر بلایا جانے والا کوچوان البتہ دلی پڑے ستاوے پر بڑے شوق سے ٹوٹ پڑا اور دو بڑے بڑے پیالے خالی کر دیے۔ اس کے بعد وہ گھوڑے کی دیکھ بھال کرنے کے لیے احاطے میں چلا گیا۔

"اوہ، فضل الدین!" طاہر کے باپ نے اپنی لمبی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بات شروع کی۔ "اچھا ہوا کہ آپ آ گئے، بہت ہی اچھا ہوا، ایسے پرآشوب ایام میں ہمیں ساتھ ہی رہنا چاہیے۔"

"آنے کو آ تو گیا ہوں لیکن کیا یہ عجیب نہیں لگتا؟ لوگ تو حملے کے خوف سے بھاگ رہے ہیں اور میں خود ہی موت کے منہ میں چلا آیا۔" فضل الدین نے طاہر کی طرف دیکھا۔

"ترماموں جان، اس کا کوئی اہم سبب ہے کیا؟" طاہر نے پوچھا۔

"سبب؟ ارے طاہر، سبب بس ایک ہی ہے، جنگ چھڑتی ہے تو عمارتوں کی تعمیر کے کام معطل ہو جاتے ہیں اور جنھیں یہ فن آتا ہے ان کی کسی کو ضرورت نہیں رہ جاتی....."

"لیکن آپ کو تو خود ہمارے شاہ نے تعمیرات کے کام کی نگرانی سپرد کی تھی نا؟"

"ہمارے شاہ کو تو ان دنوں ساری فکر اس بات کی ہے کہ آخسی کا قلعہ زیادہ سے زیادہ طاقتور ہو جائے۔ کہتے ہیں کہ تاشقند کے خان محمود بھی ہمارے دشمن ہو گئے ہیں، وہ لشکر تیار کر رہا ہے اور مشرق سے کاشغر کے شاہ ابوبکر دغلت سید بھی اوزگنت پر چڑھے چلے آ رہے ہیں۔"

طاہر کے باپ نے سہم کر اپنے گریباں کو تینوں انگلیوں سے مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا۔

"یا خدا! ادھر سے کاشغر والا چڑھتا چلا آ رہا ہے اور ادھر سے سمرقند والا..... مطلب یہ کہ دشمن تینوں طرف سے یلغار کر رہے ہیں؟ بھلا یہ کیسی بدنصیبی ہے، فضل الدین؟ یہ شاہ اور سلطان لوگ کبھی مل بیٹھ کے کیا یہ نہیں طے کر سکتے کہ امن و سکون سے زندگی گزاریں گے؟

خاص طور سے اس لیے اور بھی کہ سب ایک دوسرے کے قریبی عزیز ہیں، درست ہے نا؟"

"جی ہاں، یہ تو درست ہے۔ ہمارے شاہ عمر شیخ تاشقند کے خان کے بہنوئی ہیں اور سمرقند کے شاہ سلطان احمد مرزا جو ٹڈی دل سے ہمارے اوپر حملہ کر رہے ہیں، ہمارے شاہ کے برادر حقیقی ہیں۔ یہی نہیں، دونوں بھائیوں نے تو ایک دوسرے کے سمدھی بن جانے کا بھی فیصلہ کر لیا تھا۔ سمرقند کے شاہ کی صاحبزادی سے ہمارے ولی عہد مرزا بابر کی منگنی پانچ سال کی عمر ہی میں کر دی گئی تھی۔ مطلب یہ ہوا کہ برادر پر اور برادر نسبتی برادر نسبتی پر برہنہ شمشیریں لیے چڑھائی کر رہے ہیں!"

"یا پروردگار! یہ قرب قیامت کے آثار ہیں کیا؟ ارے فضل الدین، کہیں دنیا کا خاتمہ تو نہیں قریب آ رہا ہے؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا! ہاں یہ ضرور جانتا ہوں کہ لڑتے جھگڑتے تو یہ لوگ ہیں اور مصائب اور مظالم کے پہاڑ دوسروں کے سروں پر ٹوٹتے ہیں۔ آپ اور ہم جیسوں کے سروں پر....."

"گویا ہمارا نصیب ہی ٹیڑھا ہے....."

"جی ہاں نصیب سیدھا نہ ہو تو جینا مشکل ہو جاتا ہے۔" فضل الدین نے جیسے اپنے ہم کلام کی بات کی تائید کی اور

بچے سیادت کی رو میں بہہ نکلا "میں نے کیسے کیسے خوابوں کو بستے ہوئے ہرات سے واپس آتا تھا اپنے فرزند
میں تھے ہی خوبصورت مدرسے * شاہ اور سلطان ہمیشہ زندہ نہیں رہتے۔ ہمیشہ زندہ رہتا ہے الغ بیگ کا مدرسہ، ہرات کا
خمسہ" اور ایسی ہی دوسری یادگاریں۔"

فضل الدین نے کہنے کو تو یہ کہہ دیا لیکن اپنی بات سے خود ہی سہم گیا اور جلدی سے رخ موڑ کے دروازے کی طرف دیکھا۔ "ماموں درباریوں کے درمیان زندگی گزارنے کے عادی ہو چکے ہیں، تجربوں سے ہوشیار رہتے ہیں" طاہر نے سوچا۔

"ارے ماموں جان، آپ اپنی بات جاری رکھیے، یہاں کوئی غیر نہیں ہے۔ آخر آپ خاندان میں کیوں نہ ٹھہر سکے؟"

فضل الدین نے فوری طور پر جواب نہ دیا، وہ خیالوں میں غرق ہو گیا۔

گزشتہ شام کو فضل الدین پڑوس کی گلی میں رہنے والے اپنے خوش نویس دوست کے ہاں گیا ہوا تھا تو خود اس کے گھر میں کچھ اجنبی افراد داخل ہو گئے۔ انھیں دیکھتے ہی کتا بھونکنے لگا تو اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور گھر میں موجود نوجوان نوکر کی (جو کوچوان کی حیثیت سے نوکر آیا تھا)، مشکیں باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ پھر ان لوگوں نے سارے گھر کو چھان مارا اور جب انھیں آہنی صندوق مل گیا تو ظاہر ہے اس کا قفل توڑنے لگے۔

فضل الدین کے گھر سے ملحق دائیں اور بائیں جانب کے گھروں میں دم توڑتے ہوئے کتے کی دردناک چیخ سنائی دی گئی تھی۔ ان پڑوسیوں نے تاڑ لیا کہ ضرور کوئی ایسی ویسی بات ہے۔ دوران میں سے ایک اپنے احاطے سے دبے پاؤں نکل کر گلی میں پہنچا تو اسے درخت کے نیچے ایک شخص چار گھوڑوں کی لگامیں تھامے کھڑا نظر آیا۔ پڑوسی اس شخص کے چہرے کو نہ دیکھ سکا کیونکہ سیاہ نقاب پڑی ہوئی تھی اور صرف آنکھیں ہی چمک رہی تھیں۔ لیکن فضل الدین کے گھر کے اندر سے آہنی احاطے سے ٹکرانے کی دردار جھنجھناہٹ مسلسل ابھر رہی تھی۔ پڑوسی لپک کے خوش نویس کے ہاں پہنچا جہاں سے فضل الدین بھاگا بھاگا گھر آیا۔

وہ اندر داخل ہوا تو نامعلوم افراد آہنی صندوق کا قفل توڑنے میں آخر کار کامیاب ہو چکے تھے۔ مالک مکان کو دیکھتے ہی ان میں سے دو تو کھڑکی توڑ کر باہر کود گئے اور تیسرا باہری دروازے کی طرف لپکا۔

"ٹھہر جا، بدمعاش"، فضل الدین نے للکارا، لیکن ریچھ جیسے ہٹے کٹے نوجوان (وہ بھی نقاب پوش ہی تھا) نے اسے زور سے شانہ مار کر دھکیل دیا اور بھاگتا ہوا گلی میں پہنچ گیا۔ ڈاکو تو اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کے بھاگ کھڑے ہوئے اور گھپ اندھیرے میں ان کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔

فضل الدین کھڑے ہوئے صندوق پر جھک کر اندر دیکھنے لگا۔ طاق پر رکھی ہوئی شمع کی مدھم روشنی میں نظر آ رہا تھا کہ ڈاکو صندوق کو چھان مارنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ عمارتوں کے نقشے کہیں کہیں سے مڑے ہوئے تھے اور شاہ رخ خاندان کی عطا کی ہوئی اشرفیوں کی تھیلی غائب تھی۔ لیکن فضل الدین کو سونے کی اتنی فکر نہ ہوئی جتنی ایک دوسری بات کی۔ اس تہ خانے کا کیا حشر ہوا جس میں اس کی بنائی ہوئی تصویریں رکھی تھیں؟ خدانخواستہ وہ لوگ اسے کھولنے میں کامیاب ہو گئے ہوں تو؟ اس نے جلدی جلدی کاغذات کا سارا انبار صندوق سے باہر نکال کے اس کے پیندے سے تختے ہٹائے اور خوب چیکے

* علاقائی درسگاہوں کو مدرسہ کہا جاتا تھا۔

موٹے سنہری چوکھٹے کو بائیں جانب کھسکایا۔ اندرونی قفل دکھائی دینے لگا۔ فضل الدین نے سر کے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ گھر میں اس وقت اور کوئی بھی نہ تھا، بڑے احاطے میں نوکر کی مشکیں کھولنے میں مصروف تھے۔ اس نے اپنے چوغے کی اندرونی جیب سے چھوٹی سی کنجی نکال کر خفیہ قفل میں لگائی اور ڈھکن کو دھیرے سے اٹھایا۔ یہ رہیں اس کی تصاویر کاغذات میں لپٹی ہوئی۔ اسے یہ تک یاد تھا کہ تصاویر کس ترتیب سے رکھی ہوئی ہیں۔ پودوں کو سینچتا ہوا بوڑھا باغبان، چنچل محرم پیالہ، یوں پر شکار، دریچے چنگ بجاتی ہوئی حسینہ کی تصویر، شاہ عمر شیخ کی دختر شہزادی خان زادہ بیگم کی تصویر۔

فضل الدین نے ہرات سے واپس لوٹنے کے بعد اندجان میں اپنی سرگرمیوں کا آغاز عمر شیخ کی شہر سے باہر واقع حویلی کی اندرونی دیواروں پر گل بوٹے بنانے والے مصور کی حیثیت سے کیا تھا۔ خان زادہ بیگم کو پتا چلا کہ فضل الدین تصاویر بنانے میں بھی مہارت رکھتا ہے تو اس نے اپنی تصویر بنانے کی فرمائش کی۔ یہ کام چوری چھپے انجام دیا گیا تھا کیونکہ شاہ کو علم ہو جاتا تو وہ یقیناً رکوا دیتا۔ یہی نہیں، حسین و جمیل شہزادی کی خواہش کی تکمیل کرنے والے مصور کی جان کے لالے بھی پڑ جاتے!

نوکر آخر کار ہوش میں آ گیا اور اس نے گھر پر ہونے والے حملے کی تفصیلات ایک حد تک تسلسل کے ساتھ بیان کر دیں۔ فضل الدین نے اس کی اور واقعے کے چشم دید گواہ پڑوسی کی باتوں پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ حملہ آور عام ڈاکو نہ تھے۔ وہ تو کسی کے اشارے پر یہ کام کر رہے تھے۔ آخر انھیں تلاش کاہے کی تھی؟ عمارتی نقشوں کی؟ لیکن نقشوں کو تو وہ لوگ اپنے ساتھ نہیں لے گئے تھے حالانکہ بالکل اوپر ہی رکھے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ تصویریں ڈھونڈ رہے تھے۔ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ انھیں کوئی ایسا شخص ہی بھیج سکتا تھا جسے فضل الدین کی مصوری میں مہارت کا علم ہو اور جو کسی بات کا بدلہ لینا چاہتا ہو۔

فضل الدین کو یاد آیا کہ موسم بہار میں حسن یعقوب نے جو اندجان کے مشہور اور بہت دولتمند بیگوں میں سے ایک تھا، اسے اپنے ہاں بلا کر بڑے گھمنڈ کے ساتھ کہا تھا:

”میں ایک ایسا شاندار حمام تعمیر کرانا چاہتا ہوں جو لاثانی ہو۔ اس کے اندر گرمیوں میں غسل کے لیے سنگ مرمر کے حوض ہونے چاہئیں۔“ پھر حسن یعقوب نے دھیرے دھیرے سے کہا ”میں کئی خوبصورت لڑکیاں خریدوں گا، سونا میرے پاس بہت ہے... میں چاہتا ہوں کہ ان لڑکیوں کے نہاتے وقت چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں سے ان کا نظارہ کر سکوں اور مجھے کوئی نہ دیکھ سکے۔ یہ کھڑکیاں بڑی صفائی سے بنائی جانی چاہئیں، خفیہ ہونی چاہئیں، سمجھ گئے نا؟“ بیگ نے اپنے آپ سے کافی مطمئن ہو کر زوردار قہقہہ لگایا۔ ”آپ کو اس لیے زحمت دی ہے کہ آپ اس کام میں مصروف ہو جائیں۔ منہ مانگی اجرت دوں گا۔“

فضل الدین فنِ عمارت سازی کی تقدیس میں یقین رکھتا تھا۔ وہ اپنی ناپسندیدگی کو چھپا نہ سکا اور اس نے اس ”ناپاک“ تعمیر کی ذمے داری سنبھالنے کی تجویز مسترد کر دی۔

”اس میں ناپاک بات کون سی ہے؟... حمام تو میں اپنے پیسوں سے تعمیر کراؤں گا۔“

”میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں، حضور کہ ایسی کھڑکیاں بنانے میں مہارت رکھنے والے استاد موجود ہیں۔ بہتر ہو گا اگر آپ یہ کام ان ہی کے سپرد کریں۔ مجھے تو بادشاہ نے مدرسوں کی تعمیر کا حکم دیا ہے اور میں ان کے ابتدائی نقشے تیار کرنے میں

مصروف ہوں۔ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔"

حسن یعقوب نے فضل الدین کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھا

"کوئی بات نہیں۔ لیکن میں نے جو کچھ کہا ہے اسے ہم دونوں کے درمیان راز ہی رہنا چاہیے، جناب وزیر۔"

"ہماری یہ گفتگو یہیں شروع ہوئی اور سے یہیں پر ختم سمجھئے۔ لیکن آپ بھی مجھ سے ناراض نہ رہیں گے، سچ ہے نا، حضور؟"

"مجھ سے ناراض نہ رہیں گے۔۔ " بھلا یہ کیسے ممکن تھا! موٹی گردن والے حسن یعقوب نے اپنی توہین کا انتقام لے لیا۔ اس بیگ سے پیچھا چھڑانے (فضل الدین نے یہی سوچا تھا) کے کوئی پندرہ دن بعد کی شام کو جھٹپٹے میں ایک اور دولت مند بیگ احمد تنبل اس کے ہاں آ دھمکا۔ بیگ نے تنہائی میں اس کی طرف اشرفیوں کی تھیلی بڑھاتے ہوئے کہا

"جناب میر عمارت، یہ سونا قبول کیجئے اور میرے لیے ایک تصویر بنا دیجئے"

'کیسی تصویر؟'

احمد تنبل کی عمر پچیس سے تجاوز کر چکی تھی لیکن چہرے پر ابھی تک ایک بال بھی نمودار نہیں ہوا تھا۔ بے ریش بیگ نے اپنے پتلے ہونٹوں کو فضل الدین کے کان کے پاس لا کے چپکے سے کہا

'مجھے شہزادی کی تصویر چاہیے۔"

'کس کی؟' فضل الدین چونک پڑا۔ "خان زادہ بیگم کی؟"

'جب آپ ہمارے حکمران کی شہر سے باہر والی حویلی کی دیواروں پر نقاشی کر رہے تھے تب آپ نے انہیں پہلی بار دیکھا تھا نا؟ میرا مطلب ہے، خان زادہ بیگم کو؟ وہ خود بھی آپ کے فن کے بارے میں گہری دلچسپی سے باتیں کرتی رہتی ہیں۔"

اندیشوں کے مارے فضل الدین کے دل کی دھڑکنیں اتنی تیز ہو گئیں کہ اسے لگا جیسے پھٹ ہی جائے گا۔ اس بے ریش کو قصے کی واقعی بھنک لگ گئی تھی کیا؟

'یہ آپ کو کس نے بتایا؟ میں ٹھہرا میر عمارت۔۔۔ میں تو عمارتوں ہی کے نقشے، تصویریں بنا سکتا ہوں۔"

'ارے جناب، مجھ سے اس رازداری کی کیا ضرورت! میں جانتا ہوں کی تصویریں بنانے والوں کو پریشان تھوڑی کرتا ہوں۔ لوگ سچ ہی کہتے ہیں نا کہ ہرات میں عالی جاہ شاہ رخ* نے اپنے سمرقندی مرزا کے لیے جو محل بنوایا تھا اس کی دیواریں حسیناؤں کی تصویروں سے آراستہ ہیں۔ کیوں ہے نا سچ؟"

"سچ ہے لیکن۔۔۔ ہر شہر کے معیار جدا جدا ہوتے ہیں، کسوٹیاں الگ الگ ہوتی ہیں۔ شہزادی کی تصویر کی بات کہیں ہمارے حکمران کے کانوں تک پہنچ گئی تو؟ آپ نے اس بارے میں بھی سوچا ہے؟"

"کیا مجال جو کسی کو بھنک بھی لگے" احمد تنبل نے پھر سرگوشی کی۔ "یہاں گواہ کون بیٹھا ہے؟ راضی ہو جائیے، جناب! یہ اشرفیاں لے لیجئے۔"

"اتنی عجلت بھی کیا، بیگ صاحب۔۔۔۔ آپ سے یہ کس نے کہہ دیا کہ میں انسانوں کی تصویریں بنا سکتا ہوں؟"

---

* شاہ رخ۔ تیمور کا ایک بیٹا جسے باپ کی موت کے بعد اس کی سلطنت کا ایک وسیع وعریض علاقہ ورثے میں ملا تھا۔ اس کا پایۂ تخت ہرات تھا۔

"کسی پری کی... میں ٹھیک سے سمجھ نہیں سکا تھا کہ کس کی۔"

"ارے آپ کے صندوق میں کہیں تصویریں تو نہیں تھیں؟ پریوں یا حسیناؤں کی، کیوں جناب؟ ڈاکو کہیں تصویریں تو نہیں اٹھا لے گئے؟"

"تصویریں کیسے ہو سکتی تھیں، سرکار؟ میرے لیے حکمران عالی نے مدرسوں کی تعمیر کا حکم صادر فرمایا ہے اور میں انہی کے نقشے بنانے میں مصروف ہوں۔ تصویریں بنانے کی نہ مجھے فرصت ہے، ورنہ ہی اس فن پر عبور رکھتا ہوں۔ اور یقین مانیے، آقا، ایسا کرنے کی خواہش بھی نہیں رکھتا۔ صندوق میں صرف نامکمل نقشے ہی تھے اور کچھ بھی نہیں۔"

"وہ نقشے تو صحیح سلامت ہیں نا؟... اور جب یہ بات ہے تو احمد تنبل پر شک کیوں؟"

وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے خاموش کھڑے رہے۔

"حضور، میں نے اپنے گھر پر ہونے والے حملے کا سچا قصہ آپ کے گوش گزار کر دیا ہے۔ التجا ہے کہ معاملے کی تحقیقات کی جائیں۔"

"میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ آقا احمد تنبل شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ہمارے حکمران کی بڑی ملکہ فاطمہ سلطان بیگم کے رشتے دار ہیں۔ ہاں، یاد آ گیا، آج صبح ہی صبح وہ ہماری سلطنت کے دارالحکومت آخسی روانہ ہو گئے، فاطمہ بیگم صاحبہ نے یاد فرمایا تھا۔"

"اگر صندوق والی تصویریں اس بے ریش کے ہاتھ لگ جائیں تو وہ انہیں آخسی لے جا کر یقیناً شاہ یا ان کی بڑی ملکہ کو جو اس کی بہن ہیں، دے دیتا۔" یہ سوچ کر فضل الدین کا دل دھک سے ہو گیا۔ "خانزادہ بیگم کی تصویر کی ضرورت احمد تنبل کو کیا صرف اس لیے پڑی تھی کہ وہ مجھے تباہ کر دے؟ کیوں نہیں؟ شاہی خاندان سے تعلق جو رکھتا ہے۔ کنوارا بھی ہے اور عمر کے لحاظ سے اس کی شادی ہو جانی چاہیے تھی۔ اسے شاہ کا داماد اور خوبصورت شہزادی کا خاوند بننے کی سوجھی ہے۔"

فضل الدین کو لگا جیسے وہ مکڑی کے لسلسے جالے میں پھنس گیا ہو اور اس نے سوچا کہ اس جالے سے نکلنا چاہیے، کسی بھی طرح!

"داروغہ صاحب، ہمارے مہربان حکمران نے یہاں اندجان میں مجھے آپ کی حفاظت میں رکھا ہے۔ گر آپ ڈاکوؤں کو سزا نہ دیں گے تو یہ خادم براہ راست شاہ معظم سے درخواست کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔"

"یہ نہ بھولیے، میر عمارت صاحب کہ شاہ معظم تک آپ سے پہلے آپ کے وہ الفاظ پہنچ جائیں گے، جنہیں آپ بار بار دہراتے رہتے ہیں۔"

"کون سے الفاظ، داروغہ صاحب؟"

"کچھ لوگ ایسے ہیں... جنہیں یہ کہنا پسند ہے، "لوگوں کے دل و دماغ پر اپنی چھاپ، شاہ نہیں بلکہ شاعر، معمار اور مصور چھوڑ جاتے ہیں۔" دراصل کچھ لوگ کہتے ہیں، کچھ سنتے ہیں۔ شاعروں اور معماروں کے دوست ہمارے ہاں بھی تو دوست ہوتے ہیں۔"

"ارے، تو یہاں مخبر اور چغل خور چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن بے خوف کا اظہار سب سے زیادہ خطرناک ہوگا۔" فضل الدین نے سوچا اور تلخ لہجے میں کہا:

ثبوت نہ باقی رہنا چاہیے، تصویر کو ضائع کر دینا چاہیے، اسے نذرِ آتش کر دینا چاہیے، نذرِ آتش!

برش اور قلم کے ذریعے یہ تصویر بڑی باریکی کے ساتھ بنائی گئی تھی۔ اس سے ایک عجیب و غریب دوشیزہ جھلک رہی تھی، ہو بہو کسی جیتی جاگتی دوشیزہ جیسی۔ شمع کی دھندلی روشنی میں مشکل ہی نظر آنے والی لمبی لمبی پلکیں مرتعش سی معلوم ہو رہی تھیں، اور سرخ ہونٹوں پر دلآویز تبسم رقصاں تھا۔ خانزادہ بیگم کی خوبصورتی اور دلکشی نے میر عمارت کو ایک بار پھر اپنا گرویدہ بنا لیا۔ ''کیا میں واقعی اس دوشیزہ کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہوں؟'' فضل الدین نے حیرت و مسرت کے ساتھ سوچا۔ ''کوئی مفلوک الحال شخص شہزادی کی محبت میں گرفتار ہو جائے تو کیا یہ ہنسی کی بات نہیں؟ لیکن جب وہ مفلوک الحال شخص مصور بن جائے تو؟ نہیں! میں تو اپنے شاہکار سے محبت کرتا ہوں۔ اسے نذرِ آتش کر دینا چاہیے! زندہ رہوں گا تو ایسی ہی دوسری تصویر بنالوں گا۔''

وہ تصویر کو جلانے کے لیے بڑھا لیکن جلا نہ سکا۔ اسے یوں لگا جیسے خانزادہ بیگم کا چہرہ بے رحم پنجوں میں گھر کر شدتِ درد سے مسخ سا ہو گیا۔ وہ شمع کے پاس سے الگ ہٹ گیا۔ زندہ فرد کی جان سے زیادہ، خود اپنی محبوبہ کو نذرِ آتش کر دینا بھلا یہ کیسے ممکن تھا؟ اسے اپنے دل کی گہرائیوں سے دھیمی آمیز چیخ سنائی دی ''تم بزدل ہو، بزدل! تمھارے حریفوں نے ابھی تمھارے در پر دستک بھی نہیں دی اور تم ارتکابِ جرم پر آمادہ ہو گئے! خود کو فریب دینے کی حماقت میں نہ جلا ہو۔ یہ شاہکار کی تخلیق تم دوبارہ کبھی بھی نہ کر سکو گے! تم نے صرف ایک ہی حسن کی نقاشی نہیں کی، تم تو شہزادی کی سادگی، زرکت و نزاکت کی، اس کی یکتائی کی عکاسی کرنے میں کامیاب ہو گئے ہو اور یہی شاندار کامیابی دوبارہ حاصل ہونے سے رہی! مرد ہو تو اسے محفوظ رکھو!''

فضل الدین نے تصویر کو دوبارہ صندوق کے خفیہ خانے میں چھپا دیا۔ پھر اس نے نوکر کو آواز دی۔

''فوراً سامان باندھو اور اصطبل میں گھوڑا جوتو! ہم یہاں سے چلے جائیں گے! آج ہی، اسی وقت!''

فضل الدین نے بہنوئی کے گھر پر آپ بیتی سناتے وقت قریبی عزیزوں کو بھی نہ بتایا کہ اس نے آہنی صندوق کے اندر خانزادہ بیگم کی تصویر کو چھپا رکھا ہے۔ اس راز کو وہ اپنے سینے کے اندر ہی دفن رکھنا چاہتا تھا۔

''ہائے مقدر، ہمارا مقدر!'' طاہر کے والد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''آپ ہمارا سہارا تھے، ساری امیدیں آپ ہی سے وابستہ تھیں، فضل الدین۔ اور اب آپ خود ہی قسمت کی بے رحمی کا شکار ہو گئے ہمارے حکمراں آپ کے آڑے نہ آئیں گے کیا؟''

''جنگ ختم ہو گئی اور اللہ ہمیں فتح سے ہمکنار کرے گا تو میں حکمران کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ وہ میری داستان غم سن کے کرم فرمائیں گے تب تو کہنا ہی کیا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا تو ہرات چلا جاؤں گا۔ سنا ہے کہ علی شیر نوائی کوئی شفاخانہ تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ ہم عمارت سازوں کے لیے چراغِ امید اگر کہیں روشن ہے تو صرف نوائی کے مسکن ہی میں ہے۔''

''آخر ہرات ہی کیوں؟ ارے فضل الدین، دنیا میں اکیلا ہرات ہی تو نہیں ہے جو آپ کے فن کی قدر و قیمت جانتا ہو۔ فرغانہ میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں ورنہ الغ قوانو آپ سے اس ایل کی بنا پر آج تک آپ کا نام احترام کے ساتھ لیتے ہیں۔''

''اسی پل کے ذریعے گزر کر کل یا پرسوں دشمن کا لشکر آنے لگا! ہمارے سروں پر جو قیامت منڈلا رہی ہے اس کا تصور کر کے افسوس ہونے لگتا ہے کہ پہاڑوں سے بہتی ہوئی سیل بھی نہیں آ رہی ہے جو اس پل کو بہا لے جائے۔ مجھے بہت

خوشی ہوگی اگر یہ پل جل ہی جائے تاکہ اس پر سے گزر کے دشمن یہاں نہ آ سکے۔"

"واقعی پل تو لکڑی کا ہے اور اس پر تیل چھڑک کر آگ لگائی جا سکتی ہے۔" طاہر نے جو خاموش بیٹھا ہوا تھا، سوچا۔ "دشمن کی فوج صرف اس پل کے ذریعے دریا کو پار کر سکتی ہے۔ دریا تیرنے کے قابل ہی نہیں، دور تک سرکنڈے اور جھاڑیوں والا دلدلی علاقہ ہی پھیلا ہوا ہے۔ اگر یہ پل جل جائے" طاہر کو گرمی لگنے لگی گویا شعلوں میں لپٹا ہوا پل چناخ چناخ کی آوازوں کے ساتھ جل رہا ہو۔ "یہی وہ تدبیر ہے جو علاقے کو بچا سکتی ہے۔" اس نے اپنے والدین کی طرف دیکھا۔ "ان لوگوں سے ذکر کروں؟ نہیں! ابا جان ایسے پر خطر کام میں پڑنے نہ دیں گے کیونکہ اکلوتا بیٹا ہوں۔ ماموں جان تعلیم یافتہ آدمی ٹھہرے، انہیں ایسے چکر میں نہ الجھانا ہی بہتر۔ مجھے جوان لڑکوں کو تلاش کرنا چاہیے جو دلاور اور دلیر ہوں۔"

گھنے سیاہ ابر پاروں کے بیچ بیچ اب بھی کہیں کہیں تارے نظر آ رہے تھے۔ گھروں میں بتیاں گل ہو چکی تھیں۔ چاروں طرف سناٹے کا دور دورہ تھا۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں تک نہیں سنائی دے رہی تھیں۔

محمود بھی باہر آ گیا گویا ان دونوں نے پہلے ہی سے ملاقات کا وقت طے کر رکھا ہو۔ اس نے فوراً ہی اپنی بہن کے جانے کی بات چھیڑ دی۔

"وہاں وہ قلعے میں رہے گی۔ اندجان کا قلعہ بہت مضبوط ہے۔"

"کچھ ایسا مضبوط بھی نہیں" طاہر نے اسے ٹوکا اور اپنے ماموں سے سنا ہوا قصہ فوراً بیان کر دیا۔

"اب جہاں پہ نصیب ہوگی، خدایا!"

"ہمت مرداں، مدد خدا" محمود تمہیں یہ کہاوت یاد ہے نا؟ آؤ، میرے احاطے میں چلو۔ تمہیں راز کو راز رکھنا آتا ہے؟" اور دوسرے ہی لمحے اضافہ کیا "ہم پل کو نذر آتش کر کے دشمن کو آگے بڑھنے سے روک دیں گے، سمجھے؟"

محمود نے طاہر کی اس تجویز کے قابل عمل ہونے پر شروع میں شک ظاہر کیا "ٹھیک تو ہے، بارش میں لکڑی کے آگ پکڑنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا اور پھر پہرہ بھی رہتا ہے۔"

"ابھی جلد بازی بھی کیا؟ سنا ہے کہ آج کسی سے ہمارے حکمران لشکر کے ساتھ آ رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے فوجیوں کو پل کی ضرورت ہوگی!"

"حکمران نے اگر سمرقند سے کمک بھیجنے کے لیے کوچ کیا ہوتا تو وہ کبھی کے یہاں پہنچ گئے ہوتے۔ دراصل وہ قلعے سے باہر آنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ اور پھر قلعے بھی تو شکست تسلیم کر لیتے ہیں۔ مرغیلان ہی کو دیکھو ہتھیار ڈال دیے نا۔ میں تو کہتا ہوں "ہمت مرداں، مدد خدا""

"مجھے نہیں معلوم۔ گاؤں کے مقدم نے تو کہا تھا کہ حکمران آ رہے ہیں، ہماری مدد کرنے آ رہے ہیں" اس نے یہی کہا تھا۔"

"مجھے یقین نہیں ہے!"

"مجھے تو یقین ہے!"

"مجھے نہیں!"

آخسی

۱

بلند پہاڑی پر واقع آخسی کا قلعہ رات میں کسی چٹان جیسا لگ رہا تھا۔ پہاڑی کے دامن کے قریب ہی کاسان سائے دریا سیر دریا پر ٹوٹ پڑتا تھا۔ دونوں طوفانی دریاؤں کی لہروں کے ایک دوسرے سے ٹکرانے اور کناروں پر تھپیڑے مارنے کی آوازیں دور سے ہی سنائی دے رہی تھیں۔

فرغانہ اور آخسی کے حکمران مرزا عمر شیخ نے یہ رات حرم کی خواب گاہ میں اپنی اٹھارہ سالہ بیگم قارا کوز کے ہاں گزاری تھی۔

پلنگ ریشمی پردے کی آڑ میں تھا اور پردے کے سامنے رکھی ہوئی واحد شمع کی ہلکی سی لو یوں ٹمٹما رہی تھی جیسے اردگرد کی تاریکی سے خوف زدہ ہو کے کانپ رہی ہو۔

پچھلے پہر سرنا کی دھیمی اور اداس صدا نے قلعے کے سناٹے کو جھنجھوڑ دیا۔ پھر تو تاشوں کی تڑتڑ بھی اس صدا میں شامل ہو گئی۔ روزے رکھنا ہر مسلمان کا فرض ہونے کی بنا پر سحری کے وقت کا اعلان کرنے والے تاشوں اور سرنا کی آواز سے شاہ و غلام یکساں طور پر متوجہ ہو جاتے تھے۔

گرمیوں کی راتیں چھوٹی ہوتی تھیں۔ صبح سے قبل بیدار ہونا اچھا نہیں لگتا تھا لیکن مجبوری تھی۔ سحری کی پابندی ہی ایسی تھی۔

قارا کوز بیگم چپکے سے پلنگ پر سے اتر گئی۔ لیکن عمر شیخ نے جو بغلوں میں دو تکیوں کو دبائے، طاقتور ہاتھوں کو ریشمی چادر سے باہر نکالے لیٹا ہوا تھا، جنبش تک نہ کی۔

خواب گاہ سے دو کمروں کے بعد ایک آراستہ و کشادہ طعام گاہ میں لگا ہوا شاندار دسترخوان عمر شیخ کا منتظر تھا۔ شاہ نے گزشتہ شام کو افطار کے بعد ہی کہہ دیا تھا کہ سحری کے وقت اس کی تینوں بیگمات اور بچے موجود رہیں۔ بڑی بیگم فاطمہ سلطان، منجھلی بیگم قتلوغ نگار خانم، سترہ سالہ شہزادی خان زادہ بیگم اور دس سالہ شہزادہ جہانگیر دسترخوان کے پاس پہنچ چکے تھے لیکن جب تک خود شاہ وہاں پہنچ کر کھانا نہ شروع کرتا تب تک ان لوگوں کے کھانے کو ہاتھ لگانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔

اتنے میں خواب گاہ کی طرف کھلتے ہوئے نقشی دروازے سے پستہ قد، خوش سلیقہ اور خوش رو قارا کوز طعام گاہ میں داخل ہوئی۔ اس نے شرماتے لجاتے ہوئے بڑی بیگمات کو سلام کیا اور بتایا کہ وہ حکمراں کو بیدار کرنے کی جرأت نہیں کر سکی۔

قارا کوز کے شباب، حسن اور ہچکچاہٹ ”ہچکچاہٹ؟ لیکن کون نہیں جانتا کہ یہ لڑکی ہی ان دنوں مرزا کی سب سے زیادہ منظور نظر بیگم ہے؟“ نے فاطمہ سلطان کی پوشیدہ جلن کو فوراً ہی ابھار دیا

”آپ نے ہمارے سرتاج کو ایسی گہری نیند سلا دیا ہے تو انھیں بیدار کرنے کی جرأت کیوں نہیں کر پاتیں؟“

شکیل، طاقتور مرد۔ ابھی چالیس کے بھی تو نہیں ہوئے تھے۔ اس کے شوہر اس کے آقا، پہلوان . . . اور غنیمت بھی پہلوانو ں ہی کی مانند کتنے عزیز و قریب تھے وہ! قاراکوز بیگم کو بیتی ہوئی رات کا سکون یاد آیا اور دوسرے ہی لمحے اس کے رخساروں پر حیا کی سرخیاں پھیل گئیں۔ اچانک اسے خیال آیا کہ محبت کتنی نازک اور ناپائیدار چیز ہوتی ہے۔ آج آخسی پر دشمن ٹوٹ پڑنے کو ہیں، کل جانے کیا ہو۔ قاراکوز بیگم کا دل ڈوبنے سا لگا گویا کہ اس پر عمر شیخ کی موت کے لمحے کی جو بہت ہی قریب تھا، پیش خبری کا منحوس سایہ پڑ گیا ہو۔ وہ تیزی سے جھکی اور مرزا کی آنکھوں، ہونٹوں اور ہاتھوں کے بوسے لینے لگی۔

عمر شیخ چونک کے جاگا اور اٹھ کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ وہ خواب آلودہ نگاہوں سے چند لمحات تک قاراکوز بیگم کو یوں تکتا رہا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

قاراکوز بیگم کی بڑی بڑی آنکھیں خوف کے مارے کچھ اور زیادہ پھیل گئیں۔ خاوند کو بیدار کرنے کے لیے بوسے دے لیے تھے، کہیں وہ اسے بدتمیزی تو نہ تصور کریں گے؟

”آپ؟“ مرزا نے انگڑائی لی اور اپنی بیگم کے خوف کا سبب تاڑ کر ہنس پڑے۔

قاراکوز بیگم نے اطمینان کی سانس لی۔

”میرے فرمانروا، سحری کا وقت گزر رہا ہے۔“

”آپ کے بوسے ہر طرح کے کھانے سے زیادہ شیریں ہیں۔ ذرا قریب آئیے! . . .“

”لیکن وہاں ...“ قاراکوز بیگم نے ہاتھ اٹھا کے دروازے کی طرف اشارہ کیا، ”وہاں بڑی بے چینی سے آپ کا انتظار کیا جا رہا ہے . . .“

مرزا عمر شیخ کی نیند پوری طرح غائب ہو گئی اور وہ کام یاد آ گئے جن سے دن میں نپٹنا تھا۔ اس نے اپنی بیگم کو ایک طرف ہٹا دیا اور بھویں سکوڑے، منہ سے ایک لفظ بھی نکالے بغیر پلنگ سے نیچے اتر آیا۔

طعام گاہ میں جہاں فرش پر زردوزی کے کام کے گدے بچھے ہوئے تھے، وہ خاص دروازے سے اندر داخل ہوا۔ جسم پر شاندار ریشمی لبادہ، رعب دار چہرے پر کچھ کر گزرنے کا عزم۔ دستار میں ٹنکے ہوئے قیمتی موتی اور پٹکے پر زردوزی کا کام بڑی شان سے چمک رہے تھے۔ ضیافت کی منتظر بیگمات معمول کے مطابق کورنش بجا لائیں اور معمول کے مطابق ہی خاموش رہیں۔ اس کے سامنے بہت ہی اہم اور سنجیدہ مسئلہ یہ تھا کہ بیگمات میں سے کس کو کس جگہ پر بٹھائے۔

وادی فرغانہ میں دشمن تین اطراف سے دھاوا بولتے چلے آ رہے تھے اور خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ آخسی کے قلعے کا محاصرہ کر لیا جائے گا۔ مرزا عمر شیخ اپنی بیگمات میں صلح صفائی کے مسئلے پر غور کر رہا تھا، مناسب اشاروں سے واضح کرنا چاہتا تھا کہ وہ ان میں سے ہر ایک کا خیال رکھتا ہے۔ بڑی بیگم فاطمہ سلطان کو اپنی اہمیت جتانے کی دوروں سے زیادہ ہی فکر رہا کرتی تھی۔ اس سے مرزا نے سب سے پہلے اپنے پہلو میں بیٹھنے کو کہا۔ فاطمہ کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں، وہ حکمران کے دائیں طرف بیٹھنا چاہتی تھی لیکن عمر شیخ نے بائیں جانب بیٹھنے کا اشارہ کر دیا۔ دائیں جانب سب سے اہم جگہ پر بیٹھنے کا اشارہ اس نے قتلوغ نگار خانم کو کیا۔ عمر شیخ نے جان بوجھ کر یہ کیا، خانم ولی عہد ظہیر الدین بابر کی ماں تھی۔ فاطمہ سلطان نے جلن کے مارے آنکھیں بھینچ لیں۔

ہرن کے گوشت کے سیخ کباب، بھنے ہوئے تیتر اور دوسرے کھانے عمر شیخ کے بعد قتلوغ نگار خانم کو اور بعد میں کہیں

جا کر فاطمہ سلطان کو پیش کیے جا رہے تھے۔ بالکل تازہ و نرم۔ منہ میں رکھتے ہی گھل جانے والا گوشت بھی فاطمہ سلطان کو گرم کیے ہوئے باسی کھانے کی طرح بے ذائقہ معلوم ہو رہا تھا۔

کسی کو بھوک نہیں لگی تھی لیکن طویل دن کا تصور کر کے ہر ایک زبردستی زیادہ سے زیادہ کھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ صرف قارا کوز بیگم ہی جو قتلغ نگار خانم کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی، گوشت کے بجائے کھیرے اور تربوز سے شغل کر رہی تھی، شربت پیتی جاتی تھی۔ گزشتہ روز وہ پیاس کی شدت سے تڑپتی رہی تھی اس لیے آج زیادہ سے زیادہ پانی پینا چاہتی تھی۔

کھانے کے بعد چائے کا دور چلا جس کے دوران مرزا نے اپنی جماعت کو بتایا کہ ریاست کے معاملات کتنے زیادہ الجھ گئے ہیں۔ پھر اس نے کہا:

'جسم کے تمام حصوں کو ساتھ رہنا چاہیے' دانشمند ہمیں یہی سکھاتے ہیں۔ فاطمہ سلطان، قتلغ نگار خانم، قارا کوز بیگم اور میرے جگر کے ٹکڑو، خان زادہ اور جہانگیر" مرزا نے ہر ایک کا نام لیتے وقت اس کی طرف دیکھا، "آپ میں سے ہر ایک اس خاندان کا حصہ ہے۔ میری خواہش ہے کہ مصیبت کے ان ایام میں آپ ایک دوسرے کی عزت اور مدد کریں۔ ہاتھ اپنی جگہ پر اہمیت رکھتے ہیں اور آنکھیں اپنی جگہ پر۔ ہاتھ اور آنکھیں ایک دوسرے کو نقصان پہنچاتے ہیں تو دراصل تمام جسم کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اور انھیں اس کی سزا دی جائے گی'

سب پر واضح ہو گیا کہ طنز کے یہ تیر کس پر چلائے گئے ہیں۔ فاطمہ سلطان کی آنکھیں کچھ اور زیادہ سکڑ گئیں۔ قتلغ نگار کو فوراً ہی اپنے واحد فرزند بابر کا خیال آیا جو مدائن سے دور اندجان میں مقیم تھا۔ حکمران نے اس کا نام نہیں لیا تھا۔ کیوں؟

"حکمران کے یہ الفاظ در بے بہا ہیں" قتلغ نگار خانم نے کہا اور پھر اضافہ کیا "اجازت ہو تو میں کچھ عرض کروں'

عمر شیخ نے اجازت میں سر ہلا دیا۔

'جنگ کا خطرہ بہت سنگین معلوم ہوتا ہے۔ میں ولی عہد مرزا بابر کی طرف سے فکرمند ہوں۔ وہ ہم لوگوں کے پاس موجود ہوتے تو شاید اتنی فکر نہ ہوتی"

"اندجان کا قلعہ مضبوط ہے اور مرزا بابر کی موجودگی میں تو یہ ناقابل تسخیر ہے۔ میں نے ان سے بہت امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔"

خانم سے انکار کر دیا گیا تھا۔ فاطمہ سلطان نے اپنے بیٹے جہانگیر کو جو نیند سے مغلوب ہوا جا رہا تھا قریب کھینچ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا گویا کہہ رہی ہو ذرا یہ لومڑی دیکھ لے کہ ان دونوں میں زیادہ خوش قسمت کون ہے۔ امیر اپنا میرے پاس ہے، اپنی ماں کے پاس ہے۔ اور وہ "ولی عہد"

'مرزا بابر کی ماں ولی عہد کی تعریف کے لیے حکمران کا شکریہ ادا کرتی ہے" قتلغ نگار خانم پل بھر کے لیے خاموش ہو گئی، "لیکن .... آخر ایسا کیوں؟ تاج جو ابھی بارہ برس کا بھی نہیں ہوا ... اسے میدان جنگ میں۔"

"ارے بیگم، کوئی خطرے کی بات نہیں۔ مرزا بابر کے ساتھ ہمارے بہترین بیگ وہاں مامور ہیں۔ وہ کم سن ضرور ہیں لیکن ابھی سے فن حرب میں مہارت حاصل کر لی ہی ہوگی۔ میری قسمت میں مرنا ہی لکھا ہو تو میری جگہ یہ سالار بابر ہی ہیں"

شاہ کی زندگی کا یہ ستائیسواں ہی سال ہے، اور وہ ابھی تک اپنی موت کی باتیں کرنے لگے۔ حتیٰ کہ جنگ پر آئی بیگمات اس خیال سے مغموم ہو گئیں۔ خان زادہ بیگم کے دل میں باپ کے متعلق بھی دردمندی کی جو کیفیات آئی تھیں انھیں بھول کر وہ مرزا کے چہرے کو محبت بھری ہمدردی سے تکنے لگی۔ عمر شیخ نے اس خیال سے کہ سب صاف صاف سن اور سمجھ لیں، اپنی بات واضح اور بلند آواز سے جاری رکھی

''اگر میں میدان جنگ میں کام آ جاؤں یا اتفاقاً کسی اور وجہ سے چل بسوں تو آپ سب مرزا بابر کے احکام کی تعمیل اسی طرح کرنی چاہیے جیسے اس وقت میرے احکام کی کرتے ہیں۔ مرزا جہانگیر! آپ سن رہے ہیں نا؟''

شہزادہ جہانگیر چوکنا ہو گیا اور اس نے فوراً تعظیماً سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا

''فرمائیے، حکمران!''

''میرے ان الفاظ کو آپ بھی یاد رکھیے گا مرزا بابر آپ سے صرف دو سال بڑے ہیں لیکن اگر وہ میرے جانشین بنیں تو آپ ان کے وفادار فرزند بن کر رہیے گا۔''

''بے شک، حکمران!''

لڑکا باپ کے ان لفظوں میں مضمر گہری معنویت کو نہ سمجھ سکا لیکن فرماں برداری کا وہ بہر حال عادی ہو چکا تھا۔ دونوں بڑی بیگمات پر بے چینی سی ہو گئیں لیکن خود اپنی فکر کرنے کی بجائے۔ قارا گوز کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں (وہ خاوند کے چہرے پر تھکن کی علامت دیکھ رہی تھی)۔ عمر شیخ نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے اور اسے بیگم کے پچھلے پہر کے بوسے یاد آ گئے لیکن ان یادوں سے جانے کیوں مسرت کا احساس نہ ہوا۔ 'شاید تمامیت کے الوداعی بوسے لے رہی ہوں' اس نے سوچا۔ ''درحقیقت میں نے جو کچھ کہا وہ بھی وصیت جیسا لگتا ہے۔' عمر شیخ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا گویا اشارہ دے رہا ہو۔ 'یہ مجھے ہو کیا رہا ہے؟ کیا واقعی مجھے عزرائیل کی آمد کا احساس ہو رہا ہے؟ نہیں نہیں!''

خان زادہ بیگم نے اپنے والد کے دل کی پریشانیوں کو بھانپ لیا۔ انھیں مدد کی ضرورت تھی، بیٹی نے مدد کی!

''میرے حکمران، آپ کی دختر دعا کرتی ہے کہ پروردگار آپ کو شیخ سعدی جیسی طویل عمر عطا کرے۔ آپ سو برس تک زندہ و سلامت رہیں!''

''خدا آپ کی دعا قبول فرمائے، عزیز دختر!'' مرزا عمر شیخ جیسے سوتے سے جاگ پڑا، جیسے اسے پہلی بار احساس ہوا کہ بیٹی کتنی عقل مند ہے، اس کی خوبصورتی میں کیسی پختگی آ چکی ہے۔ ''پہلا کام میں اب جو کروں گا وہ ہے آپ کی شادی!''

خان زادہ بیگم کی شادی سمرقند کے حکمران کے بیٹے بائی سنقر سے کرنے کی بات پکی ہو چکی تھی لیکن عمر شیخ نے اس رشتے کی منظوری قطعی طور پر ابھی نہیں دی تھی اور اب سمرقند کے حکمران سے جنگ چھڑنے والی تھی۔ یہ سچ تھا کہ عمر شیخ سنگین صورت حال پیدا ہو جانے پر بیٹی کی شادی اپنے بڑے بھائی کے بیٹے سے کر کے اس قدیم روایت کا سہارا لیتے ہوئے جنگ کو امن کی شکل دے سکتا تھا۔ لیکن خود خان زادہ بیگم بھی اس بات کو سمجھتی اور اس کے امکان سے اتنی ہی خائف تھی جتنی کہ شب کی تاریکی سے۔ اس کے خواب تو کچھ اور ہی تھے۔ یہی سبب تھا کہ اس نے گفتگو کا رخ شادی سے ہٹا کر اسی مسئلے کی طرف موڑنے کی کوشش کی جو پہلے چھڑا ہوا تھا۔

''اگر برادر عزیز مرزا بابر کو آخسی بلانا ممکن نہ ہو تو آپ مجھے اور میری والدہ محترمہ کو اندجان جانے کی اجازت دے دیجیے'' اس نے ہمت کر کے تجویز پیش کی۔

''وحرمِ من، آپ تو میرے غرور کا درس بہا ہیں۔ میں پیچھے پرخطر یام میں آپ کو اپنے سایۂ عاطفت سے جدا نہیں کر سکتا!''

''اس صورت میں، حکمران، مجھے اکیلے ہی جانے کی اجازت دے دیجیے'' تلوغ نگار خانم میں دوبارہ جان پڑ گئی۔

''آخر اتنی عجلت کیوں، خانم؟ ہمیں مرغیلاں سے قاصدوں آمد کا انتظار ہے۔ ممکن ہو تو اجازت مل جائے گی۔''

عمر شیخ نے جلدی جلدی نماز فجر ادا کی، کھڑا ہوا اور حرم سے باہر نکل آیا۔ اب اس کا ذہن جنگ کے مسائل سے معمور تھا۔

مرزا کے محافظین حرم میں داخلے کی ممانعت کی بنا پر تمام رات باہر کھڑے حکمران کا انتظار کرتے رہے تھے۔ اب وہ چند قدم الگ ہٹ گئے تاکہ حکمراں کے غور و خوض میں خلل نہ ڈالیں، اپنی طرف اس کی توجہ نہ مبذول کرائیں۔ پھر وہ دھیرے دھیرے، دبے پاؤں اس کے پیچھے پیچھے چل دیے۔

۴

سحر نمودار ہوئی۔ سپہ سالار بیگ اور درباری طلوع آفتاب سے قبل ہی جمع ہو چکے تھے۔ ان لوگوں نے دیوان خانے میں کورنشات کے ذریعے مرزا عمر شیخ کا خیر مقدم کیا۔ سب سے پہلے وزیر اعظم۔ جسم پر زری کا شاندار چوغہ، کمر پر عمر اور عہدے کے بموجب پٹکا اور چہرے پر گھنی گھنی سی داڑھی۔ اپنی جگہ پر سیدھا کھڑا ہوا۔ مرزا نے اس سے دریافت کیا کہ قاصد کہاں سے آیا ہے۔

''اسفرا سے، عالی جاہ''

اور وہ دوبارہ اس طرح کورنش بجا لایا کہ اس کا چہرہ چھپ گیا۔

''خبریں کیا ہیں؟''

''عالی جاہ اپنے غلام پر رحم فرمائیں''

''اچھا، مطلب یہ کہ اسفرہ پر بھی دشمن قابض ہو گیا۔''

پھر عمر شیخ نے اپنے جسم میں مسلسل کپکپی محسوس کرتے ہوئے مرغیلان کے قاصد کے متعلق دریافت کیا۔

''عالی جاہ، مرغیلان کے قاصد کا بڑی بے تابی کے ساتھ انتظار کیا جا رہا ہے۔''

کیا مرغیلان کو بھی شکست کا منہ دیکھنا پڑے گا؟ لیکن تب تو اندجان کے لیے بھی خطرہ پیدا ہو جائے گا! آخر قاصد آئے کیوں نہیں؟ کہیں پھندے میں پھنس گئے، گرفتار کر لیے گئے کیا؟ کہیں خود اہل مرغیلان ہی نے تو غداری نہیں کر دی؟

''کیا عالی جاہ دوسرے قاصدوں کی روانگی کا حکم صادر فرمائیں گے؟''

''جواب لانے والے قاصدوں کا ایک بار پھر راستہ دیکھ جائے؟ آخر کتنے دنوں تک انتظار کرتے رہیں گے؟''

وزیرِ اعظم دوبارہ کورنش بجا لایا اور معذرت چاہنے کے انداز میں الٹے قدموں پیچھے ہٹ گیا۔

مرزا پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گیا کہ آخسی یقیناً محاصرے میں آ جائے گا۔ اس نے چھ مہینوں کے لیے کافی رسد جمع کر لیے جانے کا حکم دیا۔ قلعے کے بلند پہاڑی پر واقع ہونے کی بنا پر وہاں آبِ رواں میسر نہ تھا۔ مرزا نے عقل مند اور انتظامی صلاحیتوں کے مالک تیس سالہ قاسم بیگ کو قلعے میں پتھروں کا ایک بہت بڑا حوض تعمیر کر کے اسے مشکوں کے ذریعے لبالب بھروانے کی ذمے داری سپرد کر دی۔

بیگوں نے یہ دیکھ کر کہ شاہ بہت بضد ہوا ہے، اس کے احکام کی تعمیل جلدی جلدی شروع کر دی۔ خود عمر شیخ گھوڑے پر سوار ہو کر گھڑ سوار محافظ دستے کی معیت میں قلعے سے روانہ ہو گیا۔

یہ گھڑ سوار دریا کے بلند کنارے پر واقع کبوتر خانے کی طرف گئے جس کا اوپری برآمدہ کراڑے پر آگے کی طرف نکلا ہوا تھا۔ آخسی سے روانہ کیے جانے والے قاصدوں کے دھر لیے جانے کی بنا پر مرزا نے نامہ بر کبوتروں سے کام لینے کا فیصلہ کیا تھا۔

دراصل اب ساری امیدیں اڑ کر مرغینان اور قند جانے کے لیے سدھائے گئے انھی کبوتروں ہی سے وابستہ تھیں۔ کبوتروں کو باہر نکال کر انھیں ذرا پرسکون ہو جانے کا موقع دیا گیا اور پھر گول گول لپٹے ہوئے خط ان کے بازوؤں کے نیچے باندھ دیے گئے۔ مرزا عمر شیخ کو خود بھی کبوتر اڑانے کا بہت شوق تھا۔ وہ ایک نیلگوں کبوتر کو ہاتھوں میں احتیاط سے پکڑ کے چوبی زینے سے کبوتر خانے کی چھت پر چڑھ گیا۔

وہاں سے قرب و جوار کا سارا علاقہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ دور پہاڑیوں کے عقب سے آفتاب دھیرے دھیرے ابھر رہا تھا اور نیچے اس کی شعاعوں میں دریا کی سطح جھلملا رہی تھی۔ نسیمِ سحر رخساروں کو چھوتے ہوئے سہلاتی ہوئی سی معلوم ہو رہی تھی۔ مرزا آخسی کے قلعے کی مورچہ بندی اور پہاڑی کے نیچے بچھے ہوئے خندقوں کے ٹیڑھے میڑھے جال کو کافی دیر تک دیکھتا رہا۔ "یہ خندقیں میرے دشمنوں کی لاشوں سے پٹ جائیں گی" اس نے سوچا۔

اسے یا اس کے آدمیوں کو کبھی شک بھی نہیں ہوا تھا کہ دریا کا تیز دھارا جانے کب سے کناروں کو کاٹتا جا رہا ہے، ٹیلے کے نیچے کی چٹانوں کو برہنہ کر کے کبوتر خانے کی بنیادوں کو کھوکھلا کرتا جا رہا ہے۔ کبوتروں کو البتہ جیسے خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ اپنے صاف ستھرے خوبصورت ڈربوں میں بے چینی سے پر پھڑپھڑاتے رہتے تھے۔ اس وقت بھی وہ چگنے کے دانے اور صاف پانی کی طرف ذرا بھی نہیں متوجہ ہو رہے تھے اور گھبراہٹ کے ساتھ ڈربوں کی تیلیوں میں چونچیں مار مار کر باہر نکلنے کے کوشاں تھے۔ کبوتر باز سمجھ نہیں پاتے تھے کہ آخر کبوتروں کی ان حرکات کا مطلب کیا ہے اور ان سے درباری کبھی اس بارے میں پوچھتے تو وہ جواب نہیں دے پاتے تھے، بس شانے اچکا کے رہ جاتے تھے۔ اس وقت فقط وہی ایک نیلا کبوتر پرسکون تھا جو مرزا کے ہاتھوں میں تھا۔

عمر شیخ نے چھت کے بالکل کنارے پر جا کر کبوتر کے نرم پروں کو پل بھر کے لیے ہونٹوں سے لگایا اور یوں سرگوشی کی گویا کبوتر اس کی بات کو سمجھ سکتا ہو "عزیز کبوتر، اڑ کے مرغینان جا، جلدی سے خوشخبری لا، جا" اس نے پیچھے ہٹ کر اپنے طائرِ امید کو نیلگوں فضاؤں میں اچھال دیا۔ عین اسی لمحے، اسی معمولی سے جھٹکے سے بنیاد کا جو کٹ کر بہہ چکی تھی، سہارا نہ رہ جانے کے باعث کبوتر خانے کا چوبی ڈھانچہ خم ہو کے چرچراتا ہوا نیچے گرنے لگا۔ پہلے اگلا حصہ پانی میں گر کے کھسکنے لگا اس کے بعد کبوتر خانے کی پچھلی دیوار اور دھیرے دھیرے پھر تیزی سے لڑھکتے، غبار کے بادل اڑاتے، عمر شیخ

"اچھا اب میں جا رہی ہوں بیگم۔" اس نے قتلق نگار بیگم سے معذرت کی۔ "جا کے اندجان کو قاصد روانہ کروں گی۔ بیٹے کو والد کے انتقال کی اطلاع مجھے خود ہی بھجوانی چاہیے۔"

قاسم بیگ شاہ مرحوم کی اس جنسی بیگم کا بڑا وفادار رہا تھا اور اب وہی غم زدہ اور شکوک اور اندیشوں کی ماری ہوئی قتلق نگار خانم کے خط کو اس کی والدہ ایسان دولت بیگم کے پاس پہنچا سکتا تھا جو اندجان سے باہر واقع شاہی حویلی میں بابر کے ساتھ رہتی تھی۔

لیکن خانم کا یہ خط جس وقت قاسم بیگ کے ہاتھوں تک پہنچا اس وقت سلطان احمد تنبل جسے فاطمہ سلطان نے خفیہ طور پر اندجان روانہ کیا تھا وہ دریائے سیر کا پل پار کر چکا تھا اور اس طرح قاسم بیگ سے کافی آگے نکل گیا تھا۔ اس نے لوگوں کی توجہ اپنی طرف نہ مبذول کرانے کے لیے صرف ایک سپاہی اپنے ساتھ لیا تھا حالانکہ گزشتہ روز جب وہ اندجان سے آخسی آیا تھا تو ساتھ کئی سوار سپاہی اس کے ہمرکاب تھے۔ آج فاطمہ سلطان نے اس سے بہت بہت انعام کا وعدہ کیا تھا اگر وہ فاطمہ سلطان کے دونوں بیٹوں کو متحد کر کے مرزا بابر کے بجائے مرزا جہانگیر کو تخت پر بٹھانے میں کامیاب ہو جائے گا تو... احمد تنبل کو عمر شیخ کے دربار میں کئی برسوں سے دوسرے درجے کے بیگوں کے ساتھ بیٹھنا پڑ رہا تھا جو اس کے لیے توہین آمیز بات تھی۔ اس صورت حال کو وہ بہت جھیل چکا تھا۔ جہانگیر کے تخت نشین ہونے کی صورت میں اس کا وزیر اعظم کے عہدے پر مامور ہونا یقینی تھا۔ اور اتنے کم سن لڑکے کی بادشاہی میں وزیر اعظم بننا۔ کیا خود ہی تخت شاہی پر جلوہ افروز ہونے کے مترادف نہ تھا؟ تب تو اسے خان زادہ بیگم کی تصویر کے پیچھے بھاگنے کی ضرورت ہی نہ پڑے گی۔ وہ تو خود خان زادہ بیگم ہی کو حاصل کر لے گا اور یہ ایک حقیقت تھی کہ اس حکومت کے آقا بن جانے کے خواب سے زیادہ شیریں خواب احمد تنبل نے اپنی زندگی میں کبھی بھی نہیں دیکھا تھا۔

اس نے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ رہگزر سنسان پڑی تھی۔

چند گھنٹوں کے بعد قاسم بیگ آخسی کے قلعے سے روانہ ہو گیا۔ مرزا بابر کے بھی حمایتی اور طرفدار موجود تھے۔ انہیں بھی جمع کر کے جانشینی کے حق سے متعلق جدوجہد کے لیے تیار کیا جانا تھا۔

اندجان

1

اندجان میں ابھی امن کا دور دورہ تھا۔

شہر سے باہر واقع بلند چہار دیواری والی خوبصورت حویلی کے پھاٹک پر معمول کے مطابق پہرے دار موجود تھے۔

"جنگ" تو چہار دیواری کے اندر ہو رہی تھی۔ مرزا بابر بڑے جوش کے ساتھ فن حرب سیکھ رہا تھا۔ اس نے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے لگام چھوڑ دی اور مستعدی اور پوری طاقت سے تانت کو کھینچ کر تیر چلا دیا۔ سنسناتا ہوا یہ تیر تیزی سے جا کے اس تختے میں پیوست ہو گیا جو نشانے کا کام دے رہا تھا۔

چنار کے سائے میں کھڑے ہوئے گھڑسوار ولی عہد کو نشانے بازی کی مشق کرتے دیکھ رہے تھے۔ وہاں سے مزید

پڑا اور اپنے گھوڑے کو دوسری ایڑ لگائی۔

گھوڑا فوراً ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ بابر نے محافظ سے جو عام رفتار سے چلا آ رہا تھا [illegible] اپنے پاؤں [illegible] سے نکال لیے اور جیسے ہی اس کا بھورا گھوڑا کمیت کے برابر آیا ویسے ہی اس کی طرف جھک کے اس نے ہاتھوں سے اس کی کاٹھی پکڑی اور اپنے گھوڑے کے اوپر سے بڑی آسانی سے چھلانگ لگا دی۔

محافظ کا کمیت چھلانگ سے خوف زدہ ہوتے ہوئے ہڑبڑا اور ایک طرف ہٹ گیا۔ بابر ایک لمحے تک فضا میں معلق رہا، پھر اس کے پیر زور سے زمین سے ٹکرا گئے۔ لیکن کمیت کی کاٹھی پر اس کی گرفت ڈھیلی نہیں ہوئی (واقعی اس کے ہاتھ بہت طاقتور تھے) اور وہ اسے پکڑے ہوئے دوڑتا رہا۔ محافظ نے [illegible] اپنے گھوڑے [illegible] اس کے [illegible] کھینچنے سے نیم دائرہ سا بن گیا۔ اس کی ریشمی دستار سر سے پھسل کر دور جا گری تھی اور وہ اپنے قدموں پر [illegible] کھڑا ہو گیا۔ چہرے پر بہت خاصی زردی چھا گئی تھی۔ نویان نے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا [illegible] پاس پہنچا اور [illegible] دینے لگا لیکن بابر نے دستار پر اچٹتی سی نظر بھی نہ ڈالی۔ وہ چپ چاپ [illegible] ہاتھ میں پکڑ کر منہ سے ایک لفظ بھی نکالے بغیر ہی محافظ کے تانے ہوئے بھورے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

دوسرے ہی لمحے اس نے گھوڑے کو چابک رسید کیا اور سے راستے کی پرواہ کیے بغیر درختوں کے درمیان سے بے تحاشا دوڑنے لگا۔

گھڑسوار عموماً باغ کے کنارے کنارے واقع راستے کو استعمال کیا کرتے تھے لیکن بابر سیدھا باغ کے بیچ میں سے بل کھاتی ہوئی کنکریلی پگڈنڈی پر گزرنے لگا۔ گھوڑا نالیوں کو چھلانگ لگا کر پار کرتا تو بابر کا سر خوبانیوں کی مضبوط شاخوں سے ٹکرانے سے بال بال بچتا۔ اس نے جھک کے گھوڑے کی گردن مضبوطی سے تھام لی تھی اور اسے سرپٹ دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ اس کے شانوں سے ٹکرا ٹکرا کر شاخوں سے ٹوٹ جانے والی خوبانیاں پانی میں چھپ چھپ گر رہی تھیں۔

”ارے احمق تم نے گھوڑے کو مضبوطی سے کیوں نہیں پکڑ رکھا تھا؟“ نویان غصے سے بابر کے محافظ پر برس پڑا۔ ”ولی عہد ہم لوگوں سے ناراض ہو گئے ہیں۔ تمھاری وجہ سے ہم سب کو سرزنش جھیلنی پڑے گی۔“

بابر نے گھوڑے کو باغ کے وسط میں واقع شاندار طور پر آراستہ برآمدے کے سامنے روک دیا۔ خدمت گار جو لگام تھامنے کے لیے بھاگا بھاگا باہر نکلا تھا، بابر کو برہنہ سر دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ خود بابر کا چہرہ یہ جانتے ہی سرخ ہو گیا کہ نانی ایسان دولت بیگم ابھی اس کی یہ حالت دیکھ کر فوراً ہی سمجھ جائیں گی کہ قصہ کیا ہے۔ خدمت گاروں اور محافظوں کا اس سلسلے میں سزا بھگتنا یقینی تھا کیونکہ شاہ فرمانہ نے نانی سے بابر کو آنکھ کی پتلی کی طرح رکھنے کو کہا تھا اور اسی لیے خدمت گاروں اور سپاہیوں سمیت یہ جاگیر عطا کی تھی۔

اتنے میں قریبی دوست لڑکے اور محافظ دوڑتے ہوئے برآمدے کے سامنے پہنچ گئے اور بابر اندر چلا گیا تو یہ لوگ اپنے گھوڑوں سے نیچے اتر آئے۔ نویان کوکلتاش نے بابر کی دستار کا غبار جھاڑ دیا تھا اور اب اسے ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے تھا۔ بابر ٹوپی پہن کر اس اطمینان کے ساتھ باہر آیا کہ اب نانی کچھ بھی نہ پوچھیں گی۔ اس نے آتے ہوئے لوگوں پر نظریں دوڑائیں۔ وہ محافظ جو بھڑک جانے والے گھوڑے کی لگام کو تھامے نہیں رہ سکا تھا۔ معافی مانگنے کے لیے بابر کے قدموں پر سر رکھنے کو لپکا لیکن بابر نے اسے فوراً ہی گھٹنوں کے بل بٹھا دیا اور خود مڑ کے نویان کوکلتاش کی طرف رخ کر لیا۔ نویان کو دیکھ کے ہنسی آ گئی تھی، دستار کو دونوں ہاتھوں سے تھامے یوں سنبھال سنبھال کے چل رہا تھا گویا کوئی نازک اور

اور ساتھ ہی ساتھ فرہاد کے کارنامے سے متعلق اپنے شعر بھی دل ہی دل میں دہرایا کرتا ہے

دلیری گر سیکھنا چاہتے ہو

تو بانکوں سے سیکھو، یہ دوں سے لیکھو

بابر نے معلم کی نظر بچا کر تصویر دفتر کے اندر سے نکال لی۔ سیاہ چغے میں ملبوس اس کی چہرے پر شکن لگا رکھی تھی اور اس کی آنکھوں میں تیکھی چمک رہی تھی۔ بابر نے دل ہی دل میں خواب دیکھا: اے عظیم میر مجھے آپ سے شرف ملاقات حاصل ہو اور اگر میں ان سب نسخوں کو دیکھوں جو میری رہنمائی کے راستے میں حائل ہوں گے، فرہاد کی طرح فتح حاصل کروں... تو کیا آپ مجھے شاعری کے طلسمی دروازے کی کلید عنایت کریں گے؟

معلم اپنے گدے پر سے چیکے سے اٹھا اور غیر معمولی تیزی کے ساتھ بابر کے پاس پہنچ گیا۔ بابر تصویر کو چھپانہ سکا۔

"انسان کی تصویر ہے؟" معلم نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔ "سبق کے بجائے تصویر پر توجہ! یہ تو شرعاً ممنوع ہے۔"

"استاد محترم یہ تصویر..... ہرات سے لائی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو یہ ہیں عظیم میر علی شیر"

معلم نوائی کی شاعری کے تذکرے سن چکا تھا لیکن خود کبھی پڑھی نہیں تھی۔

"میرے شہزادے، انسانی تصویریں بنانا، دیکھنا اور دکھانا سب شیطان کی حرکت ہے! مجھے دیجیے یہ تصویر! دیجیے!"

معلم صاحب تنے ناراض ہیں تو کون جانے، تصویر کو لے کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے نہ کر ڈالیں۔ بابر نے سوچا اور کہا: "جی نہیں!" اس نے یہ الفاظ اتنے سخت لہجے میں کہے کہ معلم ولی عہد کے غصے سے خوف زدہ ہو گیا۔ لیکن اس نے درس روک دیا اور بابر کی نانی ایسان دولت بیگم سے اس کی شکایت کرنے چلا گیا

اور پھر کوئی پچپن سال کی ایک فربہ اندام عورت اپنے اطلسی لباس سے سرسراہٹ پیدا کرتی ہوئی مطالعے کے کمرے میں داخل ہوئی۔ بابر جلدی سے اٹھ کر نانی کو کورنش بجا لایا۔ ایسان دولت بیگم نے اس بچے کی تصویر کو لے لیا اور گہری دلچسپی سے دیکھنے لگی۔

"میر علی شیر کے چہرے میں تو لگتا ہے کہ فرشتوں کی سی کچھ صفات پائی جاتی ہیں" وہ بولی اور یہ ایسی بات تھی جس کی معلم کو قطعاً توقع نہ تھی۔ پھر اس نے اپنے ریشمی لباس کے آنچل سے چہرے کو ڈھکتے ہوئے معلم کی طرف رخ کر کے کہا "محترم معلم یہ تصویر ہرات میں علمائے دین کی اجازت سے بنائی گئی ہے۔"

پھر وہ بابر سے مخاطب ہوئی:

"معلم صاحب یقیناً درست فرما رہے ہیں۔ عزیز مرزا، فقہ کے دائرے میں تصاویر خواہ وہ کیسی بھی کیوں نہ ہوں، دیکھنا ناجائز ہے۔ وقت آنے پر انشاء اللہ تعالیٰ آپ کو ملک کی عنان حکومت سنبھالنی ہوگی۔ فقہ تو آپ کو اوس تا آخر جاننا ہی ہے۔ لہٰذا یہ تصویر تو اب میں اپنے پاس رکھوں گی۔"

بابر نے نانی سے پل بھر کے لیے تصویر مانگ کر دوبارہ کتاب کے اندر رکھ دی۔

"میں اپنا خواب آپ کے سپرد کر رہا ہوں" اس نے کتاب کو ایسان دولت بیگم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

نانی نے نواسے کی اس بات کو بہت پسند کیا۔

"تو ہمارا کدھر جانے کا قصد ہے؟"

شیرم بیگ نے بابر کے کان کے قریب منہ کر کے کہا

"الاتاؤ کی طرف چلیں گے۔ پھر اوش۔ بعد میں شاید اورگنت۔"

بابر سفر کے اس راستے کو قاسم بیگ سے چھپانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے چپکے سے اس سے کہا

"ہم لوگ اوش کے راستے میں کسی جگہ پر مل جائیں گے۔ والدہ صاحبہ کو بتا دیجئے گا"

"میرے شہزادے، پہلے تو میں قلعے میں جا کر بیگوں سے صلاح مشورہ کروں گا۔ مجھے پتا چل جائے گا کہ حرام لوگوں کے ارادے کیا ہیں۔"

"سب سے اچھا تو یہ ہوگا کہ آپ میرے محترم استاد خواجہ عبداللہ سے ملاقات کریں۔"

"جو حکم!"

اور قاسم بیگ اپنے گھوڑے کو موڑ کر قلعے کے پھاٹک کی طرف چل دیا۔

۴

ان لوگوں کی بحث پر فصیل قلعہ کے ایک کنگورے سے کوئی فربہ اندام شخص اپنی نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس نے قاسم بیگ کو تیزی سے پھاٹک کی طرف بڑھتے دیکھا تو پھاٹک کے اوپر سے دھیرے دھیرے نیچے اترا اور اپنے مالک احمد تنبل کے پاس چلا گیا۔۔۔

خوبانیوں کے ایک وسیع باغ کے وسط میں نائل در گنبد کا کشادہ حمام بنا ہوا تھا۔ باغ کا مالک یعقوب بیگ شدید گرمیوں کے ایام میں اسی حمام کے ایک کمرے میں جو اپنی اندرونی آرائش کی بنا پر کسی محل کے دیوان خانے سے مشابہ تھا، آرام کیا کرتا تھا۔ اس وقت اس کمرے میں معزز مہمان کے لیے مخصوص جگہ پر احمد تنبل بیٹھا ہوا تھا۔

اس نے تو بنی کے پیالے میں جس پر جنگلی گلاب کی پنکھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ قمیز* انڈیلا اور اسے پی کر ہتھیلی سے اپنی ٹھوڑی پونچھی۔

"پروردگار میرا گناہ معاف فرمائے، میں نے روزہ توڑ دیا" اس نے پرسکون لہجے میں کہا۔ "یہاں تک آتے آتے زبان میں کانٹے پڑ گئے۔۔۔ بے ہوش ہو کر گھوڑے سے گرتے گرتے بچا۔"

"آج آپ کو اس گناہ کی اجازت ہے" یعقوب بیگ نے کھیسیں نکال دیں۔ "اشد ضروری ہو تو سے معاف کیا جا سکتا ہے۔ آپ نے بڑے مشکل کام کا بیڑا اٹھایا ہے، محترم بیگ۔ لیکن اگر آپ کی قسمت کا ستارہ چمک اٹھا اور مرزا جہانگیر تخت نشین ہو گئے تو ان کی نگاہ میں سب سے زیادہ معتبر آپ ہی ہوں گے۔ آپ ہی تو وزیر اعظم ہوں گے، درست ہے نا؟"

احمد تنبل اپنے اس شاندار مستقبل کا تصور کر کے دل ہی دل میں خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ مثلاً یعقوب بیگ بھی مسکرانے لگا۔ اس کی یہ مسکراہٹ اگلے دو دانتوں کے غائب ہونے کی وجہ سے کچھ اور بھی مضحکہ خیز معلوم ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بہت غور سے احمد تنبل کا جائزہ لے رہی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں "تم کہیں یہ تو نہ بھول بیٹھو گے کہ راستے پر خطر

---

* قمیز گھوڑی کے دودھ سے تیار کیا جانے والا مشروب۔

رہیں گے یہاں سب کی باتیں۔

''کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟ کچھ ہوا [illegible] افواہ [illegible] معلوم ہے یا ہے''

''آپ مطمئن رہیے قاسم بیگ صاحب [illegible]''

اندجان میں ایسے بھی ایک [illegible] افواہ [illegible] پھیل چکی تھی۔ [illegible] سے [illegible] آ رہے تھے جس سے لوگوں [illegible] خوف [illegible] ہوتی جاتا ہے۔ لوگ کانا پھوسی کر رہے تھے ' بادشاہ [illegible] دشمن کا قابض ہو جانا یقینی ہے۔' پھر ایک اور افواہ [illegible] 'مرزا بابر [illegible] دشمن [illegible] حوالے کر کے بھاگ گئے۔'' دن کا وقت تھا، بازاروں میں خرید و فروخت [illegible] چہ میگوئیاں [illegible] دیگرے بند ہونے لگیں۔ ٹھیک سے کوئی بھی نہیں جانتا اور اپنی طرف سے خوب نمک مرچ لگا کر [illegible] باتیں جوڑ جوڑ کے دوسروں کو سناتے تھے۔ آخر میں نوبت اس افواہ تک پہنچ گئی کہ [illegible] دشمنوں نے قبضہ [illegible] شاہی خزانے کو کراڑ [illegible] دریا میں پھینک دیا [illegible] پھر جلدی جلدی داروغہ شہر سے [illegible] تازہ خبروں سے مطلع کرتے تھے۔

بیگوں میں بھی کھلبلی مچ گئی۔ یہ لوگ قاسم بیگ سے شاہ کے انتقال کی خبر سن کر خوف سے پوری طرح مغلوب ہو گئے اور اس فکر نے کہ اب تخت پر کون بیٹھے گا، انہیں جنگ کے بجائے دیگر باتیں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ [illegible] افواہیں تو یہ ہیں کن من کے داروغہ شہر اوزون حسن کا دماغ چکرا گیا۔ یہ افواہیں تو بے بنیاد ہیں پر جانے اصلیت کیا ہے؟

بیگ یک جگہ جمع ہوئے لیکن کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکے۔ داروغہ شہر نے جھنکنا شروع کیا۔ ''قلعے کے باہر دشمن کھڑے ہیں اور قلعے کے اندر بھگدڑ مچی ہے۔ نہ ہمیں کچھ معلوم ہے نہ ہم کسی بات کے لیے تیار ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ مرزا بابر قلعے میں داخل ہوئے بغیر ہی ہم سب کو نہیں چھوڑ گئے۔''

''تو پھر ہمیں بھی بھاگ کھڑے ہونا چاہیے؟'' مولانا عبداللہ نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

خواجہ عبداللہ کو سچے سید ہونے اور علم و فضل کی بنا پر شہرت حاصل تھی اور وہ اندجان کے بیگوں کا بہت ہی بااثر پیر تھا۔ خود مرزا بابر بھی اپنے آپ کو اس کا مرید تصور کرتا تھا اس لیے اوزون حسن سید و ریش خواجہ کو ناشائستگی سے جواب نہ دے سکا اور خاموش ہی رہا۔

''مرزا بابر کو اندجان سے زیادہ دور نکل جانے سے قبل ہی واپس بلا لیا جانا چاہیے'' قاسم بیگ نے خیال ظاہر کیا۔

''میں مرزا بابر سے بخوبی واقف ہوں'' خواجہ عبداللہ نے حاضرین پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں، وہ یہاں سے ڈر کے بھاگے نہیں ہیں۔ وہ تو صرف ہماری وفاداری کا امتحان لینے کے لیے ہمیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ دراصل فسادی اور سازشی لوگ عوام میں اشتعال پیدا کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ کے انتقال پر ملال کی خبر ہم تک پہنچنے سے قبل ہی بازاروں تک پہنچ گئی۔''

درست، ساری بات بالکل درست! اوزون حسن حیرت میں پڑ گیا کہ خواجہ عبداللہ نے وہیں، ان سب کے درمیان رہتے ہوئے بھی مرزا بابر کے خیالات کا اندازہ لگا لیا۔ اس نے سوچا کہ خواجہ تو صحیح معنوں میں ولی ہیں، ولی!

''لگتا ہے کہ ہمارے پیر صاحب کو تو سب کچھ واضح طور پر معلوم ہے!'' اوزون حسن نے مصنوعی احترام کے ساتھ

پہلے آپ نے ہم لوگوں کو یہاں کیوں جمع کیا ہے؟ فرمائیے۔"

"مجھے خفیہ طور پر پتا معلوم ہے" خواجہ عبداللہ نے ایک سے سنا ہے "کہ سب وقت ... بابر کی عادت

... ہی چاہیے اور جب تک ہم مدد نہ کر سکیں گے اور ہم میں سے کسی کا وہاں کوئی بھی ٹھکانا نہ ہوگا۔"

درست، یہ بھی بالکل درست ہے۔ ازون حسن نے سوچا اور پھر یقین کے ساتھ بولا۔ "یہ خواجہ عبداللہ کی باتیں پھر بھی خوف کو محسوس ہی ہوتا ہے۔ اگر حالات نے یہ رخ اختیار کیا کہ خواجہ عبداللہ کی بات حق ثابت ہوئی اور بادشاہ فرغانہ بن گئے تو داروغہ شہر کی آج کی اس ہچکچاہٹ کو کیا معنی پہنائے جائیں گے؟ کیا خود آپ نے یہ نہیں سوچا کہ اس ہچکچاہٹ کے متعلق مرزا بابر کے کان نہ بھریں گے؟ تب کیا داروغہ شہر کو عہدے سے ہاتھ نہ دھونے پڑیں گے؟ نہیں، ازون حسن تم نے جو راستہ منتخب کیا ہے اس سے نہ ہٹو۔

"محترم پیر آپ کا حکم ہو تو میں خود مرزا بابر کی خدمت میں حاضر ہوں" ازون حسن نے کہا۔ "میں جا کر انہیں سارے سپتوں کی طرف سے وفاداری کا یقین دلاؤں گا اور درخواست کروں گا کہ وہ قلعے میں آ جائیں۔"

"آپ کے ارادے قابل ستائش ہیں، داروغہ صاحب۔ لیکن میں کہنا چاہتا ہوں کہ جب تک آپ اس عہدے پر مامور ہیں تب تک آپ کو چاہیے کہ شہر میں فسادیوں کو کچلیں، فسادیوں کے اڈے کا پتا لگا کر انہیں شکست دیں اور جان کے دفاع کے لیے ضروری تیاریاں کریں۔ آپ اپنے ان ہی کاموں کی بنا پر مرزا بابر کی عنایات کے مستحق ہو سکتے ہیں۔"

پیر نے واقعی ازون حسن کے دل کی بات بھانپ لی تھی۔

۵

موسم گرما کے آفتاب نے زمین و آسمان میں آگ سی لگا رکھی تھی۔ گھوڑوں کے سموں سے ویرانی اڑتی ہوئی دھول پتوں کی طرح گھڑسواروں کے چہروں کو جھلس رہی تھی۔ ہوائیں یوں ساکت تھیں کہ کوئی خفیف سا جھونکا بھی نہیں چل رہا تھا۔

بابر کا تمام جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ پیاس کی شدت سے منہ بری طرح خشک ہو گیا تھا۔ ورکل میں اسی وقت وہ اندجان سے ... کے کنارے کتنے مزے سے وقت گزر رہا تھا۔ سرسبز و شاداب جاگیر کی صاف ستھری فضا، شفاف پانی، ہوادار برآمدہ شہر رنگین، سب کچھ اس ماضی کا جزو بن چکا تھا۔ جو جیسے کہ اس وقت اس تپتے اور دھول سے اٹے راستے پر محسوس ہو رہا تھا، پیچھے، بہت پیچھے چھوٹ گیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے پریوں کی کسی کہانی کا سا کوئی بگولا چک اٹھا تھا جس نے عنفوان شباب کی پرمسرت زندگی سے اس کا رشتہ توڑ دیا تھا اور اب اسے تنکے کی طرح اڑائے لیے جا رہا تھا۔ اڑتی ہوئی ریت اسی بگولے کی ریت تھی۔ والد کو دریا میں گرانے والی طاقت اسی بگولے کی طاقت تھی اور اس کے پیچھے ہم سفروں کی وہ دھندلی پرچھائیاں بھی اسی بگولے کی پرچھائیاں تھیں جس نے ان سب کو اپنی مہیب باہوں میں جکڑ رکھا تھا۔

بھوک کی شدت سے سر چکرا رہا تھا۔ لگ رہا تھا جیسے کوئی دیوانہ لوگوں کو سیدھے راستے سے بھٹکا رہا ہے۔

وہ اورگنت جانے والے راستے سے نمازگاہ تک پہنچ گئے۔ اب انہیں برف پوش چوٹیوں والے پہاڑ نظر آنے لگے۔ بابر کی آنکھوں کو ٹھنڈک محسوس ہونے لگی، اس نے گھوڑے کو ایڑی لگائی اور خشک لبوں کو بمشکل کھول کر شیرم بیک

سے کہا

"آپ لوگ رفتار تیز کیجئے! رفتار تیز کیجئے۔"

"کوئی قاصد آ رہا ہے، کچھ دیر انتظار کریں؟" شیرم بیگ نے پیچھے دیکھ کر کہا۔

قاصد نے آ کر بابر کو خواجہ عبداللہ کا خط دیا۔ بابر نے گرل بیٹھے ہوئے خط پر بندھا ہوا ریشمی فیتہ کھول کر پرچے کو تویان کوکلتاش کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا

"پڑھیے۔"

خط میں اندجان کے بیگوں کی وفاداری کا تذکرہ تھا۔ حقیقتاً اشاروں اشاروں میں یہ بھی لکھا تھا کہ شہر میں جھوٹی افواہیں پھیلائی جا رہی ہیں گویا کہ "مرزا بابر بھاگ کھڑے ہوئے" مزید یہ کہ ان افواہوں کے ذریعے فسادی لوگ عوام کو بابر سے دور کرنا چاہتے ہیں۔

"میرے شہزادے، ان ہی فسادیوں سے تو میں آپ کو محفوظ رکھنا چاہتا تھا" شیرم بیگ نے بابر سے کہا۔ "وہاں کے حالات بہت خراب ہیں، بہت ہی خراب۔ اندجان لوگوں کا اڈا بن گیا ہے۔ وہاں واپس نہ جائیے، مرزا۔ اگر بیگ آپ کے وفادار رہیں تو ہمیں یہیں آنے دیجئے!"

"ڈر کے مارے بابر وطن سے بھاگ کھڑے ہوئے" ہاں یہ افواہ ایسی ہی تھی کہ ایک کان سے دوسرے کان تک، ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک پھیلائی جاتی۔

"نہیں! میں بھاگ کھڑے ہونے کا قطعاً ارادہ نہیں رکھتا!" اور بابر نے اپنے گھوڑے کا رخ پیچھے کی طرف موڑ دیا۔

"یہ محض ایک چال ہے شہزادے، یقین کیجئے۔"

"میں خود ہی ساری باتوں کی تصدیق کروں گا۔ میں ان لوگوں کو دکھا دوں گا کہ بزدل نہیں ہوں۔ سب لوگ واپس چلیں! اندجان کو واپس چلیں!"

بابر نے لگام ڈھیلی چھوڑ کے گھوڑے کے چابک رسید کر دیا۔ گھوڑا تیزی اور غضبناکی کے ساتھ دوڑنے لگا۔ ہوا کا ایک جھونکا بابر کے سینے سے ٹکرایا جس سے اسے کچھ راحت محسوس ہوئی۔ ایسے لگا کہ وہ مہیب بگولا پیچھے چھوٹ گیا، راستے میں کہیں کافور ہو گیا۔

آفتاب غروب ہونے کو تھا تو وہ لوگ قلعے کے اندر داخل ہو گئے۔ شام کو جن راستوں پر عموماً بڑی چہل پہل نظر آیا کرتی تھی ان پر اس وقت سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ساری دوکانیں بند تھیں۔ چاروں طرف ویرانی سی برس رہی تھی۔ دہشت زدہ شہر اپنے ڈربے میں دبکا ہوا تھا۔

بابر کی حفاظت کی طرف سے مسلسل فکر مند شیرم بیگ نے سپاہیوں کو اشارہ کیا کہ وہ بابر کو جو اپنے گھوڑے پر آگے آگے چل رہا تھا، گھیرے میں لے لیں۔ بابر کو یہ دیکھ کر ایسا لگا جیسے اسے قید کر لیا گیا ہو، جیسے اس گھونسلے نے ایک بار پھر سے بازوؤں میں جکڑ لیا ہو۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور حصار کو توڑ کر دوبارہ آگے نکل گیا۔ شیرم بیگ نے ایک بار پھر حکمت عملی دکھائی۔ اس نے بابر کے پہلو بہ پہلو چلنے کی کوشش کی تاکہ لوگ دیکھیں کہ وہ اپنے بھانجے کو نظر بد سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے لیکن تویان کوکلتاش نے اس کے گھوڑے کی لگام تھام لی۔

"بیگ صاحب، آپ شہزادے کو آگے آگے ہی چلنے دیجئے۔ عوام ان کو دیکھنے کے لیے بے چین ہیں۔ لوگ اونچی کھڑکیوں کے شگافوں سے جھانک رہے ہیں وہ دیکھیں کہ شہزادے کی سواری کتنی شان سے آ رہی ہے"

"اور کہیں باغیوں نے کسی شگاف سے تیر چلا دیا؟"

"انہیں اس کی جرأت ہی نہیں ہو سکتی اور عمداً آگے ہی رہنا چاہتے ہیں۔ اللہ ان کا نگہبان ہے۔"

اور یوں بابر دوسرے گھڑ سواروں سے آگے آگے چلتا ہوا قلعے کے قریب پہنچا۔ فوراً ہی صدر دروازہ کھل گیا اور خواجہ عبداللہ، قاسم بیگ اور شاہی سپہ سالار اس کے خیر مقدم کے لیے باہر نکلے۔ بابر نے گھوڑے سے اتر کے اپنے استاد کو سلام کیا اس کا دل بھر آیا اور رخساروں پر آنسو بہہ نکلے۔ خواجہ عبداللہ نے بابر کو گلے سے لگا لیا۔ حوصلہ افزائی اور شفقت کی ضرورت تھی۔ لڑکے کو جو کہنا تھا کہہ لیا لیکن بہرحال وہ عمداً تھا۔ لوگوں کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ خواجہ عبداللہ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا۔

"ہمیں سخت صدمہ پہنچا ہے، عزیز شہزادے" اس نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا "اب تو ہمارے جان و مال کے محافظ آپ ہیں!"

اتنے میں بیگوں میں سے کسی نے دو قدم آگے نکل کر خواجہ عبداللہ کی بات کاٹ دی۔

"محترم ولی عہد، ہم سب بیگ آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہیں"

بابر نے جواب دیا لیکن اس کی آواز اب بھی مرتعش تھی۔

"بہت بہت شکریہ!"

سب لوگ قلعے میں داخل ہونے لگے تو یعقوب بیگ بھی آ کے بیگوں کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ وہ بابر کی واپسی کی خبر سنتے ہی بھاگا بھاگا وہاں پہنچا تھا تاکہ اس پر کسی قسم کا شک نہ کیا جا سکے۔

ماضی میں جب اندجان دارالحکومت تھا تو تخت شاہی مرمر محل میں رکھا ہوتا تھا اور یہی محل قلعے کا مرکز بھی تھا۔ تیمور کے پوتے کے تخت بن جانے کے بعد سنہرے گل بوٹوں سے آراستہ سنگ مرمر کی سیڑھیوں والے اس محل کی شان و شوکت بتدریج گھٹنے لگی تھی۔ بابر کی آمد سے قبل خواجہ عبداللہ کے حکم سے محل کی سیڑھیوں پر شاندار غالیچے اور دیوان عام کے اس چبوترے پر جہاں کبھی تخت شاہی رکھا رہتا تھا، قیمتی ترکمانی قالین بچھا دیے گئے تھے۔ قالینوں کے اوپر مخملی گدے بھی بچھا دیے گئے تھے۔

منقش غالیچوں پر سے گزرتے ہوئے بابر کو کھانسی آ گئی کیونکہ حلق بری طرح خشک ہو چکا تھا۔ تاہم اس نے ذرا بھی آرام نہ کیا اور اسی حالت میں سیدھے شاہ نشیں پر پہنچ کر بیٹھ گیا۔

دوسرے افراد بھی اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ پھر خواجہ عبداللہ نے شاہ مرحوم مرزا عمر شیخ کو ثواب پہنچانے کے لیے فاتحہ پڑھا۔

"یا اللہ، انہیں جنت نصیب کر" سارے بیگ ایک ساتھ کہہ اٹھے۔ بابر کی طرف متوجہ چہرے ہمدردی اور غم کے جذبات کے آئینہ دار تھے۔

"محترم حضرت، ساتھین حکومت" خواجہ عبداللہ نے کہنا شروع کیا۔ "جنگ کی بلا ہمارے سروں پر منڈلا رہی

بابر کی دھندلی پڑ جانے والی آنکھوں کو گاؤ کی داڑھی پر لڑھکتے ہوئے نفرت اشک اب بھی نظر آ رہے تھے۔ کس نے سوچا تو اس شخص کو، ایسے زندہ و تندرست شخص کو کیا لاش میں تبدیل ہو جانا چاہیے؟ کیا خود اس کے لیے یہ اجازت بھی ضروری ہے کہ اس شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے؟ آخر کیوں؟ محض اس لیے کہ یہ سب بیگ یہی چاہتے ہیں؟ یہ بھی تو ممکن ہے کہ یہ بیگ واقعی اسے فریب ہی دے رہے ہوں؟ کہیں ایسے ہی بیگوں نے تو والد صاحب کو آخسی میں کراڑے سے پیچھے نہیں دھکیل دیا تھا؟ اور کل یا پرسوں یہی لوگ خود اس کی بھی جان لینے کی کوشش تو نہ کریں گے؟

''استادِ محترم!'' بابر نے کھوکھلی سی آواز سے خواجہ عبداللہ کو مخاطب کیا اور وہ بابر کے شانے کی طرف جھک گیا۔

''آپ کو ثابت قدم رہنا چاہیے، حکمران!''

''کیا کرنا چاہیے، بتایئے نا!'' بابر نے چپکے سے کہا۔

''سزا سنایئے۔ بیگ سزائے موت کا مطالبہ کر رہے ہیں''

''اور استاد خود آپ؟''

ایسے میں جبکہ اندجان بلکہ ساری سلطنت فرغانہ کا مقدر داؤں پر لگا ہوا تھا، گاؤ جیسے افراد کی وقعت ہی کیا تھی۔

''حضور والا!'' خواجہ عبداللہ نے بھی سرگوشی ہی میں جواب دیا۔ ''ایسے پر خطر لمحات میں، بیگوں کی مرضی کے خلاف کچھ نہ کرنا چاہیے۔ حکم دیجئے...... سزائے موت دی جائے..''

اور اگلے دن قلعے کے سامنے والے میدان میں نقاروں کی گونج کے ساتھ درویش گاؤ کا سر تن سے جدا کر دیا گیا۔

اسی دن اندھیرا ہوتے ہی احمد تنبل چپ چاپ آخسی روانہ ہو گیا۔

نو

۱

فضل الدین اندجان گیا لیکن اسی روز وہاں سے سخت پریشانی کے عالم میں تو۔ واپس لوٹ آیا۔

وہ نئے شاہ فرغانہ بابر سے یہ التماس کرنے کے ارادے سے اندجان گیا تھا کہ اس کی حفاظت کا انتظام کر دیا جائے۔ اسے یقین تھا کہ یہ انتظام کر دیا جائے گا لیکن اس سلسلے میں کمسن حکمران سے براہ راست ملاقات ضروری تھی۔ میر عمارت بابر سے متعارف تھا، شہر کے باہر والی شاہی حویلی کی تعمیر کے دوران اس سے اکثر باتیں کرتا رہتا تھا اور جانتا تھا کہ بابر کو بے شمار اشعار یاد ہیں نیز یہ کہ وہ شعر و سخن کا بڑا دلدادہ ہے۔ فضل الدین کو مصوری سے بابر کے گہرے لگاؤ کا بھی علم ہو تھا اسی لیے اس نے عظیم نوائی کی تصویر اسے نذر کر دی تھی اور بابر نے اسے زردوزی کے کام کا خلعت عطا کیا تھا۔ اب وہ بابر کو اس ناانصافی کے متعلق بتانا چاہتا تھا جس کا اسے خود غرض بیگوں کے ہاتھوں شکار ہونا پڑا تھا اور اسے یقین تھا کہ بابر اس کی باتیں توجہ سے سن کر اس کی حفاظت کا انتظام کر دے گا...

لیکن اسے تو بابر سے ملنے ہی نہ دیا گیا!

انوار حسن اور یعقوب بیگ نے نہ ملنے دیا۔

آوازیں نہ ابھر رہی ہوتیں تو سوچا جا سکتا تھا کہ ساری کی ساری آبادی کہیں دور چلی گئی ہے۔

قراسو کے پل پر بھی ہو کا عالم طاری تھا، ایک بھی شخص نہیں نظر آ رہا تھا۔ طاہر کی بات صحیح نکلی تھی۔ پہریدار بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

نصف شب کو پل کی طرف جاتے ہوئے راستے پر چند سائے نمودار ہوئے۔ ان میں ایک اور سائے کا جو گلی کی دیوار کی آڑ سے نکل کر راستے پر آ گیا تھا، اضافہ ہو گیا۔

"چقماق اور چھپٹیاں لے لیں نا؟" طاہر نے حتی الامکان دبی آواز سے پوچھا۔

"ہاں لے لیں" ایک پستہ قد شخص نے جو کندھے پر تھیلا رکھے ہوئے تھا، دبی آواز ہی سے جواب دیا۔

اس شخص کے کپڑوں میں تل کے تیل کی بو بسی ہوئی تھی، وہ روغن گر تھا۔

طاہر کی پیشانی اور رخساروں پر بوندیں پڑیں تو اس نے سر اٹھا کے آسمان کی طرف دیکھا۔ کالے کالے بادل امڈتے چلے آ رہے تھے، کہیں ایک ستارہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

"موسلا دھار بارش ہوگی۔ تب تو آگ سلگ ہی نہ سکے گی" طاہر نے سوچا۔ "شاید پل کی لکڑی ویسے بھی گیلی ہو چکی ہوگی۔"

"ارے عمرزاق، میں ایک کلہاڑی تو لے آیا ہوں لیکن ایک اور کلہاڑی اور دو دستوں والے ایک بڑے آرے کی بھی ضرورت ہے۔ تم تو نجار ہو، تمہارے ہاں یہ سب چیزیں ہوں گی۔"

"لیکن آرے کی کیا ضرورت پڑ سکتی ہے؟"

"یہ سب نہ پوچھو، بیکار وقت ضائع ہو رہا ہے۔ محمود، تم بھی ان کے ساتھ چلے جاؤ جلدی کرو، بھائیو!"

دیکھتے ہی دیکھتے ساری تیاریاں مکمل ہو گئیں۔

دو راتیں!

پہریداروں کے اچانک بھاگ جانے کی بات ایک طاہر ہی کو تھوڑی معلوم تھی۔ دشمن کو بھی اس کا علم تھا اسی لیے فوری اقدام کی ضرورت تھی۔ اگلی صبح ہی کو تو دشمن کا لشکر پل پار کرنے والا تھا۔

طاہر نے اپنے احباب کو پل کے قریب ہی ایک اونچے درخت کے پاس روک دیا۔

"ہمیں کچھ کھونا نہیں ہے، برادران عزیز۔ بزرگوں اور سپاہیوں نے ہمیں بے سہارا چھوڑ دیا ہے تاکہ دشمنوں کے گھوڑے ہمیں روند دیں۔ میں اس کہاوت کو دہرا رہا ہوں 'ہمت مرداں، مدد خدا' قسمت نے ہمارا ساتھ دیا تو ہم اپنے عزیزوں رشتے داروں سمیت بلائے عظیم سے بچ نکلیں گے کیونکہ نئے پل کی تعمیر اور وہ بھی ہمارے قراسو جیسے دریا پر کوئی ہنسی ٹھٹھا نہیں ہے۔ لیکن اتفاقاً اگر قسمت ساتھ نہ دے تو ہمیں اپنی زبانیں سی لینی چاہئیں، ہم سب کو، انجام خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو۔"

"ہم قسم کھاتے ہیں!" محمود نے عزم و یقین کے ساتھ کہا۔ "ہم میں سے اگر کوئی بھی دشمن پر یہ راز فاش کرے تو وہ سچے باپ کا بیٹا نہیں!"

"آمین!"

"آمین!"

سب نے سر پر ہاتھ پھیرے اور یکے بعد دیگرے پل پر چڑھ گئے۔

طاہر چالیس پچاس قدم چلنے کے بعد پل کے وسطی حصے میں آگ لگانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ جوں جوں آگے بڑھتے جا رہے تھے ویسے ویسے اس کا خود کو غیر محفوظ تصور کرنے کا احساس بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ دونوں جانب کھلے پانی کی موجودگی کے باعث پل کے اوپر کنارے کی بہ نسبت زیادہ اجالا تھا۔ کوئی بھی انہیں دیکھ سکتا تھا۔ دشمن کے ہراول دستے کے کسی بھی تیر انداز کے لیے وہ بہت آسان نشانہ ثابت ہو سکتے تھے۔ یہ ڈر بھی درست ہوا کہ آگے سے جیسے بچ کر سنبھلتے ہوئے طاہر کی کلہاڑی ٹکرا گئی اور دور دور تک رات کے سناٹے میں گونج اٹھی۔ نوجوان گھبرا کر ٹھہر گئے اور کچھ دیر تک تاریکی میں ہمہ تن گوش کھڑے رہے۔ پھر تسلی ہوئی کہ شہ سوار بدستور مسلسل بڑھتے جا رہے تھے۔

"طاہر، اب ہمیں آگے نہ بڑھنا چاہیے" محمود نے چپکے سے کہا۔ "تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ ادھر سے وہ لوگ آ گئے تو ہم کریں گے کیا؟"

"ہم میں سے کسی ایک کو پل کے دوسرے کنارے پر پہنچ جانا چاہیے۔ سنو عمرزاق، تم اس کنارے پر جا کے پہرہ دو۔ ابھی ڈرو نہیں، وہ لوگ یہاں سے ابھی بہت دور ہیں۔"

بوندا باندی تیز ہو گئی اور اس کی اوٹ میں دور جاتے ہوئے راوی اوجھل ہو گئے۔ اب ان لوگوں کو دشمن نہیں دیکھ سکتے تھے۔

یہ خاصا لمبا پل تین چوبی ستونوں پر ٹکا ہوا تھا۔ طاہر نے جنگلے پر سے جھک کر نیچے دیکھا وہ رہا دریا کے دوسرے کنارے والا پہلا ستون۔ اس نے عمرزاق کے سوا جو آخرکار پل کے دوسرے سرے پر جا کر پہرا دینے کی جگہ پر کھڑا ہو گیا تھا، سب کو اسی جگہ روک لیا۔ طاہر نے ان لوگوں کو مختلف جگہوں پر تعینات کر کے ہدایت کی کہ کلہاڑیوں سے لکڑیوں کی اوپری نم سطح کو چھیل کر خشک سطح پر فوراً تھیلے سے تیل چھڑک دیں۔ وہ خود چھپٹیوں کو بھیگنے سے بچانے کی کوشش کرتا ہوا چقماق سے چنگاریاں نکالنے لگا۔ کئی ناکام کوششوں کے بعد آخرکار سوختے نے آگ پکڑی اور تلخ دھوئیں کی بو پھیل گئی۔ روغن گر نے جو زیادہ مستعد تھا فوراً ہی چھپٹیاں جلا لیں۔ طاہر نے پرانے ٹن میں جسے وہ راستے بھر اپنی بغل میں دبائے رہا تھا، آگ لگا دی۔

ہلکی ہلکی آگ دھیرے دھیرے پل کے تختوں پر پھیلی لیکن اتنے میں ہوا کا جھونکا آیا اور بارش کے قطروں سے یہ آگ دھیمی سی چھن چھناہٹ پیدا کرتی ہوئی بجھ گئی۔

"تیل بالکل بیکار ہے" روغن گر نے صفائی پیش کی۔ "یہی کیا کم ہے کہ یہ تیل بھی مل گیا۔"

"خاموش!" طاہر نے چپکے سے کہا۔ "سوختے کو سلگنے دو۔"

طاہر نے جلدی جلدی دو پٹکوں کو جوڑ کر رسی کی طرح بنا کر ایک سرے کو اپنی کمر میں باندھنے کے بعد دوسرے سرے کو جنگلے میں باندھ دیا۔ پھر وہ جنگلے سے نیچے لٹک گیا اور پیروں سے پل کے ستون کو ٹٹول کر آڑے شہتیر پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے شہتیر پر جہاں بارش کا پانی نہیں پہنچ رہا تھا، چھپٹیاں رکھیں، ان پر تیل چھڑکا اور آگ لگا دی۔ لکڑی تیزی سے جل اٹھی لیکن اتنی ہی تیزی سے بجھ بھی گئی کیونکہ ہوا کے جھونکوں سے جلتی ہوئی چھپٹیاں اڑ کے نیچے پانی پر بکھر گئیں۔

طاہر اچھل کر دوبارہ پل کے اوپر آ گیا اور جلدی سے کلہاڑی تھام کر جنونی کیفیت کے ساتھ جنگلے کو کاٹنے لگا۔

"کمبخت پل تو جلتا نہیں [illegible]"

روشن گر نے دوسری کلہاڑی اٹھائی اور دوسری طرف کے جنگلے کو کاٹنے لگا۔

"ارے ٹھہرو بھی۔ طاہر، اس سے آخر حاصل کیا ہوگا؟" محمود چیخ اٹھا۔ "بہتر ہوگا کہ کلہاڑی مجھے دے دو۔ ذرا دیکھو تو، یہ تختے کیلوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ ہم انھیں اکھاڑ پھینکیں گے۔"

شاید اسی طرح کام بن جائے؟ اندھیرے میں کیلیں نظر نہیں آ رہی تھیں لیکن محمود ٹٹول ٹٹول کے تلاش کر لیتا تھا۔ ان دونوں نے مل کر جوں توں پل کے ایک بہت بڑے اور موٹے تختے کو جو آڑا جڑا ہوا تھا، اکھاڑ دیا لیکن دوسرے تختے کو اکھاڑنے کی طاقت نہ رہ گئی۔

"آرے سے کاٹو نا، بھائی" محمود نے کہا۔

اور وہ لوگ آڑے جڑے ہوئے تختوں کو کاٹنے لگے۔

"اتنی جلد بازی بھی کیا!" طاہر نے کہا۔ "اس سے کوئی فرق نہ پڑے گا   ہم پانچ چھ تختے نکال لیں تب بھی جو شگاف بنے گا اس سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوگا"

"کیوں؟ ہم اتنا چوڑا شگاف بنا دیں گے کہ پل پر سے گھوڑے اور اراب نہ گزر سکیں گے!"

"لیکن کوئی بھی نجار ذرا سی دیر میں پل کی مرمت کر دے گا۔ تمھارے خیال میں دشمن کے پاس نجار نہیں ہیں کیا؟"

"لگتا ہے ہم لاحاصل کام میں الجھ بیٹھے!" نوجوان روشن گر نے اداسی کے ساتھ اعتراف کیا۔

محمود جھلا اٹھا۔

"تو پھر آؤ، شہتیروں ہی کو کاٹ ڈالیں!"

"یہ شہتیر کاہے کو ہیں، پورے کے پورے تنے ہیں، تم مذاق کر رہے ہو کیا؟ کتنے موٹے ہیں، انھیں کیسے کاٹا جا سکتا ہے؟"

"کاٹ ڈالیں گے!" طاہر کو بھی جوش آ گیا۔

جوانوں کی دو جوڑیوں نے باری باری آرے سے پل کے آڑے شہتیروں کو کاٹنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ تیز بارش میں سوئی تھی لیکن گرم گرم سی پھوار اب بھی پڑ رہی تھی۔ پانی کے قطرے کام کرنے والوں کے پسینے میں شامل ہوتے رہے وہاں سے کپڑے پوری طرح بھیگ گئے۔ آرا چلانے والے شہتیروں کو دو دو تین تین جگہوں پر کاٹ کے ان حصوں کو کمزور کر دینا چاہتے تھے جہاں وہ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے لیکن ان میں سے کسی کے بھی ذہن میں یہ خیال نہ آیا کہ اگر وہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے تو تختوں اور شہتیروں کے ساتھ ہی ساتھ خود بھی تند و تیز [illegible] میں جا گریں گے۔ بہرحال جیسی کہ انھیں امید تھی، پل نہ گرا وہ کچھ دوسری بڑی بڑی کیلوں، شہتیروں اور اس پر بچھے ہوئے ستونوں کے سہارے ٹکا ہوا تھا۔ طاہر اور محمود ایک بار پھر کلہاڑیاں چلانے لگے۔ اتنے میں پل یکایک جگہ پر اچانک چرمرایا، اس میں کچھ لرزش سی پیدا ہوئی لیکن جوں کا توں کھڑا رہا۔

"بس ہو چکا" محمود جو تھکن سے چور چور تھا، کہہ اٹھا۔ "یہ ہمارے بس کی بات نہیں"

"بھاڑ میں جائے کمبخت!" طاہر نے کہا اور جنگلے کو پھر کاٹنے لگا۔ اسی لمحے پل کے دوسرے کنارے سے تمرزق بھاگا بھاگا ان لوگوں کے پاس آیا۔

"لوگو، وہ اس طرح کچھ نہ کرو [illegible] دشمن کا لشکر [illegible] رہا ہے

واتنا نقصان نہ جھیلنا پڑتا۔ مرمت کے بعد لشکر سے پار کر لیتا۔ لیکن دریا میں پشتے کی اس کارروائی کے بعد یہ اندازہ لگانا دشمن کو بھی مشکل نہ ہوگا کہ یہ سوچی سمجھی سازش کی اور سازش بھی کسی مہارت کی۔ وہ لوگ پل کی مرمت کرنے یہاں پہنچیں گے، اور تم سب کو قتل کر دیں گے! ساتھ میں ہمیں بھی۔"

"تو کیا وہ لوگ اب بھی دریا کے کنارے پر موجود ہیں؟"

"ان کے گشتی دستے تو دریا کے اس کنارے پر بھی پہنچ چکے ہیں۔ میں نے خود دیکھا ہے۔ باتوں میں وقت نہ ضائع کرو۔" "فوراً کارروائی کرو، جا کے سرکنڈوں میں چھپ جاؤ۔ عجلت سے کام لو۔"

طاہر نے اپنے احباب کو ماموں کے مشورے سے باخبر کر دیا۔

"اپنے ساتھ رسیاں اور درانتیاں لے لو۔ راستے میں کوئی پوچھے تو کہنا لکڑی کاٹنے جا رہے ہیں۔ دو تین دنوں کے لیے کھانا ساتھ لے لینا۔"

اس طرح پانچ نوجوان یکے بعد دیگرے سب کی نظروں سے چھپتے چھپاتے گاؤں سے چلے گئے۔ ان کی ملاقات تقریباً ایک ناقابلِ گزر مقام پر کہیں جا کے ہوئی۔

اس اثنا میں دشمن کے گشتی دستے نے لیلیک باشی* کو ڈھونڈ نکالا اور اس کی مدد سے قوم کے تمام نجاروں اور بعض دھاتوں کو اکٹھا کر کے پل کی مرمت کے لیے پکڑ لے گیا۔ دریا کے دوسرے کنارے سے سپاہی شہتیر اور تختے گھسیٹ گھسیٹ کر لانے لگے۔

کام پر طلب کیے جانے والوں میں طاہر کا باپ بھی شامل تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا بیٹا رات میں کہیں چلا گیا تھا اور علی الصبح واپس لوٹا تو تھکن سے چور تھا۔ ایک نجار نے طاہر کے باپ کو کرسے کے نشانات دکھائے لیکن آخر مدد کرنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کی تاکید کی

"اس بارے میں ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالنا! دشمنوں کو بھنک بھی لگ گئی تو قوم کو جلا کے خاک کر دیا جائے گا اور ہمارے سر بھی سلامت نہ رہیں گے!"

"آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں"

پل کی مرمت کے دوران پورے دو دن کسی بھی نجار نے منہ نہ کھولا۔

دشمن کے لشکر نے بآسانی پل کو پار کر لیا۔ سب سے آخر میں سلطان محمد اپنے محافظ دستے کے ساتھ پل پر سے گزرا اور قوم میں قیام کیے بغیر ہی آگے بڑھ گیا۔

ریوڑ پر لدے بھاری سامان، اونٹوں اور لشکر کے ایک حصے کو دریا کے دوسرے کنارے پر ہی چھوڑ دیا گیا۔ گزشتہ دو دنوں میں دشمن نے اپنے منصوبے کو شاید کچھ بدل دیا تھا۔

طاہر کو جنگل میں ذرا بھی سکون نہ میسر ہوا، وہ ربعہ کی طرف سے مسلسل تشویش میں مبتلا رہا۔

وہ جانتا تھا کہ والدین اپنی بیٹی کو غیروں کی نگاہوں سے بہر حال چھپائے رکھیں گے لیکن وہ سوچتا کہ ایسے میں جبکہ دشمن کے سپاہی قدم قدم پر موجود ہیں خبر نہیں وہ کیسے بچ رہے ہیں، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ گھروں کے ساتھ ہی ساتھ تیسرے دن نوجوانوں کی غذائی اشیا بھی ختم ہو گئیں۔ اب انھیں گھروں کو واپس جانے کا فیصلہ کرنا تھا۔ طاہر نے شام ہی کو جنگل

* باشی - گاؤں کا مقدم

سرکنڈوں کا ایک گٹھا تیار کر رہا تھا جسے وہ کے روانہ ہو گیا۔ گھر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ چوکھٹ اندر سے بند ہے تو اس نے ایک شگاف سے جس کا صرف اسی کو علم تھا، ہاتھ اندر ڈال کے زنجیر کھول دی۔ صحن میں اس کی نظر فضل الدین پر پڑی جو سائبان کے پاس کھڑا اپنے رباب کے پہیوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے طاہر کو کندھے پر سرکنڈوں کا گٹھا لادے اندر آتے دیکھا تو ہاتھ اٹھا کر اس کی طرف لپکا

''امن، میرے بھانجے! امن قائم ہو گیا، مبارک ہو!''

''تو جنگ ختم ہو گئی!''

طاہر نے گٹھے کو زمین پر گرا دیا۔ ماموں نے اسے گلے سے لگا کر گرمجوشی کے ساتھ چپکے چپکے کہا

''تم لوگوں کی شجاعت رائیگاں نہیں گئی، طاہر جان! سنا ہے کہ شاہ سمرقند نے خود ہی جنگ بندی کی پیشکش کی۔ تو سائے میں اتنے زیادہ سپاہیوں سے ہاتھ دھو بیٹھنے کے بعد اس کا دماغ درست ہو گیا۔'' پھر اس نے طاہر کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بات جاری رکھی ''بہت اچھا ہوا، بہت ہی اچھا! یہ اتنے سارے عقل مند بیگ جو ہیں نا، وہ دشمن کا بال بھی بیکا نہ کر سکے اور تم جیسے دلیروں نے کم بختوں کو پسپا کر دیا۔ دہقانوں، دستکاروں، نجاروں۔۔۔ اور کس نے؟''

''روغن گروں نے''

''ہاں، روغن گروں نے بھی'' فضل الدین نے زور دار قہقہہ لگایا اور طاہر کو اپنی گرفت سے آزاد کر کے اس کے چہرے کو پرمسرت نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا ''دہقانوں، دستکاروں۔۔۔ وہ تم جیسوں کو متکبر بیگ قلی کباڑی کہتے ہیں لیکن یہ قلی کباڑی نہ ہوتے تو ان بیگوں کو مصیبت سے بھلا کون نجات دلا سکتا تھا؟ کون؟''

''ارے ماموں جان، خود ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایسا شاندار نتیجہ برآمد ہوگا۔ یہ بھی بہت اچھا ہوا کہ آپ یہاں آ گئے تھے۔ اگر آپ نہ آئے ہوتے تو شاید یہ ترکیب مجھے سوجھی ہی نہ ہوتی''

''ارے واہ، تم نے بھی بات کا رخ کتنی خوبصورتی سے موڑ دیا، بھانجے۔ ساتھ ہی ساتھ مجھے بھی آسمان پر چڑھا دیا''

فضل الدین ہیجانی انداز میں جلدی جلدی کبھی دھیمی تو کبھی بلند آواز سے باتیں کیے جا رہا تھا گویا اب بھی کوئی خطرہ لاحق ہو۔

''ماموں جان، تو کیا وہ لوگ اب بھی قلعہ میں موجود ہیں؟'' طاہر نے پوچھا۔

''ہاں۔ فوج کی آمد جاری ہے، گشت بھی نہیں ختم کیا گیا۔ ان کے حکمران نے اندجان سے سات فرسخ کی دوری پر ہی جنگ بندی کا معاہدہ کر لیا اور واپس لوٹ گیا۔ اس کے محافظ دستے کا ایک حصہ دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچ چکا ہے، یہ تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ باقی دستہ اس کے ساتھ ہے کہ نہیں، اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا، پر وہ یہاں پہنچنے ہی والا ہے۔ ہمیں پہلے ہی کی طرح چوکس رہنا چاہیے، طاہر جان۔ دشمن پیچھے ہٹنے لگتا ہے تو خاص طور سے خطرناک ہو جاتا ہے۔ تم اندر جاؤ اور لوگوں کی نظروں سے دور ہی رہنا''

طاہر نے اپنے پیروں میں چپکے ہوئے تنکے جھاڑ دیے اور اندر چلا گیا۔ پڑوس والے گھر سے لوریاں دینے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ طاہر کو فوراً ہی رابعہ یاد آ گئی اور دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ آہ، کتنا تڑپ رہا تھا وہ رابعہ کی یاد میں!

بند نہیں نہ ہوتیں تو وہ اسی لمحے ابو ریحان کے پڑوس کے احاطے میں پہنچ جاتا رابعہ کو بتانے کہ لڑائی ختم ہوگئی۔ وہ تو اس وقت تک شاید اس بات سے بے خبر ہی رہی ہوگی۔ اور دیکھتا کہ اسے کتنی مسرت حاصل ہوتی اس خبر سے! لیکن نہیں، وہ ایسے نہیں کرسکتا تھا، اسے تو پہلے ہی کی طرح چوری چھپے رابعہ سے تنہائی میں ملاقات کی صورت نکالنی تھی۔

طاہر نے گھر کے اندر پہنچ کر والدین کو جنگ بندی کی مبارک باد دی ہی تھی کہ پھاٹک کے تختے زور زور سے بجنے لگے، گھوڑوں کی ٹاپیں اور پھر پھاٹک کے بجڑ بجڑائے جانے کی آوازیں سنائی دیں۔ اس کے لیے خشک گھاس رکھنے کی کوٹھری میں چھپ جانا ضروری تھا، فوراً ہی!

اس نے کمر سے لٹکتے ہوئے خنجر کے دستے پر ہاتھ رکھ کر بجلی کی سی تیزی سے برآمدے کو پار کیا اور آن واحد میں خشک سرکنڈوں کے گٹھوں کے درمیان چھپنے کی جگہ تک پہنچ گیا۔

پھاٹک مسلسل زور زور سے بجڑ بجڑایا جا رہا تھا، مجبوراً کھولنا ہی پڑا۔ گھڑسوار سپاہی جن کے سروں پر خود تھے، شلواروں کے چوڑے پائینچے جوتوں سے گڑ کھا رہے تھے اور کاٹھیوں سے کمانیں لٹک رہی تھیں، احاطے میں گھس آئے۔ ان میں سے دو ایک ہی گھوڑے پر سوار تھے۔ سپاہیوں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں لیکن منہ سے کچھ بھی نہ کہا جیسے انہیں گھر والوں کی خاک بھی پروا نہ رہی ہو۔

دستہ دار نے جس کے خود کی نوک پر سبز کپڑے کی ننھی سی جھنڈی لگی ہوئی تھی، سائبان میں بندھے ہوئے گھوڑے کو دیکھ لیا جس پر کاٹھی نہیں کسی ہوئی تھی۔ اس نے مشکی گھوڑے پر سوار دونوں سپاہیوں کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

"یہ رہا تمھارے لیے گھوڑا!"

حبشی جیسا سیاہ فام گھنی مونچھوں والا نوجوان گھوڑے سے نیچے کود کے سائبان کی طرف لپکا۔ باقی سپاہی اپنے سردار کے اشارے پر گھر کے اندر گھس گئے اور بالکل ایسے جیسے نمدے، قالین اور گٹھڑیاں نکال نکال کر احاطے میں ڈھیر کرنے لگے۔

فضل الدین برآمدے کے کھمبے سے ٹیک لگائے بت کی طرح کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ پہلے وہ یہ سوچ کر بری طرح سہم گیا تھا کہ سپاہی طاہر کی تلاش میں آئے ہیں۔ لیکن وہ عام لٹیرے نکلے، قابل نفرت اور ذلیل لٹیرے۔ طاہر کے والدین گھبرائے ہوئے خاموش کھڑے تھے۔ فضل الدین کے لیے ضبط کرنا ناممکن ہوگیا تو اس نے کہا۔

"ارے دستہ دار صاحب!" دستہ دار اپنے گھوڑے پر سوار احاطے کے وسط میں کھڑا ہوا تھا، "آخر آپ کا ضمیر کہاں گیا؟ ہمارے حکمرانوں نے جنگ بندی کا اعلان کر دیا ہے جس کے بعد اس قسم کی قزاقی خلاف شرع ہے!"

سیاہ فام نوجوان نے جلدی جلدی فضل الدین کے گھوڑے پر کاٹھی کسی اور ہنس پڑا!

"ہاں ہاں، امن ہے۔" پھر اس نے طنزیہ لہجے میں اضافہ کیا "واقعی امن ہے امن اور ہمارے لیے خوشحالی!"

دوسرے سپاہی نے سامان کی ایک گٹھری کو ٹٹول کے اس میں سے پکا اطلس نکالی اور دستہ دار کی طرف بڑھا دی۔

"ہاں امان!" اس نے کہا۔

دستہ دار نے فضل الدین کو گھورتے ہوئے اطلس کو دھیرے دھیرے اپنی خرجی میں ٹھونس لیا اور رک رک کر سمرقندی لہجے میں بولا:

"ہمارے ساتھ گھوڑے ہلاک ہوگئے۔ مصیبت بہرحال مصیبت ہی ہوتی ہے۔ تم تو یہاں ٹھاٹھ سے گھوڑے کی

اوش

۱

اوش سے آفتاب جھانک رہا تھا۔ جہاں اونچی اونچی پہاڑیاں اور سرسبز و شاداب کھیت اور میدان حیرت انگیز طور پر ایک دوسرے سے گلے ملتے تھے۔ دریائے سیحوں چمکتا جا رہا تھا۔ اندیجان سے وقفے وقفے پر امرا کے شامیانے تنے ہوئے تھے۔ امرا کے شامیانوں میں نہایت نفیس ریشمی سرخ سرخ اسباب آراستہ کیے گئے تھے۔ رنگ برنگے سامان کے کنارے بھی سبزہ زاروں پر جھنڈیوں جیسے نظر آ رہے تھے۔ آتش دانوں میں لکڑیاں جل رہی تھیں اور سیخوں پر ذبح کیے گئے تھے۔ بیتے کی لکڑیوں کے کوٹے جو اوقد رہے تھے، مہمانوں کے لیے ضروری تصور کیے جاتے تھے۔ انگیٹھیوں میں دہک رہے تھے اور بڑی بڑی آتشی دیگوں میں گوشت پک رہا تھا۔

بابر کا انتظار کیا جا رہا تھا۔

دفاتر سرکاری عہدے داروں میں فضل الدین بھی شامل تھا۔ آج اس کے مقدر کا فیصلہ ہونے والا تھا۔

اسے یعقوب بیگ نے جو عیاری کی بدولت وزیراعظم کے عہدے پر مامور ہو گیا تھا عرصے تک بابر سے ملاقات نہیں کرنے دی تھی۔ پھر جب یعقوب بیگ نے جہانگیر کی طرف سے ایک اور سازش کرنے کی کوشش کی تو خود ہی پھنس گیا کیونکہ جہانگیر نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ یعقوب بیگ انتقامی کارروائی کے خوف سے اندجان سے فرار ہو گیا لیکن قاسم بیگ کی سرکردگی میں سپاہیوں کے ایک دستے نے اس کا رات تعاقب کرتے ہوئے آخر کار اسے جا لیا اور سردریا کے کنارے ہونے والے تصادم میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ قاسم بیگ وزیراعظم بن گیا اور فضل الدین کو مرزا بابر سے ملاقات کا موقع ملا۔

وسیع پیمانے کی تعمیرات کے پیچ جن میں مدرسوں کی وہ عمارتیں بھی شامل تھیں جن کے نقشے میر عمارت نے عمر شیخ مرحوم کے حکم سے تیار کیے تھے، حکومت فرغانہ کے پاس ابھی کافی وسائل موجود نہ تھے۔ بابر نے کہا کہ منحوس جنگ سب ہڑپ کر چکی ہے اور اس نے فضل الدین کو اوش میں اس بلند ترین پہاڑی پر جو شہر کے ایک سرے سے اٹھی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی، ایک حجرے اور برآمدے کی تعمیر کا کام سونپ دیا۔ وہاں سے قرب و جوار کے آنکھوں کو فرحت بخشنے والے خوبصورت مناظر دکھائی دیتے تھے۔ کئی مہینے بیت چکے تھے، حجرے کی تعمیر کب کی مکمل ہو چکی تھی لیکن بابر بے حد مصروف رہنے کی بنا پر آج کہیں جا کر ہی ادھر وہاں آنے والا تھا۔ اسے حجرہ پسند آ جانے کی صورت میں فضل الدین کے لیے دور سے، اس سے کہیں زیادہ وسیع پیمانے کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کی راہ ہموار ہو جانا یقینی تھا اور ناپسند آنے کی صورت میں۔ فضل الدین اس خیال سے بہت فکرمند تھا۔ ضروری تھا کہ حجرہ بہترین آرائش کے ساتھ مرزا بابر کو "نذر" کیا جائے۔

میر عمارت نے کچھ شاہی خدمت گاروں کے ساتھ جنھیں پہلے ہی سے بھیج دیا گیا تھا، پہاڑی سے نیچے اتر کر خود ہی عمدہ قالینوں اور توشکوں کا انتخاب کیا۔ خدمت گار ایک کھڑی چڑھائی طے کرنے کے عادی نہ تھے اور ان چیزوں کو اوپر پہنچاتے پہنچاتے بری طرح نڈھال ہو گئے۔ مثلاً چوب دار اوزٹ کے تمام پردہ بس ایک چاندی کی پتلی کرن والا کا

[illegible] سے بچتے ہوئے خان زادی [illegible] سمجھ گئی تھی جب یہ
بس یہ شہزادی [illegible] جس کسی کے سامنے پڑتی آپ ہی نظر پڑ جاتی ہے وہ خوبصورت ہو جاتا ہے
مگر سے سے میر عمارت صاحب، کیا آپ مصوری بھی کرتے ہیں نا؟''

''میر عمارت کو مصوری بھی آنی ہی چاہیے، شہزادی''

''تب تو آپ میری تصویر بنا کر دیکھئے کہ کیسی بنتی ہے؟''

یہ غیر متوقع تجویز تھی۔ فضل الدین نے مڑ کر دیکھا۔ محل کے اس حصے میں اس وقت ان دونوں کے سوا کوئی بھی نہ تھا۔ پھر بھی اس نے دھیرے سے کہا

''آپ فکر نہ کیجئے، مجھے [illegible] آتی ہے''

''اور شہزادی، اگر تصویر بنانے کی پاداش میں مجھ سے دوسرے جہاں میں میری روح طلب کی گئی تو میں سے کہاں سے لاؤں گا جبکہ میں خود پکا ہوں گا؟ میں تو سے کھوئی رہا ہوں شہزادی''

خان زادہ بیگم شوخ حرکت کو سمجھ گئی اور دلکش تبسم کے ساتھ بولی

''اگر میری تصویر بنانے کی پاداش میں آپ سے آپ کی روح طلب کی جائے تو مجھے بتائیے گا، اپنی روح دے دوں گی۔''

آہنی صندوق میں رکھی ہوئی تصویر کو بنانے کی جرأت فضل الدین نے اسی پر مذاق، شوخ اور خوبصورت الفاظ کو سننے کے بعد کی تھی۔

جنگ کے پر آشوب مہینوں کے دوران اور جنگ ختم ہونے کے فوراً بعد کے ایام میں اسے خان زادہ بیگم سے ملاقات کا کوئی موقع نہیں میسر ہوا تھا۔

آخر کار گزشتہ موسم خزاں میں خود خان زادہ بیگم ہی اس سے ملنے کے لیے [illegible] تاغ پہنچی۔ بابر لشکر کشی کے سلسلے میں روانہ ہوتے وقت اپنی بہن اور والدہ سے اوش کے تعمیری کاموں پر نظر رکھنے کو کہہ گیا تھا۔ وہ میزان* میں خان زادہ بیگم مہمان کی حیثیت سے اوش آئی۔ اور تاغ پہاڑی شہر کے کنارے ہی پر واقع تھی۔

فضل الدین ان دنوں صرف اپنے ایک شاگرد کی مدد سے کام کر رہا تھا۔ نیچے سے ایک ایک اینٹ، ایک ایک تختہ، ڈول پانی کے ایک ایک گھڑے کو بڑی مشکل کے ساتھ پہاڑی کے اوپر لایا جا رہا تھا۔ نہ سنگ مرمر کے چوکے تراشنے کے لیے کوئی سنگ تراش تھا اور نہ ہی کاشیں** خریدنے کے لیے پیسے۔ ان سب چیزوں کی قلت نے فضل الدین کو بری طرح پریشان کر رکھا تھا۔ لیکن ان کمیوں کا تذکرہ بھلا خان زادہ بیگم سے کیسے کیا جا سکتا تھا؟ ایک ایسے فرد سے ایسی بات بھلا کیسے کی جا سکتی تھی جو سر کی موتیوں سے آراستہ ریشمی طاقیہ سے لے کر ہیروں کی [illegible] مڑی نوکوں والی سرخ کفشوں تک نزاکت اور نفاست کا پیکر ہو، نرم و نازک، اور پھر پوری نسوانی حسن کی زندہ مثال ہو! تصویر حیرت بنے ہوئے میر عمارت کی زبان ہی جواب دے گئی۔

آخر خان زادہ بیگم نے خود ہی فضل الدین سے زیر تعمیر حجرے کا نقشہ مانگا۔

---

* میزان: ان دنوں اس علاقے میں رائج شمسی سال کا ایک مہینہ، ۲۳ ستمبر تا ۲۲ اکتوبر۔

** کاشیں: ٹائل

"گنبد کے اوپر آپ چینیلی کا شیشہ لگانا چاہتے ہیں؟ آپ کے پاس کافی شیشہ ہیں؟" انہوں نے نقشے پر نظر جمائے جمائے پوچھا۔

مجبوراً فضل الدین کو ان کا چہرہ دیکھنا پڑا جس کی اسے ضرورت تھی۔ "آپ تو شہری فنِ تعمیر سے بھی واقف ہیں؟ کتنی کتابوں کا مطالعہ کر چکی ہیں آخر وہ؟"

"مرزا بابر ظفریاب ہو کر واپس لوٹیں گے اور والد مرحوم کے خوابوں کو حقیقت میں بدل دیں گے" خان زادہ بیگم نے عزم کے ساتھ کہا۔ "ہم بہت سی عمارتیں تعمیر کرائیں گے اور ان کاموں کے رہنما و نگراں آپ ہی ہوں گے۔"

فضل الدین کو دنیا میں اتنی زیادہ محبت بھری آواز سے کبھی کسی نے مخاطب نہیں کیا تھا۔ خان زادہ بیگم! یہ بات کتنی خوش قسمتی کی آئینہ دار تھی کہ شاہی خاندان میں ایک ایسی شخصیت موجود تھی جو فنِ تعمیر کے رموز سے اتنی زیادہ واقف اور اس کی اتنی قدرداں تھی۔ لیکن کیا بس یہی ایک بات تھی جو فضل الدین کے حوصلے بڑھا رہی تھی؟ اس کے دل میں شہزادی کی طرف شکر گزاری بھرے جھکاؤ کے لطیف جذبات بیدار کر رہی تھی۔

اچانک خان زادہ بیگم واپسی کے لیے عجلت کرنے لگی۔

فضل الدین بخوبی جانتا تھا کہ پہاڑ سے نیچے اترنا اوپر چڑھنے سے زیادہ دشوار ہوتا ہے۔ یہی سبب تھا کہ اس نے واپسی میں خان زادہ بیگم کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا۔ "پل صراط" پر جیسا کہ لوگ اس پھسلن دار پہاڑی پگڈنڈی کو کہا کرتے تھے، خان زادہ بیگم کی چپٹے تلووں والی [illegible] پھسل گئیں۔ اس کے جسم کا توازن بگڑ گیا اور اس نے اپنی کنیز کی طرف جو ڈھلوان سے آگے آگے اتر رہی تھی، ہاتھ بڑھایا۔ لیکن خود کنیز بھی لڑکھڑا گئی اور ڈر کے مارے چیخ اٹھی۔ دونوں ہی کے گر جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ فضل الدین فوراً چیتے کی سی تیزی سے کود کر ان دونوں کے آگے پہنچا اور انہیں اپنی بانہوں میں سنبھال لیا۔ جوان کنیز نے تو سہم کر جلدی سے فضل الدین کو پکڑ لیا لیکن ہرن جیسی تیز و پھرتیلی خان زادہ بیگم نے اپنی کمر کو جھٹکتے ہوئے مرد کے بازو کا صرف ایک لمحے کے لیے سہارا لے کر اپنا توازن درست کیا اور سیدھی کھڑی ہو کے چپکے سے بولی "شکریہ"۔ فضل الدین نے خان زادہ بیگم کی گرم گرم سانسوں اور عطر کی خوشبو کو محسوس کیا۔ وہ خوشبو کیا صرف عطر ہی کی تھی؟ خان زادہ بیگم... اس نے خان زادہ بیگم کے سرد ہاتھ کو مضبوطی سے تھام لیا اور اس وقت تک تھامے رہا جب تک اسے ہموار جگہ سے بل کھاتی گزرتی ہوئی پگڈنڈی تک نہ پہنچا دیا۔

یہ ایک خواب تھا، شاندار اور طلسمی خواب لیکن اسے وہ نصف سے کچھ کم پگڈنڈی تک ہی دیکھ پایا۔

اگلے ہی روز خان زادہ بیگم نے دو طاقتور نوجوان بھیج دیے جو نیچے سے پہاڑی کے اوپر فضل الدین کے پاس تک عمارتی سامان پہنچانے لگے۔ ہفتے بھر بعد، چینیلی کا شیشہ لدے ہوئے اونٹ بھی پہنچ گئے۔ فضل الدین کو ہر کاشین میں خان زادہ بیگم کا عکس نظر آتا اور شام کو جب وہ تنہا رہ جاتا تھا تو اپنے آہنی صندوق سے اس کی تصویر نکال لیا کرتا تھا۔

اس وقت خان زادہ بیگم کو اپنے قریب آتے دیکھ کر فضل الدین کے دل میں پہلے ہی کی طرح آتشِ شوق بھڑک اٹھی اور اس نے حتی الامکان کوشش کی کہ اس کی یہ اضطرابی کیفیت کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے۔

۲

مرزا بابر گھوڑے سے اترا۔ وہ خاصا بڑا ہو گیا تھا، دیکھنے میں نوجوان سا لگ رہا تھا۔ فضل الدین کی نگاہوں

میں تو بڑی چاق و چوبند تھی اب بڑی پُروقار ہو چکی تھی۔ آخر تخت پر بیٹھے ہوئے تین سال ہو چکے تھے اور فکروں پریشانیوں سے بھرے ہوئے سال ماں کو جلدی پختگی سے ہمکنار کر دیتے ہیں، کسی بھی عمر کا آدمی کیوں نہ ہو اس میں مردانگی آ جاتی ہے۔ محض تعلیم کر اور سے اذان شاہ ہی کہہ سکتے تھے کہ وہ پندرہ سال کا ہے۔

لیکن پہاڑ پر چڑھنے کے لیے پندرہ سال کی عمر بہت موزوں ہوتی ہے۔ بابر دوروں کو پیچھے چھوڑ کر ایک چٹان سے دوسری پر کود رہا تھا اور آسانی سے چڑھتا چلا جا رہا تھا، کبھی والدہ کو اور کبھی بہن کو ہاتھ کا سہارا دے کر چڑھائی کے دشوار حصوں کو طے کرنے میں ان کی مدد کرتا جا رہا تھا۔ اعلیٰ عہدیداروں میں سے زیادہ تر افراد نیچے ہی ٹھہر گئے تھے۔ راستہ تنگ تھا، حجرے میں گنجائش کم تھی اس لیے بابر کے ساتھ اس کا معتبر ترین عہدے دار وزیرِ اعظم قاسم بیگ ہی پہاڑی پر چڑھ رہا تھا جسے دربار میں پیٹھ پیچھے "توندی" کہا جاتا تھا۔ قاسم بیگ اپنے موٹاپے کے باعث نصف راستہ طے کرنے کے بعد ہی ہانپنے لگا۔ بابر ٹھہر گیا۔ قاسم بیگ نے مڑ کر فضل الدین سے جو سب سے پیچھے آ رہا تھا، کہا۔

"میرِ عمارت صاحب، آپ کو یہاں سیڑھیاں بنانے کا خیال کیوں نہ آیا؟"

فضل الدین نے ادب کے ساتھ جواب دیا

"شاہ والا قدر کا حکم ہو تو ......"

بابر جو ایک ہموار پتھر پر کھڑا ہوا تھا، مسکرا دیا اور اس نے کم سنوں کی سی نرم اور دھیمی آواز میں میرِ عمارت کو ٹوکتے ہوئے کہا

"عجیب بات ہے! کیا پہاڑ کی چوٹی پر پہنچنے کے لیے بھی محل کی سی سیڑھیاں بنائی جاتی ہیں؟"

قاسم بیگ نے بےتکلفی آداب کی نزاکتوں کو ملحوظ رکھے بغیر سادہ لوحی سے شکایت کی

"محترم حکمراں آپ کے اس خادم کو تو سیڑھیاں بھی پسینے سے محفوظ نہیں رکھ سکتیں۔"

قہقہوں کا فوارہ سا ابل پڑا

"قاسم بیگ صاحب، ایسی ڈھلوان چٹانوں پر تو کبھی پیدل چلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، شاہ بھی اور خادم بھی!"

"حتیٰ کہ شہزادیاں بھی!" بابر نے بہن کی طرف دیکھتے ہوئے مذاق کیا۔

وہ سب اسی طرح ہنسی مذاق کرتے ہوئے حجرے کے سامنے کے میدان تک پہنچ گئے۔ نیلے گنبد والی چھوٹی سی عمارت لعل گل کے آفتاب کی شعاعوں میں کچھ اس طرح چمک رہی تھی کہ بابر کا دل فوراً ہی نور اور حرارت سے معمور ہو گیا۔ قرب و جوار کے علاقے کا جو وہاں سے صاف صاف دکھائی دے رہا تھا، سارا حسن اس کے دل میں سرایت کرنے لگا۔ دوری پر واقع پہاڑیاں، موسمِ بہار کی ہوائیں اور بالکل پاس ہی برآمدے کے کھمبوں پر آنکھوں کو فرحت بخشتے ہوئے گل بوٹے، گنبد کی رنگ برنگی چمکیلی کاشیوں پر دھوپ اور چھاؤں کی اٹکھیلیاں۔

قاسم بیگ بابر، اس کی ماں اور بہن کو عمارت میں داخل ہونے کے دروازے تک پہنچا آیا اور خود دروازے کے باہر سنگِ مرمر کی سیڑھیوں کے قریب کھڑا ہو گیا۔ وہ بابر کی اجازت کے اشارے کے بغیر اس حصے میں نہ گیا جس میں شاہی خاندان کی خواتین داخل ہوئی تھیں۔

فضل الدین بھی برآمدے کے باہر ہی کھڑا رہا۔

شایانِ شان ہے، کئی صدیوں* تک مضبوطی کے ساتھ کھڑا رہے گا۔"

بابر کو یہ سن کر اور زیادہ جوش آ گیا۔

"آمین! حجرہ ہماری توقعات سے زیادہ خوبصورت ثابت ہو!"

"آفرین، فضل الدین صاحب" قاسم بیگ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

بابر نے بات سنبھال لی

"صاحب کمال فضل الدین" اس نے آفتابہ چی کے قریب کھڑے ہوئے میر خدم کی طرف مڑ کر بلند آواز سے کہا۔ "صاحب کمال کو خلعت عطا کیا جائے!"

میر خدم نے گھبرا کر آفتابہ چی کی طرف دیکھا۔ کیا کیا جائے؟ خلعت تو نیچے شامیانے ہی میں رہ گئی تھی۔ قاسم بیگ تاخیر ہوتے دیکھ کر اپنے زردی کے چوغے کے گریبان کا جس پر گل بوٹے کڑھے ہوئے تھے، بند کھولنے لگا۔

بابر نے اس فیاضی کو درست تصور کرتے ہوئے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

قاسم بیگ نے اپنا چوغہ اتار کے فضل الدین کے شانوں پر ڈال دیا۔

"انہیں ہماری طرف سے ایک گھوڑا پورے ساز کے ساتھ پیش کیا جائے" بابر نے بڑی فیاضی کے ساتھ کہا۔

اور بیک وقت کئی آوازیں گونج اٹھیں

"مبارک ہو! انعام و اکرام مبارک ہو!"

فضل الدین کو سب سے پہلے خان زادہ بیگم کی آواز سنائی دی، دوسری آوازوں کے لیے وہ جیسے بہرا سا ہو گیا تھا۔ وہ شہزادی کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ کر سکا اور کورنش میں سر کو جھکائے ہوئے کھڑا رہا، ساری باتوں کے باوجود خود کو خوش نصیب تصور کرتا رہا۔

۳

مرزا بابر سہ پہر کو پورا تاغ پر تنہا رہ گیا۔ قاسم بیگ نے عہدے داران سلطنت کو بتا دیا تھا کہ "حجرہ حکمران کے لیے تنہا وقت گزارنے کی جگہ بن گیا ہے اور ممکن ہے کہ وہ ساری رات وہیں کاٹ دیں" محافظ دستے کے سپاہی بابر کو نظر نہ آنے کی کوشش کرتے ہوئے پہرہ دینے لگے

بابر کافی دیر تک برآمدے کی بلندی سے قرب و جوار کے خوبصورت مناظر سے محظوظ ہوتا رہا۔

فصل گل چاروں طرف سے اوش کی جانب خراماں تھی۔ فضائیں اتنی صاف و شفاف تھیں کہ نیچے وادی میں چلتے ہوئے اردوں کا دھواں تک سیاہ نہیں بلکہ خاکستری نیلگوں ہو رہا تھا۔ دور دراز واقع برف پوش پہاڑیوں کے دامنوں تک ساری وادی ہریالی کے بحر بے کراں کی سی لگ رہی تھی۔ بابر یہ اندازہ لگاتے ہوئے کہ اوزگنت، مرغیلان اور یہاں سے بہت دوری پر واقع استروشنہ، خوجند اور آخسی کہاں کہاں ہیں، تصور کرنے لگا کہ ان سب شہروں کے باغات اس وقت کیسے

---

* واقعی یہ حجرہ اوش میں چار سو سے زائد برسوں تک برقرار رہا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہی ساتھ اس کے گنبد کی چمک دمک ماند پڑ گئی، دیواروں پر بنے ہوئے گل بوٹے مٹ گئے اور رنگ برنگا سنگ مرمر چھریوں چاقوؤں کے دستے بنانے میں کام آ گیا۔ اب اس کے صرف کھنڈر ہی باقی رہ گئے ہیں۔ یادگار کی بحالی کی تجویز زیر غور ہے جسے امید ہے کہ عملی جامہ پہنا دیا جائے گا۔ (مصنف)

سفید جھاگ جیسے پھولوں میں ڈوبے ہوئے ہوں گے۔ ہندوستان [illegible] پھولوں اور خوشبوؤں سے معمور ہوگی۔ تو جہاں حکمران نے قدرے فخر کے ساتھ سوچا [illegible] جنگ کے خاتمے کو دو سال سے زائد مدت ہو چکی تھی۔ وہ شاہ سمرقند [illegible] تھا۔

ایسے عالم میں کاغذ اور قلم بابر کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لیا کرتے تھے۔ خدمت گاروں نے [illegible] پایوں والی چوکی بچھا دی تھی۔ وہ اس کے پاس ہی قسم کا گدا بچھا کر بیٹھ گیا اور اپنے روزنامچے کو کھولا جس پر عنوان کی حیثیت سے "تزک" درج تھا۔ اس میں گزشتہ بارش کے [illegible] سے متعلق اپنے مشاہدات قلم بند کئے تھے۔ اس وقت اس نے صاف صاف حروف سے لکھا "[illegible] کے باہر [illegible] تاغ پہاڑی کی چوٹی پر میں نے ۹۹۲ ہجری میں برآمدے والا ایک چھوٹا سا حجرہ تعمیر کروایا۔ یہ حجرہ بہت اچھی جگہ پر بنا ہوا ہے اور یہاں سے سارا شہر اور قرب و جوار کے علاقے صاف دکھائی دیتے ہیں۔"

وہ بڑے جوش و خروش کے ساتھ لکھتا رہا اور چشمے اور [illegible] کے پھولوں کا جغرافیہ سے متعین کر دیا تھا اور [illegible] کے مالا مال سے پتھروں کا تذکرہ کرنا نہ بھولا۔

اتنے میں قاسم بیگ دروازے میں نمودار ہوا۔

"گستاخی معاف فرمائیں، عالی جاہ کہ آپ کے نیک کام میں مخل ہوا۔ لیکن [illegible] کے سلطان علی خان نے فوری اہمیت کی کوئی خبر بھیجی ہے۔"

بابر نے قدرے جھنجلاہٹ کے ساتھ قلم رکھ کر قاسم بیگ کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ قاسم بیگ نے کھلا ہوا خط جس کے اوپر مہر شاہی ثبت تھی، پیش کیا جسے پڑھ کر بابر نے سر اٹھایا

"سلطان علی خان نے ہمیں سمرقند پر لشکر کشی کی دعوت دی ہے" اس نے کچھ سوالیہ سے لہجے میں کہا۔

"سمرقند والوں سے ہمارے پر امن تعلقات قائم ہیں لیکن سلطان علی خان سے تو ہم نے جنگ میں ساتھ دینے کا معاہدہ کر رکھا ہے حکمران عالی۔ میرے خیال میں لشکر کشی کو ٹالا نہیں جا سکتا"

"جنگ چھیڑنے میں عجلت نہ کیجئے، وزیر اعظم۔ ہمیں اس معاملے میں پہلے تو والدہ صاحبہ کی دعائے خیر حاصل کرنی ہوگی۔"

بابر کا ہر اہم معاملے میں کسی فیصلے پر پہنچنے سے قبل والدہ سے مشورہ قاسم بیگ کو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ اس نے سوچا آخر اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ خواتین جنگ کو پسند نہیں کرتیں۔ مہمیں، حملے اور جنگیں تو بہادروں کی شہرت میں چار چاند لگاتی ہیں اور یہ خود اسے اور جنگجو بیگوں کو قابو میں رکھنے کا موثر ذریعہ ہیں۔ ان بیگوں کے پیٹ محض روٹی ہی سے نہ بھرے جا سکتے، کم از کم ان کی تلواروں کو بھی تو میان سے نکالے جانے کا موقع ملنا چاہیے جن میں عرصے تک رکھے رہنے سے زنگ لگ سکتا ہے۔

قاسم بیگ بابر کے پیچھے پیچھے قتلغ نگار خانم کے شامیانے میں داخل ہوا۔ وہ غیر مطمئن سا تھا لیکن اس نے یہ ظاہر کیا گویا کہ اس کی یہ کیفیت پورا تاغ کی کھڑی ڈھلان سے اترنے کا نتیجہ رہی ہو۔

ماں کے پاس خانزادہ بیگم بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ خدمت گاروں نے بابر کے لیے دسترخوان لگایا اور طلائی قاب میں

بج کباب لائے۔ سب لوگ خاموش تھے۔ کبابوں کے بعد آبجوش ہوا گیا۔ اب بھی شامیانے میں خاموشی ہی چھائی رہی۔ آخر کار قاسم بیگ نے اپنی لمبی داڑھی پر سے قہوے کے سفید قطرات کو پونچھ کر گفتگو چھیڑی۔

"ہمارے حکمران نے مرزا سلطان علی خان سے معاہدہ کر رکھا ہے۔ ہم نے وعدہ دیا ہے کہ موسم گرما میں اپنے لشکر سے ان کی مدد کریں گے۔ گرمیاں شروع ہونے ہی کو ہیں۔"

"اللہ تعالیٰ نے ہمیں امن چین سے زندگی گزارنے کی خوش بختی عطا کی ہے" قتلوغ نگار خانم نے کہا۔ "ہمیں اس نعمت کی قدر و قیمت کا احساس ہونا چاہیے محترم قاسم بیگ۔ سلطان علی خان اپنے برادر بایسنقر مرزا کی تخت نشینی پر معترض ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے حکمران کا تخت اندجان میں موجود ہے۔"

قاسم بیگ خاموش رہا۔ خان زادہ بیگم بول اٹھی۔

"میرے میر، سمرقند پر حملہ کرنے میں تو کثیر رقم صرف ہوگی۔ اس کے بجائے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اندجان میں نئے محل اور مدرسے تعمیر کرائے جائیں؟ اگر اندجان اپنی شان و شوکت اور خوبصورتی کے معاملے میں سمرقند سے ٹکر لینے لگے تو مرزا الغ بیگ ہی کی طرح آپ کو بھی شہرت حاصل ہو جائے گی۔ آپ کی ہمشیرہ عرصے سے یہی خواب دیکھتی رہی ہے، خدا اسے حقیقت بنا دینے میں مدد کرے۔"

بابر مذاق کرنے کے انداز میں مسکرا دیا

"اندجان کو سمرقند کا ثانی بنانے کے لیے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آغاز سمرقند کی شان و شوکت کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر کیا جائے؟ سمرقند سے واقفیت حاصل کر لینے کے بعد اندجان میں عمارت تعمیر کرائی جا سکتی ہیں۔" |

بابر کی اس بات نے قاسم بیگ کے حوصلے بڑھا دیے

"اس دانش مندی کا کہنا ہی کیا، عالی جاہ"

"تو کیا آپ نے اپنے بچپن میں سمرقند کو دیکھا نہیں تھا؟" قتلوغ نگار خانم نے بیٹے سے بحث چھیڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

"جی ہاں، دیکھا ضرور تھا لیکن پانچ سال کی عمر میں۔ اب تو کچھ بھی یاد نہیں رہا"

خان زادہ بیگم نے مذاق کے انداز میں یاد دلایا

"اور گزشتہ سال؟ آپ سمرقند کی مہم پر چلے گئے اور ہمیں مجبور کر دیا کہ سات مہینوں تک آپ کی یاد میں تڑپتے رہیں"

بابر بھویں سکوڑنے لگا

"یہ سچ ہے کہ گزشتہ سال ہم نے چڑھائی کی تھی۔ تین مہینوں تک سمرقند کے ارد گرد گھات لگائے رہے۔ سلطان احمد ایک زمانے میں اندجان میں داخل نہیں ہو سکے تھے اور میرے لیے بھی میرے مورث اعلیٰ کے شہر کے دروازے بند ہی رہے!"

بابر نے یہ الفاظ جھنجلاہٹ کے ساتھ کانپتی ہوئی آواز سے ادا کیے اور فوراً ہی سب پر واضح ہو گیا کہ وہ اب بھی ذہنی پختگی کی منزل سے کتنا دور ہے۔ فوجی مہموں میں اسے بڑی کشش محسوس ہوتی تھی اور تیمور اور الغ بیگ کا عظیم شہر سمرقند اسے بلا رہا تھا۔ سمرقند کے حکمران بدلتے رہے تھے سلطان احمد کے بعد اس کا بھائی سلطان محمود تخت نشین ہوا اور اب

عنان سلطنت سلطان محمود کے بیٹے مرزا بایسنقر کے ہاتھوں میں تھی۔ بایسنقر بھی آل تیمور میں تھا، وہ بھی جاہ طلب تھا، جنگجو اور نوجوان (بابر سے صرف پانچ سال بڑا) اس نے سمرقند کے تخت پر قبضہ کیا تھا، تخت وراثت میں ملا تھا یعنی یہ کہ وہ قانوناً تخت نشین ہوا تھا۔ اس کے باوجود اندجان کی بیگوں کو مرزا بایسنقر ایک آنکھ نہ بھاتے تھے، یہ لوگ اس میں ہزاروں کیڑے ڈالتے اور مسلسل بابر کے کان بھرتے رہتے تھے کہ سمرقند پر حکمرانی کے اہل ایک ہی آپ ہی ہیں۔ بایسنقر بابر کے دعووں سے باخبر تھا، اس سے خائف رہتا تھا اور بابر کو شہر میں داخل ہونے سے روکنے کے سلسلے میں تمام اقدامات کر چکا تھا۔ عیار بایسنقر نے بابر کو لشکر کے بغیر سمرقند آنے کی بھی دعوت دی لیکن بابر اس کی چال میں نہ آیا۔ اس واقعے کے بعد رقابت کی آگ اور بھی زیادہ بھڑک اٹھی تھی جسے دونوں طرف کے جنگجو بیگ بڑی ہوشیاری کے ساتھ ہوا دیتے رہے۔

قتلوغ نگار خانم چاہتی تھی کہ اس کا پندرہ سالہ بیٹا فربیبی کے لیے تباہ کن جنگ میں نہ پھنسے اور امن و سکون کے ساتھ اپنی سلطنت پر حکمرانی کرے۔

ماں نے بابر کے چہرے پر جو دن کا تھکن لگنے سے پیدا ہو گیا تھا بلائیں لینے کے سے انداز میں محبت بھری نظر ڈالی اور کہا۔

"ارے بابر جان! یقین مانیے یہ فانی دنیا اس لائق نہیں کہ آپ اس کا غم کریں ..." ماں نے بچپن کے نام سے مخاطب کر کے پل بھر کے لیے بابر کو بے فکری کے ان ایام میں پہنچا دیا جب وہ ان مہموں کے بارے میں سوچا کرتا تھا نہ تخت و تاج کے بارے میں۔ لیکن بابر تو جانے کب ہی سے وہ بابر جان نہیں رہ گیا تھا، اس کی ماں نے اپنی بات دوسرے انداز سے جاری رکھی "وقت آنے پر آپ کا سمرقند کو فتح کرنے کا خواب بھی پورا ہو جائے گا۔ ابھی تو سب لوگ امن و سکون سے زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کے پاس محترم قاسم بیگ جیسے دانش مند وزیر موجود ہیں۔ آپ کو ماہر و قابل میر عمارت کی خدمات حاصل ہیں جنھوں نے اوش میں یہ حجرہ تعمیر کیا ہے۔ آپ کی ماں آپ سے التجا کرتی ہے کہ سمرقند کا خیال کچھ دنوں کے لیے دل سے نکال دیجئے ... خانزادہ بیگم ٹھیک ہی کہتی ہیں، بہتر ہوگا کہ آپ وادی کی خوشحالی میں اضافہ کیجئے، اندجان، مرغیلان اور اوش میں عالیشان محلات اور مدرسے تعمیر کرا دیجئے۔"

قتلوغ نگار خانم نے اپنے خیالات کا اظہار اتنی سختی اور عزم کے ساتھ عرصے سے نہیں کیا تھا۔ قاسم بیگ نے سر جھکا لیا۔ بابر نے اپنی نظریں میز پر جما دیں جو پیالے کے کناروں کے عکس سے سنہرا ہو گیا تھا۔ یہ سب درست ہے لیکن بیگ کیا کہیں گے؟" قاسم بیگ نے سوچا۔ "اور سمرقند کا کیا ہوگا؟ اور بیگوں سے کیا کہوں گا؟" بابر کے دل میں خیال آیا۔ شامیانے میں چھائی ہوئی خاموشی کو خانزادہ بیگم کی واضح اور کھنکتی ہوئی آواز نے توڑا

"میرے امیر، آپ کو لطف نوائی کا کلام زبانی یاد ہے۔ ذرا خیال تو کیجئے کہ فرہاد نے کتنی شاندار عمارتیں تعمیر کی تھیں۔ آپ کی ہمشیرہ ہمیشہ آپ کو عمارت تعمیر کرانے والے کی حیثیت سے دیکھنا چاہتی ہے جیسے کہ فرہاد تھا۔ دنیا میں اس سے بڑھ کر پاک اور نیک کام اور کوئی بھی نہیں!"

بابر کو مسرت کے وہ لمحات یاد آگئے جو اس نے حجرے کے اندر گزارے تھے۔ سمرقند پر یلغار تو کبھی بھی کی جا سکتی ہے... لیکن فرہاد کی شہرت، عظیم شہرت ہے اور پھر والدہ محترمہ کی باتوں میں بھی کافی سچائی پائی جاتی ہے... سوال صرف یہ ہے کہ بیگوں سے کیسے نپٹا جائے؟" یہ سوچتے ہوئے بابر نے قاسم بیگ کی طرف دیکھا

"تو کیا ہم یہ کر سکتے ہیں؟"

قاسم بیگ سمجھ گیا کہ اب گفتگو کا مقصد سمرقند پر یلغار کو ملتوی کرنا ہے۔ بہادر سپہ سالار کی حیثیت سے وہ دل ہی دل میں طیش میں آ رہا تھا ورنہ کل حکومت کی حیثیت سے جانتا تھا کہ بابر وہ کرنا چاہتا ہے جو ناممکن ہے۔ سمرقند پر حملے کی حمایت سب سے زیادہ ممتاز اور طاقتور بیگ کر رہے تھے اور اس سلسلے میں کافی دنوں سے تیاریاں بھی کی جا رہی تھیں۔ رکاوٹ کو پھلانگنے کے لیے سارے پٹھوں کو تانے، تیار گھوڑے کو روکا نہیں جا سکتا اور اگر طاقت لگا کر کسی طرح روک بھی لیا جائے تو وہ یا تو خود ہی ریڑھ کی ہڈی توڑ لے گا یا پھر سوار کو پٹخنی دے دے گا۔ قاسم بیگ اس بات کو براہ راست صاف صاف کہنے کی جرأت نہ کر سکا۔ اس نے اپنے ہاتھ سینے پر رکھ کر سر جھکا لیا۔

"میرے حکمراں، آپ کا یہ خادم اس صورت حال سے نکلنے کا راستہ نہیں تلاش کر پا رہا ہے۔"

"یعنی ہم ملکہ عالیہ کی خواہش کا احترام نہ کریں؟"

"آخر یہ مجھ سے چاہتے کیا ہیں؟" وزیر دل ہی دل میں بھنا گیا۔ "آج اپنی والدہ اور ہمشیرہ کو خوش کرنے کو تیار ہیں جبکہ کل ہی بڑے جوش و خروش کے ساتھ کہہ رہے تھے کہ حملوں، جنگوں اور فوجی کارناموں کے لیے بے حد تڑپ رہے ہیں۔ کم سنی کی بنا پر ابھی متلون مزاج ہیں۔" اس کے باوجود قاسم بیگ قتلوغ نگار خانم کی مخالفت بھی نہیں کر سکتا تھا، وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا کہ کم سن بیٹا ماں کے کتنا زیادہ کہنے میں ہے۔

"ملکہ عالیہ کی خواہش میرے لیے فرمان کا درجہ رکھتی ہے" قاسم بیگ نے کہا: "آپ کا خادم بس اتنا ہی عرض کرنا چاہتا ہے کہ ہمیں سارے بااثر بیگوں کی منظوری حاصل کر لینی چاہیے"

قاسم بیگ پر مخصوص شاہی الطاف و عنایات کے اظہار کے طور پر اس کے نام کے ساتھ اس کا خطاب "امیر الامرا" بھی جوڑا جاتا تھا۔ قتلوغ نگار خانم اس بات کو نہ بھولی

"جناب امیر الامرا" وہ اس کی طرف دیکھ کر التفات سے مسکرائی، "دوسرے بیگوں کی منظوری حاصل کرنے میں آپ مرزا بابر کی مدد کریں گے، ٹھیک ہے نا؟"

"بسر و چشم، ملکہ عالیہ، لیکن میں... بیگوں کی مرضی سے کچھ کچھ واقف ہوں۔ میرے الفاظ کو گستاخی پر نہ محمول کیا جائے تو عرض کروں کہ ان کا کہنا کس حد تک درست ہے..."

"فرمائیے!"

قاسم بیگ نے پل بھر کے لیے آنکھیں بند کر کے گردن کچھ اس انداز سے تانی کہ اس کی سفیدی سے یکسر خالی سیاہ ڈاڑھی کی نوک اونٹ کی کھال کی قیمتی چکمن کے گریبان میں گھس گئی۔ پھر اس نے سیدھے ہوتے ہوتے سر اٹھایا اور بابر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ دنیا کو ہلا دینے والے عظیم امیر تیمور اور مشہور عالم مرزا الغ بیگ سمرقند میں عالیشان عمارتیں اس لیے تعمیر کرا سکے کہ وہ وسیع و عریض سلطنت کی دولت اور طاقت کے مالک تھے جبکہ آج اس وسیع و عریض سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے ہیں۔ خوبصورت فرغانہ خاصے بڑے علاقے پر مشتمل ہے پھر بھی یہ کسی زمانے کے متحد اور طاقتور ماوراءالنہر کا ایک ٹکڑا ہی ہے۔

خان زادہ بیگم نے فوراً ہی اس کے اشارے کو بھانپ لیا اور پوچھا:

"تو جناب امیر الامرا، کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وسیع پیمانے پر عمارتوں کی تعمیر کے لیے ہمارے وسائل ناکافی

ہیں؟"

"عالی نسب شہزادی، ابھی آپ نے فرمایا تھا کہ اندجان کو عظیم سمرقند سے بہتر بنا دیا جانا چاہیے۔ بیگ سمجھتے ہیں کہ ایسا کارنامہ انجام دینے کے لیے سابق سلطنت کا بحال کیا جانا ضروری ہے۔ اس کے تمام حصوں کی جو آج تقسیم ہیں، طاقت کو یکجا کر کے حملے کر سکنے والی طاقت میں بدلنے کی ضرورت ہے، دوسرے لفظوں میں کیا یہ ممکن ہے کہ ایک ہی پرچم تلے سب کو متحد کیا جا سکتا ہے؟ موجودہ حالات آپ کے شاندار تعمیری منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کی راہ میں حائل ہے۔"

قاسم بیگ کی دلیلوں سے بابر پوری طرح قائل ہو گیا، اس نے بڑے جوش کے ساتھ یہ دیکھنے کے لیے ماں پر نظر ڈالی کہ وہ وزیر کی بات کی کاٹ کیسے کرتی ہے۔

"قاسم بیگ صاحب، عالیشان عمارتیں صرف امیر تیمور اور مرزا الغ بیگ ہی نے نہیں تعمیر کرائیں۔ ہرات میں میر علی شیر نوائی نے تین مشہور عمارتیں تعمیر کروائی ہیں۔ اخلاصیہ، خلاصیہ اور انسیہ۔ مرزا بابر کی طاقت میر علی شیر سے جو محض ایک تاجدار کے مشیر ہیں، ذرا بھی کم نہیں۔"

"درست ہے، والدہ صاحبہ، بالکل درست" قتلغ نگار خانم کے حافظے سے بابر کے دل کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی آرزوئیں بیدار ہو گئیں۔ شباب کا آتشیں جذبہ۔ نام شہرت و ناموری پر پہنچنے کا جذبہ۔ کبھی اسے عظیم فوجی فتوحات کے تو کبھی خود اپنے تخلیق کردہ بلند پایہ اشعار اور داستانوں کے خواب دیکھنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ اس وقت اس نے سوچا لیکن کیا وہ اپنی فتوحات سے نوائی جیسے عظیم افراد کی نظروں میں قابل احترام بھی ہو سکتا ہے؟ اور پھر سپہ سالار کی شہرت بھی تو کتنی پر تغیر اور متلون ہوتی ہے؟ وہ سمرقند کے باہری علاقوں ہی میں سات مہینوں تک طرح طرح کی تکالیف برداشت کر کے بھی ابھی واپس ہوتا ہے۔ زبردست معرکوں میں فتوحات سے متعلق خواب ادھورا ہی رہ گیا۔ تو پھر کیا عظیم شاعر بننا چاہیے؟ لیکن عظیم شاعری کی مثال بھی تو بلندیوں پر محو پرواز طائر کی سی ہے اور وہ محسوس کر رہا ہے کہ اس کے اندر اس طائر کو اسیر کرنے کی قوت کم ہے۔ فی الحال تو کم ہی ہے۔ والدہ صاحبہ البتہ ایک اور راستہ سجھا رہی ہیں جو نسبتاً آسان ہے۔ اگر نوائی کی بنوائی ہوئی عمارتوں اخلاصیہ، خلاصیہ اور انسیہ کی شہرت پھیلتے پھیلتے وادی فرغانہ تک پہنچ سکتی ہے تو آخر خود اس کی یہاں بنوائی ہوئی عمارتوں کی شہرت ہرات تک کیوں نہ پہنچ سکے گی؟ ضرور پہنچے گی۔ اس کی خبر نوائی کو بھی ہو گی۔ وہ یقیناً دریافت کریں گے کہ بابر کون ہے، اس سے تو جلد از جلد متعارف ہونا چاہیے۔ اس کے بعد بہت ممکن ہے کہ وہ خود ہرات جائے یا پھر خود نوائی ہی یہاں تشریف لے آئیں۔ یہ افواہیں خود اس کے کانوں میں بھی پڑ چکی ہیں کہ علی شیر نوائی کو ہرات کے موجودہ حکمران حسین بیقرا کا دربار پسند نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے کہ عظیم شاعر نوائی اس کے استاد بھی بن جائیں'

اور تب بابر کی آنکھیں سرخ ہو گئیں، آواز میں حکمرانہ سختی پیدا ہو گئی

"والدہ محترمہ نے درست فرمایا ہے! بیگوں کو قائل کیا جانا چاہیے، جناب وزیر!"

یہ تو فرمان تھا۔ قتلغ نگار خانم اور خان زادہ بیگم کے چہرے اس خیال سے کھل اٹھے کہ قاسم بیگ ہار گیا ہے، اب ہتھیار ڈال دے گا۔

لیکن قاسم بیگ اپنی بات پر سختی سے ڈٹا رہا، سارے ممتاز بیگ اس کی پشت پناہ جو تھے۔

"عالی جاہ! آپ کے حکم کی تعمیل سے قبل آپ کا خادم بیگوں کی ایک اور خواہش کے اظہار کی اجازت چاہتا ہے"

بابر نے بادل ناخواستہ اثبات میں سر ہلا دیا۔ قاسم بیگ نے اپنی گھنی سیاہ مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر بڑی بے باکی کے ساتھ خان زادہ بیگم کی طرف دیکھا (ایسی گستاخانہ جسارت وہ شاذ و نادر ہی کرتا تھا)۔

"شہزادی صاحبہ آپ نے بڑی خوبصورتی سے ہمارے میرزا کو فرہاد سے تشبیہ دی ہے۔ جنگجوؤں کو آج کے فرہاد کی خدمت بجا لانے پر فخر ہے وہ ہم" وزیر مسکرایا "فرہاد کو شیریں سے ملنے کے خواب دیکھتے رہتے ہیں" اچانک اس نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اضافہ کیا "اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، ہماری شیریں سمرقند میں ہیں، بیچاری بندی کی طرح تڑپ رہی ہیں"

بابر کے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی۔

قاسم بیگ نے بڑا نازک مسئلہ چھیڑ دیا تھا۔

میرزا بابر کی منگنی پانچ سال کی عمر ہی میں عائشہ بیگم سے کر دی گئی تھی جو شاہ سمرقند سلطان احمد کی، اسی سلطان احمد کی بیٹی تھی جس کے لشکر کو قوا سوئے کے پل کو پار کرتے وقت زبردست نقصانات اٹھانے پڑے تھے۔ اب عائشہ چودہ سال کی ہو چکی تھی۔ منگنی کے بعد کے ان تمام برسوں میں بابر نے تو عائشہ کو ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا لیکن جو لوگ دیکھ چکے تھے ان سب کی متفقہ رائے تھی کہ وہ گل نو شگفتہ سے بھی حسین تر ہے۔ یہ کم سن حسینہ جس کا تذکرہ اب بابر کے خیر خواہ اس سے کرتے رہتے تھے، بابر کا اپنے نجات دہندہ کی حیثیت سے انتظار کر رہی تھی۔ جوشیلا بابر اپنی شیریں کو جو کمینے باپ سے سفاک کے ہاتھوں سخت مصائب کا شکار تھی، آزاد کرا کر سب کو دکھا دینا چاہتا تھا کہ وہ کتنا جری ہے۔ عائشہ بیگم چھوٹی لڑکی کی حیثیت سے کس شکل و صورت کی تھی یہ تو بابر کو یقیناً یاد نہ تھا لیکن عرصے سے، پانچ سال کی اس عمر ہی سے اسے ایک دوسری خوبصورت دوشیزہ، سلطان احمد کی نئی نویلی دلہن ضرور یاد تھی اور جانے کیوں وہ سوچتا رہتا تھا کہ اب عائشہ بھی اسی دوشیزہ جیسی خوبصورت ہوگی۔

رواج کے بموجب دلہن کی نقاب کسی معصوم کم سن لڑکے ہی کو اٹھانی تھی۔ ان دنوں قتلوغ نگار خانم مہمان کی حیثیت سے سمرقند گئی ہوئی تھی۔ اسے سلطان احمد کی نئی شادی میں مدعو کیا گیا تھا اور پانچ سالہ بابر اس کے ساتھ تھا۔ خود سلطان احمد کے بیٹوں کا انتقال ہو چکا تھا اس لیے اس حقیقت کے باوجود کہ شاہی خاندان کے افراد قتلوغ نگار خانم سے جلتے اور بابر کو بھی ترچھی نگاہوں سے دیکھتے تھے، دلہن کے چہرے سے نقاب "عروس کو خدا شیر سا بیٹا عطا کرے!" کی گونج کے درمیان بابر ہی کو اٹھانی پڑی تھی۔ اس واقعے کی بہت سی یادیں بابر کے ذہن سے مٹ چکی تھیں پر جو ناقابل فہم جذباتی کیفیت طاری ہوگئی تھی وہ اب تک یاد تھی۔ اب وہ سمجھنے لگا تھا کہ وہ کیفیت دراصل حسن سے محظوظ و مسرور ہونے کی کیفیت تھی۔ اس واقعے کے بعد سے اب تک اسے خوبصورت اشعار کے مطالعے کے دوران، لطیف نغمات کی سماعت کے دوران، مناظر قدرت کے حسن سے لطف اندوز ہونے کے دوران جانے کتنی ہی بار اس کیفیت کا تجربہ ہو چکا تھا۔ مہ جبینوں کے پیکر بابر کے تخیل کو سوتے جاگتے مضطرب رکھتے تھے۔ پانچ سالہ لڑکا نسوانی حسن کی مخصوص کشش کو نہیں سمجھ سکا تھا پھر بھی اس حسن کے نظارے سے اپنی بے تابی اسے یاد تھی۔ اب جب بھی نوجوان بابر کے سامنے اس کی سمرقند کی منگیتر کی خوبصورتی کو سراہا جاتا تھا تو عائشہ اس کی تخیل میں نمودار ہو جاتی تھی سلطان احمد کی دلہن اور کتابوں کی حسین و جمیل ہیروئنیں بھی یاد آ جاتی تھیں۔ بابر عائشہ کو دیکھے بغیر ہی اپنے نوجوان تخیل کے ساتھ لطیف و پاک جذبات کے ساتھ محبت کرنے لگا تھا۔

اس صورت میں اسے جبکہ خوبصورت عائشہ بابر کے دشمنوں کی قید میں گھٹ رہی تھی تو کیا وہ اندجان میں خاموش بیٹھا رہ سکتا تھا؟

قاسم بیگ صاحب" قتلوغ نگار خانم نے کہا، "مرزا بابر کی منگیتر کے حالات کی طرف سے ہم بھی فکر مند ہیں۔ ہم نے عائشہ بیگم کو ان کی بڑی ہمشیرہ رضیہ کے پاس تاشقند بھیج دیے جانے کے سلسلے میں ان کی والدہ صاحبہ کو لکھا تھا۔ شاید ہماری یہ التجا پوری کر دی گئی ہو گی"

قاسم بیگ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"صد افسوس، محترمہ بیگم صاحبہ، ایسا نہیں کیا گیا" اس نے کہا۔ "آپ کے اس خادم کو حال ہی میں سمرقند سے اپنے ایک وفادار شخص کا خط موصول ہوا ہے۔ سے فوراً ہی حکمران کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے مجھے کچھ شرم سی محسوس ہوئی "

"کیسا خط؟ کیا ہوا؟" بابر کی ماں پریشان ہو اٹھی۔

"عائشہ بیگم نے اپنی والدہ صاحبہ و ہمشیرہ کے ساتھ تاشقند جانے کی تیاریاں کر لی تھیں، روانہ ہونے ہی کو تھیں کہ مرزا بائے سنقور نے انہیں روک دیا، یہی نہیں ان کے گھر کے سامنے پہرہ بھی بٹھا دیا۔ کہتے ہیں کہ کسی کو بھی گھر سے باہر قدم نکالنے کی جارت نہیں۔ یہ تو صحیح معنوں میں اسیری ہی ہوئی۔ اب قیدیوں کو اپنی نجات کے لیے جو بھی توقع ہے صرف اندجان ہی سے ہے!"

یہ سنتے ہی بابر کا رنگ بگڑ ہو گیا۔ یتیم لڑکی کے ساتھ ایسی کمینگی کا طرز عمل اپنانے والے بائے سنقور کو سزا ملنی ہی چاہیے تھی۔ لشکر کے ساتھ سمرقند کے لیے کوچ کرنے کی خواہش دوسری تمام خواہشات پر غالب آ گئی۔

خان زادہ بیگم نے تاڑ لیا کہ بھائی کے دل کی کیفیت بدل گئی ہے۔

"میرے امیر، ان خواتین کو جلد از جلد آزاد کرانے میں خدا آپ کا حامی و ناصر ہو!" اس نے کہا۔ "لیکن یہ رہائی کیا محض جنگ جھگڑے کے ذریعے ہی حاصل کی جا سکتی ہے؟ کیا لشکر کشی کے نتیجے میں دشمنی کچھ اور نہ بڑھ جائے گی؟ مرزا بائے سنقور کو آپ کی لشکر کشی کا علم ہوگا تو وہ عائشہ بیگم سے اور بھی زیادہ متنفر ہو جائیں گے۔ میرے خیال میں تو ان لوگوں کی رہائی کے لیے کوئی امن کا رستہ تلاش کیا جانا چاہیے۔ .. "

بابر ان الفاظ سے جھنجھلا اٹھا۔

"امن کا رستہ تلاش کروں؟ بے عزتی کرنے والے کے ساتھ امن؟"

قتلوغ نگار خانم نے بابر سے کہا

"مرزا بائے سنقور کے پاس سفیر امن بھیجئے، میرے فرزند۔ آپ کے تنازعے کو سلجھایا جا سکتا ہے"

جنگ جاری ہو تو امن کی بات کیسے کی جا سکتی ہے؟ بابر نے سوچا کہ امن کی بات میں پہل تو وہی فریق کرتا ہے جو خود کو کمزور محسوس کر رہا ہو۔ وہ بائے سنقور سے کمزور تھوڑی ہے۔

"بائے سنقور ظلم ڈھا رہے ہیں" میں اس صورت حال سے مرعوب ہو جاؤں اور صلح کی درخواست پیش کرنے کے لیے قاصد روانہ کروں؟ عائشہ سے شادی کرنے کی خاطر گھٹنے ٹیک دوں؟ جی نہیں، اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جاتا ہے!"

"ملکۂ عالیہ، آج کے زمانے میں خاموش رہ کر مظالم کا سدباب نہیں کیا جا سکتا!" قاسم بیگ نے بابر کی طرف

دیکھی۔ "طاقتوروں کے درمیان ہمیں سب سے زیادہ طاقتور بننا ہوگا۔ اور پھر یہاں ہر ریاست کی ایک ایک چیز سب سے بڑھ [illegible]
سمرقند ہے۔ سمرقند پر تو سبھی قبضہ کرنے کے خواہاں ہیں۔ اگر ہم نے [illegible] تو [illegible] شیبانی خان
نے سمرقند پر دانت لگا رکھے ہیں۔ حصار کے لشکر نے [illegible] سمرقند پر حملے [illegible]
[illegible] حکمران ہیں۔ ماوراء النہر کے دارالحکومت میں ٹک نہ پائیں [illegible] سمرقند پر قبضہ [illegible]
کے اجداد کا پایۂ تخت دوسرے خاندانوں کے ہاتھوں میں چلا جائے گا اور شیبانی خان [illegible] سمرقند پر قبضہ [illegible] تو
ان کی طاقت اتنی بڑھ جائے گی کہ [illegible] اندجان کے لیے بھی اور ہمارے لیے بھی مشکلات میں [illegible]
ہمیں یہ جو موقع ملا ہے اسے ہرگز ہرگز ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیے۔"

"میر تیمور کے خاندان کے سب حکمران کہیں اکٹھا ہو کر کوئی فوجی معاہدہ کیوں نہ کر لیں [illegible]
مایوسی کے ساتھ اس جواب کے انتظار میں پوچھا جو اسے پہلے ہی سے معلوم تھا۔

"کس کی قیادت میں؟ کس کے پرچم تلے؟ وہ کون سی طاقت ہے جو انہیں متحد کر سکتی ہے؟ بارے ستو رتہ طاقتور ہیں نہ عقل مند۔ ماوراء النہر کو تو ہمارے حکمران مرزا بابر ہی بچا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اپنی زندگیاں اس مقصد کی تکمیل کے لیے، اپنے حکمران کی خدمت کے لیے وقف کر رکھی ہیں۔ اس سال ہم سمرقند پر قابض ہو جائیں تو انشاء اللہ تعالیٰ تمام خطرات کافور ہو جائیں گے اور صحیح معنوں میں امن و سکون کا دور دورہ ہوگا۔ تب ہم جیسے بھی محل چاہیں گے تعمیر کرا سکیں گے۔"

خان زادہ بیگم نے صدر سے آگے بڑھتے ہوئے وزیر سے بآواز بلند پوچھا:

"تو اس کا مطلب مختصراً یہ ہے کہ آپ بیگوں کو قائل کرنے سے متعلق ہماری والدہ صاحبہ کی خواہش کی تکمیل کے لیے تیار نہیں ہیں؟"

"اپنے اس ناچیز خادم کو صاف گوئی کے لیے معاف کر دیجئے شہزادی۔ میں نے تو اپنے حکمران کی اجازت سے بس اپنے دل کی بات بیان کر دی ہے۔"

اس طرح بحث کے دو پاٹوں کے درمیان پھنس کر رہ گیا: "صلح کرو اور عمارتیں تعمیر کرو" اس کی ماں کہہ رہی تھی جس کا مطلب یہ تھا "ہرن کی طرح بے فکری کی زندگی گزارو۔" لیکن قاسم بیگ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا کہ امن آج کل سکون سے بیٹھنے کے لیے نہیں ہوتا۔ خونخوار بھیڑیوں کے درمیان ہرن زیادہ دنوں تک زندہ نہیں بچ سکتا۔ بھیڑیوں کے غول میں تو شیر بن کر رہنا چاہیے۔

آخر قاسم بیگ نے اس طویل اور ہلکان کر دینے والی بحث کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا:

"عالی جاہ، آپ نے فرمایا تھا کہ آج سیر کرنے کے لیے نکلیں گے۔ گھوڑے کب سے تیار کھڑے ہیں۔ اور آج شام کو ملکہ صاحبہ کی تجویز کے متعلق سارے بیگوں سے مشورہ کیوں نہ کر لیا جائے؟ بیگوں کی مجلس مشاورت کریں گے۔۔۔"

خان زادہ بیگم نے جلدی سے ماں پر ایک نظر ڈالی۔ ایک وزیر ہی کو قائل نہ کر سکے تو سارے بیگوں کو کیسے قائل کیا جا سکے گا؟ قتلغ نگار خانم سوچنے لگی کہ اس وقت بحث کا سلسلہ کس طرح جاری رکھا جائے لیکن بابر نوجوانوں کی سی پھرتی سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا

"مجلس مشاورت کل طلب کیجیے گا، ہر بات کو اچھی طرح سوچ سمجھ لینا چاہیے۔ اور اس وقت۔ چلیے، آیے چلیں۔۔"

۴

اوش کے جنوب میں پھیلا ہوا ٹیلوں دار وسیع و عریض میدان شوخ جنگلی پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ گرد و نواح کے گہرے زرد، ہری پودوں کے پیلگوں دھبے، اور پوست کے سرخ پھول چاروں طرف بہار دکھا رہے تھے۔ بابر جس کا گھوڑا ہم پرسکون رفتار سے چل رہا تھا، دوری پر واقع برف پوش کوہستانی چوٹیوں پر سے نگاہیں نہیں ہٹا پا رہا تھا اور ساتھ یہ محسوس کرتا جا رہا تھا کہ اونچی اونچی گھاس کے اوپر گھوڑے کے قدم کتنی نرمی سے پڑ رہے ہیں۔ حسن بہاراں آنکھوں اور دل کو پیار سے سہلاتا معلوم ہو رہا تھا لیکن دل کو دولت سکون میسر نہ تھی، دن تو بس اور دیر والی اس تلخ بحث کو اپنے اندر ہی اندر اپنے آپ ہی سے جاری رکھے ہوئے تھا۔ گتھی خود بخود نہیں سلجھ سکتی تھی اور ایسا دانش مند کہاں مل سکتا تھا جو گتھی کو اس انداز سے سمجھ سکتا جس سے بابر چاہتا تھا؟ پھر بھی کتنی خواہش تھی اس کی کہ یہ گتھی سلجھ جائے! تو کیا پیر سے مشورے کی ضرورت تھی؟ صاحب فراش خواجہ عبداللہ اوش نہیں آ سکا تھا لیکن بابر کو معلوم تھا کہ وہ سمرقند پر یورش کی حامی ہے۔ اپنے استاد کے منہ سے وہ یہ الفاظ کتنی ہی بار سن چکا تھا کہ جب تک دو اشہر کا اتحاد بحال نہ کر دیا جائے گا اس وقت تک بابر کا ہر عظیم خواب محض خواب ہی رہے گا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک بار پھر جنگ چھیڑی جائے، عمارتوں کی تعمیر کا کام ملتوی کر دیا جائے۔۔ غیر معین مدت کے لیے۔۔

گھڑ سوار ڈھلان کے اوپر چڑھ گئے۔ وہاں سے چاروں طرف کے سارے علاقے صاف صاف نظر آ رہے تھے۔ قاسم بیگ بلند ٹیلوں کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے کہہ اٹھا

"کتنے زیادہ گلے ہیں!"

وہاں سے مغرب کی سمت واقعی دسیوں ٹیلوں سے نیچے اترتے ہوئے گلے نظر آ رہے تھے۔

چھپیس سالہ بیگ خواجہ کلاں نے پیشانی پر ہتھیلی کا چھجا بنا کر دوریوں پر نظر دوڑائی

"آہاہا!" وہ کہہ اٹھا۔ "وہاں تو اور بھی زیادہ گھوڑے نظر آ رہے ہیں!"

"گھوڑوں کے گلے مشرق میں بھی ہیں، دیکھیے، وہ ادھر تو دیکھیے!"

بھیڑوں اور گھوڑوں کے گلے تیز رفتار سے آگے بڑھ رہے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بھاگ نہیں رہے تھے بلکہ انھیں ہانکا جا رہا تھا۔ ادھر ڈھلان پر دو گلے دکھائی دیے۔ اس کے بعد دو اور۔ دوری پر واقع ٹیلوں پر سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑوں کے چار گلے یکے بعد دیگرے نمودار ہوئے اور سیل تند و تیز کی مانند ڈھلان سے اترتے ہوئے اس طرف آنے لگے جہاں بابر اور اس کے ہم رکاب کھڑے ہوئے تھے۔

بائیں جانب گھوڑوں کے مزید گلے دکھائی دیے۔

یہ مویشیوں کے غول گھوڑے اور بھیڑیں اوش کی جانب جا رہے تھے۔ ذرا ہی دیر بعد بلند ٹیلوں کے پس منظر میں کچھ گھڑ سوار دستے نظر آنے لگے۔

تو یہ قصہ ہے! یہ تو محمد تنبل واپس لوٹ رہا ہے جو تین سو سپاہیوں کو اپنی کمان میں لے کر دھاوا بولنے گیا ہوا تھا۔ قاسم

بیگ خوشی سے کہہ اٹھا

"واہ، کیسا مال غنیمت ہاتھ لگا!"

خواجہ کلاں بھی جوش میں آگیا

"کتنا غیر معمولی، کیسا بہادرانہ کارنامہ ہے!"

سب کے سب مسرور ہو گئے اور کیوں نہ ہوتے! ان گھوڑوں اور بھیڑوں کا پانچواں حصہ حکمراں کو اور باقی بیگوں اور درباری عہدیداروں کو ملنا تھا۔ خدا نے چھپر پھاڑ کر دیا تھا۔ بیگوں سے اپنی خوشی چھپائی نہیں جا رہی تھی۔

بابر نے اپنے گھوڑے کا رخ آتے ہوئے گھڑ سواروں کی طرف موڑ دیا۔ لگام ڈھیلی ہوتے ہی اس کا گھوڑا ہوا ہو گیا۔ بیگ بھی اس کے پیچھے پیچھے اپنے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے ایک ٹیلے کے بعد دوسرے کو پار کرنے لگے۔ آخرکار بابر نے ایک ٹیلے پر اپنے گھوڑے کو روک لیا۔

زرہ پوش احمد تنبل دستے کے آگے آگے تھا۔ سپر جس سے اس کے سینے اور بائیں شانے کو ڈھک رکھا تھا، آفتاب کی شعاعوں سے چمک رہی تھی۔ احمد تنبل کی گردن میں تیر لگا تھا جس کے زخم پر سبز پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور رخساروں کی ہڈیاں کچھ اور زیادہ ابھری ہوئی سی لگ رہی تھیں۔ بابر سے پچیس قدموں کے فاصلے پر وہ گھوڑے سے اتر کر اس کے نزدیک آیا، گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اپنے سامنے کی زمین کا بوسہ دیا۔

"عالی جاہ، ہم نے اپنے چگرک* دشمنوں کو محصول نہ ادا کرنے کے سلسلے میں کافی اچھا سبق سکھا دیا۔ ان سے سولہ ہزار بھیڑیں اور ڈھائی ہزار گھوڑے چھین لیے"

"عالی جاہ، وہ کمبخت چرواہے شاہی فرماں کو ماننا ہی نہیں چاہتے تھے، بغاوت پر اتر آئے اور ہمارے تین سپاہیوں کو ہلاک اور دس کو زخمی کر دیا..... لیکن ہم نے دشمنوں سے اس کا سو گنا بدلہ لے لیا!"

پھر احمد تنبل نے دستے کی اگلی صف کے ایک لمبے تڑنگے سپاہی کو اشارہ کیا۔ وہ کاٹھی پر دھرے ہوئے بورے کو اٹھا کر نیچے کودا اور بابر کے نزدیک آگیا۔ موٹے کپڑے کے اس بورے کو جو خون سے تر تھا، اس نے الٹ کر کٹے ہوئے انسانی سر زمین پر ڈھیر کر دیے۔ احمد تنبل نے گننا شروع کیا۔ پندرہ سر تھے۔ بابر جانے کیوں سوچنے لگا: "چگرک، یہ تو ہمارے ہی لوگ ہیں، ترک ہیں... اور ہم ان کو..." اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ خود کو قائل کرنا چاہتا تھا کہ اس کے حکم پر احمد تنبل نے جو سزا دی تھی وہ جائز تھی۔ وہ بھی ترک ہیں، ایک ہی خاندان کے افراد ہیں پھر بھی انہیں محصول تو ادا ہی کرنا چاہیے تھا۔ ان چگرکوں نے حکم عدولی کی اور محصول پر تلوار اٹھائی اسی لیے انہیں تہ تیغ کر دیا گیا۔ وہ خود کو قائل کرنا چاہتا تھا پر کر نہ سکا۔ مقتولین میں سے ایک کے تو ابھی داڑھی بھی نہیں نکلی تھی، زرد چہرہ چکنا چکنا سا تھا، اور مسیں بھیگنی شروع ہی ہوئی تھیں۔ وہ چگرک لڑکا سترہ سے زیادہ کا نہیں تھا۔ بیچارے کا سر گردن کے اوپری حصے کے پاس ہی سے قلم کر دیا گیا تھا۔

بابر کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس نے مڑ کر قاسم بیگ کی طرف دیکھا اور منہ سے ایک لفظ بھی ادا نہ کر سکا۔

احمد تنبل اور اس کے سپاہی ستائش کے، انعام و اکرام کے متوقع تھے۔ سولہ ہزار بھیڑیں اور ڈھائی ہزار گھوڑے۔ یہ

---

* چگرک: ایک ترک قبیلہ

کوئی چھوٹی موٹی دست تھوڑی تھی اوستے کے تین سپاہی کام آ گئے تھے تو کوئی خاص بات نہ تھی۔ اس کے بدلے میں پندرہ سر بھی تو حاصل ہوئے تھے اور یہ سر ان سکھوں کے تھے جن کو سپاہیوں نے شجاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اس شجاعت کی حوصلہ افزائی بہر حال ضروری تھی۔

یہی خیال قاسم بیگ کا بھی تھا جو بابر کا چہرہ فق پڑ جانے سے فکر مند ہو رہا تھا۔ ہلاک کر دیے جانے والوں کے سر کاٹ لینے کا تو عام رواج ہی تھا۔ گزشتہ سال خود کمسن حکمران بابر بھی سمرقند کے باہری علاقوں میں کٹے ہوئے بہت سے سروں کو دیکھ چکا تھا۔ جب کوئی سپاہی یہ شیخی بگھارتا تھا کہ میں نے تو کشتوں کے پشتے لگا دیے اور ثبوت خاک بھی نہیں پیش کر پاتا تھا تو کسی کو بھی پوری طرح یقین نہیں آتا تھا۔ آخر ایسے لوگ بھی تو ہوتے ہی تھے جو کرتے تھوڑا اور بتاتے بہت تھے۔ کٹے ہوئے سر موجود ہوتے تھے تو سپاہی کا کارنامہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا تھا۔ اور اس طرح کٹے ہوئے سروں کو گنوانے کا رواج چل نکلا تھا۔

"حکمران!" قاسم بیگ نے دھیرے سے کہا، "میں کچھ عرض کروں؟"

بابر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ قاسم بیگ نے اس کے قریب پہنچ کر چپکے سے پوچھا

"انعام کے طور پر تلوار دے دی جائے۔ آپ کو منظور ہے؟"

بابر کے اسلحہ بردار کے پاس اس کی سونے کے دستے والی بغدادی تلوار بھی موجود تھی۔ بابر نے اسے دو ایک بار کمر سے لٹکایا تھا لیکن پھر کھول کے رکھ دی تھی کیونکہ کچھ زیادہ ہی وزنی معلوم ہوئی تھی۔ اس بار وہ اس تلوار کو بھی ساتھ لایا تھا جو اسلحہ بردار کی کمر سے لٹک رہی تھی۔ بابر نے اس تلوار کی طرف دیکھا تو قاسم بیگ نے اس کے ارادے کو بھانپ لیا۔

"محترم بیگ" وزیر نے احمد تنبل کو مخاطب کرتے ہوئے آواز بلند کہا، "دلیرانہ مہم سے سرخرو ہو کر آپ نے اپنی جاں نثاری و وفاداری کا ایک بار پھر ثبوت دیا ہے۔ عالی جاہ اور ان کے سب درباری دعا گو ہیں کہ آپ کی نیک نامی میں اضافہ ہو۔ اوش میں فاتحین کے اعزاز میں ایک شاندار ضیافت منعقد کی جائے گی اور بہادر سپاہیوں کو انعام و اکرام سے نوازا جائے گا۔ اس وقت ہمارے حکمران آپ کو اپنی طلائی دستے کی تلوار عطا کر رہے ہیں!"

قاسم بیگ نے اسلحہ بردار سے بغدادی تلوار لے کر احمد تنبل کی طرف بڑھائی۔ احمد تنبل نے جواب میں گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ہاتھ میں تلوار لے کر نیام سے چار انگل باہر نکالا، اس کا بوسہ لیا اور جذبات کی شدت سے مرتعش آواز میں کہا:

"عالی جاہ کی اس سخاوت کو میں مرتے دم تک یاد رکھوں گا۔ قسم کھاتا ہوں کہ تمام زندگی وفاداری کے ساتھ آپ کی خدمت کرتا رہوں گا!"

۵

اس روز شام کو اندھیرا ہوتے ہی شہر کے باہر نصب سینکڑوں خیموں اور شامیانوں کے سامنے قرناؤں اور نقاروں کی آوازیں گونجنے لگیں، مشعلیں روشن کی گئیں، الاؤ جلائے گئے اور شاندار ضیافت شروع ہو گئی۔ بیگ، عہدیداران سلطنت، لشکری اور شاہی خدمت گار، سارے کے سارے لوگ جنہیں چکرکوں کی بھیڑوں اور گھوڑوں سے کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچا تھا، خوشیاں منا رہے تھے۔ ضیافت کے سلسلے میں تمام معزز و ممتاز افراد بابر کے عالی شان شامیانے کے نیچے اکٹھے تھے جہاں سازندے اپنی لطیف موسیقی سے اور مغنی اپنے بہترین نغمات سے ان کی تفریح کا سامان فراہم کر رہے

تھے۔

بادشاہی شامیانے کے اندر ایک بلند چبوترے پر بیٹھا ہوا تھا جس پر پہنچنے کے لیے چار شہری سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس کے نیچے دائیں جانب احمد تنبل معزز ترین بیگوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ آج اس نے فوجی ہیلمٹ کے بجائے زری کا چوغہ پہن رکھا تھا۔ سر پر دوپلی دستار بندھی تھی، دودھیا رنگ کے پٹکے سے بابر کی عطا کی ہوئی طلائی دستے والی تلوار لٹک رہی تھی۔ اسے مہم کی کامیابی و شاہی انعام پر مبارکبادیں دی جا رہی تھیں۔ احمد تنبل کو سب سے زیادہ مسرت قتلق نگار خانم و خان زادہ بیگم کی مبارکبادوں سے حاصل ہوئی تھی جو اس کے شامیانے میں داخل ہوتے ہی مبارکباد دینے والے اولین افراد میں شامل تھیں۔ بابر کی ماں اور بہن احمد تنبل کی قطار ہی میں اس کی طرف کچھ مڑی ہوئی بیٹھی تھیں اور وہ وقتاً فوقتاً کن آنکھوں سے دیکھ لیتا تھا۔ خان زادہ بیگم کا چھریرا بدن اور اس کا قوس قزح کی طرح جھلملاتا ہوا دلکش ست رنگی ریشمی لباس بیگ کو بے خود کیے دے رہے تھے۔ اس کی سب سے شیریں آرزوؤں کو تقویت پہنچا رہے تھے۔

تو دوس حکمران کی ضیافتوں میں مے نوشی کا چلن نہ تھا اور خود بابر نے بھی اس وقت تک جام کو کبھی ہونٹوں سے نہیں لگایا تھا۔ قاسم بیگ کو شراب پسند نہ تھی اور اس نے ضیافتوں میں بادہ نوشی کی ممنوع قرار دیا تھا لیکن دوسرے بیگوں نے مرحوم مرزا عمر شیخ کے عہد کی رنگین محفلوں کی یاد میں ہوشیاری کے ساتھ بابر سے چھپ کر وزیر کے اس حکم کی خلاف ورزی کا فیصلہ کیا۔

علی دوست بیگ نے مڑ کر پیچھے کھڑے ہوئے شربت چی کو دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں احمد تنبل کی طرف اشارہ کیا۔ شربت چی اشارے کا مفہوم سمجھ کر مسکرایا اور اس نے چاندی کی دوسری صراحی سے پیالہ بھر دیا۔ احمد تنبل نے پیالہ ہاتھ میں لیا تو فوراً ہی اس کی ناک میں شراب کی بو سما گئی۔

”پیجئے تنبل بیگ، دلی آرزو ہے کہ سمرقند پر یلغار کے دوران آپ کو اور بھی زیادہ کامیابی نصیب ہو“ علی دوست بیگ نے دھیرے سے کہا

احمد تنبل نے اظہار تشکر کے طور پر سر جھکایا اور پیالہ خالی کر کے دسترخوان پر رکھتے ہوئے گوشت کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”اب تو ہمارے پاس گوشت کا اتنا زیادہ ذخیرہ جمع ہو گیا ہے کہ ہمارے سمرقند و بخارا پر قابض ہونے تک کے لیے کافی ہوگا“ مخمور علی دوست بیگ نے بلند آواز سے کہا تاکہ سب سن لیں۔ ”ہمیں جلد از جلد حملہ کرنا چاہیے“

بابر پر بخوبی واضح تھا کہ یہ دولت کی ہوس ہی ہے جو بیگوں کو سمرقند پر چڑھائی کے لیے اکسا رہی ہے۔ اس ہوس کو قابو میں رکھنا پہلے بھی دشوار ثابت ہوتا تھا لیکن اب تو یہ کوہستانی دریا کے تند و تیز دھارے جیسی ہو گئی تھی۔ اب تو اسے کوئی بھی طاقت روک نہیں سکتی تھی۔

۲

میر عمارت فضل الدین تبریزی دو والے بورسائے کے کنارے جس سرسبز و شاداب علاقے میں عارضی طور پر مقیم تھا وہ جنت جیسا خوبصورت تھا۔ گھر کے سامنے ایک چھوٹا سا احاطہ واقع تھا جس میں ناشپاتی اور بہی کے کچھ درخت لگے ہوئے تھے اور جہاں وہ اکثر کام کیا کرتا تھا۔ احاطے کے ایک گوشے میں سائبان تلے دو گھوڑے بندھے ہوئے تھے جن میں

"چہرے کو کیا ہوا؟"

"یہ نہ پوچھئے، ماموں جان"

"خیر ٹھیک ہے آؤ، اندر آؤ تم بعد میں سب بتا دینا..."

اس ملاقات کے اولین لمحات ہی میں فضل الدین کو ساری باتیں یاد آ گئیں۔

ہیں، طاہر نے تین سال قبل دنیا سے کوچ نہیں کیا تھا۔ سلطان احمد کے حصے کو تمام کام بنا دینے والا یہ دلیر نوجوان خدا کے فضل و کرم سے زندہ بچ گیا تھا اور وہ شیطان۔ سمرقند کے سابق حکمران اور بدنام شیطان کا باپ ہی۔ یہ سمجھ کر کہ اس نے اپنے نیزے سے طاہر کا کام تمام کر دیا ہے، گھر کے احاطے سے نکل گیا تھا "بیچاری میری ہمشیرہ" فضل الدین نے سوچا۔ "لہولہان طاہر کو اوندھے پڑے دیکھ کر یوں بے ہوش ہو گئی تھیں کہ پھر ہوش میں آنا نصیب نہ ہوا" وہ خود طبیبوں کو بلا لایا تھا جن کے علاج سے تین دن بعد طاہر کو ہوش آ گیا تھا۔ نیزے کے وار سے اس کا ایک پھیپھڑا تو ضرور زخمی ہو گیا تھا۔ لیکن دل اور جگر کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا طاہر اپنی نوجوانی اور طاقت کی بدولت دھیرے دھیرے صحت یاب ہو گیا تھا۔ رشتے داروں اور ہمسایوں کا کہنا تھا کہ موت جو طاہر کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آئی تھی، اس کے بجائے اس کی ماں کو اٹھا لے گئی۔ فضل الدین ہی نے فاتحہ چہلم کے بعد سے چھپایا تھا اور اس کے بعد سے اسے بھانجے کی کوئی خبر نہیں ملی تھی

"میرے محترم برادرِ نسبتی کا کیا حال ہے، تندرست ہیں نا؟" فضل الدین نے طاہر کو برآمدے میں چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"ابا جان نے آپ کو سلام کہا ہے۔ ویسے، ماموں جان، میں کوئی سال بھر سے تو انہیں نہیں دیکھ سکا ہوں۔ رشتے داروں نے ابا جان کی دیکھ بھال کے لیے کوئی بیوہ بڑھیا تلاش کر دی تھی لیکن مجھے... مجھے ہر وقت والدہ مرحومہ کی یاد ستاتی رہتی تھی اور وہاں رہنے کو جی نہیں چاہتا تھا"

لیکن جو یادیں اس کے گھر چھوڑنے کا باعث بنیں وہ یقیناً صرف ماں ہی سے متعلق نہ تھیں۔ بدنصیب رابعہ کا خیال بھی اس کے دل و دماغ پر چھایا رہتا تھا۔ اس نے مدد کے لیے جو چیخ بلند کی تھی وہ طاہر کے کانوں میں برابر گونجتی رہتی تھی۔ پچھلے سال تو وہ بالکل سمرقند تک پہنچ گیا تھا، راستے میں کبھی فصلیں کاٹنے والے مزدور کی حیثیت سے کام کیا تھا، کبھی کاروانوں کے ساتھ ادھر ادھر بھٹکتا رہا تھا، ہر جگہ رابعہ کی تلاش جاری رکھی تھی اور سب سے پوچھتا رہتا تھا "کہیں میری بہن کو تو نہیں دیکھا؟ جسے سلطان احمد کے سپاہی پکڑ کر لے گئے تھے۔" لیکن کہیں بھی کچھ اتا پتا نہیں مل سکا تھا۔

زمانہ بڑا پر آشوب تھا۔ سلطان احمد نے جس سال فرغانہ پر حملہ کیا تھا اسی سال وہ راہیِ ملکِ عدم ہو گیا تھا۔ اس کا لشکر ٹوٹ کے بکھر چکا تھا۔ تخت پر پہلے اس کے بھائی سلطان محمود نے قبضہ کیا پھر سلطان محمود کے بیٹے بایسنقر نے۔ بھائی بھائی کے خلاف ہتھیار اٹھا رہا تھا اور بیٹا باپ کے خلاف۔ کسی شخص نے طاہر کو بتایا کہ تاشقند میں بہت سی داشتائیں فروخت کی گئی ہیں تو اس نے تاشقند کا رخ کیا۔ گزشتہ سال وہ پیدل چلتا ہوا اس حال میں تاشقند پہنچ گیا تھا کہ پیٹ بھر کھانا میسر نہیں ہوتا تھا اور کپڑے بری طرح پھٹ چکے تھے۔ لیکن رابعہ وہاں بھی نہ ملی۔ زندگی گدلے دریا کی طرح بہتی ہوئی گزرتی جا رہی تھی۔ طاہر کو احساس تھا کہ اس کی تلاش لاحاصل ہے گدلے دریا سے موتی ڈھونڈ نکالنا کسی کے بس کی بات نہیں پھر بھی اس کے پاؤں رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

"ارے طاہر، تم تو پاگل ہو گئے ہو۔ سب لوگ تو جنگ سے دور بھاگتے ہیں اور تمھیں خود ہی موت کے منہ میں جانے کی پڑی ہے۔ کیا سمرقندی نیزے کے وار سے جی نہیں بھرا تھا کیا؟"

"ماموں جان، اس نیزے کے بعد سے تو جانے کتنی ہی بار موت کے منہ میں جا چکا ہوں۔ تاشقند میں ایک بیگ کسی غریب کی بیٹی کو زبردستی اٹھا لے جانا چاہتا تھا جیسے کہ راعنہ کے ساتھ ہوا تھا۔ میں برداشت نہ کر سکا، معاملے میں ٹانگ اڑا دی اور دیکھئے، میرے چہرے پر اس بیگ کے خنجر کے زخم کا نشان موجود ہے۔"

"تم ابھی تک یہ بھی نہیں سمجھ سکے کہ دنیا میں چلتی اس کی ہے جو طاقتور ہو؟"

"اسی لیے تو میں طاقتور فوج میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔ دراصل ظالم و جابر صرف طاقت ہی سے ڈرتے ہیں ماموں جان، میں نے لوگوں کے درد و غم کو بہت دیکھا ہے، عام آدمیوں کے درد و غم میں شریک رہا ہوں۔ مجھے بہت سے لوگوں نے بتایا ہے کہ مرزا بابر کا دل صاف اور ارادے نیک ہیں۔ انصاف پسند بادشاہ بھی ہمارا حامی و ناصر نہ ہوا تو بھلا اور کون ہوگا؟"

فضل الدین نے گہری ٹھنڈی سانس لی

"لیکن مرزا بابر تو ابھی کم سن ہیں۔ میں نے بھی ان سے بہت سی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں، فرغانہ کے حسن کو دوبالا کرنا چاہتا تھا۔ پر ایک بار پھر جنگ چھڑنے کو ہے، ایک بار پھر خون کے دریا بہیں گے.... ہم سب کی آنکھوں پر پردے پڑ چکے ہیں، ہم تو ظلمت شب کی آغوش میں جی رہے ہیں۔ کیسا خراب زمانہ لگا ہے، کیسی بے انصافی کا زمانہ! خیال رہے، کہیں تم بھی بیگوں کا آلہ کار بن کر نہ رہ جاؤ۔"

"میرا اعتبار کیجیے، ماموں جان، اس کی نوبت نہ آئے گی۔ میں بے انصافی کو تقویت نہ پہنچاؤں گا۔"

"خود بابر بھی تو بیگوں کی ہاں میں ہاں ہی ملاتے رہتے ہیں، بے انصافی ہی کو تقویت پہنچا رہے ہیں۔"

"تو شاید اس کا سبب یہ ہے ماموں جان کہ مرزا بابر کے پاس وفادار سپاہیوں کی، مجھ جیسے وفاداروں کی کمی ہے؟ ان کا لشکر تو بس بیگوں کے دستوں ہی پر مشتمل ہے۔ عرصے سے یہی دستور چلا آ رہا ہے۔ بات یہ ہے کہ میں اپنے لیے کوئی اور راہ نہیں تلاش کر سکا۔ اور تن تنہا میں کچھ بھی تو نہ کر سکوں گا۔"

فضل الدین نے طاہر کا غور سے جائزہ لیا۔ نہیں، اس نوجوان کا ارادہ بدلا نہیں جا سکتا تھا، کسی بھی طرح نہیں۔

"اچھا تم بھرتی افسر سے مل چکے ہو؟"

"جی ہاں۔ وہ کہتا ہے "تمہارے پاس گھوڑا تو ہے نہیں، پیدل میں بھرتی کریں گے" ویسے میں پیدل چلنے کا عادی بھی ہوں۔"

"اور یہ بھی سوچا کہ پیدل سپاہی ہی سب سے زیادہ لقمۂ اجل بنتے ہیں؟"

"اس سے کیا ہوتا ہے... میں ایک جنگ میں حصہ لوں یا چالیس جنگوں میں، مرنا تو وہی ہے جس کی قسمت ہی میں مرنا لکھا ہو"

"اب رہنے دو، طاہر، یہ موت اور جنگ کی باتیں بہت ہو چکیں!"

صبح کو ناشتے کے بعد فضل الدین نے نوکر سے اصطبل کے بندھے دونوں گھوڑوں پر زین کسنے کو کہا۔

"تم اسے لے لو" اس نے لمبی ٹانگوں والے بچھیرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے طاہر سے کہا۔ "تم پیدل محاذ پر

جاؤ۔ یہ میرے لیے بڑی بے عزتی کی بات ہے"

میر عمارت خود ستھے پر ستارے والے اس گھوڑے پر سوار ہو گیا جو اسے بابر نے عطا کیا تھا

وہ دونوں شاہی محل کے لیے روانہ ہو گئے۔

فضل الدین نے قاسم بیگ سے طاہر کی سفارش کی۔

"میں حکمران سے یہ عرض کرتا چاہتا ہوں کہ وہ از راہ عنایت میرے بھانجے طاہر کو اپنے محافظ دستے میں رکھ لیں۔ یہ نوجوان آخری دم تک مرزا بابر کا وفادار سپاہی رہے گا"

قاسم بیگ نے دیکھا کہ طاہر کتنا تندرست و توانا ہے۔

"ارے نوجوان، تم پہلے بھی فوج میں رہ چکے ہو کیا؟" اس نے طاہر کے چہرے پر زخم کے نشان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، کبھی نہیں" طاہر نے رکھائی اور بے رخی سے جواب دیا۔

فضل الدین جلدی سے بول پڑا

"جناب امیر الامرا، میرا بھانجا ویسے تو پشتینی زراعت پیشہ ہے لیکن اس میں سپاہی کی تمام صفات، طاقت، جسارت، ذہانت پائی جاتی ہیں۔ آپ کو یاد ہے نا کہ توامیں پل کو پار کرتے وقت سمرقندی لشکر کو کتنا زبردست نقصان اٹھانا پڑا تھا؟ اس وقت ہمیں فتح سے ہمکنار کرنے والوں میں سے ایک یہی طاہر تھا"

"فتح اس نے دلائی تھی؟" قاسم بیگ نے یقین نہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "وہ کیسے؟"

میر عمارت نے مختصراً جو قصہ بیان کیا اس سے ظاہر ہو گیا کہ گاؤں کے نوجوانوں نے ایسا کارنامہ انجام دیا تھا جسے بیگ اور سپاہی بھی نہیں انجام دے سکے تھے۔ قاسم بیگ کو کسی طرح یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

"فتح تو ہمیں پروردگار نے دلائی تھی، جناب میر عمارت"

"بے شک، خود پروردگار نے ہی اس تنگ پل کو ڈھانے کا خیال ان نوجوانوں کے دلوں میں ڈالا تھا۔ اس موقع پر طاہر شدید زخمی ہوا اور مرتے مرتے بچا تھا، قاسم بیگ صاحب"

"اچھا!" وزیر طاہر کو ذرا گرمجوشی کے ساتھ دیکھنے لگا۔ "لگتا ہے تمھیں سمرقندیوں سے انتقام لینا ہے، کیوں نوجوان؟"

"جی ہاں"

قاسم بیگ نے بھرتی افسر کی طرف جو پیچھے ہی کھڑا ہوا تھا، مڑ کر کہا۔

"اس نوجوان کا نام ان سپاہیوں میں شامل کر لیجیے جو کوہ چہل محرم کے دامن میں زیر تربیت ہیں" پھر اس نے فضل الدین سے مخاطب ہو کر اضافہ کیا۔ "وہاں ہمارے بہترین سپاہیوں کو بھیجا گیا ہے جنھیں ہم حکمراں کے محافظ دستے کے لیے تربیت دلا رہے ہیں"

ـــ

بیگوں کی مجلس مشاورت نے سمرقند پر جلد ہی حملہ کرنے اور تمام ضروری تیاریاں خزاں ہی میں مکمل کر لینے کا فیصلہ

کیا۔

بابر پچھلے دنوں قتلوغ نگار خانم کا سامنا کرنے سے کترا رہا تھا۔ اسے کوچ سے قبل کی مصروفیات سے کچھ وقت ملتا بھی تھا تو اس کے دوران اپنے شامیانے میں تنہا کتابوں کا مطالعہ کرتا رہتا تھا۔

آج نماز مغرب کے بعد وہ اپنی "تزک" میں وہ مدت استقامت کے متعلق لکھ رہا تھا تو میر خدم نے اندر داخل ہو کے اطلاع دی کہ قتلوغ نگار خانم اور علی دوست بیگ ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ بابر نے چاروز نامچہ بند کر دیا، دور تک جا کے ماں کا استقبال کیا، والدہ کو خواص کے لیے مختص جگہ پر بٹھایا۔

قتلوغ نگار خانم کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اس کی پیشانی سے ذرا ہی اوپر، مانگ کے قریب بالوں کی ایک سفید لٹ صاف نظر آ رہی تھی۔ یہ چالیس سالہ خاتون اب بڑھیوں کے سے کپڑے پہنتی اور کمر جھکا کر چلتی تھی۔ بابر کو ماں کی حالت دیکھ کر افسوس ہوا اور اس نے گہری اور روشن سی آواز سے وہ بات خود ہی چھیڑ دی جسے کہنے کا چند لمحات قبل تک قطعاً ارادہ نہیں رکھتا تھا:

"والدہ محترمہ، آپ یہ نہ سوچیں کہ میں نے آپ کے مشورے کو فراموش کر دیا ہے۔ سمرقند سے واپس لوٹ کر انشاء اللہ تعالیٰ وہ سارے کام سرانجام دوں گا جن کے متعلق آپ نے فرمایا ہے۔"

"اللہ قادر مطلق اور ہمہ داں ہے۔ ہم اس کے بندے ہیں، ہمیں کوئی شکایت نہ کرنی چاہیے۔ میری دعا ہے، فرزند ارجمند کہ خدا اپنے فضل و کرم سے آپ کے سارے نیک ارادوں کو پورا کرے۔"

علی دوست بیگ نے اپنے طاقتور ہاتھوں کو دعا کے انداز میں اٹھایا۔

"الٰہی آمین!" اور اس نے اپنی بڑی بڑی، موٹی موٹی انگلیاں بے ریش چکنے چہرے پر پھیر لیں۔

وہ بے ریش شخص بابر کی نانی ایسن دولت بیگم کا چچا زاد بھائی تھا اس لیے اپنے نام کے ساتھ لفظ "تاغائی" کو خطاب کی طرح استعمال کرتا اور قتلوغ نگار خانم سے بڑے سرپرستانہ انداز سے پیش آتا تھا۔ سب لوگ ریشمی گدے پر بیٹھ گئے تو اس نے قتلوغ نگار خانم کو حوصلہ افزائی کرنے والی سوالیہ نظروں سے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو بات چھیڑی جائے نا؟ قتلوغ نگار خانم نے قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلا دیا اور علی دوست بیگ نے کھانس کر حلق صاف کیا، سر جھکا لیا اور کہا:

"حکمران عالی، آپ کی والدہ صاحبہ اور آپ کا یہ خادم ایک بہت نازک مسئلے پر آپ سے مشورہ کرنے کے لیے آئے ہیں۔ آپ کی ہمشیرہ محترمہ خان زادہ بیگم بیس سال کی ہو چکی ہیں۔ ان کی شادی کرنے کا وقت آ چکا ہے۔ وہ اپنی خوبصورتی میں رشک ماہ و مہر ہیں، دانائی اور حیا کا پیکر ہیں!... ابھی تک ان کی شادی کے لیے کوئی شایان شان شخص نہیں مل سکا۔ آپ کی والدہ صاحبہ کو بھی اور اس ناچیز کو بھی فکر لاحق ہے کہ شہزادی کی زندگی کا بہترین دور گزر رہا ہے۔"

"وہ دو ایک سال اور یوں ہی بیٹھی رہیں تو مذاق اڑایا جانے لگے گا۔ لوگ کہیں گے، مرزا عمر شیخ مرحوم کی دختر تو کنواری بیٹھی ہے۔" قتلوغ نگار خانم بھی کہہ اٹھی۔

بابر اپنی بہن کے بارے میں اس قسم کی باتیں پہلے بھی سن چکا تھا لیکن آج علی دوست بیگ کے فیصلہ کن رویے سے اس نے اندازہ لگایا کہ غالباً کوئی موزوں نوجوان تلاش کر لیا گیا ہے۔ اس نے نوجوانوں کے سے تجسس کے ساتھ براہ راست دریافت کیا:

"ہماری بہن سے شادی کرنے کا خواہش مند ہے کون؟"

علی دوست بیگ نے ویسے ہی براہ راست انداز میں جواب دینا چاہا۔

"یہ کہنے کی جرأت بھلا کون کرسکتا ہے کہ وہ شہزادی فرمانبردار بیٹی کا اہل ہے؟" بابر نے بھی جیسے بے باکانہ انداز سے سوال کیا۔

"پھر بھی؟" بابر نے اصرار کیا۔

اب علی دوست بیگ اپنا "راز" کھولنے پر مجبور ہو گیا۔

"عالی جاہ کے سپہ سالاروں میں سلطان احمد تنبل بھی شامل ہیں۔ عالی نسب، شجاع اور مردِ میدان ہیں۔ آپ کو یاد ہے نا کہ انھوں نے گزشتہ سال یعقوب بیگ کی سازش کا پردہ فاش کرنے میں آپ کی کتنی مدد کی تھی؟ اور چاروں طرف ان کا دھاوا کتنا کامیاب رہا تھا؟"

بابر نے اثبات میں سر ہلا دیا لیکن جب اس نے اپنے تصور میں خان زادہ بیگم کو احمد تنبل کے پہلو میں کھڑا کیا تو اس کا دل مضطرب ہو گیا۔ دونوں میں ظاہری یا باطنی کوئی مماثلت ہی نہ تھی۔

"آپ کو منظور ہے، والدہ محترمہ؟" اس نے پوچھا۔

قتلوغ نگار خانم نے گہری ٹھنڈی سانس لی۔

"اور چارہ ہی کیا ہے؟" اس نے سوال کا جواب سوال ہی سے دیا۔ "خان زادہ بیگم ویسے تو کسی شاہ کی ملکہ بننے کے لائق ہیں لیکن اس دورِ پرآشوب میں قابلِ اعتماد حکمران ہے ہی کون۔ میں نے اور علی دوست بیگ صاحب نے ساری چھان بین کر لی ہے۔ بیگ احمد تنبل بڑے عالی نسب ہیں، ان کے پردادا سلطان تھے اور خود چنگیز خان سے رشتے اور ان کے بڑے بھائی تنبل بیگ ان دنوں تاشقند میں آپ کے ماموں جان خان محمود کے وزیرِ اعظم ہیں۔ اگر احمد تنبل بیگ ہمارے داماد بن جائیں گے تو وہ اپنے بڑے بھائی کی وساطت سے آپ کے اور آپ کے ماموں جان خان محمود کے درمیان قریبی روابط قائم کرا سکیں گے۔ ویسے بھی اتنے بااثر بیگ کا پورے خاندان اور سپاہیوں سمیت آپ کے سائے میں آ جانا بہت بڑا سہارا ہوگا۔"

"بالکل درست فرمایا آپ نے" علی دوست بیگ نے مکمل خود اعتمادی کے ساتھ کہا۔

بابر کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے اور اس نے شانے اچکا دیے۔ وہ کچھ جھجک بھی محسوس کر رہا تھا۔ بہن اس سے پانچ سال بڑی تھی، ماں اور بزرگ بیگ آخر اسے ایسے دشوار مسئلے میں کیوں الجھانا چاہتے تھے؟

"یہ رشتہ تو خود شہزادی کے لیے بھی اچھا ثابت ہوگا" علی دوست بیگ نے مزید کہا۔ "ان کی شادی اگر کسی فرماں روا سے ہوگی تو وہ اپنی والدہ سے، اپنے برادرِ عزیز اور ہمارے حکمران کی حفاظت اور سرپرستی سے دور ہو جائیں گی۔"

"ان کا کہیں پاس ہی میں رہنا میرے لیے بھی بہت اچھا ہوگا" قتلوغ نگار خانم نے ایک بار پھر گفتگو میں مداخلت کی۔ "خان زادہ بیگم میری پلوٹھی دختر ہیں، میری مشیر ہیں، اگر ان کی شادی کر دیں، ہو سکتی ہے تو وہ میری آنکھوں کے سامنے رہیں گی اور مجھے تنہائی نہ محسوس ہوگی۔"

بابر نے سوچا کہ بہت ہی ہو، تم جس کا سے خیال نہیں آتا، والدہ سمجھ دیتی ہیں اور اس نے عزم کے ساتھ کہا:

"یہ رشتہ والدہ محترمہ کو منظور ہو تو سمجھیے کہ بات طے رہی۔"

ہوئے میں سے گی سے پیش آتا۔

اور اس طرح بھائی بہن کی ملاقات تنہائی میں ہوئی

بادشاہ بابر چوکی کے پاس جس میں چھپوٹ جڑی ہوئی تھیں بیٹھا رہا۔ چہرے سے تاثرات سے واقف رہتی اور سے یہ خیال بھی نہیں آ رہا تھا کہ دونوں شمع دانوں میں سے کسی کی بھی روشنی صفات تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ خانزادہ بیگم اپنے زرد رنگ میں بیمار یا سی نظر آتی ہوئی گدے پر بیٹھی ہوئی تھی۔

''میں حضور سے اپنی حمایت اور حفاظت کی امید رکھتی ہوں''

خانزادہ بیگم کے معصوم چہرے پر آنسوؤں کے قطرات لڑھک پڑے۔ لیکن اس کی آواز سے عزم جھلک رہا تھا۔ بابر کا دل ایک بار پھر مضطرب ہو گیا عورتوں کی اشکباری اس سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ وہ پیچیدہ مسائل جو کم تھے کیا جن سے سپہ سالار کے مقدر نے، ماوراءالنہر کے، تحاد کے عنصر داروں کے مقدر نے اسے دو چار کر رکھا تھا؟ اس نے بڑے درد وغم کے ساتھ کہا

''اعانت کی ضرورت تو مجھے خود ہی ہے، ہمشیرہ صاحبہ۔ میں تو خود ہی ان الجھنوں سے نکلنے کا راستہ تلاش کر رہا ہوں جنھوں نے مجھے گھیر رکھا ہے۔ جانے کیسی کیسی دشوار ذمہ داریاں میرے سر پر آن پڑی ہیں۔ آپ اپنے آنسوؤں سے مجھے لاچار کر دینا چاہتی ہیں کیا؟''

خانزادہ بیگم نے فوراً ہی آنسو پونچھ کر خود پر قابو پانے کی کوشش کی

''محترم امیر، میں نے سنا ہے ... کہ احمد تنبل نے پہاڑوں پر مارے جانے والے مغلوں کے سر کاٹ لیے تھے اور ان سے بھرا ہوا بورا لے کر واپس لوٹا تھا ''

بابر کو اس نوجوان کا حس کی بھی مسیں ہی بھیگ رہی تھیں، خون سے لت پت سر یاد آ گیا اور وہ چونک پڑا۔

''معرکوں میں سر تو کٹتے ہی ہیں'' اس نے بہن سے زیادہ خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''آخر ہمارے سپاہیوں کو بھی تو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا''

''میں تو اپنی سیدھی سادی زندگی کسی تعلیم یافتہ شخص کے ساتھ گزارنے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ احمد تنبل کے ہاتھ تو خون میں رنگے ہوئے ہیں، وہ تو قاتل ہے قاتل! اعلیٰ جاہ کیا واقعی اس شخص کو میرے لائق تصور کرتے ہیں؟''

''آپ کی جیسی صفات والا خاوند تو شاید دنیا میں کہیں بھی نہ ملے گا ... پھر میں ... غائب والدہ محترمہ نے آپ کو اس تجویز سے متعلق اسباب بتا دیے ہوں گے ... ور میں بھی مجبوراً آپ سے یہی التماس کر رہا ہوں''

خانزادہ بیگم نے شمعوں کی دھندلی دھندلی روشنی کی طرف تکتے ہوئے اچانک احمد تنبل کا، اس کے بے ڈول جسم اور بالوں سے خالی چہرے کا تصور کیا، سوچا کہ اسے ایک ہی بستر پر اس شخص کی ہم خواب ہونا پڑے گا اور کراہت کے مارے اس کے بدن میں جھرجھری آ گئی۔

''مجھے اس بیگ سے ڈر لگتا ہے''

''آپ کو کسی سے خائف ہونے کی ضرورت نہیں، ہمشیرہ صاحبہ۔ میں کسی کو آپ کا بال بھی بیکا نہ کرنے دوں گا''

''لیکن آپ کی ہمشیرہ کی شادی زبردستی ایسے شخص سے، اتنے مکروہ شخص سے کی جا رہی ہے۔ اس سے بڑا ناقابل برداشت ظلم اور کیا ہو سکتا ہے؟''

سمرقند

۱

بابر کے لشکر نے پورے موسم گرما اور پھر ساری خزاں میں سمرقند کا محاصرہ جاری رکھا۔ مانے مستقور نے پورے سات مہینوں تک شہر کے پھاٹک نہ کھولے۔ آخرکار جب اہل سمرقند کی بھوک اور دوسری بہت سی تکالیف کے دردناک نظارے اس کے لیے ناقابل برداشت ہو گئے تو وہ موسم سرما کی ایک سرد رات کو دارالحکومت چھوڑ کر اپنے مٹھی بھر اعزا و مقربین کے ساتھ چوری چھپے خسرو کے پاس شہر حصار بھاگ گیا۔

سمرقند کے بیگوں کو جیسے ہی اپنے حکمران کے فرار ہو جانے کا علم ہوا ویسے ہی انھوں نے حکم دیا کہ شہر کے پھاٹک کھول دیے جائیں۔

بابر تین ہزار سے زائد پوری طرح مسلح فوجیوں کے ساتھ جو اس کے سمرقند لائے ہوئے لشکر جرار کا صرف ایک حصہ ہی تھے، نقاروں اور قرناؤں کی گونج کے درمیان شہر میں داخل ہو گیا۔ اس نے دنیا کے اس عجوبے کو پہلی بار پانچ سال کی عمر میں دیکھا تھا اور اب دوسری بار دیکھنے پر ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا تھا کہ سمرقند میں کون سی چیز کہاں پر ہے۔ اسے اپنی نگاہوں کے سامنے شاندار گنبد برف کی نیلگوں چٹانوں کی طرح فضاؤں میں تیرتے ہوئے سے نظر آئے تو اس نے قاسم بیگ سے دریافت کیا کہ ان میں سے کون سا گنبد الغ بیگ مدرسے کا ہے اور کون سا بی بی خانم مسجد کا۔ دستے قلعے کی فصیل کے قریب ٹھہر گئے اور بابر مسحور ہو کر گور امیر* کے حیرت انگیز طور پر خوبصورت گنبد کو، اپنے ان عظیم آبا و اجداد کے مقبرے کو دیکھنے لگا جن کے کارناموں کی یادیں اس کے اندر شہرت کی بھوک کو بھڑکاتی رہتی تھیں۔ اس گنبد کو اس نے کسی کے بتائے بغیر خود ہی پہچان لیا۔ سلسلۂ عمارات کے پروقار نظارے اور واضح بیرونی خطوط پر بابر کا دل عش عش کر اٹھا۔

ٹیلے پر سے جہاں شہر کا قلعہ واقع تھا، بابر کو برآمدے دار بے شمار مکانات، سڑکیں اور گلیاں صاف صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ دور تک پھیلی ہوئی اس انسانی رہائش گاہ پر نظریں جمائے ہوئے تھا کہ اتنے میں اچانک اس کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔ ان ہی بے شمار مکانات میں سے کسی ایک کے جھروکے سے اس کی منگیتر عائشہ بھی اس کو، فاتح کو دیکھ رہی ہوگی۔ بیچاری اپنی قید کے تمام مصائب سے نجات پا چکی تھی، اب اس کی منتظر تھی لیکن کیا سپاہیوں کی اس بھیڑ بھاڑ میں اسے پہچان بھی سکتی تھی؟

بابر اپنے گھوڑے پر قاسم بیگ کے نزدیک پہنچا اور دھیرے سے پوچھا:

"آپ نے کس کو یہ معلوم کرنے کے لیے بھیجا کہ قیدی کس حال میں ہیں؟"

قاسم بیگ سوال کے خفیہ مفہوم کو فوری طور پر نہ سمجھ سکا۔

"عالی جاہ، یہ آپ کن قیدیوں کے متعلق فرما رہے ہیں؟"

بابر کو قاسم بیگ سے جو عمر کے اعتبار سے اس کے والد جیسا تھا، منگیتر کا تذکرہ کرتے عجیب سی محسوس ہوئی۔ اس نے کچھ عجب ڈھنگ سے شرما کر نظریں جھکا لیں۔ بات قاسم بیگ کی سمجھ میں آ گئی:

* گور امیر تیمور اور اس کے خاندان کے حکمرانوں کا مقبرہ۔

"جی ہاں، قیدی... قید میں قیدی" اس نے وہ لفظ ادا کر دیئے جو زبان پر ہی اٹکا تھا۔ "میں نے آپ کے نویان کوکلتاش کو یہ معلوم کرنے کے لیے بھیجا ہے کہ سلطان احمد مرحوم کی صاحبزادیوں پر کیا بیتی۔ حکمران کو شام تک تفصیلات کا علم ہو جائے گا۔"

وہ لوگ قلعے کے اندر داخل ہوئے جہاں سب سے اونچی اور عالی شان عمارت بلند و محل کوک سرائے کی تھی۔ کوک سرائے میں قیام کے دوران متعدد تاجدار موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے تھے، یہ مرحلہ سے حکمرانوں کے دلوں پر ہیبت سی طاری کرتا رہا تھا اسی لیے سمرقند کے کئی سابق حکمرانوں نے اس میں رہائش نہیں اختیار کی تھی۔ وہ لوک تاش* پر چڑھتے اور محل سے باہر چلے آتے تھے۔ بابر نے بھی قلعے کے دائیں حصے والے محل میں قیام کا فیصلہ کیا جو بستان سرائے کہلاتا تھا۔

شام کو جب بستان سرائے میں شمعیں روشن کر دی گئیں تو نویان بابر کی خواب گاہ میں آیا۔ یہ کمرہ ہر جگہ گلٹ کا کام ہونے کے باوجود کافی سرد تھا۔ یہاں گدے توشک وغیرہ کافی بچھے ہوئے تھے پھر بھی پوستین اور گرم کلاہیں اتارے بغیر ہی گفتگو کرنی پڑی۔

نویان کوکلتاش کے سینے میں دھیرے دھیرے گرم جوشی پیدا ہوتی گئی اور وہ بے تکلف ہو گیا۔ بابر کے عنان سلطنت سنبھالنے کے بعد سے اس کی نویان جیسے ہم عمر دوست کی ہیبت کھٹکنے لگی تھی۔ بادشاہ احباب سے نہیں بلکہ بیگوں سے گھرا رہتا تھا۔ دستور ہی کچھ ایسا تھا۔ لیکن آج بابر اور نویان دوبارہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے جس سے دونوں ہی کو مسرت ہو رہی تھی۔

نویان نے بڑے جوش و خروش سے بتانا شروع کیا
"حکمران کی طرف سے طلائی کنگن، طرح طرح کے قیمتی ملبوسات، ریشمی اور خوبانیاں، بادام کی شیرینیوں، سب کچھ پیش کیا گیا۔ خود آپ کی بڑی خالہ جان مہر نگار خانم صاحبہ نے استقبال کیا۔"

مہر نگار خانم قتلوغ نگار خانم کی بڑی بہن اور مرحوم سلطان احمد کی بڑی بیگم تھی۔ عائشہ بیگم کی ماں کا جوانی ہی میں انتقال ہو گیا تھا اور عائشہ کی پرورش مہر نگار خانم نے ہی کی تھی جس کے اپنے بچے نہیں تھے۔ اب بھی وہ سگی ماں کی طرح عائشہ کا خیال رکھتی تھی۔ بابر یہ سوچ کر خوش ہو گیا کہ اس کی خالہ اس کی ساس بھی ہو جائے گی۔

"سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہیں" نویان نے بتایا۔ "ان کے ہاں تو فاقوں پر فاقے ہوتے تھے، بیچاریوں نے روٹی تو جانے کب سے دیکھی تک نہیں تھی۔ "آٹا سونے کے عوض بھی نہیں میسر ہوتا تھا" خانم نے مجھ سے کہا اور رو پڑیں، پھوٹ پھوٹ کر روئیں۔ کہنے لگیں کہ پیٹ کی آگ چوکر کی روٹیوں سے بجھایا کرتی تھیں۔ ان کے ہاں لکڑیاں بھی نہیں ہیں، سردی کے مارے ٹھٹھر رہی ہیں"

"خواتین کے ساتھ بایسنقور نے واقعی اتنا بے رحمانہ سلوک کیا؟"

"خود مرزا بایسنقور کو بھی تو آخری دنوں میں پیٹ بھر کھانا نہیں نصیب ہوتا تھا۔ پورے سات مہینوں تک محاصرے میں رہنا کوئی ہنسی ٹھٹھا تھوڑی ہے۔ سڑکوں پر لاشیں پڑی رہتی تھیں۔ شہر شدید غذائی قلت کا شکار تھا۔ غریب لوگ تو کتوں تک کو کھا گئے۔ ہمیں ان ساری باتوں کی پوری طرح خبر نہیں ہو سکی تھی۔ میں نے ان لوگوں کے ہاں سے

---

* کوک تاش لفظی معنی نیلگوں پتھر۔ تاج پوشی کی جگہ۔ اب یہ پتھر سمرقند کے گور امیر مقبرے میں رکھا ہوا ہے۔

واپس ہوتے ہی قاسم بیگ صاحب سے ملاقات کر کے مختصراً ساری صورت حال بتاؤں گا۔ ایک راستہ آتا جاتا ہے۔ یہ
راہ گزین دواں تھے ہیں۔ یہ سب میں نے اپنی نگرانی میں خاتم صاحب کے ہاں پہنچا دیا اس کے بعد آپ کی خدمت
میں حاضر ہوا ہوں۔'

نویان وقتاً فوقتاً چند ساعت تک خاموش رہا پھر پر اسرار انداز سے مسکرایا۔ اب وہ عائشہ بیگم کا تذکرہ کرنے جا رہا تھا۔

بابر نے بے صبری سے ہاتھ جھٹک دیا۔

''بتاؤ نویان، بتاؤ بھی''

گلشت کے کام کے دیوان خانے میں جو تقریباً ایسا ہی تھا'' نویان نے دیواروں پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا، 'سفید جالی دار پردے میں ملبوس عائشہ بیگم نے مجھ سے ملاقات کی'' نویان ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ دراصل عائشہ بیگم اسے پسند نہیں آئی تھی۔ نقاب سے ڈھکے ہوئے چہرے کو تو وہ نہیں دیکھ سکا تھا پر قد بہت چھوٹا سا تھا اور دبلی پتلی عجب سوکھی سڑی سی لگ رہی تھی۔ ''مجھے وہ بڑی دبلی سی نظر آئیں۔ ''خوش آمدید'' انھوں نے کہا۔ ان کی آواز بڑی شیریں، نازک اور صاف تھی'

''کیسی بے انصافی ہے یہ!'' بابر نے سوچا۔ وہ عائشہ کی یاد میں تڑپتا ہوا اندجان سے سمرقند تک آ گیا تھا لیکن اس سے فوری طور پر ملاقات نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی اجازت ہی نہ تھی۔ دونوں کے درمیان رسم و رواج کی دیواریں حائل تھیں۔ وہ ملاقات کرتا تو چہ میگوئیاں ہونے لگتیں۔ اس کی اس بے صبری سے عائشہ کے رشتے داروں کو ٹھیس پہنچ سکتی تھی۔

لیکن نویان کوکلتاش کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس بے انصافی کا علاج اس کے پاس موجود ہے۔ اس نے اپنی بغلی جیب میں ہاتھ ڈال کر سفید ریشم کی ایک چھوٹی سی تھیلی نکالی۔

'عائشہ بیگم کی طرف سے آپ کو یہ تھیلی آپ کی خالہ جان نے بھیجی ہے''

بابر نے تھیلی لے کر ٹٹولی تو خالی سی لگی لیکن جب اس نے منہ پر بندھی ہوئی ڈوری کھول کر اسے الٹا تو اس کی ہتھیلی پر ننھے ننھے دو ہیرے آ پڑے۔ دونوں ہی قطرۂ شبنم سے ذرا ہی بڑے لیکن اپنی جسامت کو دیکھتے ہوئے خاصے وزنی تھے۔ ان کی تابانی راحت و حرارت بخش رہی تھی۔

''ذرا اسے الٹ کر تو ملاحظہ فرمایئے'' نویان نے کہا

تھیلی کے اوپر چھوٹے چھوٹے دانے خوبصورتی سے ٹنکے ہوئے تھے اور نفیس ریشم سے بڑی نفاست کے ساتھ دو ایک الفاظ کڑھے ہوئے تھے جنھیں بابر پہلی نظر میں نہ دیکھ سکا۔ بس دو ایک ہی لیکن کتنے شاندار الفاظ! ''نجات دہندہ کے لیے'' اور بابر کو یہ الفاظ عشقیہ اشعار سے بھی زیادہ لطیف و شیریں معلوم ہوئے۔ صاف ظاہر تھا کہ عائشہ بیگم نے یہ الفاظ پہلے ہی سے کاڑھ رکھے تھے۔ نویان کی موجودگی میں اس کشیدہ کاری کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ اس کا مطلب تو یہ تھا کہ اسے یقین تھا کہ بابر آ کر اسے نجات دلائے گا!

''اب ذرا ان ہیروں کا قصہ سنیے جو آپ کی ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہیں'' نویان نے بے تکلفی سے بات جاری رکھی۔ ''آپ کو معلوم بھی ہے کہ یہ ہیرے کیسے ہیں؟ یہ وہی ہیرے ہیں جو سلطان احمد مرحوم کی تخت نشینی کے وقت ان کی دستار کی زینت بڑھا رہے تھے۔' ان کی صاحبزادی کی آرزو تھی کہ یہ ہیرے آپ کے ساتھ ہی ایک بار پھر تخت سمرقند پر درخشندہ ہوں۔ خدا کرے یہ آپ کے سر پر مزید سو برسوں تک چمکتے رہیں''

سلطان محمود کے اس تذکرے سے بابر واقف ہو گیا۔ ابھی کچھ عرصے قبل شاہ سمرقند زندہ تھا، اس نے بابر کے کچھ علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا اور بابر کو اس سے صلح کرنی پڑی تھی، فتح کے بغیر ہی صلح۔ لیکن ہیروں کی تابانی تو صاف و شفاف تھی کہ ان کی شعاعوں میں سے اپنی منگیتر کی آنکھوں کا نور نظر آنے لگا۔ عائشہ اس کی منتظر تھی! اور اب... اب تو وہ بہر حال ظفر یاب ہو چکا تھا!

"عائشہ بیگم کی یہ آرزو ہے تو خدا کرے ایسا ہی ہو!" بابر نے کہا۔ پھر اس نے تالی بجا کر دستار پیچ کو طلب کیا۔

دستار پیچ نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ ان ہیروں کو بابر کی اس دستار میں جڑ دیا جسے وہ خاص خاص تقریبات کے موقعوں پر استعمال کیا کرتا تھا۔

اسی شام کو بابر نے اپنی منگیتر سے ملاقات کے اشتیاق میں ایک غزل کہنے کی ابتدا کی

حسن کا تیرے ہے چرچا ہر جگہ اے ماہ رو
وصل تیرا مجھ کو کب ہوگا میسر ماہ رو

۲

موسم سرما کی برفیلی ہوائیں ہڈیوں تک سرایت کرتی جا رہی تھیں۔ سمرقند کے خاص چوک ریگستان میں چیتھڑوں میں ملبوس پانچ دس قیدی جنھیں قاضی شہر کی دی ہوئی سزا سننے کے لیے گھسیٹ لایا گیا تھا، کھڑے کھڑے ٹھٹھر رہے تھے۔

معتبر عہدے داروں نے ثابت کر دیا تھا کہ یہ لوگ فریب دہی جیسے سنگین جرم کے مرتکب ہوئے ہیں۔ سمرقند کے محاصرے کے دوران انھوں نے باب فیروزہ پر آئیے، ہم اسے آپ کے لیے کھول دیں گے۔ لیکن دس بہادر سپاہیوں نے غار عاشقاں* کے قریب پہنچ کر جیسے ہی فصیل پر چڑھنا شروع کیا ویسے ہی ان لوگوں نے انھیں پکڑ کے بائے سنقر کے سپاہیوں کے حوالے کر دیا تھا۔

"وہ ہم نہیں تھے، ہم نہیں تھے۔ جن لوگوں نے غداری کی تھی، آپ کے سپاہیوں کو گرفتار کرا دیا تھا، وہ تو بھاگ کھڑے ہوئے" پکڑ کر لائے گئے ان لوگوں میں سے ایک نے خوف پر قابو پاتے ہوئے چلا کر کہا۔

لیکن اس کی اس بات پر کسی نے بھی کان نہ دھرے۔ جلاد شاہی فرمان اور دشمن کو سزا دینے سے متعلق اپنے آبا و اجداد کی روایت پر مبنی قانون کے بموجب مجرموں کی مشکیں باندھ کر انھیں یکے بعد دیگرے اسی مقصد کے لیے خاص طور سے کھودے گئے گڑھے کے کنارے لا کر گھٹنوں کے بل بیٹھنے اور سر جھکانے پر مجبور کرنے لگا۔ گردن پر تلوار کا ایک وار پڑتا اور سزائے موت پانے والے کا گرم خون سرد ماحول میں گرم بھاپ سی چھوڑتا ہوا چوک کے پتھروں پر پھیل جاتا تھا۔

گڑھا پاٹ دیا گیا اور تمام شب گرنے والی برف نے اپنی سفید چادر سے جو آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہی تھی، سزائے موت کے سارے نشانات ڈھک دیے۔

اگلے روز دوپہر تک موسم کچھ گرم ہو گیا اور نیلگوں گنبدوں پر جمی ہوئی برف پگھلنے لگی۔

نماز ظہر کے بعد بابر گھوڑے پر سوار ہو کر سمرقند کے بازاروں کو دیکھنے کے لیے نکلا۔ قاسم بیگ اس کے ساتھ چل رہا تھا اور کچھ فاصلے پر محمد تنبل، یک دوسرا بیگ خان قلی اور کچھ سپاہی پیچھے پیچھے۔ سن رسیدہ شاعر جوہری بھی اس کا ہم رکاب تھا جو شہر کے کوچے کوچے سے بخوبی واقف تھا۔

---

* غار عاشقاں: سمرقند میں باب فیروزہ کے نزدیک ایک غار۔

وہ ہوٹل مسافروں اور سیاحوں کے قیام کے لیے حاجی بیگ کی تعمیر کرائی ہوئی عالی شان مسجد کے قریب تھا۔ جب وہ اس سے گزرنے لگے تو جوہری نے مشرقی دروازے کی سمت جاتے ہوئے راستے کی طرف اشارہ کیا۔

"میر علی شیر جب سمرقند آئے تھے تو اسی راستے سے کئی بار گزرتے تھے۔ اس سے آگے وہ عمارت بھی موجود ہے جس میں میر علی شیر کے استاد ابواللیث کام کیا کرتے تھے۔"

"تو کیا آپ بھی میر علی شیر کے ساتھ مکتب میں شریک رہ چکے ہیں؟" بابر نے دریافت کیا۔

"جی ہاں۔ ویسے تو میں ان کا ہم عمر ہوں لیکن انھیں اپنا استاد تسلیم کرتا ہوں۔ میں انھیں اپنے اشعار سناتا تھا وہ ہمیشہ ہی نیک مشورے دیتے تھے۔ پتا چلا کہ انھوں نے مجھے فراموش نہیں کیا۔ اپنے مشہور شاہکار مجالس النفائس میں انھوں نے آپ کے اس خادم کا بھی تذکرہ کیا ہے۔"

بابر کو سفید ریش جوہری سے جس کی بھویں تک سفید ہو چکی تھیں، قدرے رشک کا احساس ہوا۔ اس نے سوچا کاش وہ بھی اس پائے کا شاعر ہوتا کہ دنیا یوں توجہ مبذول کرتی۔ دراصل ابھی وہ اس میدان میں مشق سخن کی منزل سے آگے نہیں بڑھ سکا اور اپنے کہے ہوئے شعر دوسروں کو سناتے ہوئے شرماتا ہے۔ "جوہری کو میں کبھی بھی ترک نہ کروں گا۔ یہی تو سبب ہے کہ میں نے" بابر مسکرایا۔ "اپنے ہم رکاب کی حیثیت سے سمرقند کے کسی ممتاز بیگ کو نہیں بلکہ اس سن رسیدہ شاعر کو مدعو کیا ہے جو علی شیر نوائی کا ہم عمر ہے اور ان سے باتیں کر چکا ہے۔"

جوہری ان لوگوں کو نانبائیوں کے محلے میں لے گیا۔ گلیاں سنسان پڑی ہوئی تھیں۔ ان کی برف کو ہٹانے کے لیے کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا اور کہیں کہیں تو برف کے اتنے اونچے اونچے انبار لگے تھے کہ گھڑسواروں کے جوتوں کی نوکوں کو چھو رہے تھے۔ سردی میں ہوائیں چہروں کو منجمد کیے دے رہی تھیں اور جہاں دھوپ پڑ رہی تھی وہاں بھی دریچوں دیواروں کے نیچے پگھلی ہوئی برف کے ڈھیر سے بن گئے تھے۔

بابر نے چھوٹے چھوٹے گھروں کی ہموار چھتوں پر نظریں دوڑائیں۔ وہاں سے بھی برف صاف نہیں کی گئی تھی۔ کہیں ایک بھی شخص نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ لوگ نان فروشوں کے بازار میں گئے تو وہاں بھی یہی صورت حال نظر آئی۔ ساری کی ساری دوکانیں بند پڑی تھیں۔ بابر حیرت میں پڑ گیا۔

"جوہری صاحب، نانبائی کسی دوسرے شہر کو چلے گئے کیا؟"

جوہری نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"عالم پناہ، نانیں تو بازار میں تین مہینوں سے نہیں دکھائی دے رہی ہیں۔ آٹا ہی نہیں۔ محاصرے کے دوران جانے کتنے ہی نانبائی بھوک سے تڑپ تڑپ کر چل بسے۔ لوگ اتنے نحیف و لاغر ہو گئے ہیں کہ کسی میں اپنے گھر کی چھت پر چڑھ کر برف ہٹانے تک کی سکت باقی نہیں۔"

بابر کو ایسا لگا جیسے جوہری ان افسوس ناک حالات کے لیے اسے قصوروار تصور کر رہا ہو۔ اس نے اپنی حمایت یا پوچھے نہ جانے والے سوال کے جواب کی توقع میں عادتاً قاسم بیگ کی طرف دیکھا۔ قاسم بیگ نے شاعر سے سرزنش بھرے لہجے میں کہا

"پھر بھی شاید کچھ نانبائی تو زندہ بچے ہی ہوں گے؟"

"جی ہاں... شاید کچھ بچ گئے ہیں۔ لیکن انھیں مدد کی ضرورت ہے۔ انھیں اس وقت آٹا دیے جانے کا حکم جاری

ہو جائے تو شاید یہ بار اور دوبارہ کھل جائے اور لوگوں کو تشویش ہو جو سمرقندی تاجر میں پیسہ ہوئے نہیں۔"

قاسم بیگ نے بھانپ لیا کہ بابر نے قسم کا حکم فوراً ہی سے جاری کر دیا ہے۔

"عالی جاہ، ہمارے پاس تو خود اپنے استعمال کے لیے بھی تھوڑا ہی سا غلہ باقی رہ گیا ہے۔ لشکر کو رسد کی ضرورت ہے۔ فروخت کرنے کے لیے تو ہم غلہ نہیں دے سکتے۔ ممکن ہے بعد میں"

سن رسیدہ شاعر نے اپنی پر امید نگاہیں بابر کے چہرے پر جما دیں۔ حالانکہ وہ بوڑھا تھا، بے ڈول شانوں کو ڈھکے ہوئے بانات کے سیاہ چغے کی وجہ سے ہوا یا پھر جوہری کی ترشی ترشائی چھوٹی سی داڑھی کی وجہ سے۔ بہرحال بابر کو شاعر میں وہی کی اس تصویر سے کچھ کچھ مماثلت نظر آنے لگی جو محمود مذہب نے بنائی تھی۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ جوہری کی توقعات پر پورے نہ اترنے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ نوائی کو بھی بلند کرکے قاسم بیگ سے تحکمانہ لہجے میں کہا

"غلہ وافر تاجروں کو نہیں بلکہ ناداروں کو فراہم کیا جائے۔ کوئی معتبر شخص ان پر نگاہ رکھے، وہ نانبائیوں کو پہنچائیں اور یہ روٹیاں ان افراد میں جو سب سے زیادہ بھوکے ہوں، ہماری طرف سے تقسیم کر دی جائیں۔ پانچ چھ بورے آٹے سے لشکر کی رسد میں کوئی کمی واقع ہو سکتی ہے۔ جنوب سے غلہ لانے والا کارواں تو کل پرسوں تک یہاں پہنچ ہی جائے گا۔"

"پروردگار آپ پر برکتیں نازل کرے، عظیم فرماں روا!" جوہری نے خوش ہو کر کہا۔

خوش بس ایک وہی ہوا۔ محمد تنبل اپنے موٹے تنگڑے گھوڑے کی لگام کھینچ کر کافی واضح طور پر بڑبڑایا

"اتنا زیادہ غلہ آخر آئے گا کہاں سے جس سے یہاں کے سیکڑوں کے چھوڑے ہوئے سارے مرکھوں کا پیٹ بھرا جا سکے؟ ہم یہاں انھیں شکم سیر کرنے کے لیے تھوڑی آئے ہیں۔"

جب سے دوش میں پیغام لے کر جانے والے بابر کے ہاں سے خالی ہاتھ ہوئے تھے اور خان زادہ بیگم محمد تنبل سے شادی کرنے پر راضی نہیں ہوئی تھی تب سے یہ بیگ بابر کے خلاف کچھ زیادہ نفرت کے ساتھ کارروائیاں کرنے لگا تھا لیکن چوری چھپے، "میرے لاثانی حکمراں" جیسے فقروں کے ساتھ بار بار کیے جانے والے اپنے سجدوں کی آڑ میں۔

"محترم بیگ" بابر نے کچھ اور زیادہ فخر سے سینے کو تانتے ہوئے کہا، "یہ تو سچ ہے کہ ہم اہل سمرقند کا پیٹ بھرنے کے لیے نہیں آئے لیکن انھیں لوٹنے کے ارادے سے بھی نہیں آئے ہیں!"

تنبل اس اشارے سے سہم کر رہ گیا۔ گزشتہ روز اس کے سپاہی جوہریوں کی دوکانیں لوٹ چکے تھے۔ اس کی آنکھیں سکڑ گئیں لیکن اس نے دوسرے ہی لمحے اپنے چہرے پر پرسکون ہونے کا تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"بالکل بجا فرمایا آپ نے، میرے عظیم و لاثانی حکمران" اس نے کہا۔ "میں صرف یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ ہمیں کچھ مال غنیمت حاصل کرنے کا حق ہے کہ نہیں؟ فاتح کو مال غنیمت پانے کا قانونی حق حاصل ہوتا ہے، یہ تو ہمارا قدیم دستور ہے!"

تنبل کی بات سپاہیوں کے درمیان کھڑے ہوئے خان قلی بیگ کو بھی پسند آئی جس کا اظہار اس کے سر ہلانے اور مسکرانے سے ہو رہا تھا۔ زیادہ تر سپاہی بھی تنبل سے متفق تھے مگر سب بیگوں ہی کے ہاتھ اتنا مال نہ لگا جس سے وہ مطمئن ہو سکیں تو پھر سمرقند کو "فتح" کرنے والے معمولی سپاہیوں کو کیا ملے گا، یہ کوئی چھوٹا موٹا گاؤں تو ہے نہیں۔

بابر جانتا تھا کہ اس کے لشکر میں غیر مطمئن فوجی بھی شامل ہیں۔ لیکن بیگوں کو کھلی چھوٹ دے دینے کا مطلب یہ ہوتا کہ اہل سمرقند جو اب اس کی رعایا تھے، بھوک سے تڑپ تڑپ کے مر جاتے۔ دوسری طرف رعایا کو بھوکوں مرنے سے

کے بغیر طاقوں پر سے نادر قلمی نسخے اتار اتار کر، برکافی دنوں سے جمی ہوئی دھول پونچھی۔ پھر وہ کتابیں بابر کو پیش کرنے اور ان کے متعلق مختصر بتانے لگا۔ یہ بیش قیمت سنہری جلدوں والی کتابیں محمود کاشغری، احمد برجانی جاری کی ہیں پیچ گل بوٹوں اور تصاویر سے آراستہ کتاب عبدالرزاق سمرقندی کی ہے ... اور بابر ... کے متعلق ... کی تصنیف 'میزان الاوزان' یہ وہ کتاب تھی جس کا بابر کافی دنوں سے متلاشی تھا اور دریافت کرتا رہتا تھا کہ کس سے خریدی جا سکتی ہے۔ دراصل دوکان میں زیادہ تر کتابیں ایسی تھیں جو اس کے کتب خانے کی زینت بڑھا سکتی تھیں اور جن کی قیمت کا سونے میں تعین کرنا ممکن نہ تھا۔ بابر کو دھول سے اٹی ہوئی اس دوکان میں ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ پریوں کی کہانیوں کے کسی خزانے والے غار میں پہنچ گیا ہو۔

"اور کیا ہے آپ کے پاس؟ اور کیا ہے؟ وہ بے صبری کے ساتھ بار بار پوچھے جا رہا تھا۔

قطب الدین نے تمام نئی، ایک سے ایک بیش بہا کتابیں رکھ دیں۔ قاسم بیگ جوش عمر جوہری کے پیچھے پیچھے ہی چپ چاپ دوکان میں آ گیا تھا، بخوبی جانتا تھا کہ مشہور و معروف خوش نویسوں کی نقل کی ہوئی اور پیچیدہ گل بوٹوں سے آراستہ وہ کتابیں کتنی مہنگی ہوں گی۔ سمرقند کا خزانہ جیسا کہ اسے پہلے ہی سے معلوم تھا بالکل خالی تھا۔ اندراجان سے لایا گیا سونا ایک تو بہت زیادہ نہ تھا اور دوسرے لشکر کشی کے وقت سے اس خیال سے تھوڑی لایا گیا تھا کہ اس سے کتابیں خریدی جائیں گی۔ لیکن بابر کی منتخب کردہ کتابوں کا ڈھیر لگائے جا رہا تھا، مقدار دس سے زیادہ ہو چکی تھی۔ آخر کار قاسم بیگ نے چپکے سے کہا

"عالی جاہ! اس وقت ہمارا خزانچی ساتھ نہیں ہے"

بابر ان الفاظ کا مفہوم نہ سمجھ سکا، وہ تو کتابوں کے سوا ہر بات کو فراموش کر چکا تھا۔

"خزانچی؟ خزانچی کو بھیج دیا جائے گا" اور اس نے کتب فروش سے کتابوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "کتابچی صاحب، آپ حساب لگا لیجئے، ہمارے خزانچی یہاں آئیں گے اور قیمت ادا کر کے انہیں لے جائیں گے"

قطب الدین نے شاہ سمرقند کی خدمت کا موقع ملنے پر سر جھکا کر اظہار مسرت کیا، کہا کہ حکمراں اپنی فیاضی کے لیے شہرت رکھتا ہے اور ایسی ہی چند باتیں اور بھی کہیں لیکن بابر نے محسوس کیا کہ کتب فروش کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہے پر ہمت نہیں پڑ رہی ہے۔

"آپ کیا چاہتے ہیں؟ بتایئے نا، شرمایئے نہیں۔ آپ کی کتابیں بڑی قیمتی ہیں"

"عالم پناہ" آخر کار کتب فروش نے ہمت کر کے کہا "ان دنوں پیسوں سے غذا خریدنا ناممکن ہے، اور بچے روز بلک بلک کر روٹی مانگتے ہیں تو دل پاش پاش ہونے لگتا ہے۔ مناسب خیال فرمائیں تو تھوڑا سا آٹا....."

وہ ضعیف اور باعزت آدمی ... یہ سب محاصرے میں پھنسے رہنے کے باعث بھوکوں مر رہے ہیں۔ اور میں ہوں کہ محض پیسوں اور کتابوں ہی کی بات کر رہا ہوں" بابر نے خود کو سرزنش کی لیکن ماتحتوں کے بازار میں قاسم بیگ نے جو مخالفت کی تھی اسے یاد کر کے اس نے کتب فروش کو کوئی جواب نہ دیا (صرف ڈھیر سے سر ہلا کر رہ گیا) اور ہوشیاری سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ بعد میں ان غیر مطمئن اور ناک بھوں چڑھانے والے بیگوں کی عدم موجودگی میں میر مطبخ سے اس مسئلے کو چپ چاپ حل کرایا جا سکتا تھا۔

"خدا حافظ! آپ کسی بات کی فکر نہ کیجئے" بابر نے یوں ناامیدی سے کہا گویا کہ یہ بات محض اخلاقاً کہہ دی ہو اور

...اس سے قبل چوک میں آ کر جماعت تھوڑی اپنے سپاہیوں کے درمیان گھوڑے پر بیٹھا تھا۔

لیکن یہ ورثہ موت تک شاہی کے نام لیے ہوئے تھا۔ ایک دن یہ سمرقند پہنچا دی گئی۔ یہ کام خفیہ طور پر انجام دیا گیا پھر بھی اگلی صبح دوسری تمام سپاہیوں کو بڑی طرح پتہ چل گیا جیسے تمام شہر نے سپاہیوں کے نانبائیوں کے بازار میں ایسے گرم نان پہنچے تھے۔ تب چوڑی اور تازہ نانوں کی سوندھی سوندھی خوشبوئیں سارے شہر میں پھیل گئیں۔ گھڑ سوار سپاہیوں نے ہر طرف سے واقعی مفت نان تقسیم کیے۔

بابر کے ان قدموں سے بھوکے سمرقندیوں میں جس طرح خوشی کی لہر دوڑ گئی اسی طرح مال لوٹنے کی بے تاب فوجیوں اور لشکریوں میں ناخوشی کی۔ ان فوجیوں نے جو بھوکے اور تباہ حال سمرقند کو دیکھتے دیکھتے اوب چکے تھے، بابر سے پوچھے بغیر ہی [illegible] اور خوشحال فرغانہ لوٹ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

۳

تندوروں سے نکلتی ہوئی گرم گرم نانوں کو بوریوں میں ڈھونے اور بھوکے سمرقندیوں میں تقسیم کرنے والے سپاہیوں میں طاہر بھی شامل تھا۔ پہلے تو اسے غصہ آیا اور اس فرمان سے متفق نہ ہو سکا۔ "میں ان کم بختوں کی خدمت کرنے آیا ہوں کیا جنھوں نے رابعہ کو اغوا کر لیا تھا؟" لیکن نانبائی مصائب کو دیکھ کر اس کا دل پسیج گیا۔ مفلوک الحال لوگوں، دھاگوں جیسی پتلی گردنوں والے بچوں اور بھوک سے بالکل بے جان معمر افراد کے دردناک نظاروں میں اس کی بے اطمینانی کافور ہو گئی۔ یہی نہیں، اس کے ذہن میں تو چونکہ یہ خیال بھی کوند گیا کہ ابھی اہل سمرقند میں شاید اس کی رابعہ بھی شامل ہو اور انھی کی طرح وہ بھی تڑپ رہی ہو۔ یا شاید ایسے لوگ ہی موجود ہوں جنھوں نے اسے دیکھا ہو یا جو اسے جانتے ہوں۔

طاہر لومڑی کی کھال کی کلاہ اور بھیڑ کی کھال کے لبادے میں ملبوس تھا۔ گزشتہ کئی مہینوں کی مسلسل گھڑ سواری کے باعث اس کی چال بھی بالکل بدل گئی تھی۔ رکابوں کے عادی پیر ریچھ کے پیروں کی طرح زمین پر ترچھے ترچھے پڑ رہے تھے لیکن ہاتھ بڑی پھرتی کے ساتھ بوری سے نان نکال رہے تھے۔

بھوکے لوگوں کی پھٹی پھٹی سی آنکھیں طاہر کو نہیں بلکہ اس کے ہاتھوں اور مطلوبہ روٹیوں کو دیکھ رہی تھیں۔ لوگ بوری کے نزدیک ڈھیر سے چھوٹے چھوٹے قدموں سے یوں آ رہے تھے گویا پیروں سے زمین کو ٹٹول رہے ہوں۔ طاہر اچھی طرح دیکھ چکا تھا کہ ضعیف و ناتواں افراد چھوٹی چھوٹی نالیوں کو بھی پھاندنے اور معمولی سی چڑھائیوں کو بھی طے کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔ شہر کے نسبتاً طاقتور افراد کے سہارے کا انتظار کرنے لگتے تھے۔

طاہر ہر شخص کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ کیا واقعی ان میں ایک فرد بھی ایسا نہ تھا جس نے رابعہ کو دیکھا ہو یا اس کے متعلق کچھ جانتا ہو؟

قریب ہی چوغے میں لپٹی ہوئی کوئی عورت ایک بڑھیا کو اور بڑھیا اس عورت کو سہارا دیے کھڑی ہوئی تھیں۔

"خالہ جان، آپ لوگوں میں کوئی عورت اندجان یا قوا کی رہنے والی تو نہیں؟"

"نہیں بھائی، یہی تو کوئی بھی نہیں" عورت نے تاجیک زبان میں جواب دیا

طاہر نے اس سے بھی وہی بات کہی جو اب تک جانے کتنی ہی بار کہہ چکا تھا

"میں ایک لڑکی کی تلاش میں ہوں۔ چار سال قبل سلطان احمد کے سپاہی اسے قوا سے اغوا کر کے لے گئے تھے!"

"ہائے بیچاری!" عورت نے کہا اور بڑھیا نے طاہر کے ہاتھ سے نان لیتے ہوئے اس کے سامنے احترام سے سر جھکا دیا۔

تھوڑی دوری پر کھڑا ہوا ایک شخص جس کی نگاہیں نانوں کی بوری پر جمی ہوئی تھیں، بے صبری سے رال ٹپکا رہا تھا۔ مونچھیں چھدری، قد بلند اور عمر یہی کوئی پینتیس سال۔

"تم کبھی سپاہی تو نہیں رہ چکے ہو؟"

چہرے پر مسّے والے اس شخص نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد گھبرا کر کہا

"رہ تو چکا ہوں، کیا بات ہے؟"

"کب رہ چکے ہو؟"

"کئی سال قبل"

"اندجان گئے تھے؟"

"نہیں..... وہاں پہنچنے سے پہلے ہی لوٹ آیا تھا"

ہچکچاتے لہجے اور اس شخص کے چہرے نے طاہر کے ذہن میں ان لٹیروں کی یاد تازہ کردی۔ وہ چوکنا ہو گیا۔ کہیں یہ بھی تو ان ہی لٹیروں میں شامل نہیں تھا؟

طاہر نے اپنے ایک ساتھی کو جو نانبائی کی دوکان کے دروازے پر کھڑا تھا، بلا کر نانوں کی بوری تھمائی اور خود چھدری مونچھوں اور بھوک سے سوکھے ہوئے چہرے والے آدمی کے پاس گیا۔ وہ شخص بری طرح سہم گیا۔

"ارے بھائی تمہیں مجھ سے کیا چاہیے، میں غریب آدمی ہوں! مجھے جانے دو! میں تو روٹی لینے آیا ہوں..... بس روٹی لینے!"

کہیں اس شخص نے بھی اسے پہچان تو نہیں لیا تھا؟ بجھی ہوئی کشتی کا وہ سراغ جو اسے رابعہ کے پاس تک پہنچا دے، کہیں اسی شخص کے ہاتھوں میں تو نہیں؟ اس سے تو دراصل محبت بھرے لہجے میں بات کرنے کی ضرورت تھی۔

"روٹی تمہیں ضرور ملے گی۔ میں تمہیں کچھ زیادہ نان دے دوں گا۔ پر مجھے سچ سچ بتا دو۔ تو تم سلطان احمد کے سپاہی تھے نا؟"

"ہاں، بتا تو چکا ہوں....."

"تم لوگوں نے قوسانے کا پل پار کیا تھا نا؟"

"کون سا پل؟ وہی جو ٹوٹ گیا تھا، جس نے ہمیں تباہ کر دیا تھا؟"

"ہاں ہاں، وہی" طاہر نے اپنی مسرت اور غصے دونوں کو چھپا لیا تو یہ وہی بدمعاش ہے خنجر کے وار سے کمبخت کا کام تمام کر دوں؟ لیکن پھر رابعہ کو کیسے تلاش کر سکوں گا؟

طاہر نے چھدری مونچھوں والے کے چوغے کا گریبان تھام کے اسے زور سے جھنجوڑ دیا

"رابعہ کہاں ہے؟ جلدی بتا!"

وہ بھوک سے بری طرح نڈھال شخص طاہر کے قدموں میں ڈھیر ہوتے ہوئے بچا، لگا جیسے اس کے انجر پنجر ابھی ابھی بکھر جائیں گے۔

طاہر نے گہری ٹھنڈی سانس لی اور اچانک تسلیم کر لیا
"مجھے وہ ہر شے سے سوا عزیز تھی۔ آنکھوں کی تھی۔"
ممد نے تسلی دینے کی کوشش کی
"ارے بھائی، امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو، مل جائے گی۔ یہاں میرے بہت سے احباب دروقف کار رہتے ہیں۔ سب سے دریافت کروں گا۔ اپنی بیوی سے بھی تذکرہ کروں گا، وہ عورتوں سے پوچھ گچھ کریں گی۔"
طاہر نے محسوس کیا کہ ممد سچے دل سے اس کی مدد کرنا چاہتا ہے۔
"وممد" اور نانبائی کی دوکان میں پہنچ کر اس نے تنی بوری سے چار نانیں نکال کے ممد کی طرف بڑھا دیں۔
"یہ لو! تم روٹیوں ہی کے لیے تو یہاں آئے تھے"
ممد نے کانپتے ہاتھوں میں نانیں تھام کے انھیں بغل میں دبانے سے پہلے ان کی گرم اور سوندھی خوشبو کو سونگھا۔
اس کی آنکھیں قلبی ہو لد پڑ رہی تھیں پھر بھی اس نے طاہر کے سامنے صبر سے کام لیا اور نانوں پر مدید بہت سے ٹوٹ تھیں پڑ۔ صرف مبہم سے انداز میں جیسے نانوں کی مہک نے اس پر نشہ سا طاری کر دیا ہو، کہا
"تمہیں بھائی ہمدردی سے بڑھ کر اور کوئی بھی چیز نہیں ہوتی۔ خدا تم پر یہ وقت کبھی بھی نہ ڈالے جیسا ہم پر پڑا تھا۔ میں انھیں کھاؤں گا، جسم میں کچھ جان پڑ جائے گی اور چل کے اپنے گاؤں تک پہنچ سکوں گا۔ وہ جو پہاڑی ہے نا اس کے عقب میں ہمارے بھائی رہتے ہیں۔ ہمارا تعلق تو یون قلاق قبیلے سے ہے۔ گاؤں پہنچ کر وہاں سے دو بوری غلہ لے آؤں گا۔ میرے پاس ایک گھوڑا تھا جسے خزاں کے موسم میں ذبح کر کے ہم لوگ کھا گئے۔ پیدل روانہ ہوتے ڈر رہا تھا کہ کہیں پہاڑی علاقے میں گر کر سردی سے ہلاک نہ ہو جاؤں۔ اب کا ہے کا ڈر....."
"تم سے پھر کہاں ملاقات ہو سکے گی؟" طاہر نے اسے ٹوکا۔
"اوہ! محلہ کفش دوزان ہے نا..... بس وہیں میرا گھر ہے۔ جس سے بھی پوچھو گے، بتا دے گا۔ ممد پہلوان ہاں بھائی، کبھی میں بہت طاقتور تھا۔ اب تو چلنے تک میں دشواری ہوتی ہے"
"بھولنا نہیں" اس کا نام ہر بیعہ ہے.. اور میں قاسم بیگ کا سپاہی ہوں۔ میرا نام طاہر ہے"
"ٹھیک ہے، طاہر بیگ، ٹھیک ہے، کچھ پتا چلے گا تو فوراً تمھیں تلاش کروں گا۔ ہمارے لوگوں نے تمھارے ساتھ بدی کی تھی پر تم نے ہمارے ساتھ نیکی کی۔ زندگی بھر یاد رکھوں گا، احسان کا بدلہ ضرور چکاؤں گا۔ خدا حافظ!"
طاہر اسے جاتے دیکھتا رہا۔ "گر اسے پتا چل جائے کہ اس کا بھائی کس کی وجہ سے ہلاک ہوا تھا تو.."
نانبائی کی دوکان کافی پیچھے چھوٹ گئی تو ممد نے فوراً ہی بغل میں دبی ہوئی گرم نانوں میں سے جلدی سے ایک ٹکڑا توڑ اور چپکے سے منہ میں رکھ لیا۔

۴

"سمرقند پر قبضہ ہوتے ہی ساری مشکلات ختم ہو جائیں گی" اندجان کے بیگوں اور سپاہیوں نے یہی سوچا تھا۔ لیکن وہ بہت غلطی پر تھے۔ تین ہزار لشکریوں کے کوئی چھ ہزار تو گھوڑے ہی تھے۔ قیامت کی سردیوں کے دوران اور وہ بھی ایسے شہر میں جو ہلکان کر دینے والے لمبے محاصرے کو جھیل چکا تھا، بیک وقت تمام اہل سمرقند کا پیٹ بھرنا اور لشکر کے لیے کافی غذائی

"ارے خان قلی بیگ! آخر ہم یہ سب کب تک جھیلتے رہیں گے؟ یہ کل کا لڑکا تو عظیم بادشاہ بننے کی فکر میں ہے، یہاں سے وہیں جانے سے رہا، اس کے علاوہ سمرقند کا داماد بھی ہے، یہاں اس کی منگیتر رہتی ہے۔ اسی لیے تو ان معلوک الحال شہریوں کی نظروں میں خود کو نیک اور اچھا ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے۔ آٹا بھی تقسیم کرتا ہے اور ہر ہفتے شاعروں کو بلا کے مشاعرے بھی منعقد کرتا رہتا ہے۔"

"اور کیا یہ سچ ہے کہ وہ شاعر بھی بننا چاہتا ہے؟"

"ہاں صاحب سچ ہے، اسی وجہ سے تو کونے کونے سے شاعروں کو بلاتا ہے۔ ان لوگوں کی خاطر مدارت بھی کرنی ہوتی ہے اور اسی پر سارا مال غنیمت اڑایا جا رہا ہے جو کہ ہونا ہمارا ہے۔ وہ تو فرغانے کا سارا سونا کتابیں خریدنے پر صرف کرنے کو تیار ہے۔ ورنہ وہ بھی ہمارا ہی ہے۔"

خان قلی نے اپنی چھدری داڑھی سہلائی۔

"میں تو اندجان جانا چاہتا ہوں لیکن حکمران اجازت ہی نہیں دے رہا ہے۔" اس نے کہا۔ "خدا ہی جانتا ہے کہ کتنا عاجز کر دیا ہے حکمران نے مجھے!"

احمد تنبل گدے پر سے اٹھ کر دروازے کے پاس گیا اور زنجیر بند کر کے اپنی جگہ پر لوٹ آیا۔

"محترم خان قلی بیگ! اگر بیگ یہاں نہ رکیں گے تو بادشاہ کیا کر لے گا؟ مجھے تو پورا یقین ہے، بخوبی جانتا ہوں کہ زیادہ تر سپاہی ہمارے ساتھ چلے جائیں گے۔ جنگ ہم نے جیتی۔ مصائب ہم نے جھیلے اور اب ہمیں اس چھوکرے سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے؟"

"درست فرمایا آپ نے" خان قلی بیگ نے چپکے چپکے کہا۔ "ہم بیگوں میں سے ہر ایک بادشاہ ہے، اپنا بادشاہ خود ہی ہے۔ وہ اجازت نہیں دیتا تو نہ دے، میں تو سرحاصت میں چلا جاؤں گا۔"

"میں بھی اس چھوکرے سے اپنی پگڑی اچھلوانے کا قطعاً ارادہ نہیں رکھتا۔ زندہ رہا تو اپنے لیے کوئی اور بادشاہ ڈھونڈ لوں گا۔ آخسی میں مرزا جہانگیر ہے۔ بخارا میں سلطان علی مرزا ہے۔ ارے تاجداروں کی کوئی کمی تھوڑی ہے۔ اور ان میں کون ایسا ہے جسے ہم جیسے جنگجو بیگوں کی ضرورت نہ ہو۔ ہاں، میرا ایک مشورہ ہے۔ اندجان میں زیادہ دنوں تک قیام نہ کیجئے گا۔ وہاں تو آپ پر کوئی بھی مصیبت نازل ہو سکتی ہے۔"

"تو کیا آخسی جانا چاہیے؟"

"جی ہاں، آخسی۔ اور وہاں حسن سے ملاقات کی کوشش کیجئے گا۔ وہ آپ کو جہانگیر کی ملازمت میں رکھوا دے گا۔"

"واقعی رکھوا دے گا؟ لیکن کیا جہانگیر اپنے بھائی کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی جرأت بھی کر سکے گا؟"

"کر سکے گا۔ اس کے ہاں ایسے بیگوں کی تعداد بڑھ جائے گی تو وہ اسے مشتعل کر دیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ جہانگیر مرزا کو اندجان کے تخت پر قابض ہونے کا بڑا ارمان ہے۔ یقین مانیے!"

اگلے روز شام کو جبکہ احمد تنبل کے معتبر سپاہی پہرا دے رہے تھے، خان قلی بیگ اپنے پچاس سپاہیوں کے ہمراہ شیر دروازے سے چپ چاپ باہر نکل گیا۔ ہفتے بھر بعد ہی خود احمد تنبل بھی چلا گیا۔ اسے راستے میں وارد ہونے والے قافلے کی حفاظت کے لیے ساتھ جانے کا بڑا معقول بہانہ ہاتھ آ گیا تھا۔ وہ گیا اور سمرقند واپس نہ لوٹا۔ اس کے بعد ضروری کاموں سے شہر کے باہر جا کر کہیں غائب ہو جانے والے بیگوں اور سپاہیوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔

رات کو دروازے مضبوطی کے ساتھ بند کیے جانے لگے تو لوگوں نے قلعے کی فصیل سے کود کر بھاگنا شروع کر دیا۔ موسم سرما کے آخری یوم تک یہ حالت ہوئی کہ بابر کے ساتھ آنے والے بیگوں میں سے صرف نصف ہی سمرقند میں باقی رہ گئے۔ بابر نے اپنے ایک معتبر شخص کو اندجان بھیجا کہ وہ بھاگ کھڑے ہونے والے بیگوں کو واپس بلا لے۔ تین دن بعد یہ خبر موصول ہوئی کہ احمد تنبل اور اس کے طرف داروں نے کھلی بغاوت کر کے اس قاصد کو اندجان اور اخسی کے درمیان کسی جگہ روک کر موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔

تب بابر نے قاسم بیگ کے مشورے پر خواجہ عبداللہ کو اندجان روانہ کیا۔ لیکن اوزون حسن اور دوسرے سازشیوں نے جو پہلے خواجہ عبداللہ کے مشوروں پر عمل کیا کرتے تھے اور جن میں سے کچھ تو اس کے مرید بھی تھے، کی بار اس کے مشوروں اور دلائل پر ذرا بھی کان نہ دھرے۔ یہی نہیں، ان لوگوں نے تو کھلم کھلا اندجان پر حملہ بھی کر دیا اور شہر کے دروازوں کو گھیر کر اپنے مرشد خواجہ عبداللہ اور بابر کے وفادار بیگوں کو محاصرے میں پھنسے رہنے پر مجبور کر دیا

وادی فرغانہ میں بغاوت پھیل گئی۔

۵

بغاوت کرنے والے بیگوں کو بالکل اتفاقاً ایک اور بات سے بھی مدد ملنے لگی۔ یہ تھی نوجوان حکمران کی سنگین علالت۔ اس پر مقدر کا غلاف توقع عتاب۔

بابر بستان سرائے محل کی اوپری منزل کی خواب گاہ میں لیٹا ہوا تھا اور تیز بخار اس کے جسم کو ہلکان اور نڈھال کیے دے رہا تھا۔

اندجان سے آئے ہوئے قاصد نے شاہی محافظ دستے کے سردار کو گول لپٹا اور مہر لگا ہوا خط دیا لیکن اس کے ہاتھوں میں نہ دیا۔

"ملکہ عالیہ! حکمران کی والدہ محترمہ کا ارشاد ہے کہ یہ خط صرف حکمران ہی کو دیا جائے۔"

بابر ہر روز دریافت کرتا رہتا تھا کہ اندجان سے قاصد آیا کہ نہیں اسی لیے دستے دار قاصد کو فوراً ہی اوپر لے آیا۔

"پہلے تو وزیر اعظم مطالعہ فرمائیں گے اور خبر اچھی ہوئی تو شاہ عالی کی خدمت میں پیش کر دیں گے" معمر طبیب نے کہا۔

"حکمران کی والدہ محترمہ اور ان کے استاد خواجہ عبداللہ صاحب نے حکم دیا ہے کہ یہ خط صرف انہی کو"

"خبر بد سے شاہ معظم کا مزاج اور بھی ناساز ہو سکتا ہے" طبیب نے اداس لیکن سخت لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔ "چند روز قبل ان کی صحت بالکل ٹھیک ہو چلی تھی لیکن۔۔۔ فکریں تکالیف میں اضافہ کر دیتی ہیں اور تکالیف اپنے ساتھ بیماریاں لے کر آتی ہیں۔ حکمران صحت کی بحالی سے پہلے ہی بستر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور آج تیز بخار نے انہیں دوبارہ بستر سے لگا دیا"

"اندجان کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے" قاصد نے اپنی آخری دلیل پیش کی، "اگر یہ خط فوراً ہی ان کی خدمت میں نہ پیش کیا گیا تو پھر تاخیر ہو جائے گی اور حکمران ناراض ہو جائیں گے۔"

"نہیں، میں یہ نہیں کر سکتا، معاف کیجیے"

"لیکن طبیب صاحب۔"

"نہیں، نہیں۔"

اس بحث کی آوازیں بابر کو بھی سنائی دیں اور اس نے تکیوں کے سہارے بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوری قوت کے ساتھ آواز دی۔

"قاصد ہو تو اسے آنے دیجیے! یہ میرا حکم ہے۔"

زرم پردوں سے بھرا ہوا اس کا گرد خواب گاہ کے کافی اندر پہنچا ہوا تھا۔ قاصد سر سے پیر تک گرد میں اٹا ہوا، گھٹنوں کے بل چلتا ہوا بابر کے پاس پہنچا اور خط کو دونوں ہتھیلیوں پر رکھ کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

بابر نے جس کا چہرہ بخار کی شدت سے تمتمایا ہوا تھا اور جسم لرزے کے دورے سے مرتعش، نیم دراز حالت میں ہو کر سر کو اونچے تکیوں پر ٹکا لیا۔ پھر اس نے مہر کو توڑ کر خط کھولا تو اس کے اندر ایک اور نسبتاً چھوٹا خط بھی ملا۔ بڑے خط پر خواجہ عبداللہ کے دستخط تھے اور چھوٹا قتلوغ نگار خانم کا تھا۔ دونوں کا سبب ایک ہی تھا: اندجان کا محاصرہ کر لیا گیا ہے جس کی مزاحمت کرنا دشوار ہے اور بابر کے سوا اور کوئی بھی انھیں نجات نہیں دلا سکتا۔ دونوں ہی خطوط کے آخر میں جلد از جلد مدد کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔

اندجان کا محاصرہ کر لیا گیا! غدار بیگ اندجان کے تخت پر جہانگیر کو بٹھانا چاہتے ہیں! اس کا مطلب صرف یہ ہوا کہ یہ لوگ احمد تنبل کو سہارا بنانا اور بابر کو اس کے آبائی گھر سے محروم کرنا چاہتے ہیں! اس نے تو سوچا تھا کہ یہ لوگ اپنی حرص و ہوس اور خود غرضی کے باوجود بہرحال اس کے وفادار ہیں، اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ بیگ اس حد تک بڑھ جائیں گے۔

بابر لرزے کے دورے پر قابو نہ پا سکا۔ تکیوں سے کھسک کر نیچے آ رہا اور سر نقاہت کے باعث پیچھے ڈھلک گیا۔

سب کچھ جا رہا!

اندجان میں تنبل اور جہانگیر کو فتح حاصل ہو گئی تو زیادہ تر لوگ ان سے جا ملیں گے! یہاں خود اس کے ساتھ کون رہ جائے گا؟ کیا اس وقت بھی جبکہ وہ بستر پر پڑا ہوا ہے، اس کے آدمی بھاگ بھاگ کر تنبل کے پاس جا رہے ہیں؟ لیکن قاسم بیگ؟... بابر یہ سب سوچ کر بری طرح خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے اپنی ساری طاقت کو یکجا کر کے خود کو اٹھایا اور بستر پر بیٹھ گیا۔

"قاسم بیگ کہاں ہیں؟"

"وزیر اعظم بس آتے ہی ہوں گے، انھیں بلوا لیا گیا ہے۔" طبیب نے نرمی سے کہا۔ "عالی جاہ آپ لیٹ جائیے، آپ کو سکون کی ضرورت ہے۔"

بابر کے اذیت دہ تصور میں اچانک احمد تنبل ہاتھ میں تلوار لیے ہوئے نمودار ہوا۔ وہی تلوار ہے! اوش میں اسی تلوار کا بوسہ لے کر احمد تنبل نے قسم کھائی تھی کہ تمام زندگی وفاداری کے ساتھ اس کی خدمت کرتا رہے گا... اور اب تنبل نے تلوار بلند کی اور اسے بابر کے سر کے اوپر گھمانے لگا... تنبل... کے قدموں میں بورے کے اندر سے انسانی سر نکل کر لڑھکنے لگے۔ ان میں ایک... اے قادر مطلق... اس کی والدہ کا سر!...

بابر اس مہیب نظارے کی تاب نہ لا کر تیزی سے بستر سے نیچے اترا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اسے اپنے برہنہ پیروں

پڑتے ہی اسے کمزوریوں کا واضح احساس محسوس ہوا۔ اس نے خود کو مجبور کر دیا کہ کھڑا رہے ورنہ فرش پر ڈھیر ہو جاتے۔

"مجھے تلوار دیجیے!" بابر چیخ رہا تھا۔ "فوراً، میری تلوار!"

طبیب نے اس کے کانپتے ہوئے جسم کو اپنی بانہوں میں جکڑ لیا

"عالی جاہ! آپ علیل ہیں، آپ کو لیٹے رہنا چاہیے"

بابر کو لگا کہ طبیب اسے احمد تنبل کی تلوار کے وار کے نیچے دھکیل رہا ہے۔ اس کے پیروں کو بچھوؤں کی ڈنگوں کی طرح چھا رہا ہے..... اس نے خود کو طبیب کی گرفت سے آزاد کرا کے لڑکھڑاہٹ پر قابو پایا اور دروازے کی طرف لپکا

"میرا گھوڑا لائیے! میں اندجان جا رہا ہوں! میری تلوار کہاں ہے؟ بیگوں سے کہیے کہ فوراً تیار ہو جائیں!"

طبیب بابر کے پیچھے لپکا اور مستعدی سے کام لیتے ہوئے اس کے شانوں پر پوستین ڈال دیا۔ اس نے دھڑکن کے ایک لمحے میں بابر کے پیروں کے پاس اس کے جوتے رکھ دیے۔ بابر نے ایک جوتا تو پہن لیا لیکن دوسرا پہننے کی اس میں سکت باقی نہ رہی۔ اس کا سر چکرانے لگا اور وہ پلنگ سے دم گھٹتے گھٹتے بچا۔

"غدار!" وہ احمد تنبل سے جو اب بھی ننگی تلوار لیے اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہا تھا، بس اتنا ہی کہہ سکا۔ "خونی، قاتل!"

بابر اچانک ٹھوکر کھا کر گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔

آدھی رات بیت چکی تھی تب کہیں جا کر اسے ہوش آیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ سرہانے کھڑا ہوا طبیب روئی کے ٹکڑے کو بھگو کر اس کے منہ میں اور چہرے پر پانی ٹپکا رہا ہے۔ اسے لگا کہ منہ کے اندر زبان اتنی زیادہ سوج گئی ہے کہ اس کا وزن برداشت نہیں کر پا رہا ہے۔ سارے جسم کو جیسے کوئی بھاری سی چیز کچلے دے رہی تھی۔

قاسم بیگ نے بابر کو آنکھیں کھولتے دیکھا تو اس کی پائنتی میں جا کھڑا ہوا۔

"خدا کا ہزار ہزار شکر! عالی جاہ، آپ نے ابھی ہمیں کتنا ڈرا دیا تھا!"

بابر نے کچھ کہنا چاہا لیکن اپنی بہت زیادہ سوجی ہوئی زبان کو جنبش نہ دے سکا۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے، میرے حکمران؟"

بابر اب بھی خاموش ہی رہا۔ وہ سب کچھ واضح طور پر دیکھ رہا تھا لیکن بول نہیں پا رہا تھا۔ قاسم بیگ سمجھ گیا کہ بابر کی گویائی جاتی رہی۔

اس نے اپنا منہ موڑ لیا تاکہ سولہ سالہ نوجوان اپنے حامی، اپنے سپاہی اور اپنے وزیر کی آنکھوں میں امنڈ آنے والے آنسوؤں کو نہ دیکھ سکے۔

اندجان

۱

رات ویسے بھی تیرہ و تار تھی لیکن کالے بادل گھر آئے تب تو یہ حالت ہو گئی کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دیتا تھا۔

قلعہ گہری تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ خطرے کے باعث اندجان کی سڑکوں پر، گلیوں کوچوں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ چاروں طرف خاموشی کی حکمرانی تھی، کہیں ایک شخص بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ راستے میں قلعے کا پھاٹک، کسی چرچراہٹ کے ساتھ کھلا اور پہریداروں کے حجرے کی کھڑکی سے نکلتی ہوئی مدہم روشنی میں گھڑسوار دستہ لمحے بھر کے لیے چمک اٹھا۔

دستے کی قیادت خان زادہ بیگم کر رہی تھی۔ جسم پر مردانہ چوغہ، سر پر کلاہ، کمر میں چوڑی سی پیٹی اور اس سے لٹکتا ہوا خنجر۔ اس کے سپاہیوں کے درمیان میر عمارت فضل الدین بھی موجود تھا جس کی کمر سے تلوار لٹک رہی تھی۔

قاصد کے سمرقند سے بابر کی سنگین علالت اور اس کے زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہونے کی خبر لاتے ہی قلعے کے محافظین کا ایک حصہ بھاگ کر سازشیوں سے جا ملا تھا۔ ہر مورچے پر تعینات کیے جانے کے لیے سپاہیوں کی کمی محسوس کی جانے لگی تھی۔ شب کے سناٹے میں دشمن کے فصیل پر سیڑھیاں لگا کر چپ چاپ قلعے میں داخل ہو جانے کا خطرہ بڑھ گیا تھا۔ خان زادہ بیگم حفاظتی اقدامات کی خود ہی نگرانی کر رہی تھی۔ اس نے مردانہ لباس چوگان کھیلنے کے لیے تھوڑی پہنا تھا۔

سڑک پر جڑے ہوئے پتھروں سے گھوڑوں کے نعل گھپ اندھیرے میں چنگاریاں نکال رہے تھے۔ فضا میں بارش کی مہک بسی ہوئی تھی، گرم گرم سی ہوائیں چل رہی تھیں۔ فضل الدین نے سوچا کہ فصلِ بہار آنے کو ہے، قلعے کے اندرونی باغات میں خوبانی اور بادام کے درختوں پر پھول آ رہے ہیں۔ بہار میں چاروں طرف دھوپ پھیلی رہتی ہے لیکن اس وقت۔ اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ رات ہے اور تاریکی، کہیں بھی روشنی نہیں ہے۔ قدرتی مناظر، شہر بھر کے اوپر سیاہ چادر پھیلی ہوئی ہے۔

فضل الدین کو وہ مشورے یاد آ گئے جب اس نے خان زادہ بیگم کو مستقبل کے مدرسوں اور محلوں کے نقشے دکھائے اور اس کے سامنے ستائش کلمات سنے تھے۔ بابر کے سمرقند پر قبضہ کرتے ہی میر عمارت کو پوری طرح یقین ہو گیا تھا کہ عالی شان تعمیرات سے متعلق اس کے خواب اب حقیقت میں بدل جائیں گے۔ اس کو مسرور دیکھ کر خان زادہ بیگم بھی خوش ہو اٹھی تھی۔ اسے خان زادہ بیگم نے متعدد بار اپنے پاس بلایا تھا۔ ان موقعوں پر وہ فضل الدین سے دیر تک باتیں کرتی رہتی تھی، پوچھا کرتی تھی کہ محلوں اور مدرسوں کی تعمیر کے لیے کون سی جگہیں بہتر رہیں گی نیز یہ کہ ان کی تعمیر سے متعلق کس طرح تیاریاں کی جانی چاہئیں۔ . .

خان زادہ بیگم اپنے چھ کمروں والے پراسرار مکان کے جہاں وہ کنیزوں کے ساتھ رہتی تھی۔ اگلے حصے والے دیوان خانے میں فضل الدین سے ملاقات کیا کرتی تھی۔ شہزادی عموماً ریشمی کپڑے کی قنات کی آڑ میں بیٹھ کر باتیں کیا کرتی تھی لیکن بعض اوقات تجسس کے مارے اس قنات کو ہٹا بھی دیتی تھی۔

"ذرا دکھائیے تو، گنبد والی عمارت اور میناروں کے بیچ کی جگہ میں آپ کیا بنانا چاہتے ہیں؟" مثال کے طور پر وہ پوچھتی۔

وہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے نقشے کے اوپر جھکتے، دوران کی سانسیں آپس میں ٹکرانے لگتیں۔ خان زادہ بیگم کی آنکھیں چمک اٹھتیں اور میر عمارت کے ہونٹوں پر بالکل اسی طرح جیسے کہ پہلی بار اوش میں یوں تاغ پر ہوا تھا، مہر سکوت لگ جاتی، ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکل پاتا اور اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں۔ وہ کوئی بھی بات جو اس کے کاموں سے غیر متعلق ہو کرتے ہوئے ڈرتا تھا، اپنے نوکروں اور خود خان زادہ بیگم سے بھی اپنی بے قراری کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ سب سے زیادہ ڈراتے قتلوغ نگار خانم کی تیز فہمی سے لگتا تھا جو ان دونوں کی گفتگو کے دوران کئی بار موجود

رہی تھی۔ ایسے موقعوں پر وہ فتوح نگار خانم کی طرف رخ کر کے نیچی نظروں کے ساتھ بار بار ادھر ادھر دیکھنے لگتا۔ ایک مرتبہ
گزشتہ ملاقاتوں میں سے ایک کے دوران خان زادہ بیگم نے اچانک یوں ہی پوچھ لیا تھا:

"چھا یہ تو بتایئے کہ آپ نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟"

"دراصل میں کنوارا ہی مرنا چاہتا ہوں"

"ارے واہ، یہی تو میں بھی چاہتی ہوں"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ... آپ جیسی کوئی عالی نسب خاتون نا کتخدا کیسے رہ سکتی ہے"

"کیوں؟"

"دیکھئے نا... اس دنیا میں کیسے کیسے والا شان، کیسے کیسے نامور تاجدار موجود ہیں جو خود کو خوش قسمت تصور کریں گے..."

"ممکن ہے کہ ایسے تاجدار موجود ہوں، لیکن میر عمارت صاحب! آپ ان میں سے کس کو میرے لیے منتخب کریں گے؟"

"اگر مجھ سے پوچھا جائے تو صرف فرہاد ہی آپ کے لائق ہوتا"

"لیکن فرہاد ہی کیوں؟"

فضل الدین بری طرح بوکھلا گیا اور خان زادہ بیگم نے فوراً ہی دوسرا پر معنی سوال پوچھ لیا
"فرہاد میر عمارت تھا۔ آپ ہی کی طرح۔ شاید اسی لیے؟"

"شہزادی۔ ایسا کہنے کا مجھے کوئی حق نہیں" فضل الدین نے اداسی اور سنجیدگی سے کہا۔
خان زادہ بیگم بھی سنجیدہ اور اداس ہو گئی اور اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"آخر پروردگار نے مجھے تاجدار کی دختر کیوں بنایا؟" اس نے صدق دل سے کہا "اگر میں کوئی معمولی لڑکی ہوتی تو میرے لیے حصول مسرت آسان ہوتا۔"

یہ اعتراف کتنا ہی دردناک کیوں نہ رہا ہو، اس سے فضل الدین کو خوشی ہی ہوئی۔ اس کے دل میں خیال آیا اس کا مطلب تو یہ ہوا نا کہ خان زادہ بیگم نے میری محبت کو بھانپ لیا؟ وہ نہ صرف یہ کہ میری محبت سے واقف ہیں بلکہ میں "تاجدار کی دختر" میں جو بے پایاں کشش محسوس کرتا ہوں اس سے شاید ہمدردی بھی رکھتی ہیں؟ انھوں نے یہ بات کہیں اسی لیے تو نہیں کہی ہے کہ ان کی اور میری حیثیت میں پایا جانے والا فرق خود ان کے لیے بھی باعث پریشانی ہے؟ ویسے تو یہ ممکن ہے لیکن اگر خان زادہ بیگم کو بھی مجھ سے محبت ہو گئی تو میں ان کی اور اپنی حیثیتوں کے اس فرق سے پیدا ہونے والی مشکلات پر کیسے، آخر کیسے قابو پا سکوں گا؟ میں نے اوش میں جو چھوٹا سا حجرہ تعمیر کیا تھا اس کی بنا پر مرزا بابر نے مجھے عزت دی ہے۔ اگر میں ایسی شاندار عمارتیں تعمیر کروں جن سے دنیا میں میری شہرت پھیل جائے تب کیا ہوگا؟ کیا تب بھی میں ممتاز اور عالی نسب افراد کے مقابلے میں حقیر ہی تصور کیا جاؤں گا؟ مرزا بابر اپنی ہمشیرہ کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ وہ نیک دل ہیں۔ شاید وہ ہم دونوں پر مہربان ہی ہو جائیں؟

فضل الدین کو اس کے خوابوں نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا لیکن خوابوں میں رکھا ہی کیا تھا؟ خان زادہ بیگم جس سے وہ محبت کرتا تھا اس پر عنایت کرتی رہتی تھی، اس سے بار بار ملاقات کرنے کی خواہاں رہتی تھی اور فضل الدین کے لیے تو یہ

صورت حال بھی بہت بڑی خوش قسمتی تھی

اس وقت اندجان محاصرے میں تھا۔ باغی شیبانی نے سارے ماوراءالنہر میں بغاوت کی آگ بھڑکا دی تھی۔ سمرقند کی عمارت کے سارے خوبیوں اور ساری مسرتوں کو ظلمت، آندھی تاریک رات کی جیسی ظلمت نگل گئی تھی۔ عمارتوں کے نقشے روئی کا ملبہ ت میں تبدیل ہو گئے تھے۔ وہ جنگ اور بھاڑے کے سپاہیوں سے سخت نفرت کرتا تھا لیکن آج اس بے قبضے میں سمرقند سے موصول ہونے والی خبر بد کی اور خانزادہ بیگم کو پوری طرح دست دیکھا تو وہ خود کو ان سب سے بے تعلق نہ رکھ سکا۔ اس نے سوچا کہ مردہ بر الزام ہو کر مقدر کی مار کا انتظار کرنے سے خانزادہ بیگم کا سپاہی بن کر، ہتھیار اٹھا کر لڑنا کہیں زیادہ بہتر ہوگا۔

پریشان اور مہیب تیرگی میں ڈوبے ہوئے شہر میں اس نے سپاہی کی حیثیت سے سپاہیوں کے درمیان چلتے ہوئے اپنے آپ سے کچھ قدموں ہی کے فاصلے پر خانزادہ بیگم کو دیکھا، سوچا کہ وہ اس کی حفاظت کر سکے گا اور اس خیال سے اسے کچھ سکون میسر ہو گیا۔

ان لوگوں کو مرزا دروازے کے قریب فصیل کے باہر سے قزاقوں کی للکارتی ہوئی آوازیں، جنگی نقاروں کی گونج اور سینکڑوں سپاہیوں کا شور سنائی دیا۔

"دشمن دروازے کھول کر شہر میں داخل ہو جانے کی کوشش کر رہا ہے" خانزادہ بیگم نے چلا کر کہا اور گھوڑے کی لگام ڈھیلی چھوڑ دی۔

سپاہی اپنے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے اس سے آگے نکل کر پھاٹک کے پاس پہنچ گئے۔ لیکن مرزا دروازے کے باہر مچا ہوا شور، یلغار کے بے لگائی جانے والی سیڑھیاں اور فصیل کی دوسری جانب سے اڑ اڑ کر اندر آتے ہوئے تیر۔ یہ سب کچھ محض فریب دینے کے لیے تھا۔ عین اسی وقت دشمن فصیل کے گھیرے کی دوسری جانب پر زیادہ تر سیڑھیاں کھڑی کر رہا تھا۔ اور اس جگہ خواجہ عبد صمد کے پاس سپاہی کم تھے۔

خانزادہ بیگم اپنے سپاہیوں کے ساتھ پہرے داروں کے حجرے میں گئی۔ ایک سپاہی نے مشعل جلائی اور اوپر جانے والے زینے کی سیڑھیاں نظر آنے لگیں فضل الدین ڈر گیا کہ خانزادہ بیگم سیڑھیاں طے کر کے سب سے پہلے فصیل کے اوپر پہنچ گئی اور اس نے دوسروں سے آگے نکل کر زینے پر قدم رکھ دیا۔

منڈیر پر سپاہی کھڑے ہوئے تھے۔ خانزادہ بیگم بھی مشعل ہاتھ میں لیے ہوئے وہاں پہنچ گئی۔ فضل الدین نے فوراً مشعل اس کے ہاتھ سے لے لی۔

"ہوشیار رہیے شہزادی ایسا نہ ہو کہ روشنی میں دشمنوں کی نظر آپ پر پڑ جائے"

محافظین کو ان جوڑی سیڑھیوں کے اوپری حصے نظر آنے لگے جو باہر فصیل سے ٹکا کر لگائی گئی تھیں۔ کمک پہنچ جانے سے پہرے دار کا حوصلہ بڑھ گیا، اس نے جھک کر اپنے دونوں ہاتھوں سے ایک سیڑھی کے اوپری حصے کو پکڑا اور اسے نیچے گرا دینے کی کوشش کرنے لگا لیکن عین اسی لمحے دشمن کا ایک تیر آ کر اس کے سینے میں لگ گیا۔ بیچارا نوجوان سیڑھی سمیت فصیل سے نیچے جا گرا۔

منڈیر کے قریب ہی پتھر ڈھیر تھے۔ خانزادہ بیگم نے ایک بڑے سے پتھر بمشکل اٹھا کر نیچے پھینک دیا۔ اس کے بعد سپاہی بھی پتھر پھینکنے لگے اور فصیل کے باہر نیچے سے ابھرتی ہوئی گالیوں اور کراہنے کی آوازوں سے واضح ہو گیا کہ پتھر

شے پر لگ رہے ہیں۔

اس شاہی فصیل کے گھیرے کے ایک دوسرے حصے میں جہاں خاقان دروازہ واقع تھا، نقاروں اور قرناؤں کی آوازیں اور فتح کے نعرے اللہ میں گونج اٹھے۔ یہ آوازیں تیز ہوتی جا رہی تھیں، قریب آتی جا رہی تھیں، شہر کے ہر گلی کوچے سے ابھر رہی تھیں۔

''شہزادی ذرا غور سے سنیے'' فضل الدین گھبرا کر چیخ اٹھا۔ ''دشمن شہر میں داخل ہو گیا''

نوین کوکتاش مایوسی سے چیخ اٹھا

''ارے شہزادی، غداروں نے خاقان دروازہ کھول دیا۔ فوراً قلعے کو واپس چلیے، قلعے کو، قلعے کو!''

خان زادہ بیگم تیزی کے ساتھ زینے سے اترنے لگی اور میر عمارت فضل الدین اور چند سپاہی مشعلوں سے راستہ دکھاتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے لپکے۔ نیچے پہنچ کر سب لوگ جلدی سے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔

''مشعل کو پھینک دیجیے'' خان زادہ بیگم چلائی۔

مشعل فضل الدین کو واقعی تاریکی میں نظر آتا ہوا بہت اچھا نشانہ بنا دیتی۔ وہ لوگ گھوڑوں کو اندھیرے میں سرپٹ دوڑاتے ہوئے قلب شہر میں واقع قلعے کی طرف چل دیئے۔

لیکن قلعہ تھوڑی ہی دور رہ گیا تھا تو تیز سے اور مشعلیں لیے کثیر تعداد گھڑ سواروں نے ان کا راستہ روک لیا۔ تب انھوں نے مشعلوں کی روشنی میں احمد تنبل کو دیکھا، کمر میں کار چوبی کا پٹکا تھا اور سر پر چمچماتا ہوا خود۔ فضل الدین کو لگا جیسے اچانک اس کے دل کو سرد آہنی زنجیروں نے جکڑ لیا۔

دشمن کے ان سواروں نے خان زادہ بیگم اور اس کے سپاہیوں کو گھیر لیا۔ احمد تنبل نے قہقہہ لگا کر پیچھے میں اپنے ایک سپاہی کو حکم دیا

''ارے وہ مشعل تو دینا۔ آہا، خان زادہ بیگم؟ آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا ہے۔ آخر اس کا مطلب کیا ہے؟ آپ نے یہ ایسا لباس کیوں زیب تن کر رکھا ہے جیسے کوئی بہادر مرد ہوں؟''

''سچے، وفادار اور بہادر مرد دنیا میں رہے ہی کہاں''

''مذاق میں اگر سچے مرد نہیں بچے تو بیجیے ہم حاضر ہیں، شہزادی!''

ازدون حسن جو احمد تنبل کے پیچھے کھڑا ہوا تھا، ہنس پڑا۔ اتنے میں کچھ اور گھڑ سوار آن پہنچے۔ اور مشعل کی روشنی بے ریش علی دوست بیگ پر پڑی جو آنکھیں بھینچے ہوئے قابل رحم انداز سے مسکرا رہا تھا۔ بابر اپنی روانگی کے وقت شہر اسی شخص کو سونپ گیا تھا۔ بابر کے بستر مرگ پر پڑے ہونے کی خبر سننے کے بعد علی دوست بیگ کو اس سے کوئی امید نہیں رہ گئی تھی اور اس نے احمد تنبل سے ساز باز کر کے محاصرین کے لیے خاقان دروازہ کھول دیا تھا۔

خان زادہ بیگم نفرت کے ساتھ چیخ اٹھی

''آپ خود کو سچا مرد تصور کرتے ہیں کیا؟ آپ لوگوں کے لیے تو شجاعت اور غداری میں کوئی فرق ہی نہیں! ابھی کل ہی کی بات ہے کہ آپ نے میرے بابر سے وفاداری کی قسم کھائی تھی اور آج۔ مجھے معلوم ہے کہ کل آپ مرزا جہانگیر کے ساتھ بھی غداری کر بیٹھیں گے!''

تنبل نے اپنی تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھا۔

"اور سوچ سمجھ کر بات کیجیے شہزادی!" اس نے کہا۔ "بے وفائی تو مرزا بابر نے کی۔ ان کے مرقد پر فاش ہو جانے کے بعد تو جہاں مرزا جہانگیر کو تل جانا چاہیے تھا۔ لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوئے۔ ہمیں انصاف کی خاطر تلوار اٹھانی پڑی اور آج ہم ظفریاب ہوئے" "اور آپ ... آپ ..." بیگ جانی غصے سے آگ بگولا ہو گیا۔ "آخر آپ شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کے ہماری بے عزتی کیوں کر رہی ہیں؟ آپ کو یہ طرز عمل سکھایا کس نے جو ایک دختر تاجدار کے قطعاً شایان شان نہیں؟ کہیں اسی میر عمارت نے تو نہیں جو آپ کے سامنے کھڑا ہوا ہے؟"

اور نگاروں کی طرح جھکتی ہوئی آنکھیں فضل الدین کو گھورنے لگیں۔ فضل الدین نے بھی اپنی نظریں نہ جھکائیں۔

"شہزادی نے ہم مردوں کو تہذیب کا سبق سکھایا ہے۔ اس کے بعد کوئی دوسرے معنی کوئی دغاباز ہی پہن سکتا ہے!"

"کون ہے دغاباز!" تحمل نے تلوار کو نیام سے کھینچ کر فضل الدین کی طرف گھوڑا بڑھایا اسی لمحے خان زادہ بیگم نے بھی اپنے گھوڑے کو ایڑی لگائی اور تحمل کو وار کرنے سے روک دیا۔

"کسی میر عمارت پر تلوار اٹھاتے ہوئے شرم آنی چاہیے!"

تحمل اور خان زادہ بیگم کے گھوڑے ایک دوسرے سے ٹکرا کر کانپ اٹھے اور الف ہو گئے۔ تحمل خان زادہ بیگم کے سر کے اوپر تلوار گھمانے لگا۔

"آپ اس کی حفاظت کر رہی ہیں۔ اس نقشے ساز؟ اونچے خاندان کی اس رنگا رنگ ہرائی کی؟ شرم نہیں آتی؟

ارے ہاں، مجھے باخبر لوگوں نے بتایا تھا کہ یہ استاد شہزادی کو گمراہ کر رہا ہے لیکن مجھے یقین نہیں ہوا تھا۔ اب ہو گیا!"

"ارے غدار! تو تو مجھ پر تہمت نہیں لگا سکتا!" خان زادہ بیگم نے غصے سے کہا اور خنجر نکال لیا۔

خنجر تحمل کی زرہ سے جسے وہ چوغے کے نیچے پہنے ہوئے تھا، ٹکرایا اور خان زادہ بیگم کے ہاتھ سے چھوٹ کر جھنجھناہٹ کے ساتھ پتھروں پر جا گرا۔ تحمل نے فوراً ہی وار کیا لیکن تلوار صرف شہزادی کی دستار کے ایک کونے ہی سے لگی جو سرک کر خنجر کے پاس جا گری اور خان زادہ بیگم کے لمبے لمبے بال شانوں پر بکھر گئے۔

اتنے میں مرزا جہانگیر اپنے محافظ دستے کے ساتھ وہاں آ پہنچا۔ اسے دیکھتے ہی علی دوست بیگ نے تحمل کو آگاہ کر دیا۔

خان زادہ بیگم مرزا جہانگیر کی سوتیلی بہن تھی پھر بھی بہر حال بہن تو تھی ہی اور وہ سب کے سامنے اس کی بے عزتی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ احمد تحمل نے اپنے گھوڑے کو جہانگیر کی طرف موڑ کر اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی

"آپ نے دیکھی، دیکھ لیا نا حضرت عالی؟ آپ کی ہمشیرہ ہاتھوں میں ہتھیار لیے ہم پر حملہ کر رہی ہیں۔ ان کے قریب یہ دلی خاندان کا مکار کھڑا ہوا ہے، یہ معمار۔ یہی شخص تو انھیں گمراہ کر رہا ہے!"

"میر عمارت فضل الدین تم جیسے غدار بیگ سے زیادہ پاکباز ہیں، ہزار گنا زیادہ" خان زادہ بیگم چیخ اٹھی۔ "ان کے فن پر اندجان نثار کر سکتا تھا۔ اور آپ، آپ ... سب کے سب قاتل ہیں، غدار ہیں! ... آپ سب پر ہمارے خوابوں کو پاش پاش کر دینے کے لیے پروردگار کا قہر نازل ہو! ... ہمارے خوابوں کو چکنا چور کرنے کے لیے!"

خان زادہ بیگم کے ان الفاظ کے ساتھ ہی ساتھ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ گھوڑے کو چابک مار کے قلعے کے پھاٹک کی طرف جانا چاہتی تھی لیکن سپاہیوں کی دیوار کے سامنے رکنے پر مجبور ہو گئی۔ تب اس نے یہ معلوم کرنے

احاطے میں شورِ قیامت برپا تھا۔ گھوڑوں کی ٹاپوں، کتوں کے بھونکنے، عورتوں کے رونے چلانے، گائیوں کے رمبھانے اور بچھڑوں کے ممیانے کی آوازیں زنداں تک سنائی دے رہی تھیں۔ پہرے داروں کو وہاں کھڑے کھڑے کمائی مالِ غنیمت سے محروم ہونا پڑ رہا تھا۔ یہی کیا کم تھا، کمبخت قیدی بھی ہلکان تھا اور گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے والا تھا۔ ایک پہرے دار نے جو عمر میں دوسرے سے کچھ بڑا تھا بھرّائی ہوئی آواز سے کہا

"تو کہہ رہا ہے کہ ہاتھ میں چوٹ لگی ہے!۔۔۔ ارے بدمعاش کل تو دوسری دنیا میں پہنچ جائے گا، آخر آج یہ ہاتھ کا رونا کاہے کے لیے رو رہا ہے؟"

"جلاد دکھیں گے!"

"چپ رہ، تندولش، خاموش ہو جا ورنہ ادھر آ کے ایک زخم کے دس کر دوں گا!"

"ایسے میں جبکہ موت سر پر کھڑی ہے، مجھے یہ سب سننا پڑ رہا ہے" قطل مدین نے دل ہی دل میں کہا۔ "لوگ آخر اتنے بے رحم کیسے ہو جاتے ہیں؟ کیسی واہیات بات ہے کہ دیوے کو بیچ کر رہا ہوں، موت کو ٹالنا ممکن ہی نہ تھا تو کیا احمق تکل سے لڑ کر تلوار ہاتھ میں لیے لیے جان دینا بہتر نہ ہوتا؟۔۔۔ اس وقت مجھے ان حیوانوں کی گالیاں سننی پڑ رہی ہیں اور کل سنگسار کر دیا جائے گا۔ یہ تو ممکن ہی تھا کہ میں خان زادہ بیگم کے سامنے تکل پر ٹوٹ پڑتا۔ ہائے قسمت، تو نے مجھے ایسا کیوں نہ کرنے دیا؟"

اتنے میں گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں، پہلے پکی سڑک پر اور پھر زنداں کے احاطے میں جہاں فرش پر پتھر جڑے ہوئے تھے۔

"کون ہے؟ ٹھہر جاؤ!"

احاطے میں داخل ہو جانے والے تین گھڑسواروں میں سے ایک نے پہرے دار کو جواب دیا

"محترم قاضی شہر، مولانا خواجہ عبداللہ شاہی فرمان کے ساتھ تشریف لائے ہیں!"

تینوں ایک ایک کر کے گھوڑوں سے اترے اور پہرے داروں کے ترچھے رکھے ہوئے نیزوں کی نوکوں کے عین سامنے تک آ گئے۔

"فرمان تو ہمارے داروغہ کو دکھانا چاہیے" بڑی عمر اور بھرائی ہوئی آواز والے پہرے دار نے کہا۔

احاطے میں کھلنے والے دروازے کے اوپر ایک چراغ ٹمٹما رہا تھا۔

ہلکے زرد چوغے میں ملبوس خواجہ عبداللہ نے نیزوں کی طرف سیدھے بڑھتے ہوئے پُرسکون اور پُر اعتماد لہجے میں کہا

"آپ کے داروغہ کو تو ہم تلاش نہیں کر سکے۔ آپ دونوں کے سوا یہاں آس پاس اور کوئی بھی موجود نہیں ہے۔ ایسا کیوں؟"

عمر میں چھوٹے سپاہی نے اپنی جھلاہٹ چھپائے بغیر جواب دیا

"اور سب لوگ تو مال لوٹنے گئے ہیں!"

خواجہ عبداللہ نے گول لپٹا ہوا کاغذ ان دونوں کو دکھایا۔

"تب تو فرمان کی تعمیل آپ ہی کو کرنی ہو گی" اس نے بڑے پُرسکون انداز سے کہا۔ "لیجیے، پڑھ لیجیے!"

اس کے پیچھے رک جانے والے دونوں سپاہی گھوڑوں کو دیوار کے قریب ایک بلی میں باندھ کر قریب آ گئے۔

''آپ لوگ وہیں ٹھہرے رہیے'' بھرائی ہوئی آواز والا چلایا۔

سپاہی ٹھہر گئے۔ پہرے دار نے نیزہ ہٹا کر خواجہ عبداللہ کے لیے راستہ بنا دیا اور کاغذ کو لے کر اس پر نظر دوڑائی۔ قیمتی کاغذ پر مختصری عبارت درج تھی اور اس کے نیچے بڑی سی مہر لگی ہوئی تھی۔ اس نے کاغذ کو روشنی کے قریب لے جا کر مہر کو غور سے دیکھا (پڑھنا اسے ٹھیک سے نہیں آتا تھا)۔

''ذرا پڑھو تو''

لیکن دوسرا بالکل ہی ناخواندہ تھا۔ خواجہ عبداللہ ہی پڑھ سکتا تھا۔ پہرے دار نے کاغذ کو کئی بار الٹ پلٹ کر خواجہ عبداللہ کی طرف دیکھا

''پیر صاحب، یہ فرمان ہے کاہے کے بارے میں؟''

''اس میں کہا گیا ہے کہ یہاں بند قیدی انتہائی خطرناک غدار ہے اور یہ کہ ہمیں اسے قلعے کے زندان میں لے جانا ہے''

کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے سپاہی نے بلند آواز سے کہا

''محترم قاضی صاحب کو قلعے میں اس بدمعاش سے اچھی طرح پوچھ گچھ کر لینی ہے؟''

خواجہ عبداللہ جان کا قاضی تھا، اس بات سے تو سبھی واقف تھے۔ خود بڑی عمر والا پہرے دار بھی اسے دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ پھر بھی اسے ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ قاضی ابھی کچھ ہی دنوں قبل تک بابر کا حامی تھا۔

''یہ فرمان خود مرزا جہانگیر ہی کا ہے نا؟'' بھرائی ہوئی آواز والے پہرے دار نے نیزے کو مضبوطی سے تھام لیا۔

''شک ہو تو پڑھ کیوں نہیں لیتے!''

''ہمیں اس بدمعاش پر سختی سے پہرہ دینے کا حکم دیا گیا ہے، بہت سختی سے، پیر صاحب!''

''آپ لوگ سختی سے پہرا دینا کہتے ہیں؟ صد باشی کہاں ہیں؟ دہ باشی کہاں ہیں؟ صرف آپ دو ہی سپاہی یہاں کیوں تعینات ہیں؟ اور اگر ... اگر مجرم کے حمایتی زیادہ تعداد میں آ جائیں تو؟ نہیں، اس قیدی کو فوراً قلعے میں لے جانا ہوگا! دروازہ کھولیے!''

جوان پہرے دار نے خود سے بڑی عمر والے ساتھی کی طرف دیکھا: کیا دیکھ نہیں رہے ہو؟ یہ قاضی صاحب بھی مرزا جہانگیر کے طرف دار ہو گئے ہیں۔ لیکن دوسرا پہرے دار اب بھی تذبذب میں مبتلا تھا۔

''لیکن ہم دہ باشی کو کیا جواب دیں گے؟''

''آپ دونوں کو بھی ہمارے ساتھ چلنا ہوگا'' خواجہ عبداللہ نے کہا۔ ''اس کی نگرانی تو ہم سب کو کرنی ہوگی، دو سپاہی ناکافی ہوں گے!''

بھرائی ہوئی آواز والا اس دلیل سے شاید مطمئن ہو گیا اور اس نے نیزے کو دیوار سے ٹکا کر دروازے کا قفل کھول دیا۔ لیکن وہ اندر قدم رکھ بھی نہیں پایا تھا کہ خواجہ عبداللہ کے ایک ساتھی نے اس کے خود پر زوردار وار کر کے کوٹھری کے اندر دھکیلتے ہوئے اسے اپنے قدموں میں گرا لیا۔ ان لوگوں نے دوسرے سپاہی کو بھی جو ہکا بکا رہ گیا تھا، ٹھکری مار کر فرش پر گرا دیا اور اس کے سر پر تک بوری چڑھا دی۔

خواجہ عبداللہ نے اپنے ساتھیوں سے صاف آواز سے کہا:

"انھیں ہلاک نہ کیجیے۔ ہم کسی کا خون اپنی گردن پر نہیں لینا چاہتے"

"لیکن یہ لوگ بعد میں ہمارے نام بتا دیں گے"

جوان پہرے دار سیاہ بوری سے اپنے سر کو نکالنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے روتی آواز میں منت سماجت کرنے لگا

"پیر صاحب، رحم کیجیے، میرے پیر! میں کبھی بھی آپ کا برا نہ چاہوں گا! میری جان نہ لیجیے!"

"خاموش ہو جاؤ ورنہ انجام برا ہوگا" سپاہی چلایا اور فضل الدین نے اپنے بھانجے کی آواز پہچان لی۔

"ٹھہرو!" خواجہ عبداللہ نے طاہر کو حکم دیا۔ "ہاتھ پیر باندھ دو، اس کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ اور دوسرا والا تو بے ہوش ہی ہو چکا ہے"

"میں دیکھتا ہوں!"

فضل الدین طاہر اور خواجہ عبداللہ کی طرف لپکا

"محترم استاد!.. میرے بھانجے! طاہر جان!.. میرے نجات دہندو!.."

خواجہ عبداللہ میر عمارت کو محبت بھرے انداز میں لیکن مضبوطی کے ساتھ سہارا دیتا ہوا ٹھوکریں کھائے بغیر ہی احاطے میں لے آیا۔ یہاں اس نے دروازے کے اوپر رکھے ہوئے چراغ کی روشنی میں فضل الدین کے ہاتھوں پر بندھی ہوئی رسی خنجر سے کاٹ دی۔

طاہر اور اس کا ساتھی دوسرے پہرے دار کو بھی گھسیٹ کر کوٹھری میں لے گئے اور باہر سے دروازہ بند کر دیا۔

"میرے عزیز بھانجے، خدا نے تمھیں یہاں کیسے بھیج دیا؟"

"میں سمرقند سے آیا ہوں، قاصد بن کر"

"مرزا بابر کی صحت کیسی ہے؟"

"وہ صحت یاب ہو چکے ہیں۔ مدد کے لیے جلد ہی یہاں پہنچنے کو ہیں!"

"انھیں معلوم ہے کہ اندجان پر دشمنوں نے قبضہ کر لیا؟"

"ابھی تک تو نہیں، یہی تو مصیبت ہے..."

خواجہ عبداللہ نے چپکے سے کہا

"آہستہ آہستہ بولیے، مہربانی کر کے آہستہ آہستہ"

طاہر نے ماموں کو اپنے گھوڑے پر بٹھا لیا اور وہ لوگ دھیرے دھیرے، بڑی چوکسی کے ساتھ شہر سے باہر نکلنے لگے۔ خوش قسمتی سے رستے میں انھیں کوئی بھی نہ ملا۔ فاتحین تو گھروں کو لوٹنے میں مصروف تھے۔

تین گھوڑوں پر سوار یہ چاروں افراد فصیل کے پاس پہنچ گئے۔ وہاں بھی کوئی موجود نہ تھا۔

"باہر اترنے کے لیے موزوں ترین جگہ یہی ہے" خواجہ عبداللہ نے کہا جس نے ایک بار بھی اپنی آواز اونچی نہیں ہونے دی تھی۔ طاہر کے ساتھی نے لپٹی ہوئی رسی کا ایک بڑا سا گولا خرجی سے نکالا۔ طاہر نے رسی فصیل پر پھینکی اور اس کے سہارے وہ چاروں فصیل کے اوپر چڑھ گئے۔ خواجہ عبداللہ فضل الدین کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا (دروازے سے ہو کر باہر نکلنا خطرناک ہے)۔ "میں سمجھ رہا ہوں، پیر صاحب، شکریہ، استاد محترم!" اس نے اپنی بغلی جیب سے کچھ نکال کر میر

خواجہ عبداللہ پر سینکڑوں نگاہیں جمی ہوئی تھیں۔ اس کے دل میں خیال آیا اگر اس وقت تمبل سے ڈر جاتا ہوں، بوکھلا اٹھتا ہوں تو لوگ سوچیں گے کہ واقعی مجرم ہوں۔

اور اس نے پراعتماد اور پرسکون نظر آنے کی کوشش کی

"پہرے داروں کو تو میں نے مرزا بابر کی مہر دکھائی تھی۔ میں تو کس ہی کو ندجان کا حکمران تسلیم کرتا ہوں۔"

"ارے بے ایمان تو اب بھی اپنے مریدوں کو فریب دینے کی کوشش کر رہا ہے! اور کوس کی مہریں ہو سکتی ہیں جو بابر کا سمرقند میں انتقال ہو چکا ہے۔ تخت کے حق دار مرزا جہانگیر ہیں"

"مسلمانو! اس جھوٹ پر یقین نہ کیجئے! احد کے فضل و کرم سے مرزا بابر زندہ و سلامت ہیں۔ وہ ندجان آ رہے ہیں"

"جھوٹ تو خود ہی بول رہا ہے۔ لوگو! یہ شخص اپنے مریدوں کو فریب دے رہا ہے، اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے ایک مجرم کی، اپنے یک یار کی فرار ہو جانے میں اعانت کی ہے۔ بے ایمان پیر کو سزائے موت ملنی چاہیے! لوگو! سنگسار کر دیجئے اسے! آپ کوئی نیک کام کرنا چاہتے ہوں تو سنگسار کیجئے اسے!"

تمبل نے کاٹھی سے یوں نیچے لٹک کر جیسے گھڑ سواروں کے مذبوح بکرے کو زمین سے اٹھانے کے کھیل میں حصہ لے رہا ہو، گھوڑے کے سم کے قریب سے پھرتی کے ساتھ مٹھی کے برابر ایک پتھر اٹھایا اور دوبارہ کاٹھی پر بیٹھ کر خواجہ عبداللہ پر مار دیا۔ پتھر خواجہ کے کشادہ سینے پر لگا اور سفید کرتے پر غبار کی لکیر بناتا ہوا لڑھک کر زمین پر گر گیا۔ اچانک اٹھنے والے درد سے خواجہ عبداللہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

سپاہی جھک کر موزوں پتھر تلاش کرنے لگے۔ خواجہ عبداللہ پوری قوت کے ساتھ چلایا

"ارے مسلمانو! آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔ ہوش میں آیئے!"

اتنے میں اسے ہجوم میں ایک بیس سالہ نوجوان دکھائی دیا اور اس کے ذہن میں اس واقعے کی یاد واضح طور پر تازہ ہو گئی جب یک روز میر آب گاؤ کو سزائے موت دی گئی تھی۔ یہ نوجوان درویش گاؤ کا بیٹا تھا، اپنے باپ کی ہو بہو تصویر۔ خواجہ عبداللہ نے سوچا کاش اس موقع پر اس نے بابر سے کہا ہوتا "اس شخص کو سزائے موت نہ دیجئے" کاش اس نے یہی کیا ہوتا! لیکن اس نے تو دوسرا ہی مشورہ دیا۔ احمد تمبل جیسے بیگوں کی مرضی کے خلاف قدم نہ اٹھایئے۔ وہ ایک بے قصور شخص کی حفاظت نہیں کر سکا تھا۔ اور اب وہ خود ہی اس حالت کو پہنچ گیا تھا کہ اسے بلا کسی جرم کی سزائے موت دی جانے والی تھی۔ اور اب درویش گاؤ کا بیٹا اپنے باپ کی موت کا بدلہ لینے کے لیے اس پر پتھر و کرے گا۔ ضرور کرے گا اور کیا بیٹے کا یہ اقدام جائز نہ ہوگا؟ لیکن ابھی کوئی خواجہ عبداللہ کو پتھر نہیں مار رہا تھا۔ اس نے تو ایک آدمی کی جان بچائی تھی، سزائے موت آخر کیوں؟

"مسلمانو!" خواجہ عبداللہ ایک بار پھر زور سے چلایا۔ "میں انصاف کی راہ میں اپنی جان قربان کرنے سے نہیں ڈرتا! لیکن حق و انصاف پر ہے کون؟ ذرا یہ بھی سوچئے۔ چھوٹے بھائی کو بڑے بھائی کا دشمن کون بنا رہا ہے؟ نیک آدمیوں سے خار کون کھاتا ہے، کون ہے جو انہیں پتھروں، تلواروں یا بہتان تراشی کے ذریعے موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کر رہا ہے؟ ہمارے لیے مصائب کے یہ یوم آخر لایا کون ہے؟"

"تو خود ہی لایا ہے...." احمد تمبل برس پڑا۔

"میں نے تو مرزا بابر کو بچپن ہی سے علم حاصل کرنا سکھایا، انھیں اوصاف پسند بادشاہ بننے اور ماوراالنہر کو متحد کرنے کا شعور دیا تاکہ اقربا کش جنگیں ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں۔ مرزا بابر نے یک عظیم کام ہاتھ میں لیا۔ سمرقند اور اندجان کو متحد کرنا شروع کیا۔ میں صدق دل سے مسرور ہوں لیکن آپ ... آپ لوگوں نے کیا کیا؟ بدبختو! آپ نے تو ایک بار پھر سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ... مسعود تو میری موت سے اگر آپ کی بدنصیبی ختم ہوتی ہو تو ضرور میری جان لے لیجیے میں تیار ہوں"

"اٹھاو پتھر، جلدی کرو، جلدی" تنبل نے ہجوم کو حکم دیا۔

کسی شخص نے ہچکچاتے ہوئے روتی ہوئی آواز میں مخالفت کی

"شیخ الاسلام کے فتویٰ کے بغیر ہم ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟"

کسی بوڑھے نے اعتراف کیا

"ہم پیر کے قہر سے ڈرتے ہیں"

سپاہی تک پتھر مارنے کی جرأت نہ کر سکے اور انھیں ہاتھوں میں لیے ہوئے تنبل کی طرف مڑے۔ اس نے غصے سے پاگل ہوتے ہوئے حکم دیا

"ارے صدباشی تلوار کھینچ کر اس کا سر تن سے جدا کر دو!"

حبشی جیسے سیاہ فام صدباشی نے چاندی کے دستے والی تلوار نیام سے نکال لی۔ خواجہ عبداللہ نے اس سے آنکھیں ملا کر دھیرے سے انتباہ دیا

"دیکھو، میر بدبیگ، کہیں میرا معصوم خون تمہاری سات پشتوں کو تباہ نہ کر ڈالے"

ہجوم میں سہمی سہمی سرگوشیاں سنائی دیں۔

"پیر صاحب کا خون ہماری گردنوں پر ہوگا"

صدباشی کی تلوار اوپر نہ اٹھ سکی۔ اس نے اپنے آقا سے التجا کی

"محترم بیگ، مجھے اس کار بد سے معاف فرمایئے"

تنبل نے اس کی پیٹھ پر زور سے چابک رسید کر دیا۔

"میں نے تجھے صدباشی کے عہدے سے برطرف کر دیا، بزدل کہیں کا۔ خیر ٹھیک ہے اسپاہیو۔ اس بے ایمان کو دروازے کے پاس والی حوالات میں لے جاؤ۔ اور آپ" اس نے ہجوم کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھا، "آپ لوگ یہیں رہیے! کسی نے ہمارے پیچھے پیچھے آنے کی جرأت کی تو سر قلم کر دیا جائے گا! ذرا بھی رحم نہیں کروں گا۔ ذرا بھی!"

کوئی گھنٹے بھر بعد احمد تنبل اپنے سپاہیوں کے ہمراہ حوالات سے قلعے میں آ گیا۔ بعد میں اہل اندجان حوالات کے نزدیک پہنچے تو انھوں نے خواجہ عبداللہ خاقان دروازے کے شہتیر سے لٹکتے دیکھا۔ پیر کا عمامہ زمین پر اس کے پیروں کے پاس پڑا ہوا تھا اور میت سیدھی ہو کر اکڑ گئی تھی۔ لوگوں نے میت کو احتیاط کے ساتھ پھانسی کے پھندے سے نکالا اور بے گناہ ہلاک کیے جانے والے شہید کی طرح سپرد خاک کر دیا۔

۴

فصل بہاراں کی مسلسل بارشوں کو دلدل میں تبدیل کر دیا تھا۔ طاہر اُڑتے ہوئے چھینٹوں کے درمیان کیچڑ سے اَٹے اپنے گھوڑے کو ذرا بھی دم لینے کا موقع دیئے بغیر سرپٹ دوڑائے جا رہا تھا۔ اسے جلد از جلد سمرقند پہنچ کر اندجان سے واقعات کی تفصیلات بیان کرنی تھیں۔ اگر مرزا بابر صحت یاب ہو کر اہل اندجان کی وفاداری پر اعتبار کرتے ہوئے سمرقند سے روانہ ہو جاتا، اگر اسے بروقت انتباہ نہ دیا جاتا تو برا ہوتا، بہت برا! اور اس لیے طاہر گھوڑے کو مسلسل دوڑائے جا رہا تھا۔ اس کا گھوڑا کافی طاقتور تھا لیکن کیچڑ میں ٹانگیں بری طرح دھنس دھنس جاتی تھیں اور دوڑنے میں بہت زور لگانا پڑ رہا تھا۔ آخر کار وہ نڈھال ہو کر گر پڑا اور اس کے نتھنوں سے جھاگ کے ساتھ ہی ساتھ خون بھی بہنے لگا۔ یہ واقعہ قوقند کے نزدیک پیش آیا۔ طاہر نے کاٹھی کھول کر اپنے ساتھ لی، پیدل چلتا ہوا قوقند پہنچا اور وہاں دوسرا گھوڑا لیا۔ پر یہ گھوڑا تو چوبیس گھنٹوں کی دوڑ بھی نہ برداشت کر سکا۔ اور ابھی تو قند، خوجند، ورجرخ آنے باقی تھے، کوئی دس دنوں کا سفر درپیش تھا... طاہر اپنے اوپر سے اُڑ کر جاتے ہوئے طائروں کو رشک بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

ویسے طاہر اگر طائر بن کر پرواز کرتا تو بھی سمرقند میں بابر سے ملاقات نہ کر پاتا۔ بابر اپنی ماں اور استاد کی مدد سے بعجلت نکل کھڑا ہوا تھا۔ سفر میں وہ تیز رفتاری نہ تھی جتنی کہ وہ چاہتا تھا لیکن اسے یہ امید بھی تو تھی کہ اندجان کافی دنوں تک محاصرے کو جھیل سکے گا۔ اندجان میں سال بھر کے لیے رسد اور خواجہ عبد اللہ جیسے دلیر شخص کی قیادت میں بہادر افراد موجود تھے۔ سمرقند نے تو ان دونوں سہولیات سے محروم ہونے کے باوجود سات مہینوں تک محاصرے کو برداشت کیا تھا۔

سمرقند سے روانہ ہو کر بابر بلنغور گاؤں اور خیلیہ قلعے کے پاس سے گزرتا ہوا دریائے سنگ زار کے کنارے پہنچ گیا۔

بابر کو جو طویل علالت کے بعد حال ہی میں صحت یاب ہوا تھا، سواری گاڑی میں سفر کرنے کے لیے راضی کر لیا گیا تھا۔ گاڑی میں نرم گدے بچھے اور دونوں پہلوؤں پر اور پیچھے کی طرف پردے لگے ہوئے تھے۔ گڑھوں میں پہیے دھچکا کھاتے تھے تو یہ سرخ پردے آگ کی لپٹوں کی طرح لہرانے لگتے تھے۔ بابر پر بھرے گدوں سے نیچے کھسک کر بھی پردے کو ہٹاتا اور پیچھے چھوٹتے ہوئے راستے کو اشتیاق کے ساتھ دیر تک دیکھتا رہتا تھا۔

لشکر سے کوئی فرسنگ بھر پیچھے پیچھے ایک اور گھوڑا گاڑی بھی جو نسبتاً زیادہ خوبصورتی کے ساتھ آراستہ کی گئی تھی چلی آ رہی تھی۔ اس گاڑی پر جس کی حفاظت کے لیے کافی گھڑ سوار موجود تھے، بابر کی خالہ مہر نگار خانم اور منگیتر عائشہ سوار تھیں۔ بخارا کے حکمران سلطان علی نے یہ خبر پاتے ہی کہ بابر سمرقند کو چھوڑ کر جانے کا ارادہ رکھتا ہے، شہر سبز کے قریب اپنی فوج جمع کر لی تھی جو دارالحکومت پر حملہ کرنے کے لیے تیار تھی۔ بابر کو پہلے ہی سے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے سمرقند کو چھوڑ دینے سے کیا نتائج برآمد ہوں گے اسی لیے اس نے اپنی منگیتر کے سمرقند ہی میں ٹھہرے رہنے کو مناسب نہیں خیال کیا تھا۔ سلطان علی سے اسے کبھی بھی کسی نیک بات کی توقع نہیں رہی تھی۔ خود مہر نگار خانم اور عائشہ بیگم بھی ہر قسم کے خطرات سے جلد از جلد دور نکل جانے کی خواہاں تھیں، ان کے لیے تو وہی بہت تھا جو بڑے سقوط کے عہد میں جھیل چکی تھیں۔ اس وقت ان لوگوں کے لیے تاشقند محفوظ ترین مقام تھا جہاں مہر نگار خانم کا بڑا بھائی اور بابر کا ماموں محمود خان برسر اقتدار تھا۔

عائشہ بیگم کی بہن رضیہ سلطان بھی جو محمود خان کے بیگم تھی، تاشقند ہی میں تھی۔ تاشقند اور اندجان کا راستہ بھی جو رخ تک ایک ہی تھا اس لیے بابر نے خانزادہ، منگیتر اور ان کے متعلقین کو جو اس سبب سے ساتھ سفر کر رہے تھے، راستے میں حفاظت کے خیال سے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اس خیال سے کہ رسم و رواج کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے، مستقبل کے دولہا دلہن کے درمیان فرسنگ بھر کا فاصلہ برابر برقرار رکھا جا رہا تھا اور وہ الگ الگ فوجی دستوں کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ شام کو لشکر نے دریائے سنگ زار کو عبور کر کے سرسبز و شاداب ٹیلوں پر پڑاؤ ڈالا تب بھی یہ دوری برقرار رہی اور خیمے الگ الگ ہی نصب کیے گئے۔

ٹیلوں کی ڈھلانوں پر لالے کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ آسمان صاف و شفاف تھی اور ہلکی ہلکی ہوائیں چل رہی تھیں۔

بابر نرم گھاس پر ٹہلتے ہوئے خود کو مسرور و بے فکر سا محسوس کر رہا تھا۔

سمرقند سے کوچ کرتے وقت اسے جن اندیشوں اور فکروں نے مغلوب کر رکھا تھا وہ دھیرے دھیرے غائب ہوتی جا رہی تھیں۔

پھر بھی کچھ باتیں اس کے حوصلے پست کر رہی تھیں۔

جانے کتنی مشکلات جھیل کر سمرقند پر قبضہ کیا اور پھر خود اپنی مرضی ہی سے اسے چھوڑ دیا تھا! اسے لگتا تھا جیسے اس کے سارے اقدامات پر، ساری کوششوں پر پانی پھیر دیا گیا ہو اسی لیے گزشتہ کچھ دنوں سے اس کی ذہنی کیفیت ناخوشگوار رہتی تھی۔ لیکن اس وقت ان ہرے بھرے ٹیلوں پر تازی ہوا میں مسرت کے ساتھ سانس لیتے ہوئے وہ سمرقند یا اپنے اولوالعزمانہ منصوبوں کے بارے میں نہیں بلکہ اس بارے میں سوچ رہا تھا کہ وہ اپنی ماں اور اپنے استاد کی حفاظت کرنے کے لیے جا رہا ہے جو دل کی آواز پر کان دھرنے سے متعلق خانزادہ بیگم کے مشورے کی موجب اطمینان بخش نیکی اور شرافت کی بات تھی۔ ان کی حفاظت میں اس کی منگیتر بھی سفر کر رہی تھی، یہ بھی ایک نیک کام تھا اور اس نے سوچا کہ اسے ایسے ہی بہادرانہ کارنامے انجام دینے چاہئیں۔

بابر دھیرے دھیرے ویسا ہی ہوتا جا رہا تھا جیسا کہ در حقیقت تھا۔ لشکر نے تنگ پہاڑی درے "باب تیمور" کو پار کیا تو اس نے گھوڑا گاڑی کا دروازہ کھولا اور سائیس کو بلا کر حکم دیا:

"مے..... میرا بجو..... راگھو..... ڈال..... دو"

بابر پوری طرح صحت یاب ہو جانے کے باوجود اب بھی ہکلا رہا تھا جو طویل علالت کا نتیجہ تھا۔ قاسم بیگ نے اس کی یہ بات سنی تو اپنے گھوڑے کو اس کی گاڑی کے پہلو میں لے آیا۔

"عالی جاہ، آپ کو اس وقت گھوڑے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟"

بابر نے اس اندیشے سے کہ وہ دوبارہ ہکلانے لگے گا صرف اثبات میں سر ہلایا اور سائیس کو سخت نگاہوں سے دیکھا گویا کہہ رہا ہو: "میرے حکم کی تعمیل کرو!"

قاسم بیگ نے اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی۔ چھوٹی داڑھی اور سفید بالوں والے پستہ قد طبیب نے کھلے دروازے کے قریب چلتے ہوئے اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی، منت سماجت کے انداز میں کہا کہ وہ گھوڑے کی سواری کم از کم تین چار دن اور نہ کرے لیکن بابر نے پریشان ہو کر جواب دیا

"کچھ گھڑ سو..... ری کرنا چا..... چاہتا ہوں!"

سائیس گھوڑے کو جس کی پیٹھ پر نمدہ پڑا ہوا تھا اور کاٹھی دھوپ میں چمک رہی تھی، لے آیا۔

"اسے واپس لے جاؤ" قاسم بیگ نے چلا کر کہا لیکن بابر نے اسے گھوڑے کی زین سے جست لگاتے ہوئے حکم دیا

"نہیں، گھوڑا لے آؤ" اور مسکراتے ہوئے اضافہ کیا "آپ بے شک شہسوار ہیں بیگ"

گھوڑا گاڑی روک دی گئی۔ بابر اس میں سے نیچے کی سیڑھیوں سے اتر کر گھوڑے کے پاس گیا اور رکاب میں پاؤں رکھ کر پھر اگلی قاش زین کو پکڑ کر اچھلا اور پہلی ہی کوشش میں سوار ہو گیا۔ سائیس نے خوشی سے مسکراتے ہوئے لگام پکڑا دی۔

قاسم بیگ اپنے گھوڑے پر بابر کے بالکل پیچھے پیچھے چلنے لگا تاکہ ضرورت پڑنے پر فوری مدد کر سکے۔

لیکن وہ لوگ جرخ تک آرام کے ساتھ پہنچ گئے۔

بابر گھڑ سواری کے لیے جس کا وہ بچپن ہی سے عادی تھا، بہت ترس رہا تھا۔ گاڑی کے اندر بچھے ہوئے پردے، نرم گدے اسے بستر علالت کی یاد دلا رہے تھے۔ لیکن بھورے گھوڑے کی شوخ اور پھرتیلی چال نے اس کے جسم کے اندر جیسے شباب کی ان توانائیوں کو بیدار کر دیا جو علالت کے دوران پڑی گھٹ رہی تھیں۔ وہ گھوڑے پر جتنا زیادہ فاصلہ طے کرتا جا رہا تھا اتنا ہی زیادہ خود کو تندرست اور توانا محسوس کرتا جا رہا تھا۔

جرخ سے آگے بڑھ کر رات کے لیے ایک بار پھر ہرے بھرے ٹیلوں پر پڑاؤ ڈالا گیا۔ بابر اور اس کی منگیتر کے خیمے یہاں بھی ایک دوسرے سے خاصی دوری پر نصب کیے گئے۔ لیکن بابر کے اس روز گھڑ سواری کرنے کی اور خود کو پوری طرح تندرست محسوس کرنے کی خبر اس کی منگیتر اور خالہ تک بھی پہنچ گئی۔

مہر نگار خانم بابر کی خالہ ہونے کے ساتھ ہی ساتھ اس کی منگیتر کے لیے ماں کا درجہ بھی رکھتی تھی اس لیے اس موقع کو تحائف کے تبادلے کے لیے بہت مناسب تصور کیا گیا۔ وزیر نماز مغرب کے بعد بابر کے لیے مہر نگار خانم کے دیے ہوئے تحفے لے کر آیا سنہرا جوشن، زردوزی کے کام کا پٹکا اور چاندی کے دستے کا چابک۔ جوشن بابر کی صحت یابی پر ظہور مسرت کی علامت تھا۔ پٹکا اس خواہش کا آئینہ دار تھا کہ بابر کی قوت اور عظمت میں اضافہ ہو۔ لیکن چابک... چابک شاید اس لیے بھیجا گیا تھا کہ وہ آج دن بھر گھڑ سواری کرتا رہا تھا؟ یا شاید اس کا کوئی اور مفہوم تھا، شاید یہ کہ وہ تیزی سے گھوڑا دوڑاتا ہوا اندجان پہنچے اور دشمنوں کو نیست و نابود کر دے؟

ان تحائف سے بابر کا دل باغ باغ ہو اٹھا۔ اگلے روز ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا ہونا تھا، وہ اس مقام پر پہنچنے والے تھے جہاں سے تاشقند کا راستہ شمال کی جانب مڑ جاتا تھا۔

خالہ کے واسطے بھی جوابا کچھ تحائف کا بھیجا جانا ضروری تھا لیکن سوال یہ تھا کہ کون سی چیزیں بھیجی جائیں؟ راستے میں ایسے تحائف کہاں مل سکتے تھے جو خوا تین کو پسند آتے؟ چاروں طرف بے کراں صحرا پھیلا ہوا تھا... قاسم بیگ نے ہمیشہ کی طرح اس موقع پر بھی ذہانت سے کام لیا اور اشرفیوں سے بھری ہوئی چاندی کی طشتری بھیجنے کی تجویز پیش کی۔ بابر نے اس تجویز کو کچھ اور بھی وسعت دے دی۔ اشرفیوں سے بھری ہوئی طشتری اس گھوڑا گاڑی میں رکھ کر بھیجی جائے جس پر وہ سفر کرتا رہا تھا۔

"تاکہ گاڑی بھی تحفہ ہی تصور کی جائے؟ لیکن حکمران کل آپ کو گاڑی کی ضرورت پڑ گئی تو؟"

"مجھے پاک پروردگار پر بھروسا ہے۔ خیر... ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس گاڑی میں خواتین سفر

کریں!”

قاسم بیگ نے اس بات کو حکم تصور کرتے ہوئے مزید مخالفت نہ کی۔

اگلے روز صبح ہی صبح دو شاندار گاڑیوں، ارابوں اور رتھوں پر مشتمل قافلہ سمرقند سے روانہ ہوتے ہوئے تاشقند جانے والے رستے پر شمال کی سمت مڑ گیا۔ اس کے ساتھ پیچھے سے سفر کرتے ہوئے محافظ دستے کے علاوہ بابر کے لشکر سے منتخب ہوئے سو سپاہی بھی روانہ کیے گئے۔

جلد ہی یہ قافلہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ لشکر بھی اپنے رستے پر روانہ ہو گیا پھر بھی بابر ایک ٹیلے پر چڑھ کر دیر تک اپنے لشکر کو نہیں بلکہ شمال کی سمت جاتی ہوئی گاڑیوں کو دیکھتا رہا جو بے کراں صحرا میں غائب ہو رہی تھیں۔ وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے اپنی منگیتر کو رخصت کر رہا ہو، سو بے خبر کہہ رہا ہو اور اس کے سلسلے میں اپنے قلبی لگاؤ اور احترام کا طلب گار رہا ہو۔

بابر نے سمرقند میں سو دن گزارے تھے لیکن عائشہ بیگم سے ایک بار بھی ملاقات نہیں کی تھی۔ ملاقات میں رسم و رواج کی دیواریں بھی حائل تھیں اور نوجوانی کا شرمیلا پن بھی۔ اس وقت ٹیلے پر کھڑے کھڑے اسے اپنی اس غزل کا خیال آ گیا جسے اس نے بستان سرائے محل میں کہنا شروع کیا تھا

حسن کا تیرے ہے چرچا ہر جگہ پر ماہ رو
وصل تیرا مجھ کو کب ہو گا میسر ماہ رو

پھر وہ گھوڑے پر سفر کرتے ہوئے اس غزل کے مزید اشعار کہنے کی کوشش کرتا رہا

سر نہ پہنچا تیرے زانو تک تو جاؤں گا چلا
جانے گا لے کر جہاں مجھ کو مقدر ماہ رو

قوش تیگرمان مقام پر جہاں رات بسر کرنے کے لیے لشکر نے پڑاؤ ڈالا، بابر نے اس شعر کو جس نے اسے تڑپا دیا تھا، کاغذ پر لکھ لیا اور طے کیا کہ غزل کا آخری شعر یہی ہوگا۔ بیچ کے تین چار اشعار کو اس نے بعد میں فرصت پر سکون لمحات میں تخلیق کرنے کا فیصلہ کیا

ہاں، اندجان کے مہیب واقعات بابر سے قریب تر آتے جا رہے تھے۔ طاہر ان کی خبریں لیے ہوئے چلا آ رہا تھا۔

بابر کے لشکر نے جب دریائے نو کو پار کیا تو طاہر قوقند سے آگے بڑھ کر ہادروش ریگستان میں داخل ہو رہا تھا۔ لشکر کے چھ راتوں کے پڑاؤ کے بعد ساتویں دن خوجند کے قریب اس کے سامنے کے رخ سے مشکی گھوڑے پر سوار طاہر آتا دکھائی دیا جو غبار سے بالکل سیاہ اور تھکن کے مارے اپنی پرچھائیں ہو کر رہ گیا تھا۔

“آپ سمرقند سے کیوں روانہ ہو گئے، عالم پناہ؟” قاصد نے روتے چلاتے ہوئے کہا

اندجان پر دشمن کے قبضے، اور شہر کے دفاعی انتظامات کے ذمے داروں کی غداری کی خبر سے بابر کو سخت صدمہ پہنچا۔ اسے لگا جیسے دنیا کی بنیادیں ہل اٹھیں، زمین و آسمان یوں کانپ اٹھے جیسے زلزلہ آ گیا اور دائیں جانب بہتا ہوا سیر دریا اپنے کناروں کو توڑ کر دور دور تک طغیانی لے آیا۔

دریا کے اس پار خوجند کی پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ کتنی دور تھا اندجان وہاں سے، آہ، کتنی دور! اور سمرقند بھی کتنی دور پیچھے چھوٹ گیا تھا، ظالم قسمت بابر کو فریب دے کر یہاں لے آئی تھی، اور اس نے اپنے ایک ہی وار سے اندجان سے

بھی محروم کر دیا تھا اور سمرقند سے بھی۔ اسے زمین اور آسمان کے درمیان معلق دیکھ کر اندجان میں اس پر عدم تحمل فسردہ تھا، سمرقند میں خوش قسمت سلطان علی ہنس رہا تھا اور ترکستان میں اپنے لشکر کو اکٹھا کرتا ہوا شیبانی خان۔ وہ سب ہنس ہنس کر اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ ہونہہ، بھولا بچہ کہیں کا! یہ ان ہی کے زوردار قہقہے تھے جو چاروں طرف فضاؤں میں گونج رہے تھے!

طاہر نے علی دوست بیگ کی غداری اور خواجہ عبداللہ کو بابر سے وفاداری کی بنا پر خاقان اوردو زے کے شہتیر سے لٹکا کر پھانسی دیے جانے کی تفصیلات بھی بتائیں۔ بابر اس سب کو برداشت نہ کر سکا اور اپنے گھوڑے کو چابک رسید کر کے سرپٹ دوڑانے لگا۔ اسے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ جا کہاں رہا ہے۔ گھوڑا جو صبح سے پیاسا تھا، تیزی سے دوڑتا ہوا دریا کے کھڑے کراڑے تک لے آیا۔ چونکہ بابر کو یاد آگیا کہ اس کے والد کا انتقال کراڑے کے کٹ کر دریا میں گر جانے ہی سے ہوا تھا اور اسے لگا کہ وہ بلند کنارہ بھی جس پر وہ کھڑا ہوا تھا، دفعتاً کٹ کر بہاؤ میں گرنے لگا۔ بابر نے گھبرا کر تند و تیز دریا کے کنارے سے گھوڑے کو پیچھے ہٹایا لیکن تنے میں پہاڑیاں اس کی نگاہوں کے سامنے کانپنے اور اپنی جگہ سے کھسکنے سی لگیں، وہ بھی یکے بعد دیگرے کسی غار میں گرنے سے لگیں۔

بابر گھوڑے کی گردن سے لپٹ کر رونے لگا، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور اس کے شانے ہلنے لگے۔

کچھ دیر تک وہ تنہا ہی رہا پھر قاسم بیگ سن رسیدہ طبیب کو ساتھ لیے اس کے پاس پہنچ گیا۔ قاسم بیگ نے آنسو بہائے بغیر لیکن بڑے مغموم و ملول لہجے میں کہا

”شہزادے، ہم سب پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ میرے گھر میں جو کچھ بھی تھا، لوٹ لیا گیا۔ میرے لخت جگر کو بری طرح زخمی کر دیا گیا“

بابر نے سر اٹھایا، چہرہ اب بھی آنسوؤں سے تر تھا۔ طبیب اس کی پیٹھ سہلانے لگا۔

”آپ اسے غم زدہ نہ ہوں، حضرت۔ قاصد نے ہمیں بتایا ہے کہ خدا کے فضل و کرم سے آپ کی والدہ صاحبہ اور ہمشیرہ صحیح سلامت ہیں۔ آپ زندہ و تندرست رہیں گے تو دوبارہ سب کچھ حاصل کر لیں گے۔ آپ کو اپنا خیال کرنا چاہیے، خدانخواستہ دوبارہ طبیعت ناساز نہ ہو جائے“

بابر جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ اپنے محبوب استاد کو پھانسی پر لٹکا ہوا دیکھ رہا ہو اور ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے اشک جاری ہو گئے

’ہائے میرے محترم پیر، مجھے اس دنیا میں کس کے سہارے چھوڑ کر آپ چل بسے؟ ایسے فرشتہ صفت انسان کو ان لوگوں نے پھانسی پر لٹکا دیا! مجھے ان سے اپنے استاد کا انتقام لینا ہوگا! انتقام لینا ہوگا“

اب کہیں جا کر طبیب کو خیال آیا کہ بابر کتنی صفائی سے بول رہا ہے، ذرا بھی تو نہیں ہکلا رہا ہے۔

”قسم کھاتا ہوں کہ آخری دم تک لڑتا رہوں گا!“

اس کے چہرے پر کبھی زردی چھا جاتی تھی کبھی سرخی لیکن اس کے منہ سے ہر لفظ بہت واضح طور پر نکل رہا تھا۔

”انتقام لوں گا! ہم لوگ لڑیں گے! دوستوں کو اکٹھا کر کے انہیں بتا دیجئے، ہم کوچ کر رہے ہیں... اندجان چلو!“

اور بابر اپنے گھوڑے کا رخ تیزی کے ساتھ موڑ کر لشکر کے پاس چلا گیا۔

۵

بابر نے مرغینان اور اوش پر قبضہ کر لیا۔ احمد تنبل اندجان کے نزدیک اپنی شکست دیکھنے کے بعد اپنے لشکریوں
کے ساتھ شہر کے قلعے میں جا چھپا۔

لیکن ان فتوحات کے نشے میں بابر کے سپاہیوں نے احتیاط اور چوکسی کو بالائے طاق رکھ دیا۔ ایک رات بابر کے چند
دستوں نے خاقان نالے کے قریب پڑاؤ ڈالا اور اپنی حفاظت کے لیے پہرے کا دھیان نہ رکھا۔ علی الصبح دشمن اس پڑاؤ پر
ٹوٹ پڑا۔ سوتے ہوئے لوگ بوکھلا کر اٹھے اور جس کا پاؤں جدھر پڑا، ادھر بھاگ کھڑا ہوا۔ بھاگ کھڑے ہونے والوں
میں شکست کے لیے جواہدہ بیگ بھی شامل تھا۔ بابر کو یہ لوگ محافظین کے بغیر ہی چھوڑ گئے، اس کے پاس مشکل سے دس ہی سپاہی
رہ گئے۔ بابر اچھل کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اس وقت تنبل کی آگے بڑھتی ہوئی فوج کے ہراول کے تیر انداز بابر کے
بھاگتے ہوئے لشکریوں پر تیر برسا رہے تھے۔ بابر نے یہ اندازہ لگا کر کہ ان کے مقابلے پر آنے والے دشمنوں کی تعداد کم
ہے، گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اپنے دسوں سپاہیوں کے ساتھ تیر اندازوں پر دھاوا بول دیا۔ تیر انداز مغلوب ہو کر بھاگ
کھڑے ہوئے۔ بابر ان کا تعاقب کرتا ہوا دور تک نکل گیا اور تب اچانک اس کی نظر دشمنوں کے ایک کافی بڑے دستے پر
پڑی۔ گھڑ سوار درختوں کے جھنڈ سے نکل کر اس کے راستے کو کاٹتے ہوئے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے بڑھتے چلے
آ رہے تھے۔ احمد تنبل جو آفتاب سحر کی شعاعوں میں واضح طور پر نظر آ رہا تھا، آگے آگے تھا۔ جسم پر زرہ تھی اور ہاتھ میں
سپر۔ بابر نے لگام کھینچ کر اپنے گھوڑے کو روکا اور مڑ کر دیکھا کہ خود اس کے ساتھ کون کون ہے۔ طاہر سمیت صرف تین
سپاہی رہ گئے تھے، باقی لوگ دشمن کے تنگ ہوتے ہوئے شکنجے سے بھاگ نکلنے کے لیے پیچھے کی طرف مڑ گئے تھے۔ اگر بابر
عجلت سے کام لیتا تو شاید وہ بھی دشمنوں کے گھیرے سے نکل جاتا

لیکن پیٹھ دکھا کر بھاگ کھڑے ہونا اس کے لیے ممکن نہ تھا، وہ تو اس عہد شکن غدار احمد تنبل کا سامنا کرنا چاہتا تھا جس
نے اس کو اتنے مصائب سے دوچار کر دیا تھا۔ اس نے لگام چھوڑ کر تیزی اور مستعدی سے مقابلے کے لیے کمان تیار کی اور
تیر کو تانت پر رکھا۔ اس اثنا میں احمد تنبل نے گھوڑا دوڑاتے دوڑاتے ہی تلوار نیام سے نکال لی۔ بابر نے تنبل کے ہیجان
سے سرخ چہرے پر چمکتی آنکھوں کے درمیان ناک کے بانسے کا نشانہ لگا کر تیر چلایا جو جا کر اس کے خود کے چھجے پر لگا۔
نشانہ بالکل درست تھا لیکن خود کی دھات تیر کی نوک سے زیادہ مضبوط ثابت ہوئی۔ بابر کو دوسرا تیر چلانے کا بھی موقع مل
گیا۔ اس بار اس نے تنبل کی گردن کا نشانہ لگایا تھا کیونکہ زرہ اور خود پہنے ہوئے فوجی کا چہرہ اور گردن ہی کچھ کھلے رہتے
تھے۔ تنبل سپر سے دفاع کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تیر سپر سے ٹکرا کر الگ جا گرا۔

اتنے میں تنبل کے گھوڑے دوڑاتے ہوئے سپاہی اس پر تیر چلانے لگے اور ایک تیر اس کی ٹانگ بوٹ کے اوپری حصے کو
چیرتا ہوا گھٹنے سے ذرا نیچے پنڈلی میں آن لگا۔ تنبل بابر کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا اور اس کے داہنے ہاتھ میں تلوار چمک
رہی تھی۔ "وہی تلوار ہے،" بابر نے پیر میں پھیلتے تیز درد کو محسوس کرتے ہوئے سوچا، "وہی اوش میں اس کی دی ہوئی طلائی
دستے والی بغدادی تلوار۔ تو اب تنبل اسی تلوار سے اسے ہلاک کر دے گا جس کا کبھی اس کمبخت نے وفاداری کے اظہار کے
طور پر بوسہ لیا تھا؟" بابر کا ہاتھ کمان کو جو اب بے مصرف ہو چکی تھی، دبائے جا رہا تھا۔ اس پر عجب بے حسی سی طاری ہو گئی اور
جانے مفلوج کرتے ہوئے درد کی بنا پر یا موقع نہ مل سکنے کے باعث اسے اپنی تلوار نیام سے نکالنے کا خیال ہی نہ آیا۔

دوسرے ہی لمحے وہ طلائی دستے والی تلوار اس کے خود پر پڑی۔ بابر کی آنکھوں تلے چنگاریاں سی ناچنے لگیں اور سر میں درد کی جھنجھناہٹ سی ہوئی اور خود کے اس وار کو برداشت کر لینے کے باوجود اس کے پیچھے سے خون بہہ کر رخسار تک آ گیا۔ کمر سے جوتے میں بھی خون بھر گیا تھا۔ بابر نے گھوڑے پر جھکتے ہوئے کچھ اس بیگانگی کے ساتھ سوچا گویا اس بات کا اس سے تعلق ہی نہ ہو۔ تنبل نے اپنی فتح پر مسرور ہوتے چیختے ہوئے دوبارہ تلوار بلند کی۔ عین اسی لمحے پیچھے سے طاہر نے بڑھ کر مجبور گھوڑے کی لگام کو پکڑ کے جھٹکا اور بابر کو پیچھے سے دھکا دے دیا۔ بابر کا گھوڑا اپنی جگہ سے کچھ آگے بڑھ گیا۔ تنبل کی تلوار کا زور دار وار بابر کے ترکش پر پڑا جس سے تیر اور ترکش کے تسمے پوری طرح کٹ گئے۔

''حضور، لگام تھامے'' طاہر بابر کے گھوڑے کو چابک مارتے ہوئے چلایا۔

عمدہ نسل کے اس گھوڑے سے یہ سخت برتاؤ شاذ و نادر ہی کیا جاتا تھا۔ وہ آگ بگولا ہو کر ہوا سے باتیں کرتا ہوا، سوار کو اس مصیبت سے نکال لے گیا۔

بابر واپس لوٹا تو لنگڑا رہا تھا اور اس کے سر میں ہونے والی جھنجھناہٹ جلد ہی دور نہ ہو سکی۔

لیکن زخم سے زیادہ اسے وہ بے انصافی اذیت پہنچا رہی تھی جو قسمت نے اس کے ساتھ کی تھی۔ وہ سوچتا کہ جو تلوار اس نے احمد تنبل کو تحفتاً دی تھی اسی سے اس پر وار کیا گیا۔ کیسی ستم ظریفی ہے یہ بھی! اس کے باوجود لوگ اصرار کرتے ہیں کہ دنیا میں سب کچھ پہلے ہی سے طے ہوتا ہے، ایمان دار کو انصاف نصیب ہوتا ہے اور بے ایمان کو اپنے کیے کی سزا۔ تو پھر قسمت احمد تنبل کو جس نے ایک اسی پر نہیں بلکہ دوسروں پر بھی تے مظالم ڈھائے ہیں، آخر سزا کیوں نہیں دیتی؟ میدان جنگ میں اس کا مقابلہ اتنے ذلیل شخص سے ہوا تو آخر اس بے ایمان کا ہاتھ ہی کیوں طاقتور اور خوش نصیب ثابت ہوا؟

قتلوغ نگار خانم نے بابر کو تسلی دینے کی کوشش کی

''خدا کا شکر کہ میرے بیٹے کی جان بچ گئی! .. فرزند عزیز، ابھی آپ صرف سولہ ہی سال کے تو ہوئے ہیں۔ احمد تنبل کی عمر تک پہنچتے پہنچتے آپ جانے کتنی ہی فتوحات حاصل کر لیں گے۔ . اس وقت ہمارا ملک ان اقربا کش جنگوں سے بری طرح تباہ و برباد ہو چکا ہے۔ آپ کے ماموں جان محمود خان کی آپ میں اور مرزا جہانگیر میں صلح کرانے کی خواہش قابل ستائش ہے۔ آخسی جہانگیر کو مل جانا چاہیے اور اندجان آپ کو''

''اتنی چھوٹی سی فرغانہ سلطنت کے کیا واقعی دو ٹکڑے کر دیے جانے چاہئیں؟ یہ تو سارے ماوراء النہر کو ملا کر ایک کیے جانے کے برعکس ہوگا، والدہ صاحبہ.....''

''اس وقت اور چارہ ہی کیا ہے، بابر جان! .. اور ہمیں محض امور سلطنت ہی کی فکر تو نہیں کرنی ہے۔ تاشقند میں آپ کی منگیتر اوب رہی ہے.... مجھے ہمشیرہ صاحبہ کا خط موصول ہوا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ آ کر جلد از جلد دلہن کو رخصت کرا لے جائیے''

بابر ماں کی اس تجویز کی مخالفت کے طور پر کہنا چاہتا تھا کہ ان دونوں کو ایسی کوئی عجلت تو ہے نہیں، اس ''ماہ رو'' نے اپنی زندگی کی پندرھویں بہار میں ابھی ابھی قدم رکھا ہے اور وہ خود بھی کم سن ہی ہے لیکن کہنے کی ہمت نہ کر سکا۔ دراصل اسے خود بھی تو اپنی دلہن سے جس کے خواب وہ جانے کب سے دیکھتا رہا تھا، جلد از جلد ملاقات کا اشتیاق تھا..

۶

ماہِ جوزا* کی ایک گرم شام کو اندجان قلعے کے حرم میں کنیزیں شادر رکھے تیار کر رہی تھیں۔ بادشاہ آخر کار عائشہ بیگم سے، اپنی کمسن ملکہ سے ملنے آ رہا تھا جو پورے پیتے بھر سے اس شام کی منتظر رہی تھی۔ سونے اور چاندی کی مختلف چیزوں اور ریشمی پردوں سے آراستہ حرم میں پھول اور غالیچے بچھا دیے گئے تھے۔ عائشہ بیگم کی بھووں پر لگایا جانے والا وسمہ ابھی خشک بھی نہ ہو پایا تھا کہ کسی کنیز نے گھبرا کر چپکے سے کہا

"تشریف لے آئے! تشریف لے آئے اشہ عالی۔"

زری کا لباس پہنے ہوئے بابر برآمدے میں نظر آیا۔ گزشتہ دو برسوں کی مسلسل آزمائشوں نے اسے کافی بدل دیا تھا۔ شانے چوڑے، چکلے ہو گئے تھے جیسے کہ اٹھارہ سالہ طاقتور نوجوان کے ہونے چاہئیں۔

عائشہ بیگم جس نے کورنش کے ذریعے اس کا استقبال کیا، اس کے سامنے خاصی پست قد اور دھان پان سی لگ رہی تھی۔ اس کے سر پر اونچی طاقی اور کانوں میں موتیوں کے آویزے پتلی سی گردن کی بنا پر بہت بڑے بڑے سے لگ رہے تھے۔

کنیزیں کورنش بجا لاتی ہوئی الٹے قدم دروازے کی طرف ہٹنے لگیں۔ بابر کو ان میں سے کچھ کی آنکھوں میں شرارت آمیز چمک نظر آئی اور اسے کچھ عجب بھونڈا پن سا محسوس ہوا۔ یہ تو سچ تھا کہ حرم میں حکمران کے رات بسر کرنے کے ارادے سے کنیزوں اور خادماؤں کو پہلے ہی مطلع کر دیا جاتا تھا تا کہ وہ اس سلسلے میں ضروری تیاریاں کر سکیں پھر بھی بابر کو ان لمحات میں وہاں اتنے زیادہ افراد کی موجودگی غیر ضروری معلوم ہوئی۔

اور عائشہ بیگم بھی کچھ زیادہ ہی شرمیلی ثابت ہوئی۔

"تشریف رکھیے، حکمران" اس نے بمشکل ہی سنی جا سکنے والی کانپتی ہوئی آواز میں بابر سے شایانِ شان جگہ پر بیٹھنے کی درخواست کی۔

اندرونی کمرے میں باریک پردے کے پیچھے سیج بچھی ہوئی تھی۔ بابر اس جانب دیکھے بغیر نہ رہ سکا حالانکہ اسے اپنی خواہش پر شرم محسوس ہوئی۔ دسترخوان کے پاس آ کر وہ گدے پر اس طرح بیٹھا کہ پلنگ اسے دکھائی نہ دے پھر بھی دکھائی دے رہا تھا۔ آخر اس نے اپنی نظریں دسترخوان پر جما دیں اور دھیرے سے پوچھا

"کہیے بیگم، آپ کی صحت تو ٹھیک ہے نا؟"

"خدا کے فضل سے ٹھیک ہوں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ"

عائشہ بیگم شرماتی لجاتی بابر سے دور دسترخوان کے بالکل کنارے پر بیٹھ گئی۔

تکلیف دہ خاموشی چھا گئی۔

نئی نویلی میں نئی نویلیوں کی ساری صفات موجود تھیں پر دل سب بھی لڑکیوں کا سا ہی تھا اور شکل وصورت۔۔ عائشہ بیگم اکثر بیمار رہتی تھی، مصائب بھی بہت جھیلے تھے اسی لیے اس کا سوکھا سکھا جسم بے جان سا لگتا تھا۔ بابر جس ماہرو پری کے خواب دیکھتا رہا تھا وہ صرف اس کے تصور کی دنیا ہی تک محدود رہی، حقیقت نے اس کی آرزوؤں پر پانی پھیر دیا۔

---

* جوزا کا مہینہ ۲۲ مئی سے شروع ہوتا تھا۔

"جی ابھی مرزا جہانگیر کے قبضے میں" بابر نے جواب دیا اور فوراً ہی اداس ہو گیا۔

عائشہ بیگم کچھ بھی نہ سمجھ سکی اور اس نے حیرت سے نظریں اٹھائیں۔ اندجان کو فتح کرنے تک مرزا بابر نے کچھ کم مصائب برداشت کیے تھے کیا؟ اور اب وہ عائشہ نے سوچا خود اپنی مرضی ہی سے اندجان کو چھوڑ دینا چاہتے ہیں۔

"سمرقند کی یاد تو مجھے ضرور ستاتی ہے" وہ بولی، "لیکن میں یہاں آپ کی والدہ محترمہ کے ساتھ رہنا بہتر تصور کرتی ہوں"

وہ اس طرح صاف صاف باتیں کرنے لگی تو بابر کو اس کا چہرہ دلکش معلوم ہونے لگا۔

"جی ہاں، اور میں آپ سے بھی یہی التجا کر رہی ہوں، میرے سرتاج" عائشہ بیگم نے دھیرے دھیرے جوش میں آتے ہوئے بات جاری رکھی "جانے کتنی ہی پریشانیاں تو آپ جھیل چکے ہیں اور جنگ کے بعد سمرقند کے دروازے کھلے رہے۔ آپ بہ خیال کیجئے۔ اب اور جنگ چھیڑنے نہ جائیے، التجا کر رہی ہوں"

"ہم آج جن حالات میں جی رہے ہیں وہ میرے اور آپ کے حق میں کیا؟"

"کیا آپ کیوں سفر کر رہے ہیں؟ آخر آپ اپنے ملک میں مقیم اور یہاں کے حکمران ہیں"

بابر طنزیہ انداز میں مسکرایا۔

"حکمران تو میں بس برائے نام ہی رہ گیا ہوں" اس نے کہا اور اپنی بغلی جیب سے چار تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر عائشہ بیگم کی طرف بڑھا دیا۔

وہ گزشتہ کئی مہینوں سے اپنے دل کے درد کو کاغذ پر منتقل کرنے کی ضرورت محسوس کرتا رہا تھا اور تقریباً ہر شام وہ اشعار کہتا تھا۔ اس ورق پر ایک چار بیتی درج تھی۔

عائشہ بیگم نے کاغذ کو کھول کر مصرعوں پر نظر ڈالی

تخت سے چھٹے ہیں، ان کا آسرا کچھ بھی نہیں
ہائے دنیا! اب تو قانون وفا کچھ بھی نہیں
بن جا مفلس بیگ تو بابر کہ بہتر ہو گا یہ
ایک تاج اور شاہ وہ اس سے برا کچھ بھی نہیں

"ان شاندار بیتوں کی تخلیق پر مبارکباد قبول فرمائیے، حکمران"

"شکریہ۔ لیکن آپ پر میری بات واضح ہو گئی نا؟"

"جی ہاں۔ آپ کو احساس میں مرزا جہانگیر کے دوسری سلطنت قائم کرنے کا غم ستا رہا ہے نا؟ پہلے جو ایک تھی اب اس کے دو ٹکڑے ہو گئے"

"اس میں جہانگیر کا قصور نہیں ہے، بیگم۔ جہانگیر تو ابھی کل کے لڑکے ہیں۔ دراصل احمد تنبل، علی دوست بیگ، باقی اور طاقتور بیگ میری مخالفت پر کمربستہ ہیں"

بابر علی دوست بیگ سے اپنے الجھے ہوئے تعلقات پر روشنی ڈالنے لگا۔ وہ جانتی تھی کہ گزشتہ سال بابر اپنا سب کچھ کھو بیٹھا تھا اور جنوبی علاقے میں، ترکستان سلسلہ کوہ کے دامن میں واقع اورا تیپا میں مقیم تھا۔ ایک روز خلاف توقع علی دوست بیگ (ان دنوں وہ مرغینان کا حکمران تھا اور احمد تنبل سے اس کا جھگڑا ہو چکا تھا) کا قاصد اس کے پاس پہنچا۔

"میرے بادشاہ، قصور معاف کر دیں، میری اس غلطی کو معاف کر دیں کہ میں نے اس کتے احمد تنبل کے لیے اندجان کا
دروازہ کھول دیا تھا تو وہ مرغینان آ گیا۔ میں اس کے لیے مرغینان کے دروازے کھول دوں گا۔" یہ تھا علی دوست بیگ کا
پیغام جو قاصد لے کر آیا تھا۔ علی دوست بیگ نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا جس سے بابر کے حوصلے بڑھ گئے تھے اور اس نے
جلد ہی علی دوست بیگ کی مدد سے اندجان پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔

فیاضی کا جواب فیاضی ہی سے دیا جاتا تھا لیکن بابر اپنی دریا دلی میں بہت آگے بڑھ گیا۔ اس نے علی دوست بیگ کو
قاسم بیگ کے عہدے پر فائز کر دیا۔ ایک کو بلندیوں پر پہنچا دیا اور دوسرے کو بلا سبب پستیوں میں گرا دیا۔

پھر کیا ہوا؟ علی دوست بیگ نے زیادہ تر بیگوں کو اپنی طرف دار بنا لیا اور جلد ہی بابر کے ہاتھوں میں
اقتدار بس برائے نام ہی رہ گیا۔ اس دوران قاسم بیگ نے بابر سے اپنی وفاداری برقرار رکھی اور ایک بار تو اس نے احمد
تنبل سے علی دوست بیگ کی نئی سازش کا ثبوت بھی پیش کر دیا۔ علی دوست بیگ کے حامیوں نے قاسم بیگ پر اس
معاملے میں جھوٹی شکایت کرنے کا الزام لگایا اور دھمکی دے دی کہ علی دوست بیگ پر کوئی آنچ آئی تو بابر پر بھی آ کر رہے
گی۔ اور احمد تنبل کہیں قریب ہی تلوار سنبھالے، گھات لگائے بیٹھا تھا۔ اندجان میں گھس آنے کے بہانے ہی کی تلاش
میں تھا۔ سیاسی ہاتھ آ جانے کی صورت میں اندرونی اور بیرونی دشمن متحد ہو جاتے تو کیا ہوتا؟ اسی لیے بابر دانت پیس پیس
کر علی دوست بیگ کی سازشوں کو مجبوراً برداشت کیے جا رہا تھا۔ اب اس کے پاس دشمنوں کو شکست دینے کے لیے طاقت
بہت ہی ناکافی تھی۔

"علی دوست بیگ اور احمد تنبل مکڑیوں کی طرح مجھے اپنے جالوں میں الجھاتے جا رہے ہیں" بابر نے عائشہ بیگم سے
کہا۔ "میں ان جالوں کو توڑ کر نکل جانا چاہتا ہوں ورنہ ... ورنہ ہم مکڑیوں کی غذا بن جائیں گے۔"

"لیکن عالی جاہ، سمرقند میں بھی تو آپ کے بے شمار دشمن موجود ہیں۔ اگر ایک بار پھر جنگ چھڑی تو..."

"سمرقند میں ہمارے احباب بھی کچھ کم نہیں ہیں"

"قاصد نے آپ کو دارالحکومت پہنچنے کی دعوت دی ہے کیا؟"

سمرقند کے قاصد سے ہونے والی گفتگو کو بہت زیادہ راز میں رکھے جانے کی ضرورت تھی۔

سمرقند کے بیگوں اور سلطان علی کے اختلافات بہت زیادہ بڑھ گئے تھے اور وہ مزید ترخان کی قیادت میں اپنے
سپاہیوں سمیت شہر کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ایک ہزار سپاہی ارگوت میں بڑی بے چینی کے ساتھ بابر کے منتظر تھے۔ ایک
ہزار سپاہی اور سب کچھ کر گزرنے پر آمادہ بیگ۔ یہ کوئی معمولی طاقت تھوڑی تھی! دوسری طرف حال ہی میں بخارا پر
قابض ہو جانے والا شیبانی خان اب سمرقند پر دانت لگائے ہوئے تھا۔ بابر کے وہاں بہ عجلت نہ پہنچنے کی صورت میں
سلطان علی دارالحکومت کو شیبانی خان کے سپرد کر سکتا تھا۔ شیبانی خان کے قتل و غارت گری سے متعلق قصے سن سن کر اہل سمر
قند بدحواس ہو رہے تھے اور اب وہ بابر کے لیے شہر کے دروازے کھول دینے کو تیار تھے۔

قسمت نے یہ جو مناسب موقع فراہم کر دیا تھا اس سے فائدہ اٹھایا جانا چاہیے تھا یا نہیں؟

"قاصد نے ہمیں واقعی سمرقند آنے کی دعوت دی ہے" بابر نے عائشہ بیگم کو کچھ زیادہ نہ ظاہر کرنے والے لفظوں میں
بتایا۔ "لیکن ظاہر ہے کہ سلطان علی تخت سے یوں ہی دست بردار ہونے سے رہا"

"یعنی پھر جنگ! پھر خطرات..."

اور بے جگہ کوہستانی چوٹیوں، برف سے ڈھکے جو ہر لمحہ زندگی خطرات سے خالی ہو ہی نہیں سکتیں"

عمر بھی کمری کے حالات کے متعلق اشارے کر رہے تھے۔ وہ تو سمرقند تشریف لے جا چکی ہیں۔ اور ہم؟" کہا چلو ہم بھی پیچھے روانہ ہو گئے"

"آپ چاہیں تو آپ کو اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں"

"میدانِ جنگ میں؟"

بابر کا چہرہ متغیر ہو گیا کیونکہ مخفی طنز کا تیر ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔

"آپ جنگ ختم ہونے تک والدہ صاحبہ اور خانزادہ بیگم کے ساتھ اوراتیپہ میں قیام کر سکتی ہیں۔ وہاں کے حکمران کی بیگم صاحبہ میری سگی خالہ ہیں۔ وہاں سے بہ آسانی سمرقند پہنچا جا سکتا ہے"

"اوراتیپہ میں اس کوہستانی مقام کا راستہ تو شاید بے حد خراب ہے۔ مجھے گھڑ سواری نہیں آتی"

"آپ گھوڑا گاڑی میں سفر کر سکتی ہیں"

عائشہ بیگم کو ایک جگہ پر آرام و سکون سے رہنا پسند تھا۔ سفر اسے وبالِ جان معلوم ہوتے تھے۔

"ہائے مجھے تو ڈر لگتا ہے گاڑیوں سے بھی اور راستوں سے بھی"

"بے وفا قسمت نے اس معاملے میں بھی مجھے خوب چوٹ دی ہے" بابر نے سوچا۔ "مجھ جیسے ایک جگہ بیٹھ نہ سکنے والے شخص کو اتنی نازک اور ایک ہی جگہ کی ہو کر رہ جانے والی شریکِ زندگی دے دی۔ لیکن آخر اس وقت ان سب باتوں کا تذکرہ ہی کیوں؟ کمزور خاتون کو حفاظت کی ضرورت ہے اور حفاظت میں کروں گا"

بابر نے چھیڑ خانی کے انداز میں کہا

"اگر آپ گاڑی میں سفر کرتے ڈرتی ہیں اور گھڑ سواری آتی نہیں تو بیگم آپ کو میں... گود میں اٹھا کر لے چلوں گا"

"میرا مذاق نہ اڑائیے! میں بھلا اس لائق کہاں"

بابر کو یہ الفاظ ایک دوسرے ہی مفہوم سے محبت اور ترغیب سے معمور معلوم ہوئے۔ اس کی رگوں میں خون جوش مارنے لگا اور وہ دسترخوان سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ارے نہیں، آپ یقیناً اس لائق ہیں"

"میرا مذاق نہ اڑائیے، التجا کر رہی ہوں"

"میں ثابت کر دکھاؤں گا، کروں ثابت؟" بابر نے اسے نوجوانوں کے سے شرارتی انداز سے دھمکایا۔

عائشہ بیگم غزال جیسی پھرتی سے اچھل کر اٹھی اور بھاگی لیکن بابر نے جھپٹ کر اسے پکڑ لیا اور فوراً ہی یاد آ گیا کہ جب وہ شبِ زفاف کو آئی ہوئی گاڑی سے عائشہ کو گود میں اٹھا کر اندر لایا تھا تو وہ کتنی پھول سی معلوم ہوئی تھی۔ اس وقت بھی اس نے اتنی ہی آسانی کے ساتھ عائشہ بیگم کو اٹھا لیا۔ سیج کے قریب پہنچ کر اس نے پردے کو پیر سے ہٹایا اور سرہانے جلتی ہوئی شمع کو پھونک مار کر بجھا دیا۔

عائشہ بیگم اس رات اس سے جتنی محبت اور گرمجوشی سے پیش آئی اس سے پہلے کبھی بھی نہیں پیش آئی تھی۔ کتنی حیرت کی بات تھی کہ کسی خواب کا وہم ہے سب کچھ بالکل مختلف ہی ہوتا تھا۔ "اب میں ہر رات یہیں گزارا کروں گا" بابر نے

بوس و کنار کی منزلوں سے گزرنے کے بعد نیند کی آغوش میں جاتے ہوئے سوچ لیا۔ دوسرے ہی لمحے اسے افسوس بھی ہوا ابھی تو سمرقند جاؤں گا اور تب ... جانے کتنے ہفتوں یا مہینوں کی جدائی کے دوران ان مسرتوں سے محروم رہنا پڑے گا۔ کیا اندجان میں رہنا ہی بہتر نہ ہوگا؟"

اور جانے کیوں یک بار پھر اسے عائشہ بیگم سے ملاقات کی اولین شام اور شب زفاف یاد آ گئیں۔ وہ بوس و کنار کے دوران جواباً عائشہ بیگم کے گہرے لگاؤ کے مظاہرے کے لیے مخصوص الفاظ اور طرز عمل کے لیے تڑپ رہا تھا۔ وہ اس کے دل کو جیتنا اور اپنے دل کو ہارنا چاہتا تھا لیکن عائشہ بیگم تو جیسے بے حس و حرکت سی پڑی رہی تھی۔ اس کے ہیجان بھرا جواب بھی بڑے محتاط اور مہذب انداز سے دیتی رہی تھی جو صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ماں اور بڑی بوڑھیوں کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ عائشہ بیگم کے کپڑے اتارتے وقت اس کی پتلی سی کلائی سے سونے کا وزنی کنگن جس میں یاقوت رمانی جڑے ہوئے تھے، گر کر کہیں لڑھک گیا تھا۔ اسے کلائی سے کنگن کے غائب ہونے کا احساس کچھ دیر بعد شب کی ناموزوں ساعات میں ہوا تھا اور وہ چونک بوکھلا سی اٹھی تھی۔

"ہائے، میرا کنگن کیا ہوا؟ کتنے قیمتی یاقوت جڑے ہوئے ہیں اس میں! شاہ معظم، براہ نوازش ذرا ٹھہر جائیے، میں اسے تلاش کر لوں"

اور وہ اس کی بانہوں سے نکل گئی تھی۔

بابر اس وقت یہ سب یاد کر کے دفعتاً مضطرب ہو گیا۔ پھر سے جلد ہی طمانیت آ گئی اور وہ دیر تک محو خواب عائشہ کے تھکے سے مسرور چہرے کو تکتا رہا۔

ستور سحر نمودار ہوئی اور نجوم شب کے ساتھ ہی ساتھ بابر کی وہ ذہنی کیفیت بھی کافور ہو گئی جو گزشتہ شام کو اس کے منصوبوں میں تبدیلی کرنے کی جانب مائل معلوم ہو رہی تھی۔ زن و شوہر ناشتہ کرنے کے لیے بیٹھے۔ بابر کے خیالات ایک بار پھر کڑیوں کے اس جالے میں الجھ گئے جسے اس کے ارد گرد احمد تنبل اور علی دوست بیگ بننے میں مصروف تھے۔ اس نے گزشتہ روز دوپہر کو قاصد سے کہا تھا کہ وہ ضرور سمرقند آئے گا نیز یہ کہ وہ قاسم بیگ اور اپنے دوسرے وفاداروں کے ساتھ مل کر کوچ کے سلسلے میں پہلے ہی سے خفیہ طور پر تیاریاں کرتا رہے۔ آج صبح کو اس پر یہ بات اور بھی زیادہ واضح ہو گئی کہ اس کے اپنے قول سے پیچھے ہٹنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔

عائشہ بیگم نے بھانپ لیا کہ خاوند کی ذہنی کیفیت بدل چکی ہے اور وہ خاموش بیٹھی رہی۔ بابر نے محض اتفاقاً یہ دیکھنے کے بعد سے کہ سونے کا وہ وزنی کنگن جس میں یاقوت رمانی جڑے ہوئے تھے، اس وقت بھی اس کی پتلی سی کلائی میں لٹکا ہوا ہے، اس کے چہرے کی طرف ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا۔

"اچھا، بیگم، تو آپ نے اور اندجان جانے کا فیصلہ کر لیا نا؟"

عائشہ بیگم سمجھ گئی کہ بابر کی سمرقند جانے کی خواہش نہ صرف یہ کہ ختم نہیں ہوئی بلکہ کچھ اور بھی مستحکم ہو گئی ہے۔ اس نے سوچا کہ اسے کئی مہینوں کی جدائی جھیلنی پڑے گی اور کیا یہ اس بات کی علامت نہیں کہ بابر اس سے صحیح معنوں میں محبت نہیں کرتا؟ مگر اس نے اس انداز سے جیسے دل کو تسلی دی ہو، جواب دیا

"محترم حکمران، پہلے آپ سمرقند پر دوبارہ قبضہ کر لیجئے اس کے بعد میں اپنے شہر ہی کو چلی جاؤں گی۔ اور اندجان تو میں نہیں جانا چاہتی..."

اس بات کے لہجے سے بابر کو احساس ہوا کہ اس کے سمرقند پر دوبارہ قابض ہو جانے کا اس کی شریک زندگی کو یقین نہیں ہے۔ تاہم اس نے عائشہ بیگم کو کچھ اور سمجھانے بجھانے کی کوشش نہ کی اور حرم سے باہر نکلتے وقت بڑے اعتماد کے ساتھ کہا

"اچھا تو بیگم انشاء اللہ ہماری مزید گفتگو سمرقند ہی میں ہوگی۔۔۔"

سمرقند

1

سلطان علی کی جو سمرقند کے تخت پر بیٹھا تھا اور جسے بابر غیر خاندان کے شیبانی خاں کے ہاتھوں تخت سے ہٹائے جانے سے قبل ہی ہٹا دینا چاہتا تھا، کوئی بھی تو عزت نہیں کرتا تھا۔

اس کے متعلق بستاں سرائے محل کے گوشوں میں "نکما" کہہ کر چپکے چپکے باتیں کی جاتی تھیں۔ سلطان علی کا معتبر اور بہت ہی قریبی بیگ ابو یوسف ارغون جو اس کے حرم کے لیے نئی نئی خوبصورت کنیزیں فراہم کیا کرتا تھا، تک اس سے پوری طرح مایوس ہو چکا تھا۔ اب تو سلطان علی امور سلطنت اور اپنے خاندان کے مستقبل کے بارے میں کسی چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ کر ہی باتیں کرنا پسند کرتا تھا جو سنگ مرمر کے کھلے ہوئے حوض والے حمام کے پاس بنا ہوا تھا اور جس کی ایک دیوار میں باہر سے نظر نہ آنے والی خفیہ کھڑکی واقع تھی (یہ کھڑکی سلطان محمود کے عہد ہی میں بن گئی تھی)۔ اس افتادہ سادہ عیاش کا محبوب مشغلہ تھا اس کمرے میں بیٹھے بیٹھے حوض میں نہاتی ہوئی برہنہ حسیناؤں کو تکنا، جام پر جام چڑھانا، مزے لوٹنا اور صرف نظارہ بازی یا حصول مسرت کی خاطر ہی تھیں

اس بار بھی زہرہ بیگم نے اپنے بیٹے کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی جو ناکام ثابت ہوئی کیونکہ شراب اور عیاشی کے باعث وہ عقل و ہوش گنوا بیٹھا تھا۔ سلطان علی بڑبڑانے لگا

"کیا کیا؟ ایک بار پھر ہمارا محاصرہ کر لیا گیا؟ ہونہہ، کچھ نہیں ۔۔ سازش کرنے والے سمرقند کے دروازے بابر کے لیے کھول دینا چاہتے ہیں؟ اور میرے بیگ خواجہ یحییٰ سازشیوں کے سرغنہ ہیں؟ کوئی بات نہیں، سرغنہ ہیں تو رہیں۔۔ بابر کو ہم شہر اور قلعے کے اندر داخل ہو جانے دیں گے پھر اسے گرفتار کر کے اس کی آنکھیں دہکتی ہوئی سلاخوں سے پھوڑ دیں گے۔ ہا۔۔۔ہا۔۔۔ہا۔۔۔"

زہرہ بیگم آگ بگولا ہو کے بیٹے کے پاس سے چلی گئی۔

دراصل زہرہ بیگم ہی بابر کے سمرقند پر قابض ہونے کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ اسی کے اشتعال دلانے پر سازشیوں کو، بابر کے حامیوں کو کچھ کر سکنے سے قبل ہی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اسی کے حکم پر بابر کے ہراول دستے کو فریب دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ لیکن بابر کے خاص لشکر کا مقابلہ کرنا، بابر کے نام کو مٹانا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ سمرقند کی تباہی یقینی تھی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کے نکمے بیٹے سلطان علی کی بھی۔

اس نے سوچا "کسی کا سہارا لوں میں اب، پروردگار"

اپنے رہائشی حصے میں واپس لوٹ کر زہرہ بیگم کمروں میں جہاں شمعیں پوری آب و تاب سے جل رہی تھیں، پریشان

اور مضطرب ہوتی رہی۔ صبح تک وہ پلک بھی نہ جھپکا سکی۔

وہ سوچ رہی تھی کہ حالات میں آنے والے خطرناک موڑ کو دور رکھنے میں کسی حد تک [illegible] سازش جس کا کھٹکا گزشتہ سال کے محاصرے کے وقت ہی سے ہر کسی طرف تھا، برقرار نہ رہ جائے گی۔ [illegible] اجازت اس نے مدہوش سلطان علی سے حواسوں سے لی تھی۔ اس کے باوجود شہر کے اندر ان سے اپنے [illegible] تعداد کم ہی ہوتی جا رہی ہے۔ سازشی بیگوں کو سخت سزائیں دی جائیں گی، ان کی املاک کو بھی ضبط کر لیا جائے گا [illegible] بھی۔ سلطان علی اور خود اس سے بھی ناراض لوگوں کی تعداد کچھ بڑھ ہی جائے گی۔ اور خواجہ یحییٰ [illegible] کے ساتھ سختی سے پیش آنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ اسے تو سارے کے سارے علما کی حمایت حاصل ہے۔ [illegible] مشہور و معروف خواجہ احرار کا بیٹا جو ہے۔ ایسے شخص کے اشارے پر تو علما و شیوخ کی قیادت میں سارے جاہل لوگ اٹھ کھڑے ہوں گے اور تب ایسے ہنگام کا آغاز ہو سکتا ہے جو ان ایام سے بھی بدتر ثابت ہوں جن کے دوران خود اس کا سر تن سے جدا کر دیا گیا تھا۔

زہرہ بیگم کو رہ رہ کر شیبانی خان یاد آنے لگا۔ اس نے سوچا کہ شیبانی خان کی کامرانی اور خوش نصیبی کا کہنا ہی کیا! وہ موقع کی تاک میں رہا، طاقتور لشکر تیار کر کے حال ہی میں بخارا پر یوں قابض ہو گیا جیسے یہ اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہو اور اب کسی بھی وقت سمرقند پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔ اس نے خود کو مدبر رہنما بھی ثابت کر دکھایا اور سچا سپاہی اور ایسا مرد بھی جو نسوانی حسن کا قدردان ہے۔ تین روز قبل ایک نقش بندی درویش شیبانی خان کا ایک خط لے کر خفیہ طور پر زہرہ بیگم کے پاس آیا تھا۔

زہرہ بیگم نے چھوٹی سی کنجی سے سونے کی صندوقچی کا جسے وہ پردے کے پیچھے دیوار میں بنے ہوئے خفیہ طاق میں چھپا کر رکھا کرتی تھی، قفل کھول کر اس کے اندر سے خط کو نکالا اور شمع کی روشنی میں دوبارہ پڑھنے لگی۔

خانہ بدوش خان نے شہد کے رنگ کے باریک کرکرے کاغذ پر بڑی خوش خط تحریر اور بڑے لطیف و نفیس انداز بیان میں زہرہ بیگم کی ذہانت و فراست اور حسن و جمال کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اس بات کا مخصوص احترام کے ساتھ تذکرہ کیا تھا کہ جوان خاتون نے اپنی دوسری شادی کا جو بآسانی ممکن تھی، خیال ترک کر کے اپنی زندگی نہایت ہی بے لوث طور پر بیٹے کے لیے وقف کر دی ہے۔ لیکن خط کا دلکش ترین پہلو تھا خان کا زہرہ بیگم کو دیکھے بغیر ہی اس سے اظہار محبت، یا اشارہ کہ وہ اسے اپنا شریک زندگی بنانے کا متمنی ہے۔ اس بیت کا دوسرا مفہوم ہو ہی کیا سکتا تھا

آپ کا بیٹا میرا بیٹا بھی، خود یار ہوں
ہم نفس میری ہوں، دلبر میری ہوں، دلدار ہوں

زہرہ بیگم کو اپنے چہرے پر طاقتور مرد کی گرم گرم سانسیں محسوس ہونے لگیں۔ وہ چھ برسوں سے بیوگی کی زندگی بسر کر رہی تھی، طویل چھ برسوں سے! خوبصورت پھول پژمردہ ہو جا رہا تھا۔ وہ شادی کرنا چاہتی تو یقیناً بہت سے امیدوار سامنے آ سکتے تھے۔ نامی گرامی دولت مند، ظاہری اور باطنی دونوں اعتبار سے دولت مند فرد۔ ورنہ کیوں نہ ہوتا آخر وہ سلطان محمود کی چہیتی بیگم رہ چکی تھی جو خود بھی اپنی بے مثال وجاہت کے لیے شہرت رکھتا تھا۔ لیکن وہ اب تک محض اس لیے شادی نہیں کر سکی تھی کہ خود ملکہ تھی، شوہر بھی تاجدار تھا، بیٹا بھی اور رواج کے بموجب دوبارہ وہ کسی صاحب تخت و تاج ہی سے شادی کر سکتی تھی۔

اور خفیہ طور پر پیغام بھیجنے والا شیبانی خان؟ یا صاحبِ تخت و تاج نہ تھا؟ ''ہم نفس میری ہوں، دلبر میری ہوں، ہمدرد میری ہوں'' زہرہ بیگم نے دل ہی دل میں دہرایا اور اسے اپنے جسم میں ایسی تپش محسوس ہوئی جیسے واقعی کسی نے اسے اپنی بانہوں میں بھینچ کر سرگوشی کی ہو ''میری انتہائی حسین و جمیل ملکہ!''

زہرہ بیگم اٹھ کر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ تمام شب کی بیداری نے آنکھوں کے نیچے نیلی جھائیوں سی ڈال دی تھیں لیکن ابرو بابل کے باردوں جیسے تھے، کالی کالی آنکھیں چمک رہی تھیں، گوری گوری، چکنی چکنی گردن سنگِ مرمر سے تراشی ہوئی سی معلوم ہو رہی تھی اور لب بوسوں کے لیے مضطرب اور مرتعش تھے۔

شیبانی تقریباً پچاس سال کا ہو چکا تھا۔ اس کی بیگمات بھی تھیں اور بچے بھی۔ یہ سب سچ تھا اور زہرہ بیگم اس سے واقف تھی لیکن اس نے سوچا ''وہ صحراؤں کی رہنے والیاں میرا مقابلہ کیا خاک کریں گی! خان کو میں کچھ اس طرح مسحور کر دوں گی کہ وہ عورتیں بھی میری مٹھی میں آ جائیں گی، مٹھی میں''

اگلے روز وہ نقش بندی درویش جواب کے لیے دوبارہ اس سے ملاقات کرنے والا تھا۔

زہرہ بیگم نے کاغذ اور قلم اٹھا لیے

شمع دانوں کی موم بتیاں کبھی کی بجھ چکی تھیں کمرے میں۔ اب کہیں جا کر اسے خیال آیا۔ سپیدۂ صبح پھیلتا جا رہا تھا۔ زہرہ بیگم نے نیلگوں پردے کو ہٹا کر اپنا چہرہ آہستہ سے آتی ہوئی ٹھنڈک کے سامنے کر دیا۔

دفعتاً کسی مرد کی دل دوز چیخ سنائی دی جو شہر کے قلعے کی طرف آتے ہوئے کسی راستے پر بلند ہوئی تھی اور پھر دوسرے ہی لمحے کسی عورت کی آہ و بکا۔

اس کے بیٹے کے آدمی جن میں ابو یوسف بھی شامل تھا۔ سازشی بیگوں کو تلاش کرنے اور ان کے گھروں کو لوٹنے میں مصروف تھے۔ زہرہ بیگم نے تصور کیا کہ اس وقت تلواریں اور نیزے کس طرح اہلِ سمرقند کا کام تمام کر رہے ہوں گے۔ ان چالاک اور باغی اہلِ سمرقند کا جنہیں وہ برا چاہتے تھے، اور خود سے شیبانی خان۔ لیکن اگر شیبانی خان اس سے محبت جتاتے ہوئے کوئی غدارانہ منصوبہ بنا رہا ہو تو؟ شیبانی خان کے سمرقند پر قابض ہو جانے کے بعد کیا وہ خود بھی اسی عورت کی سی حالت کو نہ پہنچ جائے گی جو اس وقت کہیں گریہ و زاری کر رہی ہے؟

وہ شدتِ خوف سے لرز اٹھی۔ اس نے خط کو دوبارہ اٹھایا جس کے آخر میں شیبانی خان نے جیسے جان بوجھ کر جیسے زہرہ بیگم کے اندیشوں کو دور کرنے ہی کے لیے ایک اور بیت لکھ دی تھی

تمہارے بنا ہے سمرقند کس کام کا میرے، جاناں
بنا روح یہ جسمِ فانی سلامت رہے کیسے، جاناں

اور اس نے سوچا کہ ایسے شوہر کے بنا جو حقیقی بادشاہ ہو، سمرقند اس کے کس کام کا، آخر کس کام کا؟ اگر عظیم اور طاقتور شیبانی خان یہاں آ کر اس بیوہ کے جسم اور روح میں آتشِ محبت نہیں بھڑکاتا تو سمرقند کی حیثیت محض ''جسمِ فانی'' کی سی، محض لاش کی سی رہ جائے گی۔

زہرہ بیگم چونک اٹھی۔ اسے اپنے سینے میں اس خواہش کی پھر ایک بار وہ پھر اٹھتی محسوس ہوئی جو ہر شخص کی زندگی میں بہت ضروری ہوتی ہے، تاجداروں کا تو خیر ذکر ہی کیا۔ وہ قلم لے کر خط لکھنے بیٹھی اور شیبانی خان کو آسمان پر چڑھا دیا:

''حضرت امامِ زماں، خلیفۂ رحمان۔۔۔''

۲

سمرقند کی فصیل کے پہلے گھیرے کے آگے وسیع باغات میں، الغ بیگ کی رصدگاہ کے قریب واقع نیوس پر اور دریائے آب رحمت کے کنارے کنارے۔ ہر جگہ اور چاروں طرف لشکر جرار کے دستے پھیلے ہوئے تھے۔ چوپان آتا پہاڑی کے دامن میں اور اس کے آگے دریائے زر فشاں کے کناروں پر مزید سینکڑوں خیمے اور شامیانے نصب تھے۔

اس لشکر کے سالار شیبانی خان نے جو خود کو "امام زماں، خلیفہ رحمان" کہتا تھا، مشہور اور خوبصورت باغ میدان میں الغ بیگ کے تعمیر کرائے ہوئے مشہور "چہل ستون" محل پر قبضہ کر لیا تھا۔ محل کی اوپری منزل بہت کشادہ تھی اور اس کے چاروں طرف برآمدے بنے ہوئے تھے۔ وہیں شجاع اور مہیب شیبانی خان نماز ظہر ادا کرنے کے بعد آراستہ شاہ نشیں پر بڑی شان سے بیٹھا ہوا تھا۔

اتنے میں خبر آئی کہ سلطان علی اپنے درباری عہدے داروں کے ساتھ شجاع اور مہیب خان سے ملنے آیا ہے۔

دیکھنے میں ذرا بھی مہیب نہ لگنے والے خان کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔

"پہلے ہمارے سلطانوں* کو یہاں بلا لیجیے اس کے بعد سمرقند کے حکمران کو لایئے"

"لیکن حکمران، آپ کا تخت تو نچلی منزل پر ہے"

"میری جانماز کسی بھی تخت سے زیادہ اونچی ہے!"

"بجا فرمایا آپ نے، عظیم خان!"

شیبانی خان اونٹ کے بچے کے نرم اون سے بنی ہوئی بھوری جانماز کے بالکل کنارے پر جان بوجھ کر بیٹھا ہوا تھا۔

سلطان علی کے اندر آنے کی اجازت ملی تو سب سے پہلے جس بات کی طرف اس کی توجہ مبذول ہوئی وہ تھی مہیب خان کے چہرے کی پرسکون کیفیت۔ وہ کافی اونچی شاہ نشیں پر بیٹھا ہوا تھا۔ ورنیچے کوئی دس سلطان پالتی مارے آرام کے ساتھ بیٹھے تھے جن کے لباس اتنے سادے نہ تھے جتنا کہ خوداں کے بادشاہ کا تھا۔ شیبانی خان کے لباس میں نام کی بھی سجاوٹ نہ تھی بلکہ سلطان علی کی دستار اور چوغے پر قیمتی کارچوبی اور موتیوں کا کام چمک رہا تھا۔

اٹھارہ سالہ سلطان علی اس بری طرح بوکھلایا ہوا تھا کہ اس کی نگاہیں کسی چیز پر ٹک ہی نہیں پا رہی تھیں اور اس کا عمر کے اعتبار سے کہیں زیادہ پھولا پھولا سا گول مٹول جسم نرمی اور بے حالتی کا آئینہ دار تھا۔ اپنی ماں اور یوسف ارغون کے مشورے پر وہ اپنے فوجیوں کو قلعے ہی میں چھوڑ آیا تھا۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ خان نے ایک لشکر جرار کے ساتھ سمرقند پر یلغار کی ہے اسی لیے اس وقت بے حد خائف تھا۔

اسے بھلا کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ ابو یوسف تو بہت پہلے ہی شیبانی خان سے سازش کر چکا تھا اور اس نے خان کے حکم ہی پر سلطان علی کو خان کی خدمت میں حاضر ہونے کا مشورہ دیا ہے۔ ابو یوسف نے آج دوپہر کے کھانے پر بچے حکمران کو تیز شراب اتنی زیادہ پلا دی تھی کہ اس وقت وہ خان کو کورنش بجالانے کے لیے جھکا تو قالین اس کی آنکھوں تلے تیرنے لگا۔ اس کا تحمل نہ کرتا گول مٹول جسم ڈگمگایا اور اگر ابو یوسف نے سہارا نہ دیا ہوتا تو سیدھا قالین پر ڈھیر ہو گیا ہوتا۔

---

* سلطان: قبیلوں کے سردار۔

سلطان علی کے استقبال کے لیے شیبانی خان اٹھ کھڑا ہوا اور تب اسے تاب کے بھکوں کا احساس ہوا۔ ہو جب تو پیشر فوراً بے ہوشی کر رہا تھا اس سے نشے میں یہاں آنے کی جرأت کی اور شیبانی خان نے حکم دیا کہ سلطان علی کو اس کے بیٹے تیمور سلطان اور داماد حاجی بیگ سے کم اہم جگہ پر بٹھایا جائے۔

سلطان علی کے دل میں خان کو دیکھ کر احترام کے جذبات بیدار ہو گئے۔

شیبانی خان کی سرخ مخملی ٹوپی پر سفید دستار بندھی تھی، بانات کے پھول "قیمتی والے نگینوں جڑے چوغے کے سونے کے بٹن بند تھے اور چوغے کے نیچے کے کپڑے سبز رنگ کے، اسلامی پرچم کے رنگ کے تھے۔ اور جانماز "بڑا مدبر ہے صحراؤں کا یہ باشندہ" سلطان علی نے سوچا۔ لیکن یہ کیا؟ سمرقند کے حکمران سلطان علی کو دوسروں سے کم اہم جگہ پر، جو لوگ اس جیسے عالی نسب نہیں ہیں ان کے پاس بٹھانے کا اشارہ کیا گیا ہے! تو یہ بے قصد! اور سلطان علی صاف بوجھ کر لاپروائی کے ساتھ سلطانوں کے سامنے پالتی مار کے بیٹھ گیا۔ شیبانی خان کے بیٹے تیمور سلطان نے اپنے ہم پہلو کو جھنجھلاہٹ کے ساتھ دیکھا۔

"تو مرزا، آپ ہم سے فرزند جیسے قریبی تعلقات قائم کرنا چاہتے ہیں؟" شیبانی صاحب نے سمرقند کے حکمران سے محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"مجاہد خلیفہ، آپ نے تو ہم کو صلح کرنے کے لیے مدعو کیا ہے۔ . ."

"لیکن آپ کی والدہ محترمہ آپ کے ساتھ نہیں آئی ہیں کیا؟"

"والدہ صاحبہ نے مجھے بھیجا ہے" سلطان علی نے واضح طور پر کہا اور پوری طرح ظاہر کر دیا کہ اس کا اقتدار کس نوعیت کا ہے۔

"لیکن وہ خود بھی تو تشریف لانے والی تھیں۔۔۔"

"رے خواتین . . جنگ و امن کے معاملات سے خواتین کو کیا سروکار" سلطان علی نے بھونڈے پن سے اپنی غلطی درست کی۔

"نہیں، آپ کسی کو بھیجئے جو انھیں یہاں لے آئے۔ خان نے محبت سے لیکن اس طرح کہا گویا یہ حکم ہو جس کی خلاف ورزی نہ کی جا سکتی ہو۔

سلطان علی نے اپنے قریب ہی گھٹنوں کے بل بیٹھے ہوئے ابو یوسف کی طرف دیکھا جو فوراً ہی اٹھ کر شیبانی خان کو کورنش بجا لایا

"مجاہد اعظم، اجازت دیجئے کہ میں فوراً ہی جا کر زہرا بیگم کو بلا لاؤں۔"

شیبانی خان نے ابو یوسف کو بھی محبت بھری نظروں سے دیکھا

"میرے بہترین تیز رفتار گھوڑوں میں سے ایک آپ کا ہو گیا، بیگ"

"حکمران کی عنایت کا بہت بہت شکریہ"

"بیگ، آپ ٹھہر جائیے" دفعتاً سلطان علی کہہ اٹھا۔ "ور خواجہ یحیٰی کو ہماری خواہش سے مطلع کر دیجئے۔ اگر وہ یہاں جہاں کہ میں اس وقت موجود ہوں، نہ آئے تو ہمارے درمیان صلح کا سوال ہی نہ اٹھے گا۔"

"بجا فرمایا آپ نے محترم امیر" ابو یوسف نے قدرے سرپرستانہ انداز میں کہا اور تاجدار کا حکم بجا لانے کے لیے

ور اسی دوال سے چل دیا۔ شیبانی خاں نے اپنے سلطانوں کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

"آپ لوگ ذرا مرزا سلطان علی سے باتیں کیجیے" اس نے کہا اور مڑ کر عقبی دروازے سے پیچھے اتر گیا۔

سمرقند کے حکمران نے سلطانوں کے چہروں پر نظریں دوڑائیں۔ ان سے نفرت اور صرف نفرت ہی جھلک رہی تھی۔ اس کا جی ان لوگوں کے درمیان ٹھہرنے کو نہ چاہا اور وہ اٹھ کر بغل والے دروازے کی طرف بڑھا۔ لیکن عین اسی لمحے ترکستان کے ایک سلطان نے کھڑے ہو کر اس کا راستہ روک لیا

"مرزا سلطان علی اب آپ ہمارے یہاں سے کہیں بھی نہ جائیں گے، ہمیں یہی حکم دیا گیا ہے۔"

ور ایک لمبا تڑنگا سپاہی جس کے کشادہ ہتھیلی خنجر کے دستے پر رکھی ہوئی تھی، دروازے کے پاس آن کھڑا ہوا۔ سلطان علی پر واضح ہو گیا کہ وہ جال میں پھنس چکا ہے، اس کا سارا نشہ پلک جھپکتے میں ہرن ہو گیا اور وہ اترے ہوئے چہرے کے ساتھ اپنی جگہ پر لوٹ آیا۔

چند گھنٹوں کے بعد زہرہ بیگم چار کنیزوں کے ہمراہ باغ میدان میں آئی۔ سر پر مخصوص انداز سے بندھے ہوئے سفید ریشمی رومال اور پیشانی پر نیم دائرے کی شکل کے طلائی زیور کی بنا پر وہ بالکل دلہن جیسی لگ رہی تھی۔ ملکات کی سی آستینوں والی پھول دار قبا، اس کی موٹی لیکن لچکیلی کمر پر کسی ہوئی تھی اور اس کے نیچے سے سفید اطلسی شلوار کے فرش تک آتے ہوئے دامنوں کو دونوں جانب سے کنیزیں اٹھائے ہوئے تھیں۔

زہرہ بیگم کو محل کے دیوان خاص میں لے جایا گیا جسے اس موقع کے لیے خاص طور پر آراستہ کیا گیا تھا۔ مہمان کو شیبانی خان کی بڑی بیگم نے بھی دیکھا جس کی عمر پچاس کے قریب ہو چکی تھی۔

"توبہ، کیسی بے حیا ہے!" اس نے اپنے پاس کھڑی ہوئی جوان عورت سے کہا "آخر یہ ہے کیسی؟ مرد کے لیے تڑپ رہی ہے، ذرا بھی تو تمیز نہیں، دلہن کی طرح سجا رکھا ہے خود کو! کم از کم شادی کے پیغام اور ضروری رسمیں ادا ہو جانے تک تو انتظار کر لیتی۔ خدا ہمیں ایسی ذلت سے بچائے"

زہرہ بیگم دیوان خاص میں داخل ہوئی تو شیبانی خان اپنے چند معتبر سرداروں کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ وہ اس امید کے ساتھ کورنش بجا لائی کہ خان تخت سے اتر کر اس کا خیر مقدم کرنے کے لیے رستے پر بچھی ہوئی قالین کی پٹی تک آئے گا لیکن خان اپنے تخت زریں سے چپکا ہوا بیٹھا رہا اور تخت کی بلندی پر سے ہی سرد مہری سے بولا

"خوش آمدید، خانم۔"

زہرہ بیگم کی توقعات کچھ اور ہی تھیں۔ اس کا سر اچانک کچھ جھک گیا اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"حکمران، خلیفہ، میں خود کو آپ پر قربان کرنے کے لیے حاضر ہوئی ہوں! میں اپنا تخت جگر، اپنی عزت، اور آن سب کچھ آپ کو نذر کر چکی ہوں... میں آپ کی شرافت پر، آپ کے خط پر پوری طرح یقین کرتی ہوں.."

زہرہ بیگم کے چہرے کو جو دبیز سفید ریشمی نقاب سے ڈھکا ہوا تھا، دیکھنا مشکل تھا۔ خان نے اس کے ہاتھوں پر، قیمتی ہیروں والی انگوٹھیوں سے لدی انگلیوں، مرتعش انگلیوں پر، ابھری ہوئی رگوں والے ہاتھوں پر نظریں دوڑائیں۔ زہرہ بیگم کی عمر ڈھل چکی تھی، اس میں ذرا بھی شک نہ تھا۔ وہ اس انیس سالہ چھوٹی بیگم جیسی قطعاً نہ تھی جس سے خان نے حال ہی میں بخارا میں شادی کی تھی۔

شیبانی کو یاد آ گیا کہ زہرہ بیگم کا بیٹا جسے اس وقت محل کے دوسرے حصے میں اس کے سلطان نظر بند کیے ہوئے

اٹھارہ سال کا ہو چکا ہے۔

"آپ گھبرایئے نہیں، خانم" شیبانی نے پرسکون لہجے میں کہا "میں آپ کی دلی آرزوؤں کا علم ہے۔ خدا نے چاہا تو آپ کی خواہشات ادھوری نہ رہیں گی!"

زہرہ بیگم خان کے منہ سے بس اتنا ہی بن سکی۔ اس کے بعد سے وہ اس کی کنیزوں کو ایک چھوٹے سے کمرے میں لے جا کر باہر سے قفل لگا دیا گیا۔

۳

قطعی طور پر تو کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ شیبانی خان اہل سمرقند کے ساتھ کیسا سلوک کرنے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن فوجی دستوں کے سالار اور درباری عہدے دار سبھی محسوس کر رہے تھے کہ کچھ اہم واقعات رونما ہونے والے ہیں۔ یہ لوگ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں چہل ستون محل کے ارد گرد ٹہل رہے تھے۔

ان میں ایک شاعر محمد صالح بھی شامل تھا۔ سر پر چست دار شاندار ریشمی دستار تھی اور جسم پر چھوٹی آستینوں والی ریشمی عبا بھی خوب جچ رہی تھی۔ محمد صالح کو صحرائی علاقوں کے سلطان جو سردیاں ہوں یا گرمیاں ہمیشہ تیلپک* پہنتے تھے اور جن میں مسلسل جنگوں میں حصہ لیتے لیتے اکھڑ پن پیدا ہو گیا تھا، گنوار آدمی سمجھتے اور اس کے شاندار لباس کی بنا پر ذرا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ یہ لوگ موقع پاتے ہی چبھتے ہوئے طنز کے ذریعے یہ یاد دلانے سے باز نہیں رہتے تھے کہ یہ بانکا چھیلا شاعر سمرقند کے حکمرانوں کی خدمت کر چکا ہے جو اپنے زمانے کے خونخوار تیمور لنگ کی بدقسمت آل اولاد میں سے تھے۔

اس وقت بھی نیمان قبیلے کے سردار قنبر بے نے محمد صالح پر چوٹ کی

"کہیے شاعر صاحب! ہمارے وفادار دوست سمرقند سے آپ کی مہربان رشتے دار بن سلطان کے اپنے صاحبزادے کے ساتھ ہمارے ہاں تشریف لائی ہیں۔ سمرقند کی اپنی ان رشتے دار کو دیکھ کر آپ تو خوشی سے پھولے نہ سما رہے ہوں گے؟"

"محترم قنبر بے، آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ زہرہ بیگم نیمان قبیلے کی ہیں اس لیے اوروں سے پہلے تو وہ آپ کی رشتے دار ہیں!"

یہ جواب سن کر منغیت، قونغرات اور دورمن قبیلوں کے سلطانوں نے زوردار قہقہے بلند کیے۔ نیمان قپچاقوں کا یہ سردار دوسروں کے سامنے خوب دون کی لیتا اور صرف اپنے قپچاقوں ہی کو ازبیک مانتا تھا۔

قنبر بے کو غصہ آ گیا

"بہتر ہوگا کہ آپ رشتے داری کی بات زبان ہی پر نہ لائیں۔۔۔ خود آپ برلاس ترک نہیں ہیں کیا؟"

برلاس قبیلہ جس سے تیمور تعلق رکھتا تھا، شیبانی خان کے لیے سب سے زیادہ قابل نفرت تھا۔ محمد صالح پہلے حسین بیقرا کے دربار سے وابستہ رہا تھا پھر سلطان علی کا مقرب بن گیا تھا اور آخر میں شیبانی خان کے پاس بھاگ آیا تھا۔ اس

---

* تیلپک: سمور کی بڑی سی ٹوپی

نے شیبانی خان کو بخارا اور دبوسیہ* کے قلعوں پر قبضہ کرنے میں معاون ثابت ہوا اور اس طرح وہ خان کا منظورِ نظر ہو گیا تھا۔ قنبر بے محمد صالح کو نامعتبر اور غداری کرنے کا اہل بلا سبب ہی نہیں سمجھتا تھا۔ یا حسب ہی اس سے نفرت نہیں کرتا تھا۔

شاعر نے مذاق میں بات ٹالنے کی کوشش کی

میرے عزیز قنبر بے، اب تو میں بھی ازبیک ترکوں میں شامل ہوں!"

"ارے شاعر صاحب، زیادہ چالاکی مت دکھائیے! ازبیک الگ ہوتے ہیں اور ترک بالکل الگ"

"کیوں؟ ماوراء النہر کے ترکوں میں تو تمام ازبیک قبائل شامل ہیں۔"

"لیکن ہم لوگ تو عظیم ازبیک خان** کی نسل کے ہیں اور آپ، شاعر صاحب، سارت*** ہیں، اُن ہی شہری لوگوں کی آل اولاد ہیں۔ یہ مت بھولیے!"

"قنبر بے صاحب، میرے آبا و اجداد شہر ترکستان میں رہتے تھے۔ ازبیکوں میں عام طور پر کہا جاتا ہے: "ہمارا وطن ترکستان"

"لیکن اس سے کیا؟"

آپ کا وطن ترکستان ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کے اور میرے آبا و اجداد کی جڑ ایک ہی ہے۔ قنبر بے صاحب، آپ تحقیق کسی ایک شاخ سے نہیں بلکہ جڑ سے، درخت کے مولے سے شروع کیجیے۔ تب آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ازبیک خان دو سو سال قبل گزرے تھے جبکہ ہمارا ترکستان ازبیک خان سے بھی ہزار سال قبل وجود رکھتا تھا۔ اور ہمارے عوام میں "ازبیک" نام ازبیک خان سے بہت پہلے ہی سے استعمال ہوتا رہا ہے"

"ارے واہ، کیا کہنا!" قنبر بے کو یقین نہ آیا۔

"میری بات پر یقین کیجیے! میں خوارزم میں بڑا ہوا ہوں، وہاں میں نے قدیم کتابوں کا جو آپ کو ایک آنکھ نہیں بھاتیں، مطالعہ کیا ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ خوارزم کے شاہ محمد نے، اسی حکمران نے جو چنگیز خان کے خلاف برسرِ پیکار ہوا تھا، اپنے ایک بیٹے کا نام ازبیک رکھا تھا؟ اس نے خود اپنے بیٹے کا نام رکھا تھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ نام عرصے سے قابلِ احترام تصور کیا جاتا تھا! اور آپ کو معلوم بھی ہے کہ اس کا مفہوم کیا ہے؟ ازبیک کے معنی ہیں "اپنا، ملک آپ"۔ "آزاد" جو قبائل ہمارے حکمران، مجاہد خلیفہ شیبانی خان کے تابع ہیں انھوں نے خود کو ازبیک کہنا اس لیے نہیں شروع کیا کہ یہ نام ازبیک خان کا یا اس سے بھی قبل خوارزم کے شاہ کے بیٹے کا تھا، انھوں نے تو یہ خوبصورت نام ترکوں سے لیا ہے۔

"بہت ہو چکا! یہ شاعر صاحب تو ایک بار پھر ترکوں کی طرف جھکنے لگے!" قنبر بے نے جھلا کر سلطانوں سے کہا جو اس بحث کو بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔

"ورنہیں تو کیا! ابھی ابھی آپ خود ہی تسلیم کر چکے ہیں کہ آپ کا وطن ترکستان ہے اور ترکستان کے معنی ہیں "ترکوں کا ملک"۔

---

* دبوسیہ قلعہ (فوادون قلعہ) اس قلعے کے کھنڈرات جس جگہ واقع ہیں وہ آج کل ضیاء الدین کہلاتی ہے۔

** گولڈن ہورڈ کا ایک خان (۱۳۱۲ء-۱۳۴۲ء)

*** خانہ بدوش ترک کی مستقل سکونت اختیار کرنے والوں کو حقارت سے "سارت" کہا کرتے تھے۔

قریب پہنچا جس پر شیبانی خان سر کو کچھ جھکائے ہوئے بیٹھا تھا۔ اس نے تخت سے قریب خواجہ کی عادی اپنی مخصوص

رعب دار آواز سے کہا

"السلام علیکم، بہادر خان! سمرقند کے دروازے آپ کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔"

شیبانی خان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے طنز کیا

"سمرقند کے دروازے آپ نے کھولے ہیں کیا؟"

"ہر کام صرف اللہ تعالیٰ کی مرضی ہی سے ہوتا ہے"

"ہم کام صرف اللہ تعالیٰ کے حکم ہی کی تعمیل کر رہے ہیں لیکن کچھ لوگ خود اپنی مرضی ہی سے سمرقند کو بابر کے حوالے

کر دینے کو تیار تھے"

پیر کی ساری تیز فہمی فوراً ہی کافور ہو گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ چبھتے ہوئے طنزیہ فقروں کا مزید تبادلہ خطرناک ثابت ہوگا۔

"انسان کمزور ہوتا ہے، محترم حکمران۔ ہم سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہو تو معاف فرمایئے۔ میں آپ کی خدمت

میں سر جھکائے ہوئے حاضر ہوا ہوں"

"حاضر ہوئے ہیں یا حاضر کیے گئے ہیں؟"

خواجہ یحییٰ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"خواجہ کی اوپری منزل پر لے جایئے" خان نے حکم دیا، "اور انہیں ان کے بھتیجے مرزا سلطان علی کے پاس بٹھا

دیجئے"

خواجہ یحییٰ کے وہاں سے لے جائے جانے کے فوراً ہی بعد شیبانی خان نے اپنے سب سے مقرب ساتھ اور مشیر

عبدالرحیم کو طلب کیا۔

دونوں نے تنہائی میں جو باتیں کیں ان کا سرداروں میں سے کسی کو بھی علم نہ ہو سکا۔ زیادہ تر سلطانوں کو حیرت تھی کہ

دروازے کھلے ہونے کے باوجود شیبانی خان سمرقند میں داخل ہونے میں جلدی کیوں نہیں کر رہا ہے۔ وہ سوچ رہے تھے

آخر ہم دیر کیوں کر رہے ہیں، برق رفتاری سے اندر جا کر اور شہر کے اس محبوب و مطلوب مرکز پر قابض کیوں نہیں ہو

جاتے جہاں پہنچنے کے لیے شیبانی کے ریک اتنے طویل عرصے سے، اتنے عزم کے ساتھ تیاری کر رہے تھے۔

تو کیا دربار خاص اس مسئلے پر کوئی فیصلہ کرنے کے لیے طلب کیا گیا تھا؟ بہرحال جب شیبانی خان صدر دروازے

سے اندر داخل ہوا تو حاضرین کا تجسس نقطہ عروج پر پہنچ چکا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی اچھل کر اپنی اپنی جگہوں پر کھڑے ہو گئے

اور کورنش بجا لائے۔ شیبانی خان دھیرے دھیرے شاہ نشیں پر چڑھا اور زری کے گدے پر پالتی مار کے اطمینان کے ساتھ

بیٹھ گیا۔ اس کے دائیں جانب عبدالرحیم کے بیٹھ جانے کے بعد چند لمحوں تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر عبدالرحیم نے

قرآن کی ایک سورت پڑھ کر دعا کی کہ پروردگار مجاہد اسلام شیبانی خان کو کامیابیاں عطا فرمائے اور مقدس مقاصد کی تکمیل

ہو سکے۔ ایک بار پھر خاموشی چھا گئی جسے کچھ دیر کے بعد ایک بار پھر عبدالرحیم نے ہی توڑا اور آخر کار اصل مسئلے پر آ گیا

"ہمارے عظیم امام، مجاہد خلیفہ، پیکر تقدس شیبانی خان صرف یہی ارادہ نہیں رکھتے کہ گناہوں میں ڈوبے ہوئے اس

شہر پر قبضہ کر لیں۔ ہمارے حکمران تو دشمنان دین کو سزا دینا چاہتے ہیں۔ اگر ہمارے حکمران ان لوگوں میں سے ہوتے

جنہیں صرف دولت ہی کی فکر رہتی ہے تو سمرقند کو اپنا خزانہ خالی کر دینا پڑتا لیکن ہمارے عظیم شیبانی خان جو اپنی دانائی میں

سکندرِ ثانی ہیں جو دینی مہمات کی فتح کو مقدم تصور کرتے ہیں۔"

"بجا فرمایا آپ نے" محمد صالح نے جو عبدالرحیم سے دورانِ گفتگو چند ہی مہینوں میں بہت بے تکلف ہو چکا تھا،

کہا۔

"خاندانِ تیموریہ کے بادشاہوں کے طرزِ عمل سے ہم پر واضح ہوتا ہے" عبدالرحیم نے شاعرانہ انداز سے ... بغیر اپنی بات جاری رکھی "کہ جب تاجدار انصاف اور ایمان کو بھول بیٹھتے ہیں تو کتنی زیادہ بداخلاقی پھیل سکتی ہے، ملک کتنا بدحال ہو سکتا ہے۔ عبداللطیف کے حکم سے الغ بیگ کو قتل کیا گیا حالانکہ وہ عبداللطیف کا سگا باپ تھا۔ پھر سلطان حسین میرزا نے اپنے سگے پوتے مومن مرزا کی جان لے لی۔ سلطان علی.... دیکھیے، وہ یہاں ہمارے پاس بیٹھا ہوا ہے۔ اپنے بڑے بھائی بایسنغر کو پکڑوا کر قتل کر دینا چاہتا تھا لیکن وہ بھاگ کر جان بچانے میں کامیاب ہو گیا اور بعد میں بایسنغر نے اپنے چھوٹے " وہ طنزاً مسکرایا "بھائی کو پکڑ لیا اور اس کی آنکھیں نکلوا دینا چاہتا تھا پر ہمارے میزبان سلطان علی جلاد کو رشوت دے کر بچ نکلا۔ دراصل سمرقند کے تاجداروں کا دربار غداری، مکر و فریب اور عیاشی کا اڈا بن گیا۔ قرآن نے مسلمانوں کے لیے شراب نوشی کو سختی کے ساتھ ممنوع قرار دیا ہے لیکن یہ کم سن مرزا سلطان علی۔ آپ دیکھ رہے ہیں نا اسے؟ امام ورعی بد اسلام کی خدمت میں ممنوع شے کے نشے میں دھت ہو کر حاضر ہوئے کا حق ہے! ہمارے مقتدیٰ، ہم کو تو خیر پہلے ہی سے علم تھا کہ نوعمر حکمران کم سنی ہی سے جام و گناہ پر گامزن ہے اور اب معزز سلطان، آپ لوگوں کو بھی اس بات کا یقین ہو گیا۔"

قپچاق قبیلے کا سردار کوپک بے اپنی جگہ سے چلایا

"اس زناکار اور شرابی کو دار پر چڑھا دیا جائے!"

"نوجوان حکمران یقیناً قصوروار ہے" محمد صالح نے کہا اور مذمت کے انداز میں سر ہلایا۔ "لیکن اس کا باپ سلطان محمود تو اس سے بھی زیادہ گنہگار تھا۔ توبہ توبہ، کتنا عیاش تھا وہ شخص! وہ تو دین و ایمان کو پامال کیا کرتا تھا۔ عورتوں اور کم سن بچوں کو اپنی ہوس کا شکار بناتا رہتا تھا۔ بدنصیب اہلِ سمرقند تو ڈر کے مارے اپنے کم عمر بیٹوں کو گھر سے باہر نہیں جانے دیتے تھے، انھیں بھی بیٹیوں ہی کی طرح زنان خانوں میں چھپائے رہتے تھے۔"

"اور بدنصیبی ہے کہ بیٹا بدکرداری میں باپ سے بھی زیادہ آگے بڑھ چکا ہے" قنبر بے نے تلوار کی دھار کی سی تندی و تیزی سے کہا۔

"باپ کا تو خیر کہنا ہی کیا، ذرا ماں کو تو دیکھیے، سلطان علی کی ماں کیسی ہے؟"

کوپک بے نے یہ کہہ کر سنگین خطرہ مول لے لیا تھا۔ لوگوں نے دم سادھ لیے، سناٹا چھا گیا۔ یہ خبر کہ شیبانی خان زہرہ بیگم سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، بہتوں کے کانوں تک پہنچ چکی تھی۔ شیبانی جانتا تھا کہ وہ زہرہ سے شادی کرے گا تو سلطانوں کی نظروں سے گر جائے گا اور ویسے بھی وہ زہرہ بیگم کے پھولی پھولی نسوں والے ہاتھوں کو فراموش نہیں کر پا رہا تھا۔ عبدالرحیم نے جو خان کے ارادوں سے واقف تھا، فوراً ہی افواہوں کا خاتمہ کرنے کی ٹھانی اور قپچاق سلطان کے غصے اور طنز سے بھرے ہوئے تبصرے کی تائید کر دی۔

"دراصل بدکار تاجداروں کی بیگمات بھی ان ہی کے نقشِ قدم پر چلتی ہیں۔ لگتا ہے کہ سلطان علی کی ماں اپنی ہوس کی آگ بجھانے کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہے۔ کہیں اسی مقصد کے تحت تو اس نے اپنے بیٹے کو ہمارے حوالے نہیں

کیا؟"

ایک سلطان نے اطمینان کی سانس لے کر فوراً ہی کہا:

"ایسی کمینی عورت کو تو گھوڑے کی دم میں باندھ کر اس وقت تک گھسیٹا جانا چاہیے جب تک مر نہ جائے"

کسی دوسرے نے ایک اور ہی سزا تجویز کی

"اسے تو بورے میں بند کر کے بلند ترین مینار کے اوپر سے دھکیل دیا جانا چاہیے!"

شیبانی خان ان مہیب سے مہیب تر تجاویز کو خاموشی سے سنتا رہا۔ آخرکار اس نے عبدالرحیم کی طرف دیکھا جس کے اشارے پر سارے کے سارے سلطان خاموش ہو گئے۔

اور تب خان نے سنجیدہ، پر رعب اور پر اعتماد انداز سے بولنا شروع کیا۔ اس کے سامعین بالکل بے حس و حرکت اور مسحور سے ہو کر رہ گئے خاص طور سے اس وقت جب وہ تیموری خاندان کے حکمرانوں کی جنھوں نے عظیم الشان سلطنت کو تباہ و برباد کر دیا تھا، اخلاقی پستی، بدکرداری اور بے دینی کو نئی نئی مثالوں کے ذریعے ثابت کرنے لگا۔ اچانک شیبانی خان نے خواجہ یحییٰ کی طرف رخ کیا

"اور پیر صاحب ان عیاشوں کے مرشد، آپ تو خواجہ احرار کے فرزند ارجمند ہیں جو خود کو "ولی" کہا کرتے تھے۔ ان کی روحانی طاقت سے تاجداروں کو سہارا ملا کرتا تھا۔ لیکن آپ کے والد محترم نے وہ جو بے حساب دولت جمع کی تھی وہ کیا ایمانداری سے کمائی ہوئی دولت تھی؟ ہمیں معلوم ہے کہ آپ کو ورثے میں ڈھیروں سونا ملا تھا۔ اسی سونے کے بل بوتے پر آپ پورے گیارہ برسوں سے سمرقند کو اپنی مٹھی میں لئے ہوئے ہیں۔ مچھلی کے سڑنے کی ابتدا اس کے سر سے ہوتی ہے۔ جیسا پیر ویسے مرید۔ یہ نوجوان زناکار مرزا سلطان علی۔ یہ آپ ہی کا مرید ہے، آپ نے خدا کے سامنے اس کی ذمہ داری اپنے اوپر لی ہے، اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھامے۔"

پھر شیبانی نے اپنی انگلی سے پہلے سلطان علی اور بعد میں خواجہ یحییٰ کی طرف اشارہ کر کے اس کا رخ فرش کی طرف کر دیا

"وہ وہاں پیچھے ایک اور بدکارہ بیٹھی ہوئی ہے۔۔ وہ شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر یہاں شوہر کی تلاش میں آئی ہے۔۔ تو ایسے پیر ہیں آپ! آپ نے اپنے مرید سلطان علی کے ساتھ غداری کی، آپ تو چاہتے تھے کہ سمرقند بابر کے حوالے کر دیں اور یہ مرید اپنے پیر سے غداری کر کے میرے پاس آ گیا۔ وہ رہے شہر! ہر طرف غداری، غدار، عیاری عیار! ایک ادھر کھینچتا ہے تو دوسرا ادھر۔ تاجدار ایک طرف کھینچتا ہے تو اس کا مرشد دوسری طرف۔ ایک دوسرے کو کچا کھا جانے کو تیار ہے! ہمارے پیغمبر حضرت محمد ﷺ دینی رہنما بھی تھے، بادشاہ بھی تھے اور سپہ سالار بھی۔ جو رسول خدا کے دکھائے ہوئے رستے پر نہیں چلتا وہ اسی پیر اور اسی مرزا کی طرح کفر کے قعر میں جا گرے گا!"

شیبانی خان نے یہ بات اپنے کچھ ضدی مقربین کو مدنظر رکھتے ہوئے کہی تھی جو چوری چھپے بڑبڑاتے رہتے تھے "ہمارے خان صرف تخت و تاج ہی سے مطمئن نہیں ہوئے، انھوں نے تو اپنے امام اور خلیفہ ہونے کا بھی اعلان کر دیا" شیبانی ماوراءالنہر کے حالات کا عرصے سے مسلسل مشاہدہ کرتا رہا تھا اور بخوبی جانتا تھا کہ خواجہ احرار جیسے لوگوں کی طاقت بڑھنے سے حکومت کمزور ہو جاتی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اپنی سلطنت میں اس قسم کی صورت حال ہرگز ہرگز نہ پیدا ہونے دے گا۔ بخارا کے مدرسے میں حصول تعلیم کے دوران وہ شریعت و طریقت سے بخوبی واقفیت حاصل کر چکا تھا اور اب اس کے

مقربین میں ایک بھی شخص ایسا نہ تھا جو احادیث سے خان کی بہ نسبت بہتر واقفیت رکھتا ہو، اور جو خان سے زیادہ متاثر کن انداز سے قرآن کی تلاوت کر سکتا ہو۔ وہ سوچتا تھا: مذہب کے بغیر جو قبائلی سرداروں اور عام قبائلیوں کو متحد اور اس کے ارد گرد اکٹھا کرنے والی قوت ہے، خان اور سپہ سالار کی حیثیت سے اس کی وقعت ہی کیا؟ لیکن اس کے حکم بردار اور طاقتور لشکر کے بغیر امام اور خلیفہ کی حیثیت سے اسے کیا اہمیت حاصل ہو سکتی ہے؟ اسی لیے سپہ سالار اور خلیفہ ایک ہی شخص کو ہونا چاہیے!

سمرقند میں ہمارے دشمن ہفت سر اژدھے کی طرح طاقتور ہیں۔ کیسے کیسے سورماؤں کو شکست دے چکا ہے یہ اژدھا! لیکن ہمارے منصوبے اور ارادے پاک اور نیک ہیں۔ اس اژدھے کو خود اللہ تعالیٰ نے اس ارشاد کے ساتھ ہمارے ہاتھوں میں دے دیا ہے "جو مرضی ہو، کرو!" اللہ تعالیٰ کے حکم سے عظیم سمرقند کے دروازے جنگ کے بغیر ہی ہمارے لیے کھل گئے ہیں!"

خان کے مقربین پر اب کہیں جا کر روشن ہوا کہ انھوں نے کتنی بڑی فتح حاصل کی ہے۔ واقعی سمرقند، عظیم سمرقند جنگ کے بغیر ہی ہتھیار ڈال رہا ہے، خود شہر کا حکمران اور دینی رہنما دونوں کے دونوں سر جھکائے ہوئے شیبانی خان کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ مقربین کے دلوں میں خیال آیا اللہ بے شک قادر مطلق ہے اور شیبانی خان سچا مجاہد اور اللہ کا محبوب بندہ۔ جب ہی تو وہ ایسے دشوار کام کو ایسی دانش مندی اور کامیابی کے ساتھ انجام دے سکا۔

عبد الرحیم نے نعرہ بلند کیا:

"ہمارے مقدس امام کو عمر ہزار سالہ نصیب ہو!"

دوسرے لوگ بھی فوراً ہی اٹھ کھڑے ہوئے

"سکندر ثانی زندہ باد!"

"خلیفہ کا ہزار بار شکریہ!"

"مجاہد خلیفہ تا ابد زندہ و سلامت رہیں!"

سلطان علی اور خواجہ یحییٰ بھی کھڑے ہو گئے۔ دونوں کے چہرے مارے خوف کے فق ہو گئے تھے اور کھڑے رہنا سخت دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ خوف کی وجہ بھی تھی۔ شیبانی خان کے بس ایک ابرو ہلانے کی دیر تھی اور اس کے رفقا ان سمرقندیوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے۔

خان کے اشارے پر تحسین و ستائش کا یہ طوفان تھم گیا اور سب لوگ دوبارہ اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ تب شیبانی نے سلطان علی اور خواجہ یحییٰ کی طرف انگلی اٹھائی

"انھیں اگر تڑپا تڑپا کر ہلاک کر دیا جائے تو یہ کوئی گناہ کی بات نہ ہو گی۔ لیکن ہم ایک بار پھر دنیا کو دکھا دیں گے کہ دین انصاف کی راہ پر چلنے والوں کی طاقت کیسی ہونی چاہیے۔ یہ طاقت ہے ہمدردی کی۔ مہمانوں کا خون نہ بہایا جائے گا۔ ان کی جان بخشی جاتی ہے۔"

یہ سنتے ہی سلطان علی اور خواجہ یحییٰ جو زندہ رہنے کی آس پوری طرح کھو چکے تھے، فلاں شاد یانہ ہیں جھک کر کورنش بجا لائے۔ اب نہ سلطان علی کا تکبر باقی رہ گیا تھا نہ ہی خواجہ یحییٰ کا وقار۔ پیر کی تو آنکھیں بھی نم ناک ہو گئیں

"خدا آپ کی عمر دراز کرے، عالی جاہ"

"ارے وہ ٹھہر تو!" شیبانی خاں نے بلند آواز سے کہا "خود پسند، خود غرض، ایمان کو فراموش کر بیٹھنے والے تجھے تزکیہ نفس کے لیے حج کرنے جانا ہوگا۔ ضروری سامان لے کر اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ روانہ ہو جا۔ چاپلوسو! تمہیں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ یہ شخص کل صبح سے قبل ہی روانہ ہو جائے۔"

"جو حکم عظیم خان۔"

"ہاں، اور یہ نوجوان مرد" شیبانی خاں نے سلطان علی پر نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے بات جاری رکھی "دوسرے فرد کی طرح رہنا چاہتا ہے ٹھیک ہے۔ گمراہ ہو جانے والے کو صراط مستقیم پر واپس لانا کار ثواب ہے۔ تیمور خان تم اسے اپنے مقربین میں شامل کر لو۔"

خان کے گٹھے ہوئے جسم والے بیٹے نے سلطان علی پر حقارت بھری نظر ڈالی لیکن باپ کا حکم بہر حال حکم تھا اور اس نے تعظیماً سر جھکا دیا۔

"یہ نیک ثابت ہو تو انعام پائے گا" شیبانی نے مزید کہا۔ "ورنہ بد ثابت ہوا تو اپنا سر گنوا بیٹھے گا"

سمجھنے والے سمجھ گئے کہ اب سلطان علی کی آخری گھڑی دور نہیں۔

اور اب زہرہ بیگم کی قسمت کا فیصلہ ہونا تھا جو نچلی منزل پر مقید تھی۔

شیبانی خان زہرہ بیگم کے حسن و جمال کی تعریفیں عرصے سے سنتا آ رہا تھا اور ایک بار تو یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ اس سے نکاح کرکے کچھ دنوں کے بعد طلاق دے دے گا۔ لیکن اس نے زہرہ بیگم کو چند اشعار سمیت جو خط بھیجا تھا اس میں اس بات کا ذرا بھی اشارہ نہیں دیا تھا کہ صرف کچھ دنوں کے لیے ہی اسے اپنی بیگم بنانا چاہتا ہے۔ شیبانی خان چاہتا تھا کہ اپنی خوبصورتی پر نازاں یہ سمرقندی بیوہ اس خیال میں کھوئی رہے کہ وہ در حقیقت خان کے دل کی ملکہ اور شریک زندگی بنے گی۔ آج زہرہ بیگم کو دیکھ کر شیبانی کو مایوسی ہوئی تھی لیکن دراصل یہ مایوسی ہی اس کے دل کی واحد کیفیت نہ تھی۔ خان کے دل کو ندامت سے ملتی جلتی ایک کیفیت بھی پریشان کیے ہوئے تھی کیونکہ اس نے اپنے اشعار اور خط کے ذریعے زہرہ بیگم کو بہکایا تھا، دوسرے لفظوں میں اسے فریب دیا تھا، دغا کی تھی۔ اس کے لیے یہ بڑی اہم بات تھی کہ اس وقت دیوان خاص میں سلطانوں نے زہرہ بیگم کا تذکرہ نفرت و حقارت کے ساتھ کیا تھا۔ گویا کہ وہ اپنے خان کو زہرہ بیگم کی بدکرداری اور آلودہ دامنی کا یقین دلانا چاہتے ہوں۔ اس کا دل پرسکون ہو گیا۔ "زہرہ بیگم خود ہی گری ہوئی عورت نکلی، وہ تو بے وفائی اور دغا کی مستحق" خان نے سوچا، "بے شک میں سلطانوں کو یہ موقع نہ دوں گا کہ اسے سزائے موت دے دیں، ہرگز نہیں۔ لیکن سلطانوں کے ساتھ میرا اتحاد مجھے ہر شے سے حتیٰ کہ ایسی عورت سے بھی زیادہ عزیز ہے جو صحیح معنوں میں پیکر حسن ہو۔ زہرہ بیگم دوبارہ شادی کرنا چاہتی تھی۔ میں اس معاملے میں اپنے قول پر پورا اتروں گا، اس کے لیے خاوند تلاش کر دوں گا"

شیبانی خان کی نظر ایک فربہ اندام چیچک رو شخص پر جا ٹھہری جو معزز شاہی مقربین کی جگہوں سے کافی ہٹ کر بیٹھا ہوا تھا۔ ہاں، منصور بخشی ہی زہرہ بیگم کے لیے موزوں خاوند تھا۔ وہ کوئی دولتمند سلطان نہ تھا لیکن فوجی مہموں میں حصہ لینے کے ساتھ ہی ساتھ جادو ٹونے سے علاج بھی کیا کرتا تھا۔ وہ زور زور سے دف بجا بجا کر مریضوں پر سے بھوتوں کا سایہ اتارنا بھی جانتا تھا اور گالیاں دے دے کر انھیں خائف کرتا بھی۔ اسی لیے اس کا نام "ہوا" پڑ گیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنی غیر معمولی حد تک جارحانہ مردانگی کے لیے بھی بدنام تھا جسے اس کی کوئی بھی بیوی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی بیویاں سال دو سال بعد یا تو اس کے گھر سے بھاگ کھڑی ہوئی تھیں یا پھر دنیا ہی سے سدھار گئی تھیں۔

"ارے منصور تحشی، بیوی کے معاملے میں یک بار پھر آپ کی قسمت پھوٹی نکلی، سچ ہے نا؟" شیبانی نے ہر سلطان سے پوچھا۔ "پیچھے وہ جو عورت بیٹھی ہوئی ہے نادہ جیسا کہ آپ دیکھ ہی چکے ہیں، عروسی لباس میں آئی ہے۔ ہم آپ کا عقد اسی سے کیوں نہ کرا دیں؟"

ہوا کی باچھیں کھل اٹھیں۔ وہ اچھل کے اپنی جگہ پر کھڑا ہوا اور سر کو بہت زیادہ خم کر کے کورنش بجا لایا۔

"محترم حکمراں، میرے بڑے خدا، میری جان آپ پر قربان۔ مجھے منظور ہے، منظور ہے۔"

دیوان خانے کی فضا سب کے قہقہوں سے گونج اٹھی۔ سارے کے سارے سلطان خوش ہو گئے کہ شیبانی خان نے یہ گتھی بھی بڑی دانش مندی سے سلجھا دی۔

"ہمارے دام نے بڑی دانش مندی سے کام لیا۔ آفریں، اس عقل و فراست کا کہنا ہی کیا ... وہ، کتنا جکڑے گا منصور ہوا زہرہ بیگم کو اپنی بانہوں میں!"

"دونوں کی جوڑی اچھی رہے گی، بہت اچھی۔"

شیبانی کے ہونٹوں نے جنبش کی اور دوسرے ہی لمحے ہنسی مذاق کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

"عقد سمرقند میں ہوگا۔ ہم شہر میں باقاعدگی سے داخل ہوں گے۔"

خان جو کئی بار سمرقند جا چکا تھا، شہر سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے بہت پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ اس کے دستے شہر میں کیسے داخل اور کہاں کہاں تعینات ہوں گے۔ دستہ سالاروں کو واضح احکام دیئے گئے، لشکر کو تیار کیا گیا اور شیبانی خان کے پانچ ہزار سپاہیوں نے چار راہ دروازے سے بڑی تیزی کے ساتھ شہر میں داخل ہونا شروع کیا۔ عین اسی وقت اس دروازے سے بالکل مخالف سمت میں واقع سوزن گراں دروازے سے سینکڑوں لوگ شہر کو چھوڑ کر بھاگے جا رہے تھے۔ بابر شہر سبز میں تھا اور اس کے حامی تیزی سے شہر سبز کی طرف بڑھ رہے تھے۔

بھاگ کھڑے ہونے میں کامیابی سبھی کو نصیب ہوئی۔ بہتوں کو صبا رفتار گھوڑوں پر سوار شیبانی کے لشکریوں نے جا لیا۔ جی بھر کے لوٹا اور جس نے ذرا بھی مزاحمت کی اسے وہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔

رات ہوتے ہی غارت گری میں خاص طور سے شدت پیدا ہو گئی۔ جس سے شاید صرف خواجہ یحییٰ کی شاندار حویلی ہی محفوظ رہی۔ اس پر تمام شب کوپک بے کے سپاہی پہرہ دیتے رہے۔ حفاظتی دستہ جس کی قیادت یہ تیچی قی سلطان خود ہی کر رہا تھا، دیکھتا رہا کہ خواجہ یحییٰ اپنے دونوں بیٹوں اور معتبر آدمیوں کی مدد سے سونے سے بھرے ہوئے صندوقوں کو الگ الگ جگہوں سے نکال نکال کر دوسرے سامان کے ساتھ ایک جگہ ڈھیر کر رہا ہے۔ صبح کو خواجہ کے نوکروں نے پیچ ڈھکے ہوئے اراجوں اور کوئی دس اونٹوں پر یہ سارا سامان لاد دیا۔ خواجہ یحییٰ کی تینوں بیویاں کچھ کچھ بھری ان ہی گھوڑا گاڑیوں پر سوار ہو گئیں، نوکروں نے اونٹوں کی نکیلیں سنبھال لیں، محافظین، خواجہ یحییٰ اور اس کے دونوں بیٹوں نے گھڑ سواروں کے ایک گروہ کی سی شکل اختیار کر لی اور اس طرح یہ پیر جس کا کل تک طوطی بولتا تھا، سمرقند کو الوداع کے ساتھ الوداع کہہ کے جنوب کی سمت روانہ ہو گیا۔ لیکن یہ کارواں تنگ کوہستانی درے سے آگے نہ بڑھ سکا۔ کوپک بے نے شام کے جھٹپٹے میں دریا کے کنارے، رات کا پڑاؤ ڈالنے سے قبل ہی پیر، اس کے بیٹوں اور یحییٰ کے معتقدوں کا، ان سب کی "عاقبت بخیر" کا کام تمام کر دیا۔ صرف عورتوں، نوکروں اور سامان کو اس نے اپنے سرداروں اور سپاہیوں میں تقسیم کیا۔ خاص دولت جو اس کے ہاتھ لگی تھی اس کا نصف حصہ اس نے اسی رات شیبانی کے خزانے میں پہنچا دیا جس نے خواجہ یحییٰ کو لوگوں کی نظروں

میں کہا

"بہت ہو چکا۔ ان گھوڑوں کو یہیں چھوڑ دینا پڑے گا"

قاسم بیگ نے تائید کی

"جن کے پاس گھوڑے نہ رہ جائیں گے انھیں میں اپنے فالتو گھوڑے دے دوں گا"

"دروں کو پار کرتے وقت کتنے ہی گھوڑے، دراونٹ کام آ گئے تھے لیکن میرے گھوڑے نے ان سب کو پار کر لیا۔ اب بچارے کو یہاں جان دینی پڑے گی؟" طاہر نے افسوس ظاہر کیا (وہ بھی اسی دستے میں شامل تھا)۔

"اس وقت تو ہمارے سر پر موت کھیل رہی ہے" بابر نے جواب دیا۔

طاہر ان گھوڑوں میں سے ایک پر سوار ہو گیا جن کی لگامیں قاسم بیگ کا اسلحہ بردار تھامے ہوئے چل رہا تھا۔ دوسرے دو سپاہی خوش قسمت ثابت ہوئے، انھیں بابر کے قدم بقدم سواری کرنے کا موقع مل گیا جو اس کے گھوڑے بدلنے کے لیے دستے کے ساتھ تھے۔

اس جگہ کے بعد پھر کہیں بھی گھوڑوں پر ترس کھانے کی نوبت نہ آئی۔ سمرقند کا فاصلہ بہت کم رہ گیا تھا۔ شہر کے پاس تک بہت تیزی سے پہنچنا ضروری تھا لیکن چپ چاپ کیونکہ شیبانی خاں کے آدمی ان لوگوں کو پہچان لیتے تو تہلکہ مچ جاتا، دشمن کا سارا لشکر صف آرا ہو جاتا اور اس لشکر سے بابر کے ٹکرا سکنے کا ابھی کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔

بابر نے سارا موسم گرما کوہستانی علاقوں میں سفر کرتے گزار دیا تھا۔ وہ شہر سبز سے حصار گیا تھا۔ وہاں سے درہ فشان کے منبع تک اور پھر دریائے فان کے کنارے کنارے چلتا رہا تھا۔

سمرقند کے بیگ اپنے سپاہیوں کے ساتھ حصار کے فرماں رو خسرو شاہ سے جا ملے تھے۔ اندجان سے جو لوگ بابر کے ساتھ آئے تھے ان میں سے زیادہ تر قیام کی جگہوں میں جلدی جلدی کی جانے والی ان تبدیلیوں سے جو بظاہر کسی قسم کی کامیابی کی امید بھی نہیں دلا رہی تھیں، تنگ آ کر وادی فرغانہ کو واپس لوٹ گئے تھے۔ یہ بات بھی قابل توجہ تھی کہ شیبانی خان کے مخبروں نے اسے مطلع کر دیا تھا کہ بابر کے فوجیوں کی تعداد روز بروز گھٹتی جا رہی ہے۔ شیبانی کو یقین ہو گیا کہ بابر (اب اس کے پاس سپاہی ہی کتنے رہ گئے تھے، کوئی ایک ہزار تا؟) کوہستانی علاقوں کے دشوار حالات کو نہ جھیل سکے گا اور یا تو اندجان لوٹ جائے گا یا پھر اپنے چچا احمد خاں کے ہاں پناہ لینے کی کوشش کرے گا۔ جو اسیق کول جھیل کے اس پار کسی علاقے کا حکمراں تھا۔ خان نے سوچا کہ بابر بہر حال اس پر حملہ کرنے سے رہا کیونکہ اس کے پاس بابر کی فوج سے پانچ گنا بڑا لشکر موجود ہے جو جلد ہی بڑھ کر اور بھی بڑا ہو سکتا ہے۔ اس نے نپٹتے ہوئے سمرقند میں اپنے پانچ سو لشکری چھوڑ دیئے اور خود باقی تمام فوج کے ساتھ سمرقند کے مغرب میں کچھ فاصلے پر واقع مقام خواجہ دیدار جا کر وہیں پڑاؤ ڈال دیا۔

بابر نے بڑے پر خطر کام کا بیڑا اٹھایا تھا۔ طے کیا تھا کہ وہ ایسی صورت میں جبکہ شیبانی کو حملے کا ذرا بھی اندیشہ نہیں، سمرقند پر اچانک ٹوٹ پڑے گا اور شیبانی کے سر پر موجود ہونے کے باوجود شہر پر قابض ہو جائے گا۔ شیبانی کو کسی بھی سمت سے اس بات کی اطلاع مل سکتی تھی۔ صورت حال انتہائی مایوس کن ہو سکتی تھی اگر شیبانی خان اپنے مخبروں کی فراہم کردہ اطلاع کے بعد یہ چال چلتے ہوئے گویا کہ اسے کچھ معلوم ہی نہیں، بابر کو اس کے مٹھی بھر لشکریوں کے ساتھ شہر تک آ جانے دیتا اور تب اپنی پوری طاقت سے حملہ آور ہو جاتا۔ پھر خود شہر کے اندر بھی بابر کے دشمنوں کی طاقت بابر کی اپنی طاقت سے زیادہ ہی تھی اور اگر بابر شیبانی خان کے ہاتھ لگ جاتا تو قطعاً زندہ نہیں بچ سکتا تھا۔ زندہ تو بس وہی سپاہی اور بیگ بچ سکتے تھے جو

خان کی چاکری سے بہتر ہو جاتے کیونکہ یہ بھی تو معلوم تھا کہ سلطان علی کے زیادہ تر بیگوں کو اس نے اپنے لشکر میں شامل کر لیا ہے۔ اور ماوراءالنہر میں ایک نئے شاہی خاندان کی داغ بیل ڈالنے کے متمنی اس مجاہد خلیفہ نے آل تیمور کو نیست و نابود کر دینے کی قسم بھی کھا رکھی تھی۔ بابر پر یہ سب واضح تھا اسی لیے اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ زندگی کے آخری لمحات تک جنگ کرتا رہے گا، کچھ بھی ہو جائے خود کو زندہ خان کے ہاتھ نہ لگنے دے گا۔

اس کے دستے نے تاریکی میں کئی ندیوں، چشموں اور پانی سے بھری ہوئی خندقوں کو پار کیا، موسم خزاں کے سنسان باغات سے گزرا اور بالآخر پل مغاک تک پہنچ گیا جو سمرقند کی فصیل سے بالکل قریب ہی واقع تھا۔ بابر نے دو درجن اپنے انتہائی معتبر سپاہیوں کو یہاں بھیج دیا تھا جنھوں نے فصیل پر چڑھنے کے لیے لمبی لمبی سیڑھیاں تیار کر لی تھیں۔ اس وقت کوئی اسی سپاہیوں نے اپنے گھوڑوں سے اتر کر ان سیڑھیوں کو اٹھایا اور دبے پاؤں پیدل چلتے ہوئے کاریز کی طرف چلے گئے۔ باقی سپاہی اور خود بابر چھپتے چھپاتے فیروزہ دروازے تک پہنچے اور اس کے سامنے والے ٹیلے پر کھڑے ہوئے درختوں کے سائے میں چھپ گئے۔

چاروں طرف گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اچانک دور سے آتی ہوئی مرغوں کی دھیمی بانگیں سنائی دیں۔ رات کے گھنے، کالے بادل فصیل شہر کے عین اوپر معلق تھے جس کی وجہ سے فصیل صاف نظر نہیں آ رہی تھی اور کہیں دور کی طرف جاتی ہوئی لگتی تھی۔

قاسم بیگ جو ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی بابر کے ساتھ تھا، تیزی کے ساتھ سانسیں لے رہا تھا۔ خود بابر کو بھی اپنے جسم میں جھرجھری محسوس ہو رہی تھی۔

سمرقند کی فصیل! چار ماہ قبل ایسی ہی ایک تیرہ و تار رات تھی جب بابر فصیل کے قریب پہنچ کر خواجہ یحییٰ کے پھاٹک کھول دینے کا انتظار کرتا رہا تھا۔ ان لوگوں کو دیکھ لیا گیا تھا، ان پر تیر برسائے گئے تھے اور انھیں اپنے زخمیوں کی آہ و بکا اور دشمنوں کی طنزیہ چیخوں کے درمیان مجبوراً لوٹ جانا پڑا تھا۔ فریب، دغا، گھات، چھپ کر حملہ... موت، اپنوں اور غیروں کی موت... اس کی زندگی، یعنی سپہ سالار اور سیاستدان کی زندگی جس نے ماوراءالنہر کو دوبارہ متحد کرنے کا عزم کر رکھا تھا، اسی سب پر تو مشتمل تھی۔

بابر نہیں چاہتا تھا کہ ایک بار پھر دشمنوں کے جال میں پھنس جائے اور شہر کے اندر موجود اس کے حامیوں کو مایوسی کا شکار ہونا پڑے، اس لیے اس نے فصیل کے پاس اپنی آمد کی کسی کو بھی خبر نہیں ہونے دی تھی۔ اس نے خود اپنے اور اپنے دلیر سپاہیوں کے اوپر ہی بھروسا کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اب یہ سپاہی جن کی تعداد بابر کو بالکل ٹھیک ٹھیک معلوم تھی، دو سو چالیس تھے جبکہ فصیل کی دوسری جانب پانچ سو سپاہی موجود تھے اور ان سے کچھ ہی فاصلے پر پانچ ہزار

یہاں کس نے کس کے لیے جال بچھایا تھا؟ بابر نے شیبانی کے لیے یا شیبانی نے خود بابر کے لیے؟

بابر کے بیگوں نے جانے کتنی ہی بار اسے سمجھایا تھا کہ ایسے غیر معمولی بہادرانہ اقدام سے باز رہے، یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ واپس لوٹ جانا ہی عین دانشمندی ہوگا۔

لیکن اپنے منصوبے کو ترک کر دینے کا مطلب ہوتا منہ نیچا کر کے اندجان لوٹنا۔ احمد تنبل کی مرضی کے بموجب زندگی گزارنا۔ یہ بھی کوئی بہتر صورت حال نہ تھی کہ وہ خزاں کے بوندا باندی کے موسم میں، گرما کی سردیوں میں خود اپنی سلطنت کے اندر ہی در بدر مارا مارا پھرتا رہتا۔ وہ کوئی خانہ بدوش تھوڑی تھا! اسی لیے وہ ایسی جنگ کو ترجیح دے رہا تھا جس

میں یا تو خود ہی لقمۂ اجل بن جائے یا پھر شیر کی طرح لڑ کے شیبانی خان کو شکست دے دے۔

شیر کی طرح بھی اور چالاک لومڑی کی طرح بھی جو چالوں سے کترا کر نکلنا اور دشمن پر چانک ٹوٹ پڑنا جانتی ہے۔ اس کی ساری امیدیں اب اسی طریقۂ عمل سے وابستہ تھیں۔

باہر ہمہ تن گوش بن کر سننے لگا۔

رات، سناٹا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ یہ اس کے اسپ مقدر کے سموں کی آوازیں تھیں۔

۶

طاہر کو سیڑھی کا وزن اس وقت تک نہ محسوس ہوا جب تک کہ سپاہی قدیم قبرستان چکر ویزہ کے کنارے کنارے چلتے ہوئے قدرے ہموار جگہ سے گزرتے رہے لیکن اس کے بعد وزن تیزی سے بڑھنے لگا جس کے باعث وہ لوگ شور نہ کرنے کی کوششوں کے ساتھ گہری خندق کے اندر اترتے وقت بار بار ٹھوکریں کھانے اور دبی زبان سے گالیاں بکنے پر مجبور ہو گئے۔ وہ توہم پرستانہ خوف کے باعث غار کے دہانے کے پاس سے بچ کر نکلے وہاں تو کوئی دن میں بھی نہیں جھانکتا تھا لیکن انہیں جھنکنا پڑا، رات کے وقت غار کے پاس سے گزرنا پڑا۔ اور اس کے بعد کانٹوں کو پکڑ پکڑ کر دوبارہ اوپر چڑھنا پڑا۔ فصیل شہر کا ایک حصہ خندق کے اندر سے بھی دکھائی دے رہا تھا اور وہاں سے وہ اپنی حقیقی بلندی سے کہیں زیادہ بلند مقام ہو رہا تھا۔

پسینے سے تر بتر سپاہیوں نے آخر کار سیڑھیوں کو فصیل کے عین نیچے تک پہنچا دیا۔

ان کا سردار نویان کوکلتاش کچھ غور و خوض کرنے اور اپنے ساتھیوں کو آرام لینے کا موقع دینے کے لیے بے حس و حرکت سا کھڑا ہو گیا اینٹوں کی فصیل باہر کے بیٹھے خاصے درخت جتنی بلند تھی اور اس کا اوپری حصہ جیسا کہ نویان بخوبی جانتا تھا، اتنا چوڑا تھا کہ اس پر دو افراد پہلو بہ پہلو چل سکتے تھے۔ وہ سوچنے لگا وہاں بلندی پر اس وقت کیا ہو رہا ہے؟ کون ہے وہاں؟ بظاہر تو سناٹا چھایا ہوا ہے۔ نہ کہیں مشعلیں نظر آ رہی ہیں نہ قندیلیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ رات بھر سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے پہرے دار نیچے اتر کر اپنے حجرے میں جا چکے ہیں۔

اس صورت میں تو کارروائی شروع کر دینی چاہیے!

دلیروں نے سیڑھیاں کھڑی کر کے ان کے اوپری سرے دھیرے سے فصیل کے کناروں پر ٹکا دیے۔

''چلو، اوپر چڑھو'' نویان کوکلتاش نے چپکے سے سپاہیوں کو حکم دیا۔

پاس کھڑے ہوئے سپاہی سناٹے میں آ گئے۔ کوئی مذاق تھوڑی تھا، فصیل تیس ہاتھ سے بھی زیادہ بلند تھی، ذرا بھی لغزش کرتے تو ہڈیاں تک ڈھونڈے نہ ملتیں اور اگر پہرے داروں کو پتا چل جاتا تو؟ سیڑھی کو نیچے دھکیل دینا ایسا کون سا مشکل کام تھا۔

نویان کوکلتاش نے سب سے پہلے ہی سیڑھی پر قدم رکھ دیا۔

''مرنا تو کبھی نہ کبھی پڑے گا ہی! تو پھر بہادروں کی طرح ہی کیوں نہ مریں۔''

طاہر دوسری سیڑھی پر چڑھنے لگا، وہ بھی مضبوط تھی اور کئی افراد کا وزن برداشت کر سکتی تھی۔

پہل کرنے والوں کے پیچھے پیچھے باقی سپاہی بھی فصیل کے اوپر چڑھنے لگے۔ نویان کوکلتاش بڑی تیزی سے اوپر پہنچ

"لیکن اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ کہیں کوئی بھی نہ تھا۔ اور فصیل واقعی تنگ چوڑی تھی کہ اس پر کوئی گھوڑا بھی ٹہر سکتا تھا۔

طاہر ایک کنگورے کے سائے میں چھپ گیا۔ اس نے ایک اور سپاہی کو سہارا دے کر اوپر چڑھایا اور پیچھے سے پوچھا

"کلہاڑی کہاں ہے؟ تمہارے پاس ہے نا؟"

سپاہی نے اپنے چغے میں پھنسی ہوئی کلہاڑی نکال کر طاہر کو تھما دی۔

"کنگوروں کے قریب آ کے چھپ جاؤ" نویان نے حکم دیا۔

اگر فصیل میں کنگورے نہ ہوتے تو وہ لوگ نیچے سے، فاصلے سے بآسانی دیکھے جا سکتے تھے۔ بڑے بڑے کنگوروں کے سایوں کے باعث گہری ہو جانے والی تاریکی میں اس سارے چھوٹے سے دستے کا یکجا ہونا اور پھر سپاہیوں کا فصیل پر تیزی سے دوڑتے ہوئے نیچے اتر کر شہر کے دروازے تک پہنچنا ممکن ہو گیا تھا۔ نیچے اترنے کے راستے پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پہرے داروں کی چوکیاں البتہ بنی ہوئی تھیں اور جب وہ لوگ ان میں ایک کے پاس پہنچے تو اندر سے کسی نے نیچی آواز میں کاہلی کے ساتھ پوچھا

"ارے اس بار نے یہ تم ہو گیا؟ اتنی تاخیر کیوں کر دی؟ تمہارا انتظار کرتے کرتے اوب گئے"

سب سپاہی بے حس و حرکت کھڑے ہو گئے۔ طاہر نے کلہاڑی کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ پکڑ کر جواب دیا

"ہاں، میں ہوں، آ گیا"

پہرے دار کو شاید کچھ شک ہو گیا اور اس نے گھبرا کر دوبارہ پوچھا

"کون ہو تم؟"

نویان کوکتاش پہرے داروں کی چوکی کے دروازے کی طرف لپکا اور جیسے ہی دروازہ کھلا اور پہرے دار سامنے نظر آیا ویسے ہی اس پر خنجر سے وار کر دیا۔ دم توڑتے ہوئے اس پہرے دار کی چیخ سن کر نیچے کے پہرے دار بیدار ہو گئے تھے۔

"طاہر پھاٹک کی طرف لپکو، جلدی کرو" نویان کوکتاش نے کہا۔ وہ خود تو کوئی دس سپاہیوں کے ساتھ پہرے داروں کی اگلی چوکیوں کی طرف لپکا جبکہ طاہر دو اور چوکیوں (ان کے دروازے نیم وا تھے) کے پاس سے گزر کر تاتا نیچے اترا اور شہر کے بلند فیروزہ دروازے کے قریب پہنچ گیا۔

اس دروازے کا پہرہ فاضل ترخان کے ذمے تھا۔ اس کے ڈیڑھ سو سپاہیوں میں سے زیادہ تر سپاہی اپنے گھروں کو واپس جا چکے تھے۔ اوپر کی چوکیوں پر اور دروازے کے پاس مل ملا کر کوئی بیس سپاہی باقی رہ گئے تھے لیکن وہ بھی اونگھ رہے تھے۔ ان میں سے اِن چند ہی کو ہوش میں آنے اور اسلحہ سنبھالنے کا موقع مل سکا کیونکہ نویان کوکتاش اور اس کے سپاہی برق کی طرح ان پر ٹوٹ پڑے۔ اس اثنا میں طاہر جھپٹ کر دروازے کے پاس پہنچا اور اس کے قفل کو جو گھوڑے کے جتنا بڑا تھا توڑنے لگا۔ کلہاڑی کی اولین ضربیں حالانکہ بھی کارگر نہ ہوئیں۔ اتنے میں فاضل ترکھان جو قریب ہی رہتا تھا اور اس نے سپاہی مشعلیں اٹھائے ہوئے نظر آئے۔ اس کے دو سپاہیوں نے قفل توڑنے میں مصروف آدمی کو دیکھ لیا۔

دوسرے ہی لمحے ایک تیر آ کر طاہر کے سر سے ٹکرایا اور دروازے میں گھس گیا اور دوسرا اس سے پہلو میں جا لگا۔
پہرہ دار دروازے کے پاس تک دم شروع ہو گیا۔ خنجر، تلواریں اور تیر ہی نہیں بلکہ نیزے تک استعمال کیے جانے لگے۔
لیکن نویان کوکلتاش نے کہیں زیادہ پھرتی اور مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے فاضل ترخان کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔
اس دوران طاہر دیوانہ وار کلہاڑی چلائے جا رہا تھا، کبھی قفل پر کبھی زنجیروں پر اور کبھی خندق سے پل کو اٹھانے
والی زنجیروں کے کنڈوں پر۔ کنڈے ٹوٹے اور زنجیریں تیز جھنکار کے ساتھ زمین پر آن گریں اور پھر آخرکار قفل بھی۔
فصیل کے عقب میں کشادہ خندق واقع تھی جس میں پانی بھرا رہتا تھا۔ طاہر نے جتنی دیر میں دروازے کو کھولا، اتنی
ہی دیر میں دوسرے سپاہیوں نے پل کی لپٹی ہوئی زنجیروں کو کھول دیا اور وہ خندق کے اوپر پھیل گیا۔

بابر اور قاسم بیگ سپاہیوں کے ساتھ خندق کے اس پار تیار کھڑے تھے۔ جیسے ہی دروازہ کھلا اور خندق کے اوپر پل
پھیل گیا ویسے ہی یہ لوگ نیام سے تلواریں نکالے گھوڑے دوڑاتے ہوئے شہر میں داخل ہو گئے۔ انہیں دیکھتے ہی فاضل
ترخان کے بچے کھچے سپاہی بھاگ کھڑے ہوئے اور قاسم بیگ نے تھوڑے سے سپاہیوں کو ساتھ لے کر ان کا تعاقب
شروع کر دیا۔

اس کے بعد کے واقعات بڑی تیزی کے ساتھ رونما ہوئے۔ نویان کوکلتاش نے شہر کے اندر سے چار راہ دروازے
کے پیچھے پہنچ کر اس پر حملہ کر دیا۔ سپاہیوں کا ایک دوسرا چھوٹا دستہ جس کی قیادت خود بابر کر رہا تھا۔ سوزن گران دروازے
کے پہرے داروں پر بجلی کی طرح ٹوٹ پڑا۔ دراصل چاروں دروازوں پر قابض ہونا ضروری تھا کیونکہ شیبانی خان اپنی
فوج کے ساتھ کسی بھی وقت حملہ آور ہو سکتا تھا۔

لڑائی کا غلغلہ آن کی آن میں سارے شہر میں پھیل گیا۔ داروغہ شہر جان وفا شیخ زادہ دروازے سے کچھ ہی فاصلے پر
واقع اس حویلی کے جو کبھی خواجہ یحییٰ کی ملکیت تھی، ایک شاندار کمرے میں محو خواب تھا۔ شور و غل سے بیدار ہونے پر وہ فوراً
ہی اپنے حواس درست نہ کر سکا، دوڑتا ہوا باہر نکلا تو اسے دروازے پر پہرا دینے والے بچے کھچے سپاہی نظر آئے جو شہر پر
قابض ہو جانے والے دشمن کے سپاہیوں کے تعاقب کرنے کی بجائے منتشر ہو کر ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ داروغہ
کے لیے یہ سمجھنا دشوار ثابت ہو رہا تھا کہ دشمن کہاں ہیں اور خود اس کے اپنے آدمی کہاں ہیں۔ سب ہی چیخ چلا رہے تھے، گالی
گلوچ کر رہے تھے، جان بچا کر بھاگ رہے تھے۔

داروغہ جان وفا نے یہ عجلت فیصلہ کر لیا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور اس کا رخ شیخ زادہ دروازے کی طرف موڑ دیا۔ جو
ابھی محفوظ تھا جہاں ابھی تک بابر کے سپاہی نہیں پہنچ سکے تھے۔ داروغہ کے حکم پر فوراً ہی دروازہ کھول دیا گیا اور وہ حیران و
ششدر رہ جانے والے سپاہیوں کے ساتھ جن کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا، گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا شیبانی خان
کو یہ خبر دینے کے لیے اس کے پڑاؤ کی طرف روانہ ہو گیا کہ بابر کے کئی ہزار لشکریوں نے سمرقند پر قبضہ کر لیا ہے۔

رات بھر سے ہی اہل سمرقند گھروں میں چھپے جانے بغیر شدت خوف سے کانپتے رہے تھے، نہ کسی کو کھڑکی سے
باہر جھانکنے کی ہمت پڑ رہی تھی اور نہ ہی کوئی یہ سمجھ پا رہا تھا کہ شہر میں ہو کیا رہا ہے۔ صبح نمودار ہوئی تب کہیں جا کر اہل سمرقند
کو منادی کروں اور چند ساعت کے اندر ہی پھیل جانے والی افواہوں سے پتا چلا کہ انہیں بابر نے ظالم خان سے نجات دلا
دی ہے۔ شیبانی خان سے جانے کتنے ہی لوگوں کو شکایات تھیں۔ نو واردوں نے دستکاروں کے گھروں کو پوری طرح لوٹ
لیا تھا، ان خانہ بدوشوں کے گھوڑوں کے گلوں نے دہقانوں کی فصلیں روند ڈالی تھیں۔ کوہستانی علاقے میں اپنے دونوں

بیوں کے ساتھ بے پناہ انداز سے قتل کئے جانے لگے۔ خود یحییٰ کے حامی علما نے دستکاروں اور دہقانوں کو انتقام سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ سابق علمائے دین کے عہدے داروں نے بھی حسین شیبانی کی فتح کے بعد جانفشانی اور اطاعت سے مجبور ہو کر انتقام لینے سے بے تاب رہے تھے۔ اس طرح کئی ہزار افراد باہر کے دو سو جیسی سپاہیوں کے ساتھ ہو گئے اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا۔ لوگوں کے گروہ سارے شہر میں منڈلانے لگے۔ عجیب بھیانک سماں تھا۔ شیبانی خان کے پیچھے رہ جانے والوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر سڑکوں پر لایا جا رہا تھا۔ کچھ لوگوں کو بھاگتے وقت ہی پکڑ لیا گیا تھا۔ چھروں، کلہاڑیوں، لاٹھیوں اور پتھروں کو آزادانہ طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ کشتوں کے پشتے لگتے جا رہے تھے۔ عوام اسے جائز غصے میں جو پہلے بے عزتی اور اپنے دشمنوں سے قتل ڈھائے جانے والے مظالم کا بدلہ لے رہے تھے۔ ان لوگوں کے تمام درمندوں کے جذبات بھی شامل ہو گئے تھے جو کئی سالوں سے اپنی بے عزتی اور تکالیف کا بدلہ لینے میں ناکام رہے تھے۔

شیبانی خان کا سارا لشکر تمام فوجی تیاریوں کے ساتھ فصیل شہر کے باہر اس وقت نظر آیا جب آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ خندق کے اوپر سے پل اٹھا لیے گئے اور شہر کے سارے دروازوں کو بند کر کے ان کی حفاظت کا معقول انتظام کر دیا گیا۔

شہر کے اندر قتل و غارت گری کا بازار اب بھی گرم تھا

۲

طاہر شہر کے مختلف علاقوں میں بھاگ دوڑ کرتا رہا تھا لیکن فتح کی مسرت میں اسے ذرا بھی تھکن نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ صرف کسی کسی وقت آنتیں البتہ قل ہو اللہ پڑھنے لگی تھیں۔ آخرکار جب بھوک ناقابل برداشت ہو گئی تو وہ قاسم بیگ سے اجازت لے کر نانبائیوں کی دوکانوں کی طرف گیا۔ صبح ہو چکی تھی لیکن کہیں کھانا ملنے کی امید نہ تھی کیونکہ راستوں اور چوراہوں پر اب بھی بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔

بازار کے چوک میں ایک بہت بڑا ہجوم شیبانی خان کے کچھ سپاہیوں کو گھیرے ہوئے ان پر پتھراؤ کر رہا تھا۔ چار سپاہی جن کا کام تمام ہو چکا تھا، خون میں لت پت پڑے ہوئے تھے جبکہ کچھ دوسرے اپنے چہروں کو ہاتھوں سے ڈھکے ہوئے کراہ رہے تھے۔ ان میں ایک بیس سالہ لڑکا بھی شامل تھا۔ اس کا کرتا تار تار ہو چکا تھا، زخموں اور خراشوں سے خون بہہ رہا تھا اور وہ گھٹنوں کے بل بیٹھا کانپ کانپ کر اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ طاہر ہجوم کو ہٹاتا ہوا اپنے گھوڑے پر آگے بڑھ کر چلایا

"لوگو! میری بات سنیئے! مرزا بابر نے حکم دیا ہے جو ہتھیار ڈال دے اسے قید کر لیجئے۔ بیکار خون نہ بہایئے! آخر یہ نوجوان بھی تو مسلمان ہی ہے... بہت ہو چکا، بس کیجئے۔ لوگو!... ہم بھی تو سپاہی ہیں، قصور کیا سپاہیوں کا ہے؟ قصور تو ان سپاہیوں کے خان کا ہے.. میں کہتا ہوں بند کیجئے یہ سلسلہ! مرزا بابر کے حکم کی تعمیل کیجئے!"

اتنے میں کچھ دوسرے گھڑ سوار سپاہی بھی بھیڑ کو چیرتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ طاہر نے ان کی مدد سے دھیرے دھیرے ہجوم کا غصہ ٹھنڈا کر دیا۔

اس واقعے کو دیکھ کر وہ اتنا آگ بگولا ہو گیا تھا کہ اسے یہ بھی نہ یاد رہا کہ وہاں آیا کس لیے تھا اور شیبانی کے جو سپاہی زندہ بچ رہے تھے اور بمشکل سانس لے پا رہے تھے انہیں گرفتار کر کے لے جانے لگا۔ تب ہی ہجوم سے ایک طویل قامت

دی نے چلا کر کہا

"ذرا ٹھہرو تو نوجوان ۔۔۔ تم طاہر تو نہیں ہو؟"

طاہر نے اس شخص کی طرف دیکھا۔ یہ تو تنومند دراز قامت طویل قامت شخص جس کی مونچھیں زرد پڑ گئی تھیں، ہاتھوں میں موٹا سا ڈنڈا پکڑے ہوئے تھا۔ طاہر کو تین سال قبل کا وہ واقعہ یاد آ گیا جب اس نے بھوک سے تڑپتے ہوئے سمرقندیوں میں روٹیاں تقسیم کی تھیں۔

"محمد! یہ تم ڈنڈا کیوں لیے ہوئے ہو؟ خود بھی تپتی تو نہیں ہو گئے؟"

"ارے بھائی شیبانی کے بھگوڑوں نے تو سارے ہی قبیلوں پر جانے کتنے مظالم ڈھائے ہیں۔ ان ہی کے ہاتھوں میری بدنصیب بیوی کی جان گئی!"

طاہر نے اس شخص سے ربعہ کے بارے میں جو باتیں کی تھیں وہ اسے یاد آ گئیں اور اس کے دل میں درد نے ایک بار پھر کروٹ لی۔ اس نے قیدیوں کو بہرے کے محافظ دستے کے دوسرے گھڑ سواروں کے ساتھ روانہ کر دیا اور خود گھوڑے سے اتر کر محمد کو ایک طرف لے گیا۔

"محمد بھائی، تمہیں یاد ہے میں نے کیا کہا تھا؟"

"ہاں بھئی، مجھے معلوم تھا کہ تم پوچھو گے ۔ اسی لیے تو میں نے تمہیں آواز دی تھی ۔ بات یہ ہے کہ میری بیچاری بیوی سے کہیں کچھ سنا تھا ۔ ۔ اسی لڑکی کے بارے میں جس کا تم نے ذکر کیا تھا۔ وہ اندجان کی رہنے والی تھی نا؟"

"نہیں، تو کی"

"کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اندجان علاقے ہی کی تھی۔ اسے اغوا کر کے یہاں لایا گیا تھا۔ بعد میں ترکستان کا کوئی سوداگر اسے خرید کر لے گیا"

"اور پھر، پھر کیا ہوا؟"

"پھر وہ سوداگر شیبانی خان کے ساتھ سمرقند آ پہنچا"

"اسی لڑکی کے ساتھ؟ وہ زندہ ہے؟"

"زندہ ہے!"

طاہر نے محمد کا ہاتھ کس کے دبایا اور ہانپتے ہوئے پوچھا:

"اس کا نام رابعہ ہے نا، رابعہ؟"

"میری مرحومہ بیوی کو لڑکی کا نام نہیں معلوم ہو سکا تھا"

"تم نے اسے دیکھا ہے؟" اور جب محمد نے اثبات میں سر ہلایا تو طاہر نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ "کہاں ہے وہ؟ کہاں ہے؟ جلدی سے بتاؤ!"

"فاضل ترخان کے گھر میں۔ ۔ جسے تمہارے ساتھیوں نے گزشتہ رات ۔ " اور محمد نے اپنے ڈنڈے کو گلے پر پھیرا۔

"اس کا گھر کہاں ہے؟ کہاں؟"

"چلو، میں دکھائے دیتا ہوں!"

تب وہ چھلانگ لگا کر گھوڑے پر سوار ہوگیا اور اس نے محمد کو اپنے پیچھے بٹھالیا۔ محمد نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور
چیزیں دیکھتا رہا۔ اسے پہلی مرتبہ کی گلیوں اور کوچوں میں راستہ دکھانے لگا۔
''اے پروردگار، میری مدد کر، مجھے سکونِ قلب سے محروم نہ کر۔'' اس دوران وہ دل ہی دل میں دعا کرتا رہا
پروردگار۔'' طاہر رابعہ کو چھ برسوں سے دراصل طور پر تلاش کرتا رہا تھا، خود کو یقین دلاتا رہا تھا کہ وہ دوبارہ ملے گی۔ مگر
قسمت ہی میں نہیں ہے۔ اس خیال کا عادی بھی ہو چلا تھا لیکن اچانک پورے چھ برسوں کے بعد کوئی امید نکل رہی
تو وہ بھی۔ امید اسے مسرور کرنے کے ساتھ ہی ساتھ اذیت میں بھی مبتلا کر رہی تھی کیونکہ وہ بجلی کی طرح چمک کر
غائب بھی ہو سکتی تھی۔ اور اس امکان کے تصور ہی سے اس کے دل میں ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔
''یہ رہا وہ مکان'' محمد نے اینٹوں کی دو منزلہ عمارت کی طرف اشارہ کیا جس کے عقب میں پھلوں کا ایک باغ
نظر آرہا تھا۔
مکان، احاطے اور باغ کے دروازے پوری طرح کھلے ہوئے تھے۔ بابر کے مسلح سپاہی منقش ہتھی صندوق اور گٹھ
ری نکلے ہوئے زرق برق ملبوسات، سامان کی بڑی چھوٹی گٹھڑیاں اور برتن باہر نکال رہے تھے۔ فاضل ترخان بہت مالدار
سوداگر اور شیبانی خان کا مقرب تھا۔ اس کی املاک کو بابر کے حق میں ضبط کر لینے کا حکم دیا گیا تھا۔
طاہر گھر کے پھاٹک کے قریب تیزی کے ساتھ گھوڑے سے اترا اور محمد کا شکریہ ادا کئے بغیر ہی ان پہچانے
سپاہیوں کی جنھوں نے اسے پہچان لیا تھا، بات کئے بغیر ہی سیدھا رہائش خانے کی طرف لپکا۔ برآمدے میں فاضل ترخان کی
سفید کفن میں لپٹی ہوئی لاش رکھی تھی۔ اوپری منزل سے عورتوں کے رونے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ فاضل ترخان کی
بیویاں بظاہر تو اس کا سوگ منا رہی تھیں لیکن دراصل ان میں سے کچھ اس بات پر رو رہی تھیں کہ مرنے والے کی دولت کو
غیر لوٹے لیے جا رہے ہیں اور کچھ محض اس اندیشے سے کہ اب ان پر جانے کیا گزرے گی۔
طاہر نے نچلی منزل کے کمروں میں جن کے دروازے کھلے ہوئے تھے، جھانکا۔ کہیں کوئی بھی نظر نہ آیا۔ جا بجا
زنانے کپڑے اور زیور بکھرے ہوئے تھے۔ وہ دنگ رہ گیا۔ آخر اس ترخان کی کتنی بیویاں تھیں؟ کہیں اس نے رابعہ کو بھی
حاصل کرنے کے بعد اپنی بیوی تو نہیں بنا لیا تھا؟ یا پھر وہ محض گھر کی نوکرانی تھی؟
طاہر برآمدے سے نیچے کود کے احاطے کے وسط میں پہنچا اور وہاں سے اوپری منزل کی طرف جہاں سے رونے کی
آوازیں آرہی تھیں، سر اٹھا کے آواز دی
''ارے وہاں رابعہ ہے کیا؟'' ''را... بعہ تو کوئی رابعہ ہے کیا؟''
رونے کی آوازیں دفعتاً ختم ہو گئیں۔ کوئی عورت جس کے سر پر سبز رومال بندھا تھا، دوڑتی ہوئی اوپری برآمدے کے
جنگلے کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ طاہر کو لگا کہ وہ اس عورت کی آنکھوں اور بھوؤں کو بہت پہلے سے پہچانتا ہے
''رابعہ، رابعہ!''
سبز رومال والی عورت طاہر کو دیکھ کر فوراً ہی جنگلے کے پاس سے ہٹ گئی لیکن دوسرے ہی لمحے پھر آ کر کھڑی ہو گئی۔
طاہر کی نظر اب اس عورت کی مخملی صدری اور گلے کے موتیوں کے ہار پر پڑی۔ یہ رابعہ تھی، وہی تھی! لیکن عورت جنگلے کے
ساتھ دوبارہ پیچھے ہٹ گئی۔ اسے چھریرے طویل قامت سپاہی کو جس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور چہرے پر زخم کا نشان تھا، دیکھ
کر ڈر لگا لیکن آواز ... آواز تو طاہر ہی کی تھی، اسی کی تھی۔ اور یہ آواز اسے بلا رہی تھی یقین دلا رہی تھی

رابعہ نے چہرے کو ہاتھوں سے ڈھک لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ گلے میں موتیوں کا ہار، ہاتھوں کی چوڑیاں، گدھے خوبصورت نقرئی زیور اور جسم پر بیش قیمت اطلس۔ یہ سب کچھ اسی تاجر کے پیسوں ہی سے تو خریدا گیا تھا۔ حقیقت بہرحال حقیقت تھی، جس نے پھٹے پرانے کپڑے تھوڑی دیر کو چھپا رکھے تھے:

''رابعہ، سچ سچ بتاؤ، تمہیں اپنے شوہر سے محبت ہو گئی تھی کیا؟ کیا تم اس کی موت پہ رو رہی ہو؟''

''مجھے تو اس کے ہاتھوں فروخت کر دیا گیا تھا! زبردستی، زبردستی میں تو اس سے نفرت کرتی ہوں.... پہلے بھی نفرت کرتی تھی اور اب بھی کرتی ہوں!''

''تو پھر رو کیوں رہی ہو؟''

''رونا تو اس لیے آ رہا ہے کہ اب میں آپ کی نظروں میں پاک دامن نہیں رہ گئی۔ لیکن میں نے آپ کو فراموش نہیں کیا ہے، طاہر جان! خدا گواہ ہے.... وہ تاجر.... وہ تو مجھے کسی کنیز کی طرح رکھنا چاہتا تھا۔''

اتنے میں وہ بات جو طاہر کے دل کو بے رحمی کے ساتھ پاش پاش کیے دے رہی تھی، آخر کار اس کے ہونٹوں پر آ گئی۔

''تمہارے اس سے کوئی بچہ بھی ہے؟''

رابعہ نے پہلے ہی کی طرح روتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

''بیوی تو میں بس نام ہی کی تھی۔ میری حیثیت تو بیوہ کی سی تھی، کنیز کی سی تھی۔''

طاہر کا دل ہمدردی اور ترس کے جذبات سے معمور ہو گیا۔ اس کے ذہن میں بے شک یہ خیال پہلے بھی آ چکا تھا کہ ظالموں نے مجبور و بے بس رابعہ کے ساتھ بدسلوکی کی ہو گی لیکن وہ اس کی تلاش کے دوران یہی سوچتا رہتا تھا ''بس وہ زندہ مل جائے'' اور اس وقت وہ جیتی جاگتی سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے پہلے جیسی گل بدن حسینہ ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ اب تو وہ قسمت کی ماری ہوئی عورت تھی، نہ بچے تھے نہ کوئی خاندان۔ اب تو وہ کسی بدمعاش کے ہاتھوں توڑ دیا جانے والا کھلونا تھی، قیمتی اطلس پہننے والی حرم کی بیوہ تھی۔ گہرے زخم بھر جاتے ہیں تب بھی زندگی بھر کے لیے اپنے داغ چھوڑ جاتے ہیں۔ طاہر نے سوچا کہ رابعہ پر جو کچھ بیتی ہے اس کے داغوں کو اپنے دل پر سے مٹا دینا بہر حال اس کے لیے آسان نہ ہو گا اور خود وہ بھی رابعہ کی تلاش میں اپنے در بدر بھٹکتے پھرنے کو، اس وقت کی ہوئی بات کو شاید ہی کبھی فراموش کر سکے۔

اس سب کے باوجود اس کی یہ ملاقات محض آنسو بہانے ہی کی نہیں بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر مسرت کی گھڑی تھی!

''رابعہ چھوڑو بھی یہ رونا دھونا! ہمیں تو اپنے مقدر کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ زندہ بچ نکلے اور آخر کار ملاقات نصیب ہوئی!۔ آؤ، چلو!''

''لیکن کہاں؟''

''تو کیا تم میری منگیتر نہیں ہو؟''

''مگر میں.... میں.... اپنا سامان تو لے لوں!''

''یہاں کی ایک چیز بھی نہ لو۔ لعنت بھیجو سامان پر اور یہاں جو کچھ بھی ہے اس سب پر! مجھے دوبارہ یاد نہ دلانا!''

رابعہ کی نظر ان سپاہیوں پر پڑی جو مقتول تاجر کا سامان اٹھا کر لیے جا رہے تھے تو اس نے شرماتے ہوئے کہا:

"مجھے پردے کے بغیر..... باہر نکلتے شرم آتی ہے"

طاہر نے اپنا چوغہ اتارا جسے رابعہ نے سر پر ڈال لیا اور اس جھکتے ہوئے چوغے سے اس کی ایڑیاں تک تقریباً ڈھک گئیں۔ پھر طاہر نے اسے گھوڑے پر اپنے پیچھے بٹھا لیا۔

رابعہ کی عدت کی مدت پوری ہوتے ہی دونوں کی شادی ہو گئی۔

دوبارہ سمرقند میں

ا

سمرقند کے مکانات کی چھتوں، اونچی دیواروں، درختوں اور گنبدوں پر برف کی نرم و سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔

بابر بستان سرائے محل کی بالائی منزل پر کھڑا ہوا شہر کے نظارے میں محو تھا۔ شفاف برف کے پس منظر میں درختوں کی ایک دوسرے سے الجھی ہوئی کالی کالی شاخوں نے اسے سفید کاغذ پر نستعلیق تحریر کی، علی شیر نوائی کے ہرات سے بھیجے ہوئے اس خط کی یاد دلا دی جو اسے آج ہی موصول ہوا تھا۔ اس کو ایک بار پھر اپنے سینے میں فخر و مسرت کے جذبات امڈتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔

بابر نے ایک ہی دھاوے میں شیبانی سے سمرقند کو چھین لیا تو شعراء نے اس موقع پر اس کی شجاعت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے بڑے شاندار قطعات تاریخ قلم بند کیے۔ لیکن ان کی بہ نسبت علی شیر نوائی کی مبارک باد نے بابر کو کہیں زیادہ مسرت سے ہمکنار کر دیا حالانکہ وہ نثر میں تھی۔ اس نے سوچا کہ ہرات سمرقند سے کتنے زیادہ فاصلے پر واقع ہے، کتنے زیادہ مشہور و معروف لوگ وہاں رہتے ہیں، کیسے کیسے اہم امور ہیں جن پر نوائی کو توجہ مبذول کرنی پڑتی ہے پھر بھی ایسا لگتا ہے کہ وہ عظیم شاعر بابر سے بخوبی واقف ہے اور اتنی دور سے بھی اس پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ "اس بار آپ نے سمرقند کو جس بہادری سے فتح کیا وہ آپ کے نام کے شایان شان ہے" نوائی نے یہ واضح کرتے ہوئے لکھا تھا کہ وہ اس شہر پر بابر کی پہلی فتح کی تفصیلات بھی جانتا ہے۔ نوائی کے ان الفاظ میں شاید ایک اور اشارہ بھی مضمر تھا۔ نوائی کی انسان دوستی دور دور تک مشہور تھی اور اس نے سمرقند پر بابر کی پہلی فتح کو شاید ہی سراہا ہو کیونکہ یہ فتح سات ماہ کے تکلیف دہ محاصرے کے بعد حاصل ہوئی تھی، درنتیجتاً اہل سمرقند کو جانے کتنے ہی مصائب جھیلنے پڑے تھے۔ نہیں، سمرقند پر اس کی پہلی فتح کا انداز ببر شیر کی چھلانگ جیسا قطعی نہ تھا'

بابر دیوان خانے کے اندر چلا گیا جہاں ماہر دستکاروں کے بنائے ہوئے منقش دروازوں والی الماریوں میں قلمی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک الماری کے قریب صندل کی خوشبودار چھ پایوں والی چوکی پر سنہری ڈوری سے بندھا اور گول لپٹا ہوا ایک کاغذ رکھا تھا۔ یہ نوائی کا خط تھا۔ بابر نے چوکی کے پاس زری کے گدے پر بیٹھ کر دوبارہ خط پڑھنا شروع کیا۔ اور اب اسے بعض جملوں کا مفہوم کچھ اور ہی معلوم ہوا جس کی طرف پہلی بار مطالعے کے دوران اس نے کوئی خاص توجہ نہیں مبذول کی تھی۔ نوائی کو اندجان کے ایک میر عمارت سے بابر کی شاعرانہ صلاحیتوں کا علم ہوا تھا اور اس نے اپنے خط کے ان جملوں میں اشارتاً کہا تھا کہ بابر کو اپنی صلاحیتوں سے میدان جنگ ہی میں نہیں بلکہ میدان سخن میں بھی کام لینا چاہیے۔ بابر سمجھ گیا کہ وہ میر عمارت غالباً فضل الدین ہی ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ فضل الدین نے ہرات پہنچ کر نوائی سے

ملاقات کی تھی اور اس سے بابر کی شاعرانہ صلاحیتوں اور بہت سی دیگر باتوں کا تذکرہ کیا تھا۔ اس خیال کے ساتھ ہی بابر کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ ہرات روانہ کرنے کے لیے جو جواب وہ لکھ رہا تھا اس میں کچھ اشعار کا بھی اضافہ کر دے۔ یقیناً بہترین اشعار ہی منتخب کیے جانے چاہئیں لیکن سوال یہ تھا کہ وہ کون سے اشعار ہوں۔

وہ اسی فکر میں اپنی ضخیم بیاض کے اوراق دیر تک الٹتا پلٹتا رہا۔

اس نے سوچا کیا وہ غزل مناسب رہے گی، حساس تنہائی کی اذیتوں سے متعلق وہ غزل جو اس نے کافی دن پہلے شروع کی تھی اور جس کا خیال اس زمانے میں اس کے ساتھ کیے گئے متعدد دیگر بے وفائیوں اور غداریوں کی بنا پر اس کے ذہن میں آیا تھا؟ ان دنوں اسے دنیا میں اپنی روح نظرانداز کی ہوئی کھوئی ہوئی سی معلوم ہو رہی تھی۔ بابر نے سن رکھا تھا کہ عظیم میر علی شیر کو بھی متعدد بار اپنے مقربین کی غداری کا تجربہ ہو چکا ہے نیز یہ کہ شاعر کا قریب ترین دوست حسین بیقرا تک اسے سہارا نہیں دے سکا تھا۔ لوگوں کے ساتھ نیکی کرنے کی اس کی پیاس کو نہیں بجھا سکا تھا۔ کاش وہ نوائی کے ان ہی جذبات و احساسات کی اپنے اشعار میں ترجمانی کر سکتا!

تو کیا اسے اسی نامکمل غزل میں اشعار کے اضافے کی کوشش کرنی چاہیے تھی جو اس دن کے بعد سے اب تک کسی طرح مکمل ہی نہیں ہو سکی تھی؟ لیکن اس وقت ایک تو اس کی ذہنی کیفیت حساس تنہائی سے پیدا ہونے والی ذہنی کیفیت سے کافی مختلف تھی۔ (شیبانی سمرقند کو دوبارہ اس سے چھین لینے کی تیاریاں کر رہا تھا، شہر کے باہر قرب و جوار کے علاقوں میں منتشر ہو رہا تھا اس کے باوجود بابر کا دل اب بھی فتح کے جوش و خروش اور عوام کے اسے حکمراں تسلیم کر لینے کی مسرتوں سے سرشار تھا) دوسرے میر خادم نے اندر داخل ہو کر فکر سخن سے اس کی توجہ ہٹا دی۔

''عالی جاہ! یہ خادم معافی کا خواستگار ہے لیکن ''

''کیا بات ہے؟''

''آپ کی والدہ محترمہ، عالی نسب خانم آپ سے ملاقات کی منتظر ہیں''

''واقعی؟'' بابر تیزی سے اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ ''وہ آ گئیں؟''

''جی ہاں، عالی جاہ۔ اور ملکہ عائشہ بھی''

''خوب بہت خوب!'' بابر کہہ اٹھا اور قلم اور کاغذ کو الگ رکھ دیا۔

۲

سب لوگوں کی ایک دوسرے سے ملاقات کوئی نصف سال سے نہیں ہوئی تھی۔ قتلغ نگار خانم، عائشہ بیگم اور خانزادہ بیگم اور اتیجان میں منتظر تھیں کہ بابر کے بھیجے ہوئے معتبر افراد آ کر انھیں اپنے ساتھ سمرقند لے جائیں۔

بابر نے ان خواتین سے نچلی منزل کے کشادہ دیوان خانے میں ملاقات کی۔ ماں نے بابر کو گلے لگایا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ کتنی دبلی ہو گئی ہے، ہاتھ کتنے ہلکے سے ہو گئے ہیں۔ بہن کے رخسار غالباً قیامت کی سردی میں سفر کے باعث تمتمائے ہوئے تھے، آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں اور لگ رہا تھا کہ طویل سفر سے وہ ذرا بھی نہیں تھکی۔ وہ پہلے کی بہ نسبت زیادہ خوش و خرم اور زیادہ حسین و جمیل نظر آ رہی تھی۔ خانزادہ بیگم نے مرد رشتے داروں کے خیر مقدم کے مروجہ انداز سے بابر کے دائیں شانے پر اپنے ہاتھ رکھے تو اس کی ہتھیلیوں کا لمس بابر کو بے حد راحت بخش معلوم ہوا۔ عائشہ بیگم

سر سے گرم اونی رومال ہٹائے بغیر ذرا فاصلے پر خاموش کھڑی ہوئی تھی۔

"آپ لوگوں نے اتنی دیر کیوں لگا دی؟ ہمیں تو آپ کا انتظار کرتے کئی ہفتے ہو گئے!"

"اس کا ایک سبب تھا، بردار عزیز، بہت ہی قابل معافی سبب۔ جلدی کرنا ممکن ہی نہ تھا" خان زادہ بیگم نے پر اسرار مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور عائشہ کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

دراصل بابر کو اپنی شریک حیات کی یاد اس نے زیادہ نہیں ستایا تھا۔ تک بھی اس نے اپنے ایک شعر میں اس کے روبرو رکھنے کی آرزو ظاہر کی تھی۔ اس کے آغاز شباب کے خواب کافور ہو چکے تھے پھر بھی وہ عائشہ سے کسی بے تعلقی کا مظاہرہ نہ کر سکتا تھا اور نہ ہی کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی سترہ سالہ دلہن یا ملکہ کے قریب جا کر اپنے دائیں شانے کو اس کی ہتھیلی کے تلے دباتے ہوئے کہا

"خوش آمدید، بیگم!"

عائشہ نے اپنا سوکھا سکھا ہاتھ خاوند کے شانے پر رکھ دیا۔

"شاہ عالی، فتح آپ کو مبارک ہو"

"اور آپ کو اپنے شہر میں واپس لوٹنا مبارک ہو، بیگم!"

"میں آپ کی شکر گزار ہوں..." اور عائشہ بیگم نے سر جھکا لیا۔

"اف، کتنی پریشانی ہوئی سفر میں بیچاری عائشہ بیگم کو" خان زادہ بیگم نے کہا۔ "اب تو ان کے لیے سفر کرنا اور بھی دشوار ہو گیا ہے"

بابر نے سوچا اچھا تو یہ بات ہے! بیگم دبلی تو ہو گئی ہیں پر ساتھ ہی ساتھ کچھ موٹی سی بھی لگ رہی ہیں۔ پیٹ خاصا ابھرا ابھرا سا ہے۔ دبلے پتلے چہرے پر زرد زرد چھائیاں بھی نکل آئی ہیں۔ یعنی یہ کہ میں باپ بننے جا رہا ہوں؟ حمل کوئی چھ مہینے کا لگتا ہے۔

عائشہ پہلے بھی گھوڑے پر یا بند گاڑی میں سواری برداشت نہیں کر پاتی تھی، اس کا سر چکرانے لگتا تھا۔ بابر سفر کی مشکلات کا خاص طور پر اسی حالت میں جبکہ عائشہ حاملہ بھی تھی، تصور کیا اور اسے ترس آ گیا: بیچاری عائشہ بیگم!

"خیر، اب آپ کو ساری مشکلات سے نجات مل گئی" اس نے کہا۔ "آپ کے لیے آرام دہ کمرے تیار کر دیے گئے ہیں۔ آپ کو کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو حکم دیجئے، بستان سرائے میں ہم سب آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہیں!"

خان زادہ بیگم خوشی سے مسکرانے لگی۔

"شکریہ... بہت بہت شکریہ... آپ کو دیکھ کر ہمیں جو مسرت حاصل ہوئی ہے، اس کی گونج آسماں تک پہنچ رہی ہے"

"آپ کا وفادار بھائی بھی آپ سے باتیں کرنے کے لیے جانے کب سے ترس رہا تھا۔ ہمشیرہ محترمہ... اچھا اب آپ لوگ آرام کریں، میں دسترخوان لگائے جانے کا حکم دیتا ہوں۔ وہاں، آسماں کی بلندیوں پر" بابر نے چھت کی طرف انگلی اٹھائی اور قہقہہ مار کر ہنس پڑے جیسے کہ بچپن میں ہنسا کرتا تھا۔ باقی افراد بھی ہنس پڑے عائشہ تک کو ہنسی آ گئی۔

اور قد، کتنا پر مسرت دن ہے، بابر نے سوچا۔ اسے اپنے دل کی دھڑکنوں کو غور سے سنتے ہوئے لگا کہ اس کے وجود

کے اندر نے کے نغمہ شیریں جیسے کوئی نغمہ باپ بننے کا اس کے لیے بالکل نیا احساس گونج رہا ہے۔ سے تھوڑی جھائیں دار دو چہرے والی عائشہ بیگم بھی بہت عزیز و قریب معلوم ہوئی۔

رات کو شمعیں گل کر کے وہ دونوں بستر پر بیٹھے تو عائشہ بیگم نے پردے کی رضائی سے سینہ تک اپنا جسم چھپا لیا۔ دیر تک بالکل بے حس و حرکت بنی ہوئی چھت کی طرف تکتی رہی۔ شاید وہ تھکن سے بالکل نڈھال ہو گئی تھی۔ پھر چونک کر کہہ اٹھی۔

"مجھے آپ پر فخر ہے، میرے تاجدار"

بابر اس حسن اتفاق پر چونک اٹھا کہ جو بات اسے یاد آ گئی تھی اسی کے متعلق اس کی بیگم بھی سوچ رہی تھی۔ اس نے عائشہ بیگم سے بھی کہا تھا "اب سمرقند میں ملاقات ہوگی" اور اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا۔

عائشہ یہ بھی کہنا چاہتی تھی کہ وہ جلد ہی اس کے بچے کی ماں بننے کی جو اس کے لیے باعث فخر و مسرت ہوگا۔ یہ بات بابر پر واضح ہو گئی اسی لیے اس نے دریافت کیا

"اچھا تو بیگم، کب ... کب منائیں گے ہم جشن مسرت؟"

"تین مہینوں سے بھی کم وقت رہ گیا ہے جیسے جیسے وہ گھڑی قریب آتی جا رہی ہے ویسے ویسے میرا خوف بڑھتا جا رہا ہے"

"جی ہاں، کہا تو تھا۔ خدا نے اگر ہمیں فرزند عطا کیا تو اس کا نام فخر الدین رکھیں گے ٹھیک ہے نا؟"

بابر نے سوچا تھی دیں ہیں عائشہ بیگم، والد کا نام ظہیر الدین ہے وہ اسی سے ملتا جلتا نام بیٹے کا رکھنا چاہتی ہیں۔

"فخر الدین۔ نام تو اچھا ہے۔ واقعی۔ اور اگر دختر تولد ہوئی تو اس کا نام فخر النساء رکھیں گے ٹھیک ہے نا، بیگم؟"

عائشہ بیگم بیٹے کی، وارث تخت و تاج کی ماں بننے کی متمنی تھی۔ اس نے بابر کو جواب دیا۔

"منظور ہے۔ لیکن میں تو خدا سے دعا کرتی ہوں کہ بیٹا ہی عطا کرے۔"

"آمین!"

فخر الدین، فخر النساء خوبصورت نام ہیں، بابر کے دل میں خیال آیا۔ پہلا یا دوسرا نام جس کا رکھا جائے اسے پروردگار خوش نصیب کرے۔

۳

مصیبت ہی کی طرح مسرت بھی تنہا نہیں آیا کرتی۔

کامرانیاں یکے بعد دیگرے بابر کے قدم چوم رہی تھیں۔ فتح سمرقند کے بعد مشرق میں اُرگوت اور مغرب میں سغد اور دبوسیہ شیبانی خان کی محکومی سے آزاد ہو کر بابر کے تابع ہو گئے تھے۔ شیبانی آنے والے معرکوں کی تیاریوں میں مصروف تھا لیکن اس نے سمرقند کا محاصرہ اٹھا لیا تھا۔ وہ اپنے خاص لشکر کے ساتھ پیچھے ہٹ گیا تھا اور اب چھوٹے چھوٹے دستوں کو لے کر دھاوے بولتا اور پریشان کرتا رہتا تھا۔

آج قرشی اور غزار سے خوش خبری موصول ہوئی تھی۔ ان شہروں سے بابر کے لشکر نے شیبانی کے مقرر کردہ حکام کو مار بھگایا تھا اور نئی حکومتوں نے بابر کے تحت اور اس کی فوج میں شامل کیے جانے کے لیے سینکڑوں نئے سپاہی بھیجے

تھے۔ ان سپاہیوں کو جو بیگ اپنے ساتھ لائے تھے انھیں بابر نے اپنی طرف سے خلعت اور شاندار مکان دے اور بڑے بڑے مشاہرے مقرر کیے۔

بابر نے میر علی شیر کے نام گزشتہ روز جو خط لکھنا شروع کیا تھا اسے آج آگے نہ بڑھا سکا کیونکہ کتب خانے والے کمرے کو جا رہا تھا تو سنگ مرمر کی سیڑھیوں پر سے بہن نے روک لیا۔

"برادر عزیز! کیا یہ سچ ہے کہ آپ کو ہرات سے کوئی خط موصول ہوا ہے؟"

بابر ٹھہر گیا۔

"ہاں سچ ہے، عالی وقار میر علی شیر کا خط ہے۔"

خان زادہ بیگم نے اظہار مسرت کیا لیکن وہ بھائی سے اپنے بیے کوئی اہم خبر سننے کی متوقع معلوم ہو رہی تھی۔ وہ اداس اداس سی تھی اور اس کی نگاہیں بھائی سے کچھ مانگ رہی تھیں۔ بابر کو ابھی تک علم نہ تھا کہ بہن کسی غم میں مبتلا ہے لیکن سے لگا کہ کوئی نہ کوئی غم ہے ضرور۔ وہ ذرا دیر کشمکش و پیچ میں مبتلا رہا پھر اس نے پرسکون انداز میں کہا:

"اوپر چلیے، میں آپ کو وہ خط دکھا دوں"

علی شیر نوائی کا خط پڑھتے وقت خان زادہ بیگم جب اس جگہ تک پہنچی جہاں اندجان کے میر عمارت کا ذکر تھا تو اچانک اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"ارے یہ آپ کی آنکھوں میں آنسو کیوں؟ میں تو اپنی ہمشیرہ کو خوش کرنا چاہتا تھا۔"

"یہ آنسو خوشی ہی کے ہیں۔ میں مسرور ہوں کہ میرے برادر عزیز کی شہرت دور دور تک پھیل رہی ہے"

"میں بھی اپنی پیاری بہن کو مسرور ہی دیکھنا چاہتا تھا"

"مجبوری ہے، بہن ٹھہری بدنصیب"

"لیکن بھائی کے اختیار میں تو سب کچھ ہے، بھائی تو کامیاب اور کامران ہے" بابر گفتگو کو ہنسی مذاق کا رخ دے جا رہا تھا۔ "بھائی کیا آپ کی مدد نہیں کر سکتا؟"

"آپ تو میری وجہ سے ویسے ہی کتنے مصائب جھیل چکے ہیں۔ اگر میں اس سال... اگر میں ان دنوں اوش میں محمد تمبل سے شادی کرنے پر راضی ہو گئی ہوتی تو شاید وہ آپ کا دشمن نہ بنتا"

خان زادہ بیگم کے اس دن اعتراف نے بابر کو پوری طرح بے دست کر دیا۔ اسے اپنے سینے میں بہن کے لیے کچھ اور بھی زیادہ محبت اُمڈتی محسوس ہوئی۔ جی چاہا کہ اور بھی زیادہ فیاضی سے کام لے اور بہن کو مسرتوں سے ہمکنار کر دے۔ اس نے سوچا کہ ایسے اعلیٰ و ارفع احساسات و خیالات کا حامل ہوتے ہوئے بھی اگر وہ اپنی سگی بہن کو جس سے زیادہ عزیز و قریب اس کے لیے اور کوئی بھی نہیں، خوش نہ رکھ سکا تو اور کس کو رکھے گا؟

بہن، والدہ اور شریک حیات تینوں خواتین جن سے وہ محبت کرتا تھا، اب سمرقند کے عالیشان محل میں آ چکی تھیں۔ اس محل میں کتنے تاجدار اور ان کے کتنے تاجدار رورتا زندگی بسر کر چکے تھے لیکن ان میں بس چند ہی ایسے تھے جو اپنے پیچھے عوام کے حافظے پر اپنی نیکیوں کے نقوش چھوڑ گئے تھے۔ اس کے برعکس عمارت سازی کے ماہرین نے اپنی صلاحیتوں سے جن شاہکاروں کی تخلیق کی تھی وہ آج تک لوگوں کی نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھیں، ان کے دیدہ و دل کو فرحت بخش رہی تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک ماہر میر عمارت سینکڑوں کاہل اور نکمے تاجداروں سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتا

ہے۔

''ہمشیرہ محترمہ، شیبانی خان صرف آپ کی بنا پر ہی میری دشمنی پر کمربستہ نہیں ہوا۔ آپ اطمینان رکھیے۔ سانپ بہرحال سانپ ہی ہوتا ہے، ڈسنے کی عادت سے باز نہیں آتا، کسی بھی حالت میں''

''میں آپ کی شکر گزار ہوں، برادر جان'' خان زادہ نے اس کی ماں کی جیسی آواز میں کہا۔

''عظیم میر علی شیر نے اپنے خط میں امید ظاہر کی ہے کہ ہم اپنے شایان شان کام انجام دیں گے'' بابر کا لہجہ یک بارگی قدرے مزاحیہ اور پرتصنع ہو گیا۔ ''کیا کریں، اب تو ہم ایسے محلات تعمیر ہی کرائیں گے جن کا رنگ روپ صدیوں تک ماند نہ پڑے گا۔ تاکہ ماوراالنہر خراسان سے پیچھے نہ رہ جائے'' اس نے مسکراتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''میری عزیز بہن، میں بہترین معماروں کو یہاں بلوانا چاہتا ہوں۔ میر علی شیر کے خط کا جواب میں کسی عقل مند قاصد کے ذریعے بھیجوں گا.... انھوں نے خط میں جس میر عمارت کا ذکر کیا ہے، اگر وہ ہمارے اندجان کے فضل الدین ہی ہوئے تو قاصد انھیں سمرقند آنے کی دعوت دے گا''

خان زادہ بیگم کی آنکھیں جو ابھی تک نم ہی تھیں، خوشی سے کھل اٹھیں۔ وہ مبہوت سی ہو گئی پھر شرماتے ہوئے بدبدائی۔

''آپ آسمان ماوراالنہر پر میری امیدوں کے وہ درخشندہ ستارے ہیں، برادر عزیز''

آپا جان، آپ پروردگار سے دعا کیجیے کہ وہ اس شیطان شیبانی خان کو ہمارے راستے سے ہٹا دے۔ خدا کرے جلد از جلد مستحکم امن و سکون کا دور دورہ ہو! تب ہم سب اطمینان کی سانس لیں گے، میں اپنی نامکمل غزلوں کو مکمل کر سکوں گا، اپنی پسند کے مدرسے اور محل تعمیر کرا سکوں گا۔ آپ کو یاد ہے نا ہم نے اوش میں یہ کام کتنی لگن کے ساتھ شروع کیا تھا؟''

یاد کیوں نہ ہوتا! خان زادہ بیگم میر عمارت فضل الدین کے بنائے ہوئے ان نقشوں کو جو اسے طاہر نے دیئے تھے، ابھی تک سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ بھائی سے اس بات کا تذکرہ نامناسب معلوم ہوا اور اس نے بس اتنا ہی کہا

''خدا ہمارے خوابوں کی تکمیل میں حامی و ناصر ہو، حکمران۔ ہمارے سارے خوابوں کی تکمیل میں! میں اس کے لیے روز و شب دعا کرتی رہوں گی''

بابر نے بہن سے ہونے والی اس بات چیت کے بعد ادھوری غزلوں کے مسودوں کو سامنے رکھ کر دیر تک فکر سخن کا ارادہ کیا۔ اسے اپنی موجودہ دلی کیفیت کے اظہار کے لیے یہ شعر موزوں معلوم ہوا

جو وفا کرتا ہے وہ خود بھی وفا پاتا ہے
اور غم دیتا ہے جو، غم ہی سدا پاتا ہے

علی شیر نوائی کو کیا یہ غزل بھیجی جا سکتی تھی؟

اس نے ایک مصرعہ اور لکھا:

نیک شاداں رہے حلقے میں وفاداروں کے

نہیں، اس نے سوچا، یہ تو بالکل عام الفاظ ہیں اور مداریت برائے درست (اس نے مصرعے کو قلم زد کر دیا) وہ یک بار پھر غور و فکر کرنے لگا۔ دراصل وہ اس خیال کا اظہار کرنا چاہتا تھا کہ اس عارضی دنیا میں نوائی جیسے یکتا و یگانہ افراد کو، ایسے افراد کو جو دوسروں کی فلاح و بہبود کے لیے بہت کچھ کرتے ہیں، اس کا صلہ بعد از مرگ نہیں، عوام کی یادوں میں نہیں بلکہ

یہاں، اسی دھرتی پر دوسروں کی زندگی ہی میں ملتا ہے۔ اس امر کو دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ مسرتیں حاصل ہونی چاہییں اور یہ مسرتیں فراہم کرنے کا فرض اس کے ماحول کے لوگوں کی نسل در نسل عصبیت پر عائد ہوتا ہے۔ مگر جانے کیوں وہ اپنے اس خیال کو اشعار کے قالب میں ڈھال ہی نہیں پا رہا تھا۔ "لیکن کیا زندگی میں ایسا ہوتا بھی ہے؟" بابر نے اپنے آپ سے سوال کیا اور مصرعے کو ایک بار پھر کاٹ کر اس کے اوپر لکھا

نیک نامی، بدی مگر سے محفوظ رہے

قلم پھر رک گیا۔ نہیں، بات اب بھی نہیں بنی تھی۔

بابر بیاض بند کر کے چوکی کے پاس سے اٹھ کھڑا ہوا۔

پھر وہ دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا۔

اتنے میں جب اسے یہ بتایا گیا کہ شہر سبز سے قاسم بیگ شاعر کمال الدین بنائی کو لے کر آیا ہے اور ملاقات کے لیے وقت متعین کیے جانے کی درخواست کر رہا ہے تو بابر خوش ہو گیا کہ اس کی توجہ ان خیالات کی طرف سے ہٹا دی گئی۔

"انتظار کاہے کا؟" "ابھی ملاقات کیے لیتے ہیں" بابر نے فیصلہ کیا اور نچلی منزل پر اترتے ہوئے بنائی سے اپنی پہلی ملاقات کی تفصیلات یاد کرنے لگا۔

۴

بابر ہرات کے مشہور شاعر کمال الدین بنائی سے تین سال قبل متعارف ہوا تھا جبکہ سمرقند پہلی بار اس کے قبضے میں آیا تھا۔ بنائی کے پاس کسی ماہر ہاتھوں سے خوش نویس کا نقل کیا ہوا ایک نادر کتاب کا نسخہ موجود تھا۔ بنائی کو کتابوں سے بابر کی بے پایاں محبت کا علم ہوا تو اس نے یہ قلمی نسخہ بابر کو نذر کرنے کا ارادہ کیا۔ بابر کو پتا چلا کہ بنائی مفلسی کی زندگی گزار رہا ہے، سمرقند میں اس کا کوئی گھر تک نہیں اور جہاں سر جھکانے کی جگہ ملتی ہے، پڑ رہتا ہے تو اس نے کتاب کی قیمت ادا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے نادر کتابوں کے تاجروں کو بلوا کر ان سے دریافت کیا کہ اس کتاب کی قیمت کیا ہو سکتی ہے اور اسے جواب ملا "زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار درہم۔"

افسوس کہ بابر بنائی کو یہ رقم نہ بھجوا سکا کیونکہ جیسا کہ ہم جانتے ہیں، وہ بیمار پڑ گیا اور اس فانی دنیا سے اٹھتے اٹھتے بچا۔

صحت یاب ہونے کے بعد جب وہ اندجان جانے کی تیاریاں کرنے لگا اور اس کی نظر اس قلمی کتاب پر پڑی تو اسے یاد آیا کہ اس کی قیمت بنائی کو ابھی تک ادا نہیں کی گئی۔ بابر نے فوراً ہی خزانچی کو بلوایا، پانچ ہزار طلائی درہم اسی وقت گنے اور ایک معتبر شخص کے ہاتھ شاعر کے پاس بھیجے گئے۔ لیکن یہ رقم فوری طور پر بنائی تک نہ پہنچ سکی۔ وہ معتبر شخص اسے تلاش ہی نہ کر سکا۔ بے خانماں شاعر لاپتا سا ہو گیا تھا، جانے کہاں مقیم تھا۔ ان دنوں بابر کے لیے اپنے استاد اور ماں کو محاصرے سے نجات دلانے کے لیے اندجان روانہ ہونا ضروری ہو گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بنائی کو تلاش کرنے کی کسی کو فرصت ہی نہیں لیکن بابر اپنی بات پر سختی سے اڑا رہا:

"اس قرض کو ادا کیے بغیر میں سمرقند سے روانہ نہ ہوں گا۔"

اس کے بعد ہرکارے اور سپاہی گھوڑوں پر سوار ہو کر شہر کے کونے کونے میں گئے۔ انھوں نے بنائی کو تلاش کر لیا اور

تاخیر کی صورت میں مہم ناکام ہو جائے گی۔ آخر کار بینائی نے وہ چوٹی سر کر لی اور مہم سے نکل گیا۔
بینائی اپنی زندگی میں کئی صاحب حکمرانوں کو دیکھ چکا تھا اس لیے وہ سارے معاملے کی اس نزاکت کو سمجھتا تھا
متاثر ہوا اور اس نے اس شاندار واقعے کے سلسلے میں ایک قصیدہ قلم بند کیا۔ وہ اس قصیدے کو خود خوش ہو کر
کے بابر کوس کے سمرقند سے روانہ ہونے سے قبل، فتح کی یادگار کے طور پر پیش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔
پانچ اشعار کے اس قصیدے میں عام رواج کے بموجب خاصے مبالغے سے کام لیا گیا تھا

جہاں میں نیک نامی تجھ کو حاصل
ظہیر الدین بابر شاہ عادل

بابر نیک دلی سے اس پر ہنس پڑا ہو گا، 'جہاں میں نیک نامی'! بہر حال یہ تو کہا ہی جا سکتا تھا۔ ہر وقت پڑی جب اور اسی نیکی سے شاید بے خانماں شاعر کی نگاہوں میں ساری دنیا انصاف کا پیکر بن گئی!
اس کے بعد سمرقند شیبانی خان نے قبضہ کر لیا۔
خان نے ایک مشاعرہ منعقد کیا جس میں بینائی کو بھی مدعو کیا گیا۔ اس بزم سخن میں شیبانی نے بینائی کے کلام کو بہت پسند کیا اور اسے ملک الشعراء کے خطاب اور مال و دولت سے نوازا۔ اس نے دربار سے عام رواج کے بموجب بینائی کو ان فتوحات کی تاریخ لکھنے پر مامور کر دیا۔ بینائی نے "شیبانی نے 'شیبانی نامہ' لکھنا شروع ہی کیا تھا کہ سمرقند پر بابر نے دوبارہ قبضہ کر لیا۔ ان ہی دنوں جبکہ شیبانی خان اپنے سارے دستوں وغیرہ سے سمرقند سے گزر کر ۱۵۰۰ء میں جاتا ہوا ایک نئے حملے کے لیے بڑی طاقت مجتمع کرنے کے ارادے سے بخارا جا رہا تھا، بینائی غالب اس کے پڑاؤ سے فرار ہو کر سمرقند آ گیا۔ وہ بابر سے ملنے کی کوشش کرنے لگا لیکن قاسم بیگ نے اسے شیبانی خان کا حامی تصور کرتے ہوئے بابر کے پاس پھٹکنے بھی نہ دیا اور شہر بدر بھیج دیا۔ بابر کو اس واقعے کا علم فوری طور پر نہیں ہو سکا تھا ورنہ پتہ چلنے پر جلد ہی میں قاسم بیگ کی سرزنش بھی کی تھی
"آپ نے بلاوجہ ہی یہ قدم اٹھایا۔ بینائی عظیم شاعر ہیں اور وہ اپنی مرضی سے یہاں آ گئے تھے تو انہیں مجھ سے ملاقات کی اجازت دے دینی چاہیے تھی۔"
ایماندار قاسم بیگ نے وضاحت کی۔
"لیکن عالی جاہ، اس عظیم شاعر نے تو سمرقند پر قابض ہو جانے والے شیبانی خان کی شان میں قصائد لکھے تھے۔"
بابر مسکرا دیا
"آپ کو نہیں معلوم کیا، قصیدہ تو انھوں نے میری شان میں بھی لکھا تھا۔ ابھی جب بادشاہوں کو اپنی مدح و ستائش کرانے کا اتنا زیادہ شوق ہے تو شاعر کیا کریں؟"
قاسم بیگ کی سنجیدگی برقرار رہی۔
"عالی جاہ، یہ شخص شیبانی خان کا مخبر بھی تو ہو سکتا ہے۔"
بابر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا
"نہیں۔ وہ ہرات میں بھی حسین بے قرار کے مخبر نہیں تھے، شیبانی کی خدمت تو انھوں نے صرف شاعری کے

بیٹھی تھی ۔ وہ بھی تھا ۔ ۔ ۔ ہی سے

میں جہاں خوجہ بیگی سے ملا کرتے تھے ان کے معتقد تھے پھر بھی بعد میں کھلے عام شیبانی خان کی طرف داری کرنے لگے جس نے خوجہ بیگی کو قتل کرا دیا تھا۔ اگر وہ مجرم نہیں تھے تب بھی ان کا طرز عمل مستحق تھا کیا؟"

مجھے تسلیم ہے کہ تحقیق ہونا تھا لیکن ان کو یہ بھی اندازہ لینا چاہیے کہ مستحق کیا ہوتا ہے۔ ۔ کسی کو شہر سبز روانہ کر دیں محترم بیگ، بینائی کو صحیح سلامت یہاں لے آئیے"

یہ حکم تھا اور قاسم بیگ نے آج اس کی تعمیل کر دی تھی۔

بابر بیٹھ کر حرم کے دروازے سے دیوان خانے میں داخل ہوا سامنے والے عام دروازے سے جلد ہی قاسم بیگ اور بینائی اندر آئے۔ بینائی تین سال قبل بہت ہنس مکھ اور رعب دار نظر آتا تھا لیکن اب تو وہ کافی دبلا پتلا اور سکڑا سکڑا سا لگ رہا تھا۔ چوغہ اور دستار بھی پھٹے پرانے سے تھے۔ تاہم اس کی بڑی بڑی آنکھیں ضبط نفس اور کردار کے بانکپن کی آئینہ دار تھیں۔

بابر دیوان خانے کے وسط میں جا کر شاعر کا استقبال کیا اور اسے شہ نشین کے پاس تک لایا۔ اس نے قاسم بیگ کو پہلے بینائی کو بائیں پہلو میں بٹھایا اور پھر بینائی سے مخاطب ہو کر اس کی خیریت دریافت کی۔ بینائی نے جواب تاجیک زبان میں ایک شعر سے دیا

نی غذا مرا کز تو ام تو شید
نی مجمل غذا تا تو ام پوشید

بابر نے انگلیاں پیشانی سے لگا دیں اور کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ اچھا تو وشاہ سلامت شعر کا جواب شعر ہی سے دینا چاہتے ہیں قاسم بیگ نے سوچا اور بینائی کو اشارہ کیا "ٹھہر جائیے!" بابر نے ذرا بعد پیشانی سے ہاتھ کو ہٹا کر اسے بلند آواز ہوتے کہا۔

بلا تاخیر یہ حق ہم استعمال کرتے ہیں
کھلایا جائے کھانا آپ کو، کپڑے دیے جائیں

بینائی کو حیرت ہوئی اتنی جلدی جواب کی توقع کب تھی۔ اس نے تاجیک میں (بابر کا شعر ترکی میں تھا) کہا
"مکرر ارشاد، عالی جاہ میں فکر کو ذرا بہتر طور پر سمجھ لوں"
بابر نے لفظی ردوبدل کے ساتھ شعر پڑھا

ہم اپنے حق کا استعمال کرتے، حکم دیتے ہیں
کھلایا جائے کھانا آپ کو کپڑے دیے جائیں

"یہ خادم حضور کی شاعرانہ صلاحیتوں کو خراج تحسین پیش کرتا ہے" بینائی نے کہا اور داڑھی کی جس پر ہلکی ہلکی سفیدی نمایاں ہو چلی تھی، نوک کو انگلیوں سے کھینچتے ہوئے خاموشی سے جواب سوچنے لگا۔ آخر کار چند لمحات میں اسے حاضر جواب بات سوجھ گئی تو اس نے نگاہیں اٹھائیں اور سینے کو ذرا تان کر بابر کے ترکی میں شعر پڑھا

بڑا انعام ہے، لائق نہیں میں ایسی نعمت کے
یقیں کیجیے، نہیں پھٹکا کبھی نزدیک دولت کے

بابر کو بھی حیرت ہوئی۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ بنائی دری ہی میں نہیں بلکہ ترکی میں بھی شعر گوئی پر اتنی زبردست قدرت رکھتا ہے۔ یہ تو سچ تھا کہ بنائی نے اپنے معاملے میں بہت انکسار سے کام لیا تھا اور خود کو "عظیم شاعر" نہیں کہا تھا لیکن صاف ظاہر تھا کہ یہ محض عام شاعرانہ انداز ہی تھا۔ اوہ، شاعری، شاعری بابر نے سوچا، سچائی پر خوبصورت الفاظ کے پردے ڈالنے اور ساتھ ہی ساتھ اس پر سے پردے اٹھانے میں تیرا بھی کوئی جواب نہیں!

بابر نے میر منشی کو طلب کر کے بنائی کی ترکی بیت کو کاغذ پر لکھ لینے کا حکم دیا۔

بنائی اور بابر کی منظوم گفتگو سے قاسم بیگ بھی بہت متاثر ہوا۔ اس نے بنائی کے قیام کے لیے اسی دن آرام دہ احاطے والے عمدہ مکان کا انتظام کر دیا اور بابر کے حکم کے بموجب گھوڑا، چاول، بھیڑ اور پوستین بھی بھجوا دیے۔ بنائی کے لیے دوسرے عہدے داروں کا جیسا معقول مشاہرہ بھی مقرر کر دیا گیا۔

اس ملاقات کے بعد بابر نے ہراتی شاعر کو متعدد بار اپنی اوپری منزل کی خلوت گاہ میں کھانے پر مدعو کر کے بات چیت کی۔ پہلے بنائی نے سوچا تھا کہ اسے شیبانی خان سے اپنی وابستگی کی تصدیق بیان کرنی ہوگی۔ اس نے یہ تیاری بھی کر رکھی تھی کہ اس معاملے کا تذکرہ کرتے ہوئے کس طرح اپنے اوپر طنز کرے گا، اپنی غلطی کی کن الفاظ میں مذمت کرے گا۔ لیکن بابر نے بالکل ہی مختلف موضوع چھیڑا وہ ہرات کے بارے میں، نوائی کے بارے میں دریافت کرتا رہا۔

دوران گفتگو پتا چلا کہ بنائی نے میر علی شیر نوائی کی شان میں ایک قصیدہ بھی لکھا ہے۔ بابر نے اس قصیدے کو سنا اور جی کھول کر داد دی۔

بنائی کی دلی خواہش تھی کہ میر علی شیر کو اس قصیدے کے بارے میں معلوم ہو جائے۔ بابر نے بڑی خوش اخلاقی کے ساتھ تجویز پیش کی کہ اس کا خط لے کر جو قاصد ہرات جانے کی تیاری کر رہا ہے اس کے ہاتھ قصیدہ بھی بھیج دے گا۔

بنائی سے گفتگو کرتے ہوئے بابر کو بار بار اپنے اشعار کا جنہیں وہ خط کے ساتھ نوائی کے پاس بھیجنا چاہتا تھا خیال آتا رہا۔ لیکن جب اس نے اپنے اشعار کا بنائی کے اشعار سے جنہیں خود نوائی نے ایک بار "بے مثال" قرار دیا تھا، موازنہ کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ابھی وہ اس دہلیز پر قدم تک نہیں رکھ سکا ہے جسے پار کر کے ہرات کے اس عظیم شاعر سے روحانی ملاقات کر سکے۔ اس نے اپنی مختلف غزلوں اور ان کی ترمیم شدہ شکلوں کو یکے بعد دیگرے مسترد کر دیا۔ اس نے محسوس کیا کہ پہلے جو کچھ آسان اور قابل فہم معلوم ہو رہا تھا وہ زیادہ سے زیادہ پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے حتیٰ کہ لوگ اسے غلط معنی بھی پہنچا سکتے ہیں۔ جس شاعری کا وہ عادی ہو چکا تھا وہ دنیا کی پیچیدگیوں کی ترجمانی و عکاسی نہیں کرتی تھی اور زیادہ تر اشعار تو اصل مسائل سے ذرا بھی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ مثال کے طور پر اسی مسئلے سے کہ نیک ارادوں والے کسی شخص پر جسے مقدر نے بلندیوں تک پہنچا دیا ہو، اس کا ماحول۔ خود غرض، عیار اور تنگ حرم درباریوں کی غل غپاڑہ کرتی ہوئی بھیڑ جس کے درمیان سے زندگی گزارنی پڑتی تھی، کتنا دباؤ ڈالتی تھی۔ بابر نے سوچا کیا اس کی شاعری، بادشاہوں نے مقربین کی پھیلائی ہوئی برائیوں کو بے نقاب کرتی ہے؟ لوگ کسی نہ کسی طرح برسر اقتدار آ جاتے ہیں اور پھر صرف اپنے آپ کو دیکھتے ہیں، صرف اپنی ہی فکر کرتے ہیں، حتیٰ کہ شاعروں اور معماروں کی سرپرستی کرتے ہیں تب بھی محض اپنے ہی مفاد میں محض اپنے ہی نام و نمود کے لیے... علی شیر نوائی اور بنائی درباریوں کی بھیڑ بھاڑ اور دنیا کے منہ زوروں سے، ڈھائی دلوں کے بادشاہوں سے بیزار ہیں تو ان دونوں کے پاس اس کے ٹھوس اسباب بھی موجود ہیں جن سے متعلق تھے زیادہ سے زیادہ افسوس ناک ہوتے جا رہے ہیں۔

کس سے نیکی کی انھوں نے جو ہیں دنیا کے غلام؟

یہ مصرعہ دل سے نکلنے والی آہ کی طرح موثر تھا اور اس میں ایک خاص قسم کی قوت و طاقت موجود تھی۔ بابر پر بہت ساری باتیں عیاں ہو گئیں۔ اس وقت اس کی ذہنی صلاحیت اور قوت بینائی ہرات میں مقیم علی شیر نوائی کی آنکھوں کی طرح تیز تھیں۔ اس وقت بابر کے پاس ایسی بہت سی باتیں تھیں جو وہ اس عظیم شاعر سے کہہ سکتا تھا۔ وہ شخص ضرور دھوکا کھائے گا جسے خود غرض لوگوں سے نیکی کی توقع ہو، چاہے یہ لوگ اعلاد رفیع خیالات کے حامل ہی کیوں نہ ہوں۔

اس نے سوچا کہ علی شیر نوائی اس لیے لوگوں کی بے لوث خدمت کرتے رہتے ہیں کہ ان کا رتبہ تاج داروں اور خود نوائی کی خوشامد کرنے والے چاپلوسوں سے کہیں زیادہ بلند ہے (دراصل تاجدار اور ان کی خوشامدی دونوں اس دنیائے فانی کے عارضی بندے ہی تو ہیں) اس نے اپنے دل کی اس بات کا اظہار کر دیا کہ انسان کی زندگی کا مقصد بلند ہونا چاہیے۔ صرف اسی صورت میں وہ اپنے آپ سے کہہ سکتا ہے کہ ہاں، تمھاری زندگی رائیگاں نہیں گئی!

کس سے نیکی کی انھوں نے جو ہیں دنیا کے غلام؟
جو بھروسا ان پہ کرتا ہے وہ دھوکا کھائے گا
جتنی نیکی تجھ سے ممکن ہو سکے کر اور تجھے
بعد مرنے کے بھی نیک انسان سمجھا جائے گا

اس طرح اس نے ایک رات کو نوائی کے نام اپنے خط اور اشعار کو مکمل کر لیا اور دو دنوں کے بعد یک مخصوص توقع تھی کہ نوائی کا جواب موسم سرما کے آخر تک موصول ہو جائے گا لیکن گل چاندنی کے اولین پھول کھلنے لگے تو ہرات سے جواب کے بجائے بڑی افسوس ناک خبر موصول ہوئی۔ کڑاکے کے جاڑے میں نوائی کا انتقال ہو گیا تھا۔ قاصد بھی راہ ہی میں تھا کہ نوائی نے دنیا کو خیر باد کہا۔ بابر کتنے ہی برسوں سے خواب دیکھ رہا تھا کہ اسے کسی دن اس عظیم شاعر سے شرف تلمذ حاصل ہو گا لیکن بدبختی نے اس خواب کو خاک میں ملا دیا۔

اس اثنا میں شیبانی خان سے نئی جنگ کا خطرہ سر پر منڈلانے لگا۔

لالے کی کلی زمین سے ابھر کر کھلنے ہی والی تھی کہ گھوڑے کے سم نے اسے روند ڈالا۔

شیبانی خان تیزی سے پہاڑی کی چوٹی پر پہنچا اور زین پر بالکل بے حس و حرکت ہو کر نیچے گھاٹی میں اپنے گھڑ سوار لشکر کو جنگی مشقیں کرتے ہوئے دیکھنے لگا۔

نظارہ واقعی قابل دید تھا حالانکہ کچھ ہی دن قبل.....

سمرقند اور بخارا کے وسط میں واقع دبوسیہ قلعہ موسم بہار کے نیلگوں آسمان تلے خان کو اس وقت انسان کا بنایا ہوا پہاڑ سا لگا لیکن گزشتہ خزاں کے آخری ایام میں جب یہ قلعہ بابر کے قبضے میں چلا گیا تھا تو شیبانی کو خوبصورت تشبیہات سوچنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ وہ سنگین حالات سے دوچار ہو گیا تھا کیونکہ اب اس کے قبضے میں صرف بخارا ہی باقی رہ گیا تھا۔ لق ودق صحرا بھی یقیناً اس کے پاس تھا جو بے کراں تو تھا لیکن لوگوں اور سپاہیوں کی وجہ سے بے حال کی تھی۔ کچھ سلطانوں نے تو اس سے یہ بھی کہنا شروع کر دیا تھا: "ابھی سویرا ہے، ترکستان صحرا کو واپس لوٹ جانا چاہیے" اس کو اپنی خوش بختی اور اپنے صحرا پر پورا اعتماد تھا۔ اسے سمرقند سے اپنے مخبروں کی دی ہوئی اطلاعات کی بنا پر یہ بھی معلوم تھا کہ بابر شعر و شاعری اور صاحبان علم سے تبادلہ خیالات سے اپنی گہری دلچسپی کے باعث آئندہ جنگوں کی تیاریاں کسی جوش و خروش کے ساتھ نہیں کر

رہا ہے۔ اس کے علاوہ گزشتہ برسوں میں بابر دو ایک کے قبضے سے ۱۱ بڑے سے قلعے میں جا سے ا سے ارتباط اور
ہمارے شکار سمرقند میں موسم بہار کے دوران وبا بھی پھیل گئی تھی اور بھکمری کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

شیبانی بڑے بیٹے تیمور کے ساتھ اپنے لشکر کو بڑھاتا اور ترتیب دیتا رہا۔ اور جب اس نے حملہ کیا تو وہ قلعے کے بے کوچ سپاہ تو اس کے سپاہی قلعے پر یلغار کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ ان پر تیروں اور پتھروں کی بارش ہو رہی تھی، کھولتا ہوا تیل پھینکا جا رہا تھا لیکن وہ اپنے نقصانات کی ذرا بھی پروا کیے بغیر، قلعے کی فصیل پر چڑھتے جا رہے تھے۔ پیچھے ہٹنے لگے تو خان نے فوراً ہی تازہ دم لشکریوں پر مشتمل نئے دستے میدان میں اتار دیے جن کی سالاری اس کا بھائی محمود اور چہیتا بیٹا تیمور کر رہے تھے۔ سپاہیوں نے جب یہ دیکھا کہ خان اپنے بھائی اور بیٹے تک کو قربان کرنے سے نہیں ڈر رہا ہے تو انھوں نے اور بھی زیادہ غصے کے ساتھ حملہ شروع کر دیا۔ مرنے والے اس طرح نیچے گرنے لگے جیسے شہتوت کے درختوں سے شہتوت جھڑ رہے ہوں اور فصیل پر چڑھنے کے لیے لگائی جانے والی سیڑھیاں خالی ہونے لگیں۔ پھر خود فصیل کے اوپری حصے پر دست بدست مقابلہ، نہایت ہی بے رحمانہ مقابلہ شروع ہو گیا جس میں کام آنے والے حملہ آوروں کی مدد کرنے لگے کیونکہ ان کی لاشوں سے کنگوروں کی درمیانی جگہیں بھرتی جا رہی تھیں اور قلعے کے محافظین کے لیے نیچے کی طرف تیر چلانا دشوار تر ہوتا جا رہا تھا۔

شیبانی خان کا لشکر تعداد اور طاقت دونوں اعتبار سے قلعے کی حفاظت کرنے والی فوج سے کہیں زیادہ بڑا تھا۔ قلعے پر شیبانی کا قبضہ ہو گیا اور جو محافظین زندہ بچ رہے تھے انھیں خان کے حکم پر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

دبوسیہ سے کمک کے لیے بھیجا جانے والا پیغام بابر کے پاس اس وقت پہنچا تھا جب شیبانی خان اپنی فتح کا جشن منا رہا تھا۔ خزاں اور موسم سرما کے دوران شیبانی کو یکے بعد دیگرے کئی شکستیں اٹھانی پڑی تھیں جن کے بعد یہ پہلی فتح تھی۔ اس قسم کی کامیابی انسان کو ہمیشہ نئی امنگوں سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ شیبانی نے دبوسیہ کو اپنا گڑھ بنا لیا تھا اور وہاں سے سمرقند پر چڑھائی کرنے کی تیاریاں کرنے لگا تھا۔

اس وقت گھاٹی میں ہونے والی گھڑ دوڑ جسے پہاڑی کے اوپر سے شیبانی خان دیکھ رہا تھا اس کی تفریح کے لیے نہ تھی۔ یہ ایک دشوار جنگی مشق تھی۔ شیبانی کو جلد ہی بابر کے خلاف جنگ کے لیے انتہائی تیز، طاقتور اور دلیر سپاہیوں اور گھوڑوں کی ضرورت تھی۔

گزشتہ روز ہی سمرقند سے درویش کے بھیس میں آنے والے اس کے ایک مخبر نے بتایا تھا کہ بابر کے ہاں ایک دختر تولد ہوئی ہے جس کا نام فخر النسا رکھا گیا ہے۔

شیبانی خان اپنے عقاب صفت گھڑ سواروں کو بڑے جوش و خروش کے ساتھ ناقدانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سوچنے لگا "بابر کو فخر ہے۔ خیر کوئی بات نہیں، اپنی موسم خزاں والی فتح کے نشے میں ڈوبا رہے، شاعری کرتا رہے اور اس کی فخر النسا صحیح معنوں میں فخر النسا ثابت ہو۔ اس دوران میرے عقاب اڑنا اور دشمن پر جھپٹنا سیکھ رہے ہیں۔ ان عقابوں کی گرفت میں آنے والا ایک بھی فرد زندہ نہ بچ سکے گا۔"

شیبانی خان پر فوجی تیاریوں کا ایسا جنون اس سے قبل کسی بھی جنگ کے سلسلے میں نہیں طاری ہوا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ بابر پر فتح پانا کوئی کھیل نہیں ہے۔ بابر کم سنی کے باوجود عقلمند ہے، جیسے دانا، نڈر اور بہادر ہے۔ اس نے کچھ ایسی فہم و فراست سے کام لیا ہے کہ ماوراءالنہر کے زیادہ تر شہر اور گاؤں اس کی حمایت پر کمر بستہ ہو گئے ہیں۔ بے شک تو وہ بھی

حیثیت پر قائم ہیں۔ سمرقند کے سارے بیگ آج بھی بابر کے حامی ہیں، جو زیادہ طاقتور ہے اسی کو سجدہ کر رہے ہیں۔ سلطان علی کے بیٹے وہ تربیک گزشتہ سال مجھ سے آ ملے تھے لیکن سمرقند پر بابر کے قبضے (بڑی چالاکی سے کام لیا تھا اس نے، اس میں ذرا بھی شک نہیں) کے بعد ہی وہ بابر کے پاس بھاگ گئے تھے جس کا لشکر روز بروز بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ احمد تنبل تک نے اپنے چھوٹے بھائی سلطان خلیل کو دو سو سپاہیوں کے ساتھ بابر کی خدمت میں بھیج دیا ہے۔ وہ بابر سے ڈرتا ہے۔ اس سے (دائمی وفاداری) کی قسم کھائی تھی۔ آئندہ بھی یوں ہی ہوتا رہا تو پھر کبھی بھی شکست نہ دی جا سکے گی۔ خیر یہ موسم بہار ہے، موسم گرما نہیں۔ گزشتہ سال کی خزاں میں جو کچھ ہوا تھا وہ دوبارہ نہ ہوگا۔ بابر کی طاقت میں اضافہ نہ ہونے دینا چاہیے۔ اسے فوجی تیاریوں کے معاملے میں پیچھے چھوڑ دینا چاہیے۔

اور پھر شیبانی خان بخارا اور دبوسیہ میں حفاظتی فوج اور معتبر ناظم مامور کر کے آندھی کی طرح سمرقند کی طرف بڑھنے لگا۔ چوری چھپے نہیں، کھلم کھلا۔ صرف یہی نہیں، اس نے تو بابر کو پہلے سے ایک خط بھی بھیج دیا جس میں نوجوان سپہ سالار کے شجاعت کے جذبات بھڑکانے کی چال چلتے ہوئے ایمانداری سے کھلے میدان میں جنگ کرنے کے لیے للکارا گیا تھا۔ خان نے لکھا تھا (بہادر ایک دوسرے کی طاقت میدان کارزار میں آزماتے ہیں، بند قلعے کے اندر تو کوئی چھوکرا بھی پناہ لے سکتا ہے!)

بابر سمرقند سے نکل کر شیبانی خان کے لشکر کا سامنا کرنے کے لیے بڑھا لیکن ایک تاش* فاصلہ طے کرنے کے بعد سرپل میں ٹھہر کر دریائے زرافشاں کے کنارے پڑاؤ ڈال دیا، لشکر کے چاروں طرف گہری خندقیں کھدوائیں اور شہتیروں اور درختوں کی شاخوں کی دیواریں کھڑی کرا دیں تاکہ تیر اندر نہ داخل ہو سکیں۔

نہیں، وہ فوری طور پر جنگ چھیڑنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ نئی فوج کی آمد کا انتظار کرنا چاہتا تھا جس میں وہ دستے بھی شامل تھے جنہیں شیبانی خان کے لشکر پر پیچھے سے حملہ کرنا تھا۔

دور دراز واقع ترکستان سے نئے دستوں کی آمد متوقع تھی۔ دوسری طرف شیبانی کو یہ معلوم تھا کہ بابر کے پاس کمک پہنچنے والی ہے۔ شہر سبز سے موصول ہونے والی ایک خفیہ اطلاع نے جس سے خان کو تشویش پیدا ہو گئی تھی، اس بات کی تصدیق کر دی تھی کہ وہاں باقی ترخان بیگ دو ہزار سپاہی اکٹھا کر چکا ہے، مزید ایک ہزار سپاہی بھرتی کر رہا ہے اور جلد ہی بابر کی مدد کے لیے روانہ ہونے کا ارادہ رکھتا ہے۔

شیبانی سمجھ رہا تھا کہ اسے لڑائی جلد از جلد، بہر قیمت جلد از جلد چھیڑنی چاہیے، اور دن رات سوچتا رہتا تھا کہ اس کے لیے کیا تدبیر اختیار کرے۔

ایک رات اچانک جنگی نقاروں اور ترہیوں کی آوازیں کانوں کے پردے پھاڑنے لگیں اور ان کے ساتھ ہی ساتھ بابر کی لشکرگاہ پر تیر برسنے لگے حالانکہ ان سے کوئی خاص نقصان نہ ہوا۔ شیبانی کے گھڑسوار وہ خندق کو پار نہ کر سکے لیکن ان کا خاص مقصد بھی نہ تھا۔ تاہم انہوں نے بابر کے پڑاؤ میں سخت کھلبلی مچا دی۔ ان کے ہتک آمیز آوازے فضا میں گونجنے لگے۔

"منہ چھپائے کیوں بیٹھے ہو؟ کھلے میدان میں نہیں لڑنا چاہتے؟"

"بزدل کہیں کے"

* تاش: ۸ میل۔

"بابر لرزہ براندام ہے، اعلیٰ حضرت خان کے سامنے آنے کی جرأت نہیں!"

"جو ڈر رہا نہیں وہ ذرا پچی ناک تو باہر نکالے!"

شیبانی خان جانتا تھا کہ شب کی تیرگی میں اس نوعیت کے ہنگامے سے لوگ بدحواس ہو جاتے ہیں۔ جنگجوؤں، ہزاروں گھڑسوار بابر کے پڑاؤ کی مورچہ بندی کے باہر منڈلا رہے تھے گھوڑوں کی ٹاپوں اور بھیانک چیخوں سے زمین کانپ رہی تھی، جلتے ہوئے تیر آ آ کر شہتیروں اور شاخوں سے بنی ہوئی چہار دیواری میں دھنس رہے تھے اور اس ہنگامے میں چھوٹی چھوٹی چنگیں بھی زبردست آتش زدگی معلوم ہو سکتی تھیں۔ وہ بابر کے محافظ دستے کے گھوڑوں کے لیے رکھی ہوئی خشک گھاس کے انبار میں واقعی آگ بھڑک اٹھی، خندق سے قریب ہی نصب خیموں کے نمدے جلنے لگے۔

رات کو کیا جانے والا یہ طوفانی حملہ پسپا تو کر دیا گیا لیکن اس سے حوصلے دفاع کرنے والوں کے نہیں بلکہ حملہ آوروں ہی کے بڑھے۔ خاص بات یہ تھی کہ حملہ نجومی کے لیے اشارہ تھا کارروائی کرو، جلدی کرنے پر اصرار کرو۔

قاسم بیگ نے بابر سے بار بار کہا کہ شہر سبز سے کمک آ جانے کا انتظار کیا جانا چاہیے لیکن اب بابر کسی کی بات سننے کو تیار نہ تھا۔ اسے تو ستاروں کی ترتیب یقین دلا رہی تھی کہ فوری فتح صرف اسی کو حاصل ہوگی۔

"ذرا ان آٹھ ستاروں کو تو ملاحظہ فرمائیے، عالی جاہ" شہاب الدین نے دبی دبی سی پراسرار آواز میں بابر کو سمجھانا شروع کیا۔ "ایسا تو شاذ و نادر ہی ہوتا ہے، آٹھوں ستارے ایک ہی قطار میں ہیں! یہ تو پروردگار کے فضل و کرم کی علامت ہے! ستارے آپ کو فتح یاب کرنے کا وعدہ کر رہے ہیں، صرف آپ کو تاخیر مناسب نہ ہوگی۔ کہیں دو تین دن بھی گزر گئے تو ان آٹھوں میں سے کچھ ستارے آسمان میں دوسری طرف چلے جائیں گے جہاں شاہ عالی کا دشمن موجود ہے..."

اور بابر نے اسی رات اپنے سپہ سالاروں کو طلب کر کے فوراً لڑائی کی تیاری کا حکم دے دیا۔

نجومی شہاب الدین شیبانی کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ سمرقند کا یہ مشہور فال گو پہلے خان ہی کے دربار سے وابستہ تھا۔ بعد میں جب خان کو پتا چلا کہ بابر اس کے ہاں سے بھاگ کھڑے ہونے والے شاعر بینائی پر بہت زیادہ اعتماد کرنے لگا ہے تو اس نے شہاب الدین کو اپنے پڑاؤ سے "فرار" ہونے کا موقع دے دیا۔ اسے بری طرح زد و کوب کر کے لہولہان کر دیا گیا اور کپڑے پھاڑ دیے گئے کیونکہ سب ہی کو معلوم تھا کہ اعتماد اور ہمدردی بابر کے کردار کی خصوصیات ہیں۔ اور ہوا بھی یہی۔ شیبانی خان کے اس جاسوس کو بابر نے اپنے معتبر درباریوں میں شامل کر لیا۔ تاروں بھری راتوں کو وہ دونوں آسمان کا غور سے جائزہ لیتے پھر شہاب الدین کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگتی اور وہ بابر کی شاندار فتح کی پیش گوئی کرنے لگتا۔

خان نے درویش کے ذریعے اس نجومی کو حکم دیا تھا کہ وہ بابر کو اسی ہفتے کے دوران جنگ چھیڑنے پر ضرور راضی کر لے۔ اگلی ہی صبح کو سے جواب بھی مل گیا تھا "عظیم خان کا حکم سر آنکھوں پر لیکن شرط یہ ہے کہ جلد ہی کسی رات خان کے دستے بابر کے پڑاؤ پر حملہ کریں۔ یہ تصادم حقیقی نہیں لیکن ایسا بہرحال ہونا چاہیے کہ اس سے نوجوان سپہ سالار بابر کے غرور کو ٹھیس لگ جائے۔"

راتیں تیرہ و تار ہوتی تھیں، چاندنی سے یکسر خالی۔

ایسی ہی ایک رات کو بہت بڑی گھڑسوار فوج بابر کے پڑاؤ پر آندھی کی طرح ٹوٹ پڑی تھی۔

چیخ پکار سے معمور اس رات کو شیبانی خان نے آنکھوں میں کاٹ دیا۔ وہ صف بندی بھی کیے ہوئے تھے۔ اس نے پلک جھپکائی۔ اجالا ہوتے ہی وہ ایک بار پھر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ بلندی پر اس کا خیمہ تھا، وہاں سے سب کچھ نظر آنے لگا۔ اس بلندی سے بابر کا پڑاؤ اور پڑاؤ کو جانے والے راستے صاف دکھائی دیتے تھے۔ تب دور سے تو قریب انہی راستوں میں سے ایک راستے سے تین چار سو مسلح سپاہیوں کا ایک دستہ بابر کے پڑاؤ پر پہنچا تھا جسے تاشقند کے حکمران محمود خان نے اپنے بھانجے کی مدد کے لیے بھیجا تھا۔ شیبانی خان نے اسے دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ یہ بیرونی فوج نہیں ہے۔ شیبانی خان کو اس دستے سے کوئی ڈر نہیں محسوس ہوا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مغلوں کے مراسم اہل سمرقند سے خوشگوار نہیں ہیں جبکہ یہ کہ الگ الگ جگہوں سے بھرتی کیے گئے مغلوں میں بھی آپس میں پھوٹ پڑ جاتی ہے۔

اس شبینہ تصادم کے بعد شیبانی خان اپنی تمام صلاحیتوں اور تجربات سے کام لیتے ہوئے دن رات جنگ کی تیاریوں میں مصروف رہنے لگا۔ دن کے وقت وہ ہونے والی جنگ کے میدان کے ہر نشیب و فراز اور ہر ترتیب کا اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ آفتاب کس سمت ہوگا، ہوا کا رخ کیا ہوگا، غور سے جائزہ لیتا تھا۔

اور جب شیبانی خان نے دیکھا کہ بابر اپنے لشکر کو اکٹھا کر رہا ہے، ہلالی پرچم لہرا رہا ہے تو وہ خود جنگ کی ساری تیاریاں مکمل کر چکا تھا۔

خان جو اپنے پسندیدہ چتکبرے خصی گھوڑے پر سوار تھا، اپنی فوج کی صفوں کا معائنہ کرنے لگا۔

"میرے عقابو!" اس کی آواز تلوار کی جیسی جھنکار کے ساتھ گونج اٹھی "ہمارا اور آپ کا خدا کے سوا اور کوئی بھی حامی و ناصر نہیں ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد کی سرزمین یہاں سے بہت دور ہے اور اگر دشمن نے ہمیں شکست دے دی تو وہاں واپس نہ پہنچ سکیں گے۔ ہمیں دشمن کو شکست دینی ہوگی! میں نے پروردگار سے بہت آس لگا رکھی ہے۔ ہمارا لشکر اسی کا لشکر ہے۔ مجھے آج خواب میں بشارت دی گئی ہے کہ فتح ہماری ہی ہوگی۔''

"انشاء اللہ! اللہ قادر مطلق ہے'' سینکڑوں لشکریوں کی آوازیں بیک وقت گونج اٹھیں۔

فوج قدم سے قدم ملاتی ہوئی تیزی کے ساتھ دشمن کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ یک جسم کی طرح کارروائی کر رہی تھی، تانت سے تنی ہوئی، وسطی حصے میں گویا خم پیدا کر کے کمان کی یاد دلا رہی تھی۔

دریا دائیں جانب واقع تھا۔ شیبانی خان نے فوج کی پیش قدمی کو کچھ توقف رکھتے ہوئے میمنہ کو میسرہ کی بہ نسبت تیزی سے آگے بڑھایا۔ اس جگہ میدان ڈھلوان تھا اور ہوا سپاہیوں کی پیٹھ کی طرف سے چل رہی تھی۔ گھڑ سوار دستے تیزی سے، بہت تیزی سے آگے بڑھ سکتے تھے محاصرہ کر لینے کی چال "تلغمہ" کے لیے جسے شیبانی اپنانا چاہتا تھا، تیزی سے کارروائی کرنے کی ضرورت تھی۔ میمنہ دراصل انتہائی دلیر سواروں والے صبا رفتار گھوڑوں ہی پر مشتمل تھا۔

بابر نے دشمن کی 'کمان' کے دائیں نصف حصے کو جو اس کے لیے بایاں حصہ تھا، مڑتے ہوئے دیکھا تو آمنے سامنے کے تصادم سے بچنے کے لیے اپنے میسرہ کو ہٹا کر اس طرح آگے بڑھایا کہ اس کی پیٹھ دریا کی جانب ہو گئی۔

خان کے دستے نزدیک آتے جا رہے تھے۔ خود خان اپنے منتخب محافظین اور علم برداروں کے ساتھ پہاڑی پر کھڑا ہوا تھا۔ کوئی ڈیڑھ میل کی دوری پر واقع ایک ایسی ہی پہاڑی پر بابر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے عقب میں دریائے زرافشاں آفتاب سحری کی شعاعوں سے جگمگا رہا تھا۔

شیبانی خان کے پاس گھڑ سوار فوج زیادہ تھی جبکہ بابر کے لشکریوں کی کثرت اونچی ڈھالوں، لمبے نیزوں اور لمبے

اونچی سوئے کا اب ربط کیا جائے گا، جا، ہوا ہو جا! میں بابر کو اپنے قدموں میں دیکھنا چاہتا ہوں، زندہ ہو یا مردہ!"
شیبانی خان نے ایک بار پھر اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ اسے اپنی پلکوں پر نمی کا احساس ہوا۔ فتح کی مسرت سے آنسو نکل آئے تھے۔ اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو نیچے کیا اور ہتھیلیوں سے جلدی جلدی آنسو پونچھ لیے۔

۵

قیامت کی گرمی کا مہینہ سرطان* بیت گیا، ماہ اسد** شروع ہوا۔

فصیل شہر کے باہر باغات میں درختوں کی شاخیں پھلوں کے بوجھ سے زمین کی طرف جھکی جا رہی تھیں لیکن خود شہر کے اندر باغ اور انگور کے چمن کبھی کے صاف ہو چکے تھے۔ پتیوں کے درمیان جن پر ابھی تک زردی نہیں چھائی تھی، کہیں کوئی پکا ہوا سیب نظر آتا تھا نہ میٹھے رس بھرا آڑو اور نہ ہی انگور کا کوئی گچھا۔ اہل سمرقند کو بھوک کی اذیتیں جھیلتے ہوئے پانچ مہینے ہو چکے تھے۔ شہر کا محاصرہ روز بروز زیادہ سے زیادہ مضبوط، سخت اور بے رحم ہوتا جا رہا تھا۔ شہر کے تمام دروازے بند تھے اور شیبانی خان کا لشکر بہت قریب ہی پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ نہ کوئی شہر سے باہر نکل سکتا تھا اور نہ ہی اندر داخل ہو سکتا تھا۔

بابر کا خیمہ الغ بیگ مدرسے کی کشادہ اور ہموار چھت کے اوپر لگا ہوا تھا۔ وہاں سے شہر کی فصیل، اس کے دروازے اور قرب و جوار کے علاقے صاف نظر آ رہے تھے۔ اتفاقاً بابر کی نگاہیں بھوک سے بے حال شہریوں پر جم کر رہ گئیں اور اس نے سوچا اے قادر مطلق، کیسا زمانہ ہے کہ لوگ ٹہنیوں کے نیچے گھونسلے بنانے والی فاختاؤں تک کو پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ایسے چڑیوں بھی اب چوکس بننے لگی تھیں جس شہر کی گلیوں میں روٹی کے ٹکڑے یا جھوٹن نہ پڑی ہو وہاں پرندوں کے لیے پیٹ بھرنا کچھ آسان تھوڑی تھا۔ پرندے تو اڑ کر فصیل کو پار کر سکتے تھے لیکن انسان؟ کوئی شخص بلی تک کو پکڑنے میں کامیاب ہو جاتا تھا تو فوراً ہی جھگڑے کی نوبت آ جاتی تھی، لوگ ایسے خوش بختوں سے ان کے شکار کو چھین لینے کی کوشش کرنے لگتے تھے۔

مدرسے کے عقب میں بہت بڑا اصطبل واقع تھا جہاں کبھی سینکڑوں شاہی گھوڑے بندھے رہتے تھے۔ لیکن اب ان میں سے بس دس ہی باقی بچے تھے۔ بہت سے گھوڑے سرپل کے نزدیک ہونے والی لڑائی میں کام آ گئے تھے اور ان سے بھی زیادہ شدید غذائی قلت کی نذر ہو گئے تھے کیونکہ محل میں رہنے والوں کے لیے گھوڑے ہی ذبح کیے جاتے تھے۔ ان بس گھوڑوں کے لیے بھی دانہ کوئی مہینے بھر سے میسر نہ تھا۔ پہلے یہ گھاس کھایا کرتے تھے جو اب عنقا ہو چکی تھی۔ اب تو گھوڑوں اور اونٹوں کو درختوں کی پتیاں اور مدروئی گیلی چھال کھلائی جا رہی تھی۔

بابر نے مدرسے کی چھت پر سے دیکھا کہ اصطبل کے احاطے میں طاہر اور زرد مونچھوں والا مدا اس قسم کا "چارا" تیار کرنے میں مصروف ہیں۔ اس نے سوچا کہ طاہر بھی کتنا بہادر جوان ہے۔ اس نے سرپل کی لڑائی میں بہت ہی دلیر سپاہیوں سے بھی زیادہ شجاعت کا مظاہرہ کیا تھا اور ان گھڑ سواروں میں شامل تھا جنھوں نے لڑائی کے آخر میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر بابر کو دریائے زرفشان کو پار کرنے کا موقع فراہم کیا تھا۔ بابر نے طاہر کی شادی کا قصہ ابھی حال ہی میں سنا

* سرطان: جون کے آخری دنوں سے ۲۲ جولائی تک۔

** اسد: ۲۳ جولائی تا ۲۳ اگست۔

تھی۔ عادی بیوی رابعہ جو اتنی زیادہ پریشانیاں جھیلنے کے بعد تلاش کر سکا تھا، اس خیال سے بابر نے وہ مقتول شکار خانم کے ہاں تیسری حیثیت سے رکھوا یا گیا تھا کہ بچ رہی کہیں جگر کی قاتل نہ ہو جائے۔

محمد بھی بابر کا سپاہی بن گیا تھا۔ گزشتہ ہفتے وہ غلوں کے بھوں سے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے نابدان میں گھس کر شہر سے باہر نکل گیا تھا لیکن شیبانی خان کے سپاہیوں نے جو گھات میں رہتے تھے، اسے پکڑ لیا تھا۔ اس کے خود کو بھوکا کاریگر بتانے پر سپاہیوں نے رحم کھایا تھا لیکن "سبق" سکھانے کے طور پر اس کا ایک کان کاٹ دیا تھا۔ اب کوئی نہیں جانتا تھا کہ قسمت کب اس کا ساتھ دے گی۔ کب نہیں۔ کوکب کے سپاہیوں نے شہر سے باہر نکلنے کی جرأت کرنے والے دوسرے افراد کی تو ناک ہی کاٹ لی تھی۔

محمد اب ٹوپی اس طرح پہنتا تھا کہ اس سے کان ڈھک جاتے تھے۔ کبھی کبھی وہ خود کو تسلی دینے کے لیے کہا کرتا تھا "کانوں کو کم از کم چھپانا تو ممکن ہے جبکہ ناک نہ ہوتی تو میں کیسے چھپاتا؟"

او خدا، بابر نے سوچا، خود میں نے اپنے سات مہینوں کے محاصرے کے دوران محمد جیسے سیدھے سادے سمرقندیوں پر کیسے کیسے مصائب ڈھائے تھے! پھر اس بڑھیا کو جو کتابوں کے بازار میں ملی تھی، بھوں میں سیا تھا۔ اس کے بیٹے کا پیٹ کھلی کھانے کے باعث پھول گیا تھا، بچہ مر گیا تھا اور خود بڑھیا اس صدمے سے پاگل ہو گئی تھی۔ اس وقت بابر کے کانوں میں اس بڑھیا کے الفاظ بد دعا لینے والی قسمت کی سنائی ہوئی سزا کی طرح گونجنے لگے "خدا تم کو بھی ایسے ہی دن دکھائے!"

بھوک کے منحوس سائے ڈھیر سے ڈھیر غریبوں کے جھونپڑوں سے سپاہیوں اور بیگوں کی رہائش گاہوں تک پہنچے تھے اور اب شاہی محل پر بھی منڈلانے لگے تھے۔ بابر نے گزشتہ دس دنوں سے روٹی دیکھی تک نہیں تھی۔ آٹا ختم ہو چکا تھا۔ صبح کو اس کے آگے طلائی رکابیوں میں کشمش اور شربت رکھ دیے جاتے تھے اور شام کو اونٹ کے شوربے دار سخت اور خشک گوشت کا ایک پیالہ۔ روٹی ہی نہ ہو تو شاندار طلائی برتن کس کام کے؟ شعور کی گہرائیوں سے سونے کی کھوکھلی ضرورت کے بارے میں تلخ مصرعے ابھرنے لگے لیکن بابر کو فکر سخن کی فرصت کہاں تھی۔

چھ مہینوں کی فخر النساء درد سے روتے روتے بے ہوش ہو جایا کرتی تھی۔ عائشہ بیگم جو سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی، دودھ پلانا بند ہو گیا تھا۔ بچی کے لیے ایک دودھ پلائی کا انتظام کیا گیا جس نے آفت ہی ڈھا دی۔ وہ عورت ہیضے سے متاثر خاندان کی تھی اور فخر النساء دو ہی دنوں میں چل بسی۔

بابر بچی کی کفنائی ہوئی میت کو خود اپنے ہاتھوں پر اٹھائے ہوئے قبر تک لے گیا۔ وہ اشکبار تھا اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا "کاش بیٹی میری جان بھی لے لے تاکہ تمام مصائب سے فوراً ہی نجات پا جاؤں" اس اذیت دہ آرزو کے ساتھ اس نے بچی کے سرد ہونٹوں کو چوم لیا اس کے فخر اور فتح کی علامت فخر النساء کو سپرد خاک کیا جانے لگا تو بابر کو بڑی شدت کے ساتھ ایسا محسوس ہوا، گویا کہ اس کی زندگی کے ایک جزو کو، اس کی اولین فتوحات کے فخر کو دفن کیا جا رہا ہو۔

غم و آلام جیسے جیسے زیر محاصرہ شہر کا گلا دبوچتے جا رہے تھے ویسے ویسے دشمن کی مسرتوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سمرقند پانچ مہینوں سے منتظر تھا کہ ہرات سے بابر کے چچا، طاقتور حکمراں حسین بیقرا اور تاشقند سے اس کے ماموں محمود خان کمک بھیج دیں گے۔ بابر نے ان دونوں کو منت سماجت بھرے خطوط ارسال کیے تھے لیکن کوئی نتیجہ نہیں برآمد ہوا تھا۔ اب اسے خود اپنے اوپر بھروسا کرنا تھا۔ کمک نہ ملی تھی، ورنہ ہی آنے کی کوئی امید تھی۔ اس حقیقت سے شیبانی خان بھی

بخوبی واقف ہو چکا تھا۔ وہ راتوں کو نقاروں اور قرناؤں کے شور سے اہل سمرقند کو بیدار کرتا تھا۔ اس کے آدمی دروازوں کے قریب بلند ٹیلوں پر چڑھ کر شہریوں سے کہتے تھے کہ وہ آ کر خان سے مل جائیں۔ انھیں پیٹ بھر کھانا کھلائے گا، بیگوں اور سپاہیوں کو اچھی اچھی نوکریوں کا لالچ دیتے تھے۔ اور بہت سے بیگ بابر کا ساتھ چھوڑنے بھی لگے تھے۔ وہ چوری چھپے فصیل سے پھاند کر یا تہ خانوں میں گھس کے شہر سے باہر نکل جاتے تھے۔

ایک دن تو بابر کے محافظ دستے کا سردار بھی چوری چھپے بھاگ کھڑا ہوا۔ اب وہ کس پر اعتبار کر سکتا تھا؟ بابر نے ایک بار رات کو طاہر کو اپنے پاس بلایا۔

"طاہر بیگ، گور امیر مقبرے پر عربی میں یہ عبارت درج ہے: "اس سے پہلے کہ دنیا تجھ سے منہ موڑے، تو خود دنیا کو چھوڑ کر چلا جا" تیار کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ کاش بیچے نے میری جان لے لی ہوتی اور سب کو مصائب سے نجات مل جاتی۔ لیکن بیچے نے مجھے چھوا تک نہیں۔"

"خدا آپ کو زندہ و سلامت رکھے، عالی جاہ! ہماری واحد امید، واحد سہارا آپ ہی تو ہیں۔" طاہر ایسا لاغر ہو گیا تھا کہ لگتا تھا شانوں کی ہڈیاں جوڑے کو چیر کر باہر نکل آئیں گی۔ چہرے پر زخم کا داغ سوج گیا تھا، آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں لیکن ان کی چمک اب بھی باقی تھی۔

"سہارا اب سہارا کہاں رہ گیا، طاہر بیگ۔ کل میں نے ایک بیت کہی تھی

نہ کر ملامت جو فکر دنیا میں بار الجھ رہا ہے، اے دل
یہ سوچ دنیا میں اور تکلیف کے سوا کیا بچا ہے، اے دل

طاہر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا

"محترم حکمران، یہ بالکل سچ ہے، آج ہماری زندگی میں مصائب و تکالیف کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ لیکن مہینے میں پندرہ تاریک راتیں ہوتی ہیں تو پندرہ چاندنی راتیں۔ ابھی ہمارے ہاتھ طاقتور ہیں اور کمر سے تلوار لٹک رہی ہے"

"تو پھر کیا کرنا چاہیے؟"

دونوں نے ایک دوسرے سے آنکھیں چار کیں۔ بادشاہ نے سپاہی سے اور سپاہی نے بادشاہ سے۔ پھر بابر نے دونوں کی طرف سے کہا:

"ہمیں آخری حربے کو آزمانا چاہیے۔ ساری طاقت کو یکجا کر کے کسی مناسب موقعے پر محاصرے کو توڑ کر نکل بھاگنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر ہماری زندگی کی آخری گھڑی نہیں آئی ہے تو کامیابی ہمارے قدم چومے گی اور اگر آخری گھڑی آن پہنچی ہے تو ہاتھوں میں تلوار تھامے ہوئے جان دے دیں گے!....."

"ہمارے اس خفیہ منصوبے کا ابھی تک صرف قاسم بیگ ہی کو علم ہے۔ تم بھی اسے راز ہی رکھنا۔ تیاری کرو دوستو، تیاری!"

طاہر نے اسی رات قاسم بیگ سے ملاقات کی۔ دونوں نے فصیل کے اوپر سے کافی دیر تک شیبانی خان کے پڑاؤ کی روشنیوں کا غور سے جائزہ لیا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ دشمن کی زیادہ تر فوج فیروزہ اور چار راہ دروازوں کے سامنے والے علاقے میں موجود ہے اور شیخ زادہ دروازے کے سامنے روشنیاں منتشر اور کم ہیں۔ سپاہیوں اور تیز رفتار گھوڑوں کو کھڑا کر کے تیاری کی جانی چاہیے تھی

۲

لیکن بابر کی قسمت میں تلوار ہاتھ میں لیے ہوئے اپنے کشتوں کے پشتے پر گر کر جان دینا نہیں لکھا تھا۔ محاصرے کو توڑ کر نکل جانے کی تیاریاں زوروں پر تھیں تو ایک روز اس کی ماں اور نانی کسی اطلاع کے بغیر اچانک اس کی خلوت گاہ میں آگئیں۔ ان دونوں کے پیچھے پیچھے قاسم بیگ بھی گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا۔

"میرے بیٹے، میرے حکمران" ایسان دولت بیگم کی کمر گزشتہ مہینوں میں بری طرح جھک گئی تھی اور بابر کو لگا جیسے اس کی صدا دور کہیں نیچے سے آرہی ہو، "شیبانی خان نے صلح کی پیش کش کی ہے"

بابر کو لفظ "صلح" نجات دہندہ سا لگا لیکن فوراً ہی سے خیال آیا بھلا شیبانی خان بھی نجات دہندہ اور امن حامی ہو سکتا ہے؟ اس نے یقین نہ کرنے کے انداز میں پہلے نانی اور پھر ماں کی طرف دیکھا۔ قتلوغ نگار خانم لگتا تھا کہ دیر تک آنسو بہاتی رہی تھی، چہرہ تصویر غم بنا ہوا تھا۔ لیکن ایسان دولت بیگم اپنے ہاتھوں میں گول لپٹا ہوا کاغذ لیے ہوئے تھی۔ جس پر بندھی ہوئی ڈوری کا سنہرا پھندنا لٹک رہا تھا۔

"یہ ہاخان کا خط" نانی نے اپنے ہاتھ کے کاغذ کو کچھ عجیب سی نگاہوں سے دیکھا۔

خان کا خط آخر ایسان دولت بیگم کے پاس کیسے پہنچا؟

بابر نے پوچھا

"اسے لایا کون؟"

"ایک قابل احترام درویش۔ ایک نقش بندی بزرگ جو خواجہ یحیٰی مرحوم کے مریدوں میں سے ہیں۔"

بابر نے ماں کی طرف دیکھا

"آپ کو دیا تھا؟"

"نہیں" قتلوغ نگار خانم نے اداسی سے نفی میں سر ہلایا۔

ایسان دولت بیگم نے خط بابر کی طرف بڑھایا اور ہچکچاتے ہوئے اعتراف کیا

"یہ خط تو خان زادہ بیگم کے نام ہے"

"عجیب بات ہے!" بابر نے گول لپٹے ہوئے کاغذ کا احتیاط کے ساتھ لے لیا اور اسے کھولے بغیر ہی غور سے بڑی دیر سے دیکھنے لگا۔

"میں جو کچھ کہنا چاہتی ہوں اسے کہنے میں سخت دشواری محسوس ہو رہی ہے" ایسان دولت بیگم پل بھر کے لیے خاموش ہو گئی۔ "لیکن کہنا ضروری ہے   شیبانی خان نے ہماری خان زادہ بیگم کی خوبصورتی کی بڑی تعریفیں کی ہیں۔ بتا چکا کہ خان تو ان کی یاد میں تڑپتا رہتا ہے۔ اس کے متعلق اپنے خط میں اس نے کچھ شعر بھی لکھ بھیجے ہیں"

شیبانی خان کی عمر پچاس سے تجاوز کر چکی تھی، اس کے بیٹوں کی شادیاں جانے کب کی ہو چکی تھیں اور اب تو وہ پوتوں پوتیوں والا بھی تھا۔ بابر نے خط کو کھولا تو اس کی نگاہ اس شعر پر پڑی

کیا ہے تو نے جادو، یاد میں جاں نکلی جاتی ہے
مچا ہے دل میں طوفاں، آتش تنت جاتی ہے

اور اس نے خط کو قالین پر پھینک دیا۔

"کیا آپ بھول گئیں کہ خان نے گزشتہ سال ایک ہی واہیات ایلچی سے مرزا سلطان علی کی دعوت وزیر کو کس طرح بہکایا تھا؟ شیبانی کے پیغام پر آخر کیسے یقین کیا جا سکتا ہے؟"

قتلوغ نگار بیگم نے گہری ٹھنڈی سانس لی لیکن ایسان دولت بیگم نے وضح سکون و اطمینان کے ساتھ کہا:

"کوئی اور وقت ہوتا تو ہم بھی دشمن کے ایسے خط پر تھوک دیتے، اسے پڑھتے تک نہیں لیکن اس وقت تو سب کے سروں پر موت منڈلا رہی ہے۔ مجھ بڑھیا کا کیا، میں تو اپنی زندگی کاٹ چکی ہوں، اپنے حصے کا دانہ پانی کھا پی چکی ہوں۔ اب میں اس فانی دنیا سے پانچ دن پہلے اٹھ جاتی ہوں یا بعد۔ اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے۔ لیکن آپ نوجوان فرد آپ میرے حکمران، میری دختر کے لخت جگر، میری آنکھوں کے نور۔"

بابر نے کبھی پرسکون اور کبھی غصے سے بھرے سخت لہجے میں مخالفت کی لیکن ایسان دولت بیگم اپنی بات پر اڑی رہی کہتی رہی کہ نوجوان افراد کے یہاں خود کو موت کے منہ میں جھونک دینے کا کوئی تک نہیں نیز یہ کہ خانزادہ بیگم جو سب سے زیادہ فہیم و نیک ہے، سب کچھ سمجھ گئی ہے، راضی ہو گئی ہے۔

"مجھے یقین نہیں ہے! میری ہمشیرہ عزیزہ جو حسن و دریائی کا پیکر ہیں، کسی گندے اور ماجد صحرائی کے حرم میں پہنچ جائیں! نہیں، ہرگز نہیں! یہ بڑی شرمناک بات ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔" بابر چیخ اٹھا۔

اچانک قاسم بیگ نے کہا:

"عالی جاہ، ہم محاصرہ توڑنے جا رہے ہیں، اس میں کامیاب ہوں گے یا کام آ جائیں گے۔ لیکن سمرقند پر تو شیبانی خان کا قبضہ ہو ہی جائے گا۔ تب تو جو کچھ وہ چاہتا ہے زبردستی کر لے گا۔"

قتلوغ نگار خانم جو ابھی تک خود کو بڑی وقت قابو میں رکھے ہوئے تھی بابر کی سوئیدہ نگاہ کے جواب میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"آپ لوگ آخر جائیں گے کہاں؟ سیدھے موت کے منہ میں؟ پروردگارا، بہتر ہو کہ مجھے اس صدمے کو دیکھنے سے پہلے ہی اٹھا لے! خانزادہ بیگم میری پہلی، میری عزیز دو بیٹی میرے دل کی ٹکڑا ہیں، مجھے بڑھاپے کے احساس تنہائی میں تسلی دیتی رہتی ہیں۔ ان کے بغیر میں کیسے جی سکوں گی، خدایا؟ اپنی عزیز دختر کو دشمن کے پنجے میں کیسے دے سکوں گی؟"

اس کے بعد دیر تک ایسان دولت بیگم دلیلیں پیش کرتی رہی، قتلوغ نگار خانم روتی رہی اور وفادار قاسم بیگ طرح طرح کے اندیشوں سے پریشان ہوتا رہا۔

"بس بہت ہو چکا!" آخرکار بابر نے کہا۔ "میں خود خانزادہ بیگم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ بے صبری اور بے قراری کے ساتھ بہن کا انتظار کرنے لگا اور آخرکار جب وہ آئی تو بابر نے اس کے چہرے کے تاثرات سے فوراً ہی بھانپ لیا کہ وہ کوئی سنگین فیصلہ کر چکی ہے۔

اس نے خانزادہ بیگم کو اپنے سامنے بٹھایا اور بڑے غور سے اس کے چہرے کو تکنے لگا۔ رخسار پچک گئے تھے، ہونٹوں پر پژمردگی چھا چکی تھی لیکن پہلے ہی جیسی خوبصورت بڑی بڑی آنکھیں چمک رہی تھیں، یہ آنکھیں عزم و استقلال کی آئینہ دار تھیں۔

"آپا جان، شیبانی خان نے شادی کی جو تجویز پیش کی ہے اسے آپ نے منظور کر لیا کیا؟ نانی جان نے مجھے جو کچھ

بتایا ہے وہ سچ ہے کیا؟
"منظور نہ کرتی تو اور کیا کرتی؟"

"میں جانتا ہوں، جانتا ہوں میری شکست نے آپ سب کو بری طرح مایوس کر دیا ہے۔ لیکن آپ کا بھائی ابھی زندہ ہے۔ میں ہتھیار ڈالنے کا قائل ہو جانے کا قطعاً ارادہ نہیں رکھتا اور آدمی کی موت بس ایک ہی بار آتی ہے۔ اس سے بچنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا... اگر ہم محاصرے کو توڑنے میں کامیاب ہو گئے اور زندہ رہے تو آپ کو یہاں سے جانے کے لیے واپس آئیں گے۔ لیکن اگر میری زندگی میں محض چند ہی دن باقی رہ گئے ہیں تو تلوار ہاتھ میں تھامے ہوئے جان دے دوں گا۔ تب آپ اس تجویز کو قبول کر سکتی ہیں۔ تب کوئی نہ کہے گا 'دوری بابر کی شجاعت، جان بچانے کی فکر میں اپنی بہن کو قربان کر دیا۔' اس قسم کی بدنامی سے میرے نزدیک موت بہتر ہے! آپ اس تجویز کو قبول نہ کیجیے، آپا جان!"

خان زادہ بیگم کی آنکھیں دھندلی پڑ گئیں، ان میں آنسو بھر آئے۔ وہ جانتی تھی کہ بابر اپنی ساری دلیری کے باوجود محاصرے کو توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے گا کیونکہ اس کی فوجی طاقت اس کام کے لیے بہت ہی ناکافی تھی۔ خود بابر بھی اس حقیقت سے واقف تھا اور اس کا عزم صرف مر مٹنے ہی کا عزم تھا۔ اسی بنا پر تو وہ خان زادہ بیگم سے، جو ممکن کر محاصرہ توڑنے کی کوشش کرنے والے دستے میں شامل ہونے کو نہیں کہہ رہا تھا۔ وہ اپنے شجاع اور نیک دل بھائی کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھی، اور اسی لیے اس نے خود کو دشمن کے حوالے کر کے اپنے بھائی کو موت سے بچانے کا فیصلہ کیا تھا۔

لیکن جو کچھ اس کے ذہن میں تھا اس کا صاف گوئی سے ساتھ بھائی سے اظہار کرنا ممکن بھی تھا؟ خان زادہ بیگم نے سوچا اگر بابر کو معلوم ہو جائے گا کہ ان سے لڑتے ہوئے جان دے دینے اور اس طرح اپنی تمام ذمے داریوں کے بار سے نجات حاصل کر لینے کے فیصلے کو، جس کا اعتراف ان کا نیک دل کبھی بھی نہیں کر سکتا، میں نے بھانپ لیا ہے تو وہ مجھے اپنی قربانی پیش کرنے سے باز رکھنے میں کوئی بھی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ اس صورت میں تو سب کا اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا یقینی ہو جائے گا اور اگر خدا نخواستہ وہ ہلاک ہو گئے تو پھر میرے لیے تختہ دار ہر کے سوا اور رہ ہی کیا جائے گا۔

"بابر جان، آپ میری خاطر ناوقت موت کی دعوت نہ دیجیے۔ یہی کافی ہے کہ میری وجہ سے آپ کو حد تحمل کی گھٹیا سازشوں کو جھیلنا پڑا۔" خان زادہ بیگم نے ہتھیلی سے آنسو پونچھے اور جلدی جلدی جوش و خروش کے ساتھ کہنے لگی "مجھے آپ کے شاندار مستقبل پر پورا اعتماد ہے، برادر عزیز۔ کوئی دوسرا تو نہیں جانتا لیکن میں بخوبی جانتی ہوں کہ آپ جیسے باصلاحیت افراد شاذ و نادر ہی دنیا میں پیدا ہوتے ہیں۔ یاد رکھیے، عظیم کارناموں کی خاطر، عظیم شاعری کی خاطر اپنے مقدر کا بدقسمت بہن کے مقدر سے موازنہ نہ کیجیے!"

"آپ یہ کیوں کہہ رہی ہیں، ہمشیرہ محترمہ؟ ہم سب مہمان ہیں... سب بابر پل بھر کے لیے خاموش ہو گیا۔" اس بے وفا اس بدلتی ہوئی دنیا میں صرف چند دنوں کے مہمان ہیں! اور آپ کو اور مجھے ایک ہی ماں نے پیدا کیا ہے!"

"لیکن میں لڑکی بن کر پیدا ہوئی تھی! اور پھر میں پچیس برس کی ہو چکنے کے باوجود آج بھی کنواری ہی ہوں۔ جس سے محبت کرتی ہوں اس کے ساتھ زندگی بسر کرنا میری قسمت میں نہیں۔ میری ساری امیدیں خاک میں مل چکی تھیں۔ میرے لیے کوئی بھی بات باعث مسرت نہیں۔ آخر میں ان بیاہی بڑھیا کی طرح آپ کے ساتھ کب تک رہ سکتی ہوں، حکمران؟ بہت ہو چکا، مجھے بھی تو عورت کی زندگی گزارنا چاہیے۔'

"واقعی کیا آپ واقعی سمجھتی ہیں کہ آپ کے لیے اس پوتے پوتیوں والے بوڑھے کی بیوی بن کر رہنا ممکن ہو سکے گا؟"

"ارے بابر جان، میں تلاش کرتے کرتے مایوس ہو چکی ہوں۔ بوڑھا ہو یا جوان، اب میرے لیے اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے۔"

"اور آپ نے اوش میں مجھ سے جو کچھ کہا تھا وہ بھی یاد ہے؟" "اپنے دل پر یقین کیجئے" "کیا سچ آپ کو اپنے دل کو بھی فریب دیا جا سکتا ہے؟" "کیا دل ان تمام مصائب کو فراموش کر سکتا ہے جو اس بے رحم اور چالباز شیبانی خاں کے ہاتھوں ہمیں جھیلنے پڑے ہیں؟ کیا اس کمینگی اور مکاری کو فراموش کیا جا سکتا ہے جو خان نے زہرہ بیگم کے ساتھ کی تھی؟"

خان زادہ بیگم زور زور سے سسکیاں بھرنے لگی۔ بابر نے اپنی بات جاری رکھی

"ہم ایک ہی ماں کے بطن سے پیدا ہوئے تھے اور ہمارے مقدر بھی ایک ہی جیسے ہونے چاہئیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم نے رات کو محاصرہ توڑ کر نکل بھاگنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ آپ ہمارے ساتھ چلنے کی تیاری کیجئے۔ شاید ہم کامیاب ہی ہو جائیں۔"

آہ، کتنی شدید خواہش پیدا ہوئی خان زادہ بیگم کے دل میں کہ وہ ایک بار پھر مردانے کپڑے زیب تن کرے، خود اور ہلکی زرہ پہنے اور اپنے بھائی کے ساتھ نکل کھڑی ہو۔ اس نے سوچا کہ بوڑھے عیاش کے حرم میں تڑپتے رہنے کی بہ نسبت لڑتے ہوئے جان دے دینا کیا واقعی بہتر نہ ہوگا؟ اس نے اس شدید خواہش سے اچانک مغلوب ہو کر پوچھا

"کب کب چلنا ہے؟"

"آج رات کو" بابر نے پرسکون لیکن پرعزم لہجے میں جواب دیا۔

دفعتاً خان زادہ بیگم کا دل اس اندیشے سے کہ آج رات ہی اس کا بھائی ہلاک کر دیا جائے گا، آج رات ہی اس کی شاعری، اس کی گفتگو اور ان سب سے اس کی محبت کا سلسلہ ختم ہو جائے گا، لرز اٹھا اور وہ چیخ پڑی

"آج نہیں، نہیں، نہیں!"

بابر اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہمشیرہ محترمہ، اگر آپ اپنے بھائی کے کہنے پر عمل کرنے کو تیار نہیں تو پھر اپنے بادشاہ کے حکم کی تعمیل کیجئے! آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا! ابھی کافی وقت ہے، اپنے کمرے میں جا کر تیاری کیجئے"

خان زادہ بیگم گدے سے اٹھی، خاموشی کے ساتھ بابر کے پاس گئی اور اس کے سینے سے اپنا چہرہ سٹا دیا۔ اور اس طرح وہ بھائی سے رخصت ہوئی۔

نصف شب کو بابر، قتلوغ نگار خانم، قاسم بیگ، عائشہ بیگم طاہرہ، اس کی بیوی رابعہ شیخ، دروازے کے پاس پہنچے۔ قتلوغ نگار خانم، عائشہ بیگم اور بعض دوسری خواتین ایک گاڑی پر جس میں سب سے تیز رفتار گھوڑے جتے ہوئے تھے، سوار ہو گئیں اور اسے دستے کے وسطی حصے میں کر دیا گیا۔ خان زادہ بیگم نہ گاڑی کے اندر تھی اور نہ ہی گھڑ سوار سپاہیوں کے درمیان۔

خان زادہ بیگم کو دریافت کیا گیا تو پتا چلا کہ وہ تو ان لوگوں کے اس جگہ اکٹھا ہونے سے کوئی گھنٹہ بھر قبل ہی بی بی نانی ایسان دولت بیگم کے ساتھ چار راہا دروازے کی طرف جا چکی ہے جو فصیل کے مخالف سمت والے حصے میں واقع تھا۔ اب

کہیں جا کر قتلغ نگار خانم نے مسلسل روتے ہوئے دراوچی دولت بابر کو بتایا کہ اس نے خان زادہ بیگم کو کتنا سمجھایا تھا کہ وہ ایسا نہ کرے جبکہ ایسان دولت بیگم اس کے برعکس تواتر سے اصرار کر رہی تھی کہ وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنائے۔

بابر سپاہیوں کی طرف مڑا اور اس کی نگاہوں نے طاہر کو تلاش کر لیا۔

"فوراً چاروں دروازوں پر جاؤ اور خان زادہ بیگم کو تلاش کر کے میرا حکم سنا دو وہ فوراً یہاں آ جائیں اور یہ بتا دینا کہ جب تک وہ نہ آ گئیں تب تک ہم کہیں نہ جائیں گے۔"

"میرے فرماں روا...." قاسم بیگ نے کہنا شروع کیا لیکن بابر نے اس کی بات سنے بغیر چیخ کر حکم دیا۔

"طاہر فوراً گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے جاؤ!"

طاہر کا گھوڑا ہوا سے باتیں کرتا ہوا شہر کو پار کرنے لگا اور اس کے سموں کی ضربوں سے سڑکوں پر جڑے ہوئے پتھروں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ وہ چاروں دروازوں پر پہنچا تو اس نے ایک سجی سجائی شاندار گاڑی کو جس پر خان زادہ بیگم سوار تھی، مشعل بردار گھڑسواروں کے حلقے میں خندق پر گرائے جانے والے پل کو پار کرتے دیکھا۔

کئی مہینوں کے اس محاصرے سے خود شیبانی خان کا لشکر بھی اوب چکا تھا۔ وہاں بھی سبھی کو بے چینی کے ساتھ امن بحال ہونے کا انتظار تھا اور زیادہ تر لشکریوں کو معلوم تھا کہ بابر اگر خان زادہ بیگم کی بیگم بننے پر راضی ہو جائے گی تو فوراً ہی جنگ بندی کا معاہدہ ہو جائے گا۔ شیبانی بھی جانتا تھا کہ اس بار وہ اس طرح نہ پیش آئے گا جس طرح زہرہ بیگم کے ساتھ پیش آیا تھا کیونکہ اس بار گھوڑا گاڑی میں بالکل ہی مختلف قسم کی عورت اس کے پاس آ رہی ہے۔ خون کی ندیاں بہانے سے یہ کہیں بہتر تھا کہ دارالشہر کے ساتھ ہی ساتھ ایک عصمت و عفت والی عورت بھی ہاتھ آ جائے اور امن بھی جس کا عرصے سے انتظار تھا۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ خان زادہ بیگم صحیح معنوں میں پری پیکر ہے۔

شیبانی نے حکم دیا اور حسینہ کے اعزاز میں جو امن کا پیغام لے کر آ رہی تھی، سارا ماحول نقاروں اور قرناؤں کی آوازوں سے گونجنے لگا۔ شیبانی کے بے شمار لشکریوں نے خان زادہ بیگم کا بہت ہی شاندار ڈھنگ سے استقبال کیا۔

طاہر نے اس نظارے کو پہلے شہر کے کھلے ہوئے دروازے سے دیکھا اور پھر فصیل کے اوپر سے۔ اس کے بعد وہ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا اور پورے شہر کو پار کر کے شیخ زادہ دروازے پر واپس لوٹا۔

شیبانی کے پڑاؤ پر منائی جانے والی خوشیوں کا شور یہاں بھی سنائی دے رہا تھا۔ اس واقعے سے بابر کو صرف مایوسی ہی نہ ہوئی بلکہ اس کے دل کو گہری ٹھیس بھی لگی۔ ایک لمحے کے لیے تو اسے یہ بھی یقین ہو گیا کہ خان زادہ بیگم بڑھاپے تک کنواری بیٹھی رہنے کے اندیشے سے اور بھائی کی مسلسل ناکامیوں سے عاجز آ کر خود اپنی مرضی سے شیبانی خان کے پاس چلی گئی ہے۔ آرام دہ اور شاید پرمسرت زندگی گزارنے کی خاطر۔

"دنیا میں وفاداری وجود ہی نہیں رکھتی" بابر نے بڑی تلخی کے ساتھ چپکے سے اپنے آپ سے کہا اور گھوڑے کو موڑ کر حکم دیا "دروازہ کھولو!"

دروازہ بہت احتیاط کے ساتھ کھولا گیا اور اس کے سامنے کی خندق پر شب کی تاریکی میں اٹھاؤ پل کو دھیرے سے گرا دیا گیا۔ گھڑسواروں، پیدل سپاہیوں اور ان کے درمیان چلتی ہوئی گھوڑا گاڑی نے خندق کو پار کر لیا۔ چاروں طرف خطرہ منڈلا رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے موت ہر درخت کی آڑ میں گھات لگائے بیٹھی ہو۔ لیکن قاسم بیگ تو پہلے ہی خان کے گشتی دستوں

کا بہت غور کے ساتھ جائزہ لے چکا تھا۔ وہ اس رستے سے ناہموار رستے سے گڑھوں اور نالوں کو پار کرتا ہوا، گاڑی کو تقریباً ہاتھوں پر اٹھواتا ہوا آگے بڑھنے لگا، پر خطر علاقے سے باہر نکلنے لگا۔

جانے کوئی معجزہ رونما ہوا جیسا کہ حال لوگ بعد میں کہنے لگے تھے یا پھر علمائے سمرقند نے شیبانی خان سے اپنی مخفی بات چیت میں ایسن دولت بیگم کی طرف سے یہ شرط رکھی تھی کہ خان زادہ بیگم سے اپنے عشق کی خاطر دستوں کو خفیہ حکم دے رکھا تھا کہ بابر کو چلے جانے دیں، کوئی رکاوٹ پیدا نہ کریں۔ کچھ بھی ہوا ہو، بابر کا ہر دستہ صحیح سلامت محاصرے سے باہر نکل گیا۔

خان زادہ بیگم نے درد وغم سے بھری ہوئی زندگی کو چنا لیا تھا تاکہ بھائی اور والدہ کو ذلت آمیز اسیری سے بچا سکے۔

یہ بات بابر کو نہیں معلوم تھی لیکن قتلوغ نگار خانم جانتی تھی اور شیبانی خان کی لشکر گاہ میں فتح و شادمانی کے جشن کا اعلان کرتی ہوئی قرناؤں کی آوازیں جیسے جیسے بلند ہوتی گئیں، نقاروں کا شور جیسے جیسے بڑھتا گیا ویسے ویسے قتلوغ نگار خانم کی آنکھوں سے بہتے ہوئے غم کے آنسوؤں میں تیزی آتی گئی۔

تاشقند، اتیپا اور اسفرہ

1

تاشقند۔ یہ وہ شہر تھا جسے پندرہ برسوں سے جنگ و جدل کی آفتوں سے کوئی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ شہر کے بارہ دروازے کھلے رہتے تھے، جس کا جب جی چاہتا آرام سے یہاں آ سکتا تھا، باہر جا سکتا تھا۔

خزاں کا خوبصورت اور پرسکون خزاں کا موسم تھا۔ بوز سو اور سالار نالوں کے کنارے لگے ہوئے باغات ابھی گرم گرم سی بارشوں سے نہائے ہوئے تھے۔ خوبانی اور آلوچے کے درختوں کی پتیاں شاخوں کو خیرباد کہنے کے قبل ارغوانی ہو چکی تھیں۔ دوریوں پر واقع چتقال پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں کا نظارہ آنکھوں کو فرحت بخش رہا تھا۔

تاشقند کی پھلوں کی فراواں خزاں، یہاں کی دھرتی کی پیاسی وادیوں کے خوبصورت مناظر اور کوہساروں سے آتی ہوئی ہواؤں کی نرمی نے بابر کو اس کے آغاز شباب کے ایام کی یاد دلا دی۔ وہ یہاں پہلی بار سولہ سال کی عمر میں آیا تھا، جدر محلے نشیب میں پیر عکاشہ چشمے سے پانی پیا تھا اور اونچی محلے کے نامی استادوں سے کمان، تیر اور تانت بنوائے تھے۔ انھی دنوں وہ اپنے نانا یونس خان کے مزار پر بھی گیا تھا جو شیخان طہور میں دفن کیے گئے تھے۔

بابر کو لگا جیسے وہ پرسکون ایام کہیں بہت پیچھے چھوٹ گئے ہوں۔ اس کے کپڑے غبار آلود تھے۔ جسم تھکن سے چور تھا، دل میں درد تھا جو اب مستقل کانٹے کی طرح چبھتا رہتا تھا۔ ہم رکاب تھے صرف چالیس بیگ اور سپاہی (باقیوں کو اس نے اوراتیپا میں یہ کہہ کر چھوڑ دیا تھا کہ وہیں اس کا انتظار کریں) اس حالت میں وہ بیش آغاچ دروازے سے شہر میں داخل ہوا اور قاراتاش محلے سے گزرتے ہوئے اپنے ماموں محمود خان کے محل کی راہ لی۔ ماموں بھانجے ایک دوسرے سے کوئی خاص محبت نہیں کرتے تھے پھر بھی گزشتہ بار جب بابر تاشقند آیا تھا تو خان نے داروغہ کو حکم دیا تھا کہ وہ شہر کے دروازے پر بابر کا خیر مقدم کرے۔

آج قاسم بیگ نے جھلاہٹ اور تشویش کے ساتھ اسے بتایا کہ داروغہ نہیں آیا۔

بابر بڑی تلخی کے ساتھ مسکرایا

محترم قاسم بیگ، اس بار تو ہم پناہ ڈھونڈ کر بھیک مانگنے والے فقیر کی طرح آئے ہیں اکسی خاص عزت و احترام اور مہمان نوازی کی توقع نہ رکھیے"

اور واقعی محل میں بھی محمود خان نے بابر کا استقبال بڑی سرد مہری کے ساتھ کیا۔ اس کے سپاہیوں کو محل میں نہ داخل ہونے دیا گیا۔ قاسم بیگ کچھ اور بھی زیادہ اداس ہو گیا۔ بابر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا

"سمرقند میں ہم لوگ یقینی موت کی تیاری کر چکے تھے۔ طے کر لیا تھا کہ موت ہی تمام مصائب سے نجات دلانے والی ہے۔ اس وقت کے خوف کے مقابلے میں تمہیں پہنچانے والی ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی اہمیت ہی کیا، ان سے ہمارا وقار مجروح کیوں ہو؟ یہ تو بہت ہی معمولی باتیں ہیں، میرے دوست کل راستے میں ایک بیت میرے ذہن میں آئی تھی،

سنیے

تو پریشاں نہ ہو دھوکے کی حکومت کے لیے

خود کو یوں رسوا نہ کر شک بھری عزت کے لیے

"بجا فرمایا آپ نے، عالی جاہ! یہ فانی دنیا اس لائق نہیں کہ ہمیں اس کا غم ہو"

خان کے دیوان خانے میں بابر کو انتظار کرنا پڑا۔ زری کے چوغے میں ملبوس فربہ اندام میر بار نے اس سے بڑے تکبر کے ساتھ کہا "شاہ معظم، اعلیٰ حضرت محمود خان اس وقت عالی خلیفہ اعلیٰ حضرت شیبانی خان کے سفیر سے گفتگو فرما رہے ہیں"۔ بابر گھبرا اٹھا: سمرقند کو گنوا بیٹھنے کے بعد اوراتیپہ میں اپنی حالت کے بارے دو مہینے کے قیام کے دوران اس نے جو افواہیں سنی تھیں وہ واقعی سچ ہیں کیا؟ وہاں اسے معلوم ہوا تھا کہ شیبانی خان نے اس کے ماموں کے پاس ایک سفیر قیمتی تحائف اور ماوراءالنہر کو آپس میں تقسیم کر لینے کی تجویز کے ساتھ روانہ کیا ہے۔ وہ وادی فرغانہ محمود خان کے حوالے کر کے بدلے میں اوراتیپہ لینا چاہتا تھا۔ اس افواہ کے سچ نکلنے کا مطلب یہ ہوا کہ بابر کے پاس رہنے کے لیے کوئی جگہ نہ رہ جاتی، اسے ماوراءالنہر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینا پڑتا۔

اور بابر یہ آس لگائے بیٹھا تھا کہ محمود خان کو شیبانی خان کی قدر کی بے رحمانہ ہوس کا یقین دلا دے گا۔ اسے اس غیر خاندان کے حملہ آور کے خلاف متحدہ جدوجہد پر آمادہ کرے گا۔

آخر کار میر بار کو خان نے (ماموں نے!) حکم دیا کہ بابر کو اس کمرے میں بھیج دیا جائے جہاں شیبانی کا سفیر ابھی تک بیٹھا ہوا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی بابر کی نظر طویل قامت اور تنومند جانی بیگ سلطان پر پڑی جو شطرنج کی چوکی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ چست کپڑوں میں ملبوس، سلیقے سے تراشی ہوئی داڑھی مونچھوں والا محمود خان اطمینان کے ساتھ مسکرا رہا تھا اور جانی بیگ مایوسی اور اداسی کے ساتھ سر ہلا رہا تھا تاشقند کے حکمران سے بازی جیت لی تھی۔ بابر کا چہرہ اس احساس سے کچھ اور زیادہ تمتما اٹھا کہ اسے محمود خان کا بھانجا ہونے کے باوجود دیوان خانے میں اتنی دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ دونوں کی ملاقات چار برسوں سے نہیں ہوئی تھی، بابر اپنی مصیبت اور ذلت کی گھڑی میں اپنے قریبی عزیز کے ہاں آیا تھا اور وہ عزیز اس وقت دشمن کے قاصد کے ساتھ شطرنج کھیل رہا تھا۔ جو کچھ ہو رہا تھا اس کا خفیہ مفہوم بابر پر واضح ہو گیا اور واضح کیوں نہ ہوتا؟! (اعلیٰ حضرت) محمود خان نے سفیر کو دکھا دیا کہ فاتح کو "اعلیٰ حضرت" شیبانی خان کو اپنے لگے لیکن بدبخت بھانجے کی بہ نسبت کہیں زیادہ قابل احترام تصور کرتا ہے۔

بابر پر یہ سب واضح ہو گیا لیکن اس نے خود پر قابو پا لیا اور ایسا ظاہر کیا جیسے اس نے اپنے لیے کوئی توہین آمیز طرز عمل

دیکھ رہی نہ ہو۔ سفیر کی طرف اس نے یوں نظر ڈالی جیسے خالی جگہ کو دیکھ رہا ہو۔

"اعلیٰ حضرت خان محترم ماموں جان میں آپ کو توانا و تندرست دیکھ کر دلی مسرت محسوس کر رہا ہوں۔ خدا کرے کہ آپ کی صحت و سلامتی پر آپ کے دشمن کی چال بازیوں سے ذرا بھی آنچ نہ آئے۔"

وہ خاموش ہو گیا اور جانی بیگ سلطان کے چہرے پر جواب کا انتظار کرنے لگا۔ محمود خان سفیر کے سینے میں مخصوص اعزاز و احترام کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے رخصت کرنے کے لیے دروازے کے پاس تک گیا۔ اس کے بعد اس نے بابر کو دائیں طرف روئی کے گدے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"خوش آمدید مرزا! اپنے موجودہ نامساعد حالات کو اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دیجئے۔ آپ پر یہ جو برا وقت پڑا ہے یہ تو گزر ہی جائے گا۔ آپ ابھی نوجوان ہیں میرے عزیز بھانجے، آپ کے باغ حیات کے دس پھولوں میں سے ابھی تو ایک بھی نہیں کھلا ہے۔"

"محترم ماموں جان میرے باغ حیات کے بہت سے پھول کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گئے۔ میرا ایک بازو تو احمد تنبل کی بھڑکائی ہوئی آگ میں جل گیا اور دوسرے کو شیبانی نے جھپٹ لیا۔ خدانخواستہ کہیں آپ بھی ان دونوں تباہ کن آتش زدگیوں میں نہ پھنس جائیں۔"

محمود خان نے اس بات کو بڑی ناخوشی سے سنا

"آپ کا خیال بالکل درست ہے، بیک وقت دو بادشاہوں سے دشمنی مول لینا خطرناک ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہم نے تنبل کا نہیں شیبانی کے سفیر کا خیر مقدم کیا۔"

"لیکن شیبانی تو آپ کے لیے تنبل کی بہ نسبت سو گنا خطرناک ہے۔ تنبل تو معمولی درندہ ہے۔ وہ وادی فرغانہ کو دبوچ میں دبا کر بھاگنے اور اسے ہی پر بہت خوش ہے لیکن شیبانی تو سارے ماوراء النہر کا شکار کرنا چاہتا ہے۔ یہی نہیں وہ تو خراسان اور پورے ایران کو بھی ہڑپ کر جانے کے لیے بے تاب ہے۔ آپ نے اس کے خطابات "امام زماں، خلیفۂ رحمان" پر توجہ نہیں مبذول کی؟ وہ خود کو سکندر ثانی کہلوانا بھی بہت پسند کرتا ہے اور سکندر ذوالقرنین کی طرح ساری دنیا پر اپنے تسلط کے خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ سارے مسلمانوں کے دلوں پر بھی حکمرانی چاہتا ہے، کیوں نہ چاہے، خلیفہ اور مذہبی رہنما جو ٹھہرا۔"

تاشقند کا حکمران اپنے بھانجے کے جوش و خروش سے بھی متاثر ہوا اور دلائل کی معقولیت سے بھی لیکن اس نے اس بات کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ صرف ایسا تاثر دیا جیسے خیالوں میں ڈوب گیا ہو۔ خان کو شیبانی کے سفیر کی کہی ہوئی باتیں یاد آ گئیں۔

"ہم تو سمجھتے ہیں کہ شیبانی خان ہمارے اوپر حملہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ بہت سی باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اس نے حصار پر دانت گاڑ رکھے ہیں جس کے بعد خراسان و ایران کی باری ہے۔"

"محترم حکمران، عزیز ماموں جان، شیبانی کے سفیر کی چکنی چپڑی باتوں کا مقصد صرف یہ ہے کہ آپ اپنی احتیاط اور چوکسی کو بالائے طاق رکھ دیں۔ ذرا تاریخ پر تو نظر ڈالیے، ذرا سوچئے تو سہی، کون حملہ آور ایسا تھا جس نے تاشقند اور فرغانہ پر قبضہ کیے بغیر خراسان و ایران کا رخ کیا ہو؟ چنگیز خان؟ جی نہیں! امیر تیمور؟ جی نہیں پہلے سمرقند، تاشقند اور اندجان اور ان پر حملے کیے گئے۔ کیا واقعی شیبانی اتنی سی بات کو بھی نہیں سمجھتا؟"

دراصل شیبانی خان کے تاشقند پر حملے کے امکانات سے محمود خان بھی خائف تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس نے اپنے چھوٹے بھائی الاچہ خان کو جو اسیق کول پار کے علاقوں پر حکمرانی کر رہا تھا، اپنے پاس بلا لیا تھا۔ الاچہ خان اپنے پندرہ ہزار پا پیادہ اور مشتمل لشکر کے ساتھ راستے میں تھا اور مہینے بھر میں تاشقند پہنچنے والا تھا۔ دونوں بھائیوں کی اس سانٹھ گانٹھ کی شیبانی خان کو یقیناً بھنک لگ گئی تھی۔ یہی سبب تھا کہ اس نے اپنے سفیر کو تاشقند بھیجا تھا اور جیسے کہ صاف ظاہر تھا، ابھی وہ پرامن طریقوں سے کام لگانے کا کوشاں تھا۔ محمود خان بخوبی جانتا تھا کہ شیبانی بہ اعتبار حیثیت اس سے زیادہ مہارت وصلاحیت کا حامل ہے اور وہ شیبانی سے جنگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت اس نے اپنے بھانجے کی باتوں کے پس منظر میں سوچا کہ بابر جنگ کو ناگزیر تصور کر رہا ہے تو آخر کیوں؟ کہیں اس لیے تو نہیں کہ شیبانی اسے شکست دے چکا ہے اور بابر اس سے بدلہ لینا چاہتا ہے؟

اس نے بھانجے کے ارادوں کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے دریافت کیا

”خیر ٹھیک ہے، مرزا! مان لیتے ہیں کہ شیبانی خان یقیناً ہم پر حملہ کرے گا۔ تو اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

”ہم سب کو جو شیبانی کے ان ناپاک منصوبوں کے مخالف ہیں، باہمی معاہدہ کر لینا چاہیے تاکہ اسے ایک ہی وار سے مار بھگائیں!“

”تو پھر ہمیں آپ کے ساتھ معاہدہ کر لینا چاہیے کیا؟“

”صرف مجھ ہی سے نہیں بلکہ الاچہ خان ماموں جان سے بھی!“

”اس طرح میں اپنی فوج کو الاچہ خان کی فوج سے ملا دوں گا تو ہمارے پاس تیس ہزار سپاہی ہو جائیں گے۔ پھر آپ کی فوج کو بھی شامل کر لیں گے تب۔ تب کتنے سپاہی ہو جائیں گے؟

بابر کے پاس اب صرف ڈھائی سو فوجی باقی رہ گئے تھے اور یہ بات محمود خان کو معلوم تھی۔ اسی لیے اس نے اپنے بھانجے کے جنگ چھیڑنے کے جوش کو ٹھنڈا کرنے اور اس پر یہ واضح کر دینے کا فیصلہ کیا تھا کہ بڑے بڑے خانوں کے درمیان بابر کی حیثیت کیا ہے۔

ماموں کا یہ طنز کارگر ثابت ہوا اور بابر کے چہرے پر ایک بار پھر سرخی چھا گئی۔ لیکن بابر نے اپنی خودداری کو مجروح نہ ہونے دیا۔

”محترم حکمران! بدبختی نے مجھے مصائب سے ہمکنار کر دیا ہے لیکن یہ نہ فراموش کیجیے کہ شکست کا زہر پینے سے قبل میں فتح کا شربت بھی پی چکا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے بڑی صاف دلی کے ساتھ آپ سے معاہدے کی تجویز پیش کرنے کی جرأت کی۔“

”یہ صاف دلی یقیناً اچھی بات ہے۔ اچھا یہ بتائیے، عزیز بھانجے کہ اگر آپ کو شیبانی خان سے ایک بار پھر کشتی لڑنے کا موقع مل جائے تو کیا لڑیں گے؟“

محمود خان کے اس سوال کا مقصد بابر کو آزمانا بھی تھا اور اس کہاوت کے بموجب اس کا مذاق اڑانا بھی کہ ”کشتی میں ہارنے والا ہی ہمیشہ لڑنے کو تیار رہتا ہے۔“

”میں اس سے دوبارہ طاقت آزمائی کرنا چاہتا ہوں تو اس کی ایک وجہ بھی ہے“ بابر نے عزم کے ساتھ جواب دیا۔ ”اور جہاں تک کشتی کا سوال ہے۔۔ تو کہتے ہیں نا کہ کسی نے ایک بار تمھیں چت کر دیا تو دوسری بار تم بھی اسے چت کر

سکتے ہو۔"

"درست، بالکل درست!" محمود خان نے مطمئن ہو کر کہا۔

پھر خان نے دل ہی دل میں سوچا "بابر کو ہم اپنے تمام فوجیوں کا سپہ سالار بنا دیں تو کیسا رہے؟ اس کے تجربات کی بدولت شیبانی خان کے خلاف جنگ میں ہمیں یقیناً فتح حاصل ہو گی۔ لیکن یہ بھی توجہ ہے کہ اگر بابر نے شیبانی خان کو شکست دے دی تو بعد میں لوگ میری نہیں بلکہ بابر ہی کی تعریف کے پل باندھیں گے۔ اور تب بابر کیا تاشقند پر بھی قابض ہونے کی کوشش نہ کرے گا؟ کون نہیں جانتا کہ جس کے ہاتھوں میں فتح ہوتی ہے اسی کی شہرت حاصل ہوتی ہے اور جسے شہرت حاصل ہوتی ہے وہی صاحب اقتدار بھی ہوتا ہے۔"

وہ یہ سب سوچ کر محمود خان نے بابر کو سپہ سالار بنانے کا خیال دل سے نکال دیا۔

"آہ، ہماری بدقسمت خان زادہ بیگم ... کتنی مصیبت کے دن آ گئے ان کے لیے" محمود خان نے گفتگو کا رخ خاندانی مسائل کی طرف موڑ دیا۔ "یہ شیبانی خان بھی کیسا موقع پرست ہے۔ کیوں، ہے نا میرے عزیز بھانجے؟ خان زادہ بیگم والدہ کی طرف سے ہمارے خاندان سے اور والد کی طرف سے تیموری خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ شیبانی خان جانتا تھا کہ وہ خان زادہ بیگم سے باقاعدہ شادی کر لے گا تو کتنے زیادہ افراد اس کے رشتے دار بن جائیں گے۔ سنا ہے کہ اس نے سارے رسم و رواج کے مطابق شادی اور سمرقند میں بڑی شاندار ضیافت کی۔"

بابر وضاحت کرنا چاہتا تھا کہ یہ واقعہ کیسے پیش آیا تھا لیکن محمود خان نے جو بابر کو خاک بھی اہمیت نہیں دینا چاہتا تھا، اس پر فوراً ہی دوسری سخت چوٹ کی

"بڑی شرمناک بات ہوئی، ہم سب کی ناک کٹ گئی!"

پھر محمود خان اپنے اس طنز کے اثر کو کم کرنے کے ارادے سے یقین دلانے لگا کہ بابر، اس کی والدہ اور کمزور ہو جانے والی بیوی عائشہ (یہ دونوں کچھ پہلے ہی تاشقند پہنچ چکی تھیں) "ہمارے بہت عزیز مہمان ہیں، کہ ان سب کو اتنی مصیبتیں جھیلنے کے بعد اب آرام کرنا چاہیے۔ اور دل بہلانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ کل شیبانی خان کے سفیر کی دعوت ہے آپ بھی آیئے گا، عزیز بھانجے۔"

بابر کی کوئی بھی دلیل کارگر نہ ہوئی۔ صاف ظاہر تھا کہ محمود خان شیبانی سے ڈرتا ہے۔ اس کی خوشامد کرتا اور "خلیفہ رحمان" کی ہاں میں ہاں ملا کر اس کے بدلے میں امن حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ماموں جان ٹھوکر کھائیں گے، بابر نے سوچا، بری طرح ٹھوکر کھائیں گے ۔ تاشقند میں ان دنوں امن کی فضا دراصل تباہ کن طوفان سے قبل کے سناٹے کی جیسی تھی۔ والدہ اور شریک زندگی کو اس ماحول سے دور نکال لے جانا ضروری تھا۔ دور لیکن کہاں؟

۲

عائشہ بیگم کو تاشقند میں رہتے ہوئے دو مہینے بیت چکے تھے۔

وہ اپنی بچی کے انتقال کے صدمے اور سمرقند کے محاصرے کے دوران تکالیف جھیلنے کے باعث سخت علیل ہو گئی تھی۔ عائشہ کی بہن رضیہ سلطان نے جو محمود خان کی چہیتی بیگم تھی، اسے محل میں رکھ لیا تھا۔ ممتاز طبیبوں نے بہترین دواؤں سے اس کا علاج کیا تھا اور آخرکار وہ پوری طرح صحت یاب ہو گئی تھی۔

رضیہ سلطان کے ان احسانات کا شکریہ ادا کرنے کے لیے بڑی بیگم سے ملاقات کرنے سے قبل ہی اس کے پاس گیا۔ بات چیت کے دوران اس نے رضیہ سلطان کو بتایا کہ وہ عائشہ کو ترمذ لے جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ رضیہ نے اپنی کالی کالی شوخ آنکھوں کو یوں مٹکاتے ہوئے گویا اپنے لقب "قارکوز* بیگم" کو موزوں ثابت کر رہی ہو، ہاتھ ہلا کر کہا

"ارے نہیں، مرزا، عائشہ بیگم بے شمار تکالیف اٹھا چکی ہیں۔ اب ہم کہیں انہیں سرحد کی طرف نہ جانے دیں گے۔"

"لیکن محترمہ بیگم صاحبہ، ہماری قسمت میں یہی لکھا ہے تو ہم کر ہی کیا سکتے ہیں؟"

"معاف کیجیے گا، ہر شخص کی قسمت تو اس کی پیشانی پر لکھی ہوتی ہے۔"

"پھر بھی ایک ہی کشتی پر سوار افراد کی قسمت بھی ایک سی ہوتی ہے، کیا یہ درست نہیں؟"

"یہ (ایک سی قسمت) کی بات بھی خوب رہی ... میری بدنصیب، ان جانے کتنی تکالیف جھیل چکی ہیں ... اور یہ (ایک سی قسمت) انہیں آپ کی عطا کی ہوئی ہے۔ یہ کافی نہیں ہے کیا؟ وہ شدید غذائی قلت کے شکار سمرقند سے ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر لوٹی تھیں۔ صحت سنبھلتے ہی دوبارہ مصائب جھیلیں، آخر اس کا تک کیا ہے؟"

بابر اپنی خودداری کو ٹھیس پہنچانے والے طنزیہ جملے سننے کو تیار ہو کر آیا تھا لیکن محمود خان کے کچھ دیر قبل کے طنز آمیز اشاروں کے بعد اب اس کی سالی بھی پرتپاک شائستگی سے اچانک جلی کٹی سنانے پر آ گئی تو وہ قابو میں نہ رہ سکا۔

"بیگم صاحبہ، صاف صاف فرمائیے نا، آپ اپنی ہمشیرہ کو مجھ سے طلاق دلوانا چاہتی ہیں کیا؟"

"میں نے یہ کب کہا! لیکن ... میرا خیال ہے کہ اب آپ کو بھی مصائب کو دعوت نہ دینی چاہیے، مرزا۔ آپ ہمارے ہاں تاشقند میں قیام کیجیے۔ مستقل طور پر۔ امن و آرام کے ساتھ۔"

"یعنی یہ کہ طفیلی بن کر رہو، طفیلی جیسا طرز عمل اپناؤ اور اپنی وقعت کو نہ بھولو" بابر نے سوچا۔

"اس عنایت کا بہت بہت شکریہ! لیکن مہربانی کر کے مجھے اپنی اور اپنی بیگم کی کفالت خود ہی کرنے دیجیے۔"

بعد میں بابر نے عائشہ بیگم سے تنہائی میں شکایت کی۔

"کہتے ہیں کہ جوتے کا مالک بہتر طور پر جانتا ہے کہ اسے کہاں رکھنا چاہیے۔ رضیہ سلطان بیگم ظاہر ہے کہ ہمارے متعلق ہم سے زیادہ نہیں جانتیں، اور بہتر ہوتا کہ وہ ہماری زندگی میں دخل اندازی نہ کرتیں۔"

"اپنی ساری تکالیف کا تذکرہ تو ان سے میں نے کیا تھا مرزا۔"

"تو زن و شوہر کے اپنے کوئی راز نہیں ہوتے کیا؟"

عائشہ بیگم کا وہ پہلے والا شرمیلا پن کافور ہو چکا تھا۔ اس نے رضیہ ہی کی طرح غیر متوقع تندی سے جواب دیا

"مجھے بھلا سگی بہن سے کیا چھپانا! اس کا کوئی سبب بھی نہیں۔"

بابر کو یاد آ گیا کہ پہلے اس کی بیگم اسے مخاطب کرتے وقت کیسے محبت اور پرستائش انداز سے کہا کرتی تھی "میرے عظیم شاہ" اب وہ بھی محمود خان ہی کی طرح فخر آمیز خوش خلقی سے اسے صرف "مرزا" کہہ رہی تھی۔ وقت کتنی تیزی سے گزر گیا تھا، لوگ کتنی تیزی سے بدل گئے تھے!

"اچھا تو آپ بہن کو زیادہ اہمیت دیتی ہیں کہ خاوند کو؟" بابر کوئی چبھتا ہوا مذاق کرنا چاہتا تھا لیکن اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔

* قار اور سیاہ چشم

''ارے مرزا میں نے تو آپ سے شادی کی ہے''

''یہ بات ہے تو میں آپ کو یہاں سے جانا ہوں مشرق تیار یاں کیجئے۔

عائشہ بیگم چونک اٹھی

تو پھر اور تیاری جانے کی ٹھانی ہے؟ وہاں کے راستے کا تصور کر کے ہی میری جان لرز اٹھتی ہے۔ اس طرح آئے دن دربدری مارے مارے پھرنے سے میری صحت جواب دے چکی ہے۔ آپ اس بات سے واقف ہیں یہ سر تاج۔ وقف میں پھر بھی کتنا مانی لے جا رہے ہیں' کاش میں تو اتنا تندرست رہتے ہوئے قدم میں زندگی ترجیح کاش یہ دربدری اور بھاگ دوڑ کی پریشانیاں نہ جھیلنی پڑتیں۔ ایسا ہوتا تو میری لاڈلی بچی مجھے داغ مفارقت نہ دے جاتی۔ آج وہ سال بھر کی ہو گئی ہوتی، پاؤں پاؤں چلتی ہوتی''

ماں کا غم مستقل اور مقدس ہوتا ہے۔ لیکن عائشہ بیگم جھوٹ بول رہی تھی۔ بابر کے تصور میں بچی سے جدائی کے وہ بھیانک لمحات پھر آئے اور اس نے موت کی سرد سرد سانسوں کے مس کو اپنے چہرے پر محسوس کیا۔ اس نے سوچا کہ کیا وہ بحث کرے۔ ثابت کر دے کہ عائشہ جھوٹ بول رہی ہے؟

''موت تو لاعلاج ہوتی ہے، بیگم' بابر نے سخت لہجے میں کہا '' انسان موت کی گرفت میں آنے سے پہلے نہ جانے کتنی ہی بار مسرتوں سے ہمکنار ہوتا ہے اور کتنی ہی بار غموں سے۔ ہم بھی نوجوان ہیں لیکن مسرت اور غم دونوں سے ہمارا سابقہ پڑ چکا ہے۔'' پھر اس کے لہجے میں نرمی پیدا ہو گئی ''ہم اپنے درخشاں مستقبل کو دیکھنے تک زندہ رہیں گے، بیگم، دیکھ لیجئے گا، ضرور زندہ رہیں گے اور خدا ہمیں بچے بھی عطا کرے گا۔ لیکن مصیبت کی اس گھڑی میں ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہ ہونا چاہیے۔ آپ میرے ساتھ چلئے التجا کر رہا ہوں۔

''میں آپ کے ساتھ ساتھ بھٹکتی رہی ہوں، آج یہاں تو کل وہاں لیکن فائدہ کیا ہوا؟ کیا ان دنوں آپ کو میرا خیال بھی آتا تھا، میری طرف بھی متوجہ ہوتے تھے، میرے مرزا؟ نہیں آپ تو سلطنت کی جھمیلوں اور جنگ ہی کی فکروں میں الجھے رہتے تھے۔ آپ تو مہینوں تک نہ مجھ سے ملاقات کرتے ورنہ ہی میری یاد میں تڑپتے تھے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں نے آپ کی خاطر کیا کچھ نہیں جھیلا۔ شاید میں آپ کے لائق ہی نہیں ہوں' لیکن ایسی بیوی کس کام کی جس کا شوہر اس سے محبت نہ کرتا ہو؟''

اے خدائے کریم و رحیم، بابر نے سوچا بجا فرمایا ہے تو نے کہ'' عورتیں اپنے لباسوں کی فکروں اور فضول بحثوں میں الجھی ہوئی بڑی ہوتی ہیں'' بے شک میں نے اپنی بیگم کا خیال نہیں رکھا لیکن عائشہ نے بھی کیا کبھی میری فکروں سے کوئی واسطہ رکھا ہے؟ وہ جانتی بھی نہیں کہ میری فکریں کیا ہیں؟۔ شاید اس وقت بھی میں ان کو یہاں سے لے جانے کی جو کوشش کر رہا ہوں اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ میں ان سے بہت زیادہ محبت کرتا ہوں اور ان کے بغیر جی نہ سکوں گا۔ پھر بھی بیوی کا شوہر سے دور رہنا اچھا لگتا ہے کیا؟

بابر نے دل ہی دل میں ایک اور دلیل پیدا کی کہ عائشہ بیگم کو ایک ایسے شہر میں جس پر اسے اپنے جانی دشمن شیبانی کے جلد ہی قابض ہو جانے کا پورا یقین تھا، چھوڑ کر چلا دینا بڑی گھٹیا حرکت ہوگی۔

''ہماری قسمت بڑی بے رحم ثابت ہوئی ہے۔ ہم خان زادہ بیگم کی حفاظت نہ کر سکے۔ ان کی قربانی میرے تڑپتے ہوئے ضمیر پر ہمیشہ بار رہے گی، بیگم۔۔ مجھے آپ کو آنے والی مصیبت سے، شیبانی سے دور لے جانا ہی ہوگا''

"بہت ہو چکا، واقعی حد ہوگئی!" اچانک بابر چیخ اٹھا۔ "میں یہ چھوڑ رہا ہوں! قاسم بیگ صاحب، میں تخت سے
دستبردار ہوتا ہوں، بادشاہ نہیں رہا یہ سب... ویران ہو جائیں یہ ساری چیزیں میری نگاہوں کے سامنے سے"
اس نے دستار پیچ کے ہاتھوں سے، زردوزی کے کام والا چوغہ کھینچ کر پھینک دیا۔ چوکی پر سے شاہی دستار اٹھا کر
اس میں جڑے ہوئے ہیرے جو کبھی عائشہ بیگم نے نذر کیے تھے، نوچ لیے اور دستار دور دے مارا۔ اچھال دی۔ دستار
کھل گئی اور اس کا ایک سرا سفید سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا فرش پر پڑا رہ گیا۔

قاسم بیگ نے گھبرا کر بابر کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"میرے فرماں روا، یہ آپ کو کیا ہو گیا؟... پرسکون ہو جائیے میرے فرماں روا!"

بابر جس کا چہرہ فق ہو گیا تھا، تپ ہانپ کر چلانے لگا

"سب کچھ ختم ہو گیا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ میں درویش بن کر جینا چاہتا ہوں۔ قاسم بیگ صاحب، میرے اس فیصلے
سے والدہ محترمہ کو مطلع کر دیجیے گا۔ میں اسی صبح یہاں سے جا رہا ہوں۔ اب میں تخت و تاج کا دعویدار نہیں رہا۔ جو مجھ سے
مخلص ہوں وہ فوراً میرے ساتھ چلیں۔ باقی سب آزاد ہیں۔"

اس نے دستار سے نوچے ہوئے دونوں ہیروں کو مٹھی میں دبائے دبائے قلعے کے احاطے کو تقریباً دوڑتے ہوئے پار
کیا۔ اس کے کانوں میں یہ الفاظ ہتھوڑے کی ضربوں کی طرح گونج رہے تھے "ایسی بیوی کس کام کی جس سے اس کا
شوہر محبت ہی نہ کرتا ہو؟" اور وہ سوچ رہا تھا کہ ہاں، یہ سچ ہے! نہ وہ عائشہ سے محبت کرتا ہے نہ عائشہ اس سے۔ دونوں کے
ستارے ہی الگ الگ ہیں۔ اس عورت کی خباثت بھری ناانصافی سے، اس بات سے کہ وہ اپنی صرف اپنی ہی فکر رکھتی
تھی، بابر کے دل کو گہری ٹھیس لگی تھی اور وہ ناقابل برداشت درد و کرب میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ تیزی کے ساتھ مڑا، اسی
طرح دوڑتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہوا اور اپنی پوشاکوں کے صندوقچے سے تھیلی نکالی جس پر کبھی سمرقند کی اس ناقص
حافظے والی عورت نے کشیدہ کاری کی تھی۔ کئی برس گزر جانے کی بنا پر یہ سفید تھیلی مدھم پڑ گئی تھی، لگتا تھا کہ میلی ہوگئی ہے
لیکن اس پر کڑھے ہوئے الفاظ "نجات دہندہ کے لیے!" پہلے ہی کی طرح نمایاں تھے۔

بابر وہاں سے عائشہ بیگم کے پاس گیا تو اس کا غصہ تقریباً ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔

"کبھی آپ نے مجھے اپنا نجات دہندہ تصور کیا تھا اور مجھے تحفے میں ہیرے دیے تھے۔ اس وقت آپ نے اپنی اس
آرزو کا بھی اظہار کیا تھا کہ میں تخت نشیں ہوں اور یہ ہیرے میرے تاج میں جڑے جائیں۔ اب میں تخت و تاج سے محروم
ہو چکا ہوں۔ اپنے ہیرے واپس لے لیجیے۔ انھیں آپ اپنے کسی دوسرے نجات دہندہ کو نذر کر سکتی ہیں۔"

عائشہ بیگم ذرا بھی نہ گھبرائی۔ اس نے فوراً ہی ہیرے لے لیے اور پرسکون لیکن خباثت بھرے انداز سے چوٹ کی۔

"میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ مجھے ایک بار پھر چھوڑ کر چل دینے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ مجھے پوری طرح
آزاد کر دیں۔"

"اچھا؟ آپ طلاق چاہتی ہیں؟ تو پھر... آج سے آپ کی پشت میرے لیے پشت مادر جیسی ہوگئی۔ میں آپ کو
چھوڑ رہا ہوں۔ آج سے آپ میری زوجہ نہیں رہیں! طلاق! طلاق! طلاق!"

اور اندیجان کے جنوب میں واقع پہاڑوں کے دامن میں بہار کا موسم دیر سے آتا ہے۔ اس علاقے میں بیلوں سے

کھیتوں کی کاشت وسط حمل* کے آخری ایام میں شروع کی جاتی تھی۔ دہ کاشت گاؤں میں نے چاروں طرف سے گھرے ہوئے پہاڑیاں ہواؤں سے محفوظ رکھتی تھیں، خوبانی کے درختوں پر پھول ثور** میں نمودار ہوتے تھے۔ اس سے کچھ دور کے کوہستانی سلسلے پر، شیخ عظیم پہاڑ کی چوٹی چھپا ہوا سا معلوم ہوتا تھا اور اس کی چوٹیاں ہمیشہ برف سے ڈھکی رہتی تھیں۔

گاؤں کے مغربی سرے سے کھڑی چڑھائی شروع ہو جاتی تھی جس کے بلند ترین مقام سے دیکھنے پر لگتا تھا کہ گاؤں کسی گہرے غار کی تہہ میں واقع ہے۔

اس کھڑی چڑھائی کے دوسری طرف وادی ڈھلانوں پر بھی جتائی جاری تھی۔ وہاں طاہر جو دوسرے دہقانوں کی طرح بڑھا چلا جا رہا تھا، ہل میں جتے بیلوں کو ہانک رہا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے محمد جو بابر کا سپاہی بن جانے کے بعد سے ہمیشہ طاہر کے ساتھ ہی رہتا تھا، پائنچوں کو اوپر تک چڑھائے، دائیں ہاتھ کو زور زور سے جھٹکتا ہوا کھیت میں بیج بو رہا تھا۔ ان دونوں سے کچھ فاصلے پر دہ کاشت کے تاجیک کاشتکار کھیتوں کی بوائی میں مصروف تھے۔ مٹی نرم تھی، موسم خوشگوار تھا اور کام ۔۔۔ سب ہی مسرور نظر آ رہے تھے۔ طاہر گزشتہ برسوں میں صرف جنگوں اور یلغاروں میں الجھے رہنے کے باعث کاشتکاری کے لیے ترستا رہا تھا اور اب جو موقع ملا تھا تو وہ جتائی کرتے ہوئے کوئی گیت گنگنائے جا رہا تھا۔

بابر بھی کھڑی چڑھائی کو طے کر کے بلندی پر پہنچا اور وہاں سے مویشی چراتے، کھیتوں کو جوتتے ہوئے بوڑھے و جوانوں کو دیکھنے لگا۔ اس علاقے کے مفلس و نادار افراد جوتوں کو سنبھال کر رکھتے تھے کیونکہ پتھریلے راستوں کے باوجود بڑے مہنگے تھے اور جب پیٹ بھر کھانا میسر ہو جاتا تھا تب ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں رہتا تھا۔

بابر ان افراد سے اپنا موازنہ کرنے لگا "خیر میں بھی تو تندرست و توانا ہوں بیس سال کا نوجوان ہوں۔ آخر مجھ میں کیا کمی ہے جو ان دہقانوں میں ہے؟ دراصل مجھے سکون قلب میسر نہیں ہے اور اسی لیے عظیم الشان کوہساروں کے درمیان زندگی کی مسرتوں سے قدرت کے ایک جاندار جزو کی طرح محظوظ نہیں ہو پا رہا ہوں۔

کاش اس سب کا انحصار ننگے پیر گھومنے پھرنے پر ہی ہوتا!'

بابر نے جوتے اتار کر مینڈھ پر رکھ دیے اور چلتے ہوئے کھیتوں میں بے ڈھب ڈگ بھرنے لگا۔

مٹی مخمل جیسی نرم تھی اور اس سے بہار و شباب کی خوشبوئیں پھوٹ رہی تھیں۔ بابر نے سوچا کہ شاید پروردگار نے آدم اول کو ایسی ہی نرم، آدمی کا انتظار کرنے والی ایسی ہی خاک سے بنایا تھا۔

دہقان اور سپاہی بادشاہ کے نرم مٹی پر ننگے پاؤں چلنے کو مذاق سمجھ کر خوش ہو گئے اور اس کی طرف دیکھنے لگے۔ لیکن پھر بابر اسی طرح بڑھتا ہوا پتھریلی پگڈنڈی سے گزرتا ہوا ڈھلان سے نیچے اترنے لگا۔ نکیلے پتھر اس کے تلووں میں چبھنے لگے۔ وہ بیچ بیچ میں راستے کو مختصر کرنے کی خاطر جھاڑیوں میں بھی گھستا جا رہا تھا جس سے تلوے لہولہان ہو گئے۔ دہقان حیرت میں پڑ گئے "آخر وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟" لیکن بابر دانت بھینچے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔ آخر طاہر سے نہ رہا گیا، وہ جوتے اٹھا کر بابر کی طرف لپکا اور اسے ڈھلان کے وسط میں جا لیا۔

"جوتے پہن لیجیے، حکمراں!" طاہر نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "ٹھہر جائیے۔ یہ پتھر آپ کے پیروں کو زخمی کر دیں گے۔"

بابر ٹھہر گیا اور اس نے طاہر کے پیروں کو جو مٹی لگنے سے سیاہ پڑ گئے تھے دیکھتے ہوئے کہا

* ۲۲ مارچ تا ۲۱ اپریل ** ۲۲ اپریل تا ۲۱ مئی۔

یادرکھنے کے لیے، دوسری جگہ ہوتا اور اس سے اپنی ہیبت بڑی رکھتا۔ چنانچہ ... سے بہتر ... وہ شاعر ... میں

بلکہ خود اپنے آپ سے مخاطب ہو

"سب کچھ فانی ہے، بڑی بڑی سلطنتیں تک اپنے بانیوں سے، حیات ختم ہوتے ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن شاعر

کا کلام صدیوں تک زندہ رہتا ہے۔"

"میں آپ کی دلیل کو سمجھ رہا ہوں، عالی جاہ، لیکن جنگ بھی تو ہمارے ساتھ ہیں"

"ہم جنگوں کو رخصت کر دیں گے، وہ بے فائدے کے لیے زخم سے چلے جائیں گے"

بابر یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ اپنے اس نوعیت کے فیصلے کو بھی عملی جامہ پہنانے کی قوت رکھتا ہے، اسی پتھر

پگڈنڈی کا انتخاب کیے بغیر نکیلے پتھروں والے اسی راستے پر گامزن ہو گیا۔ اسے تکلیف ہو رہی تھی جس کا اندازہ اس کی

چال اور چہرے پر نمایاں تناؤ سے ہو رہا تھا۔ طاہر اس کے قریب پہنچ کر جوتے پہن لینے کی ایک بار پھر اصرار کے ساتھ

درخواست کی۔

"شاہ عالی، بے بس اور بے یار افراد پر بھلا آپ کو رشک کیوں آئے۔ ان کے جیسے حالات سے خدا کرے آپ کو کبھی بھی

سابقہ نہ پڑے۔"

"ان کے حالات میرے حالات سے بہتر نہیں ہیں کیا؟"

"میں ایک بار پھر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خدا نہ کرے کبھی آپ کو ان مفلوک الحال افراد کی جیسی زندگی گزارنی

پڑے۔"

"ہونہہ! عجیب مشورہ ہے۔ ننگے پیر رہنے والے افراد انسان نہیں ہوتے کیا؟"

"ہوتے کیوں نہیں۔ لیکن آپ تو پیدائشی تاجدار ہیں"

"میں دوبارہ پوچھتا ہوں کیا پیدائشی تاجدار انسان نہیں ہوتا؟"

طاہر نہیں جانتا تھا کہ وہ اس قسم کی بات چیت کو کیسے جاری رکھیں۔ اسے تو صرف یہ معلوم تھا کہ دہقان یا معمولی

سپاہی اور بادشاہ کو ایک دوسرے سے الگ کرنے والی دیوار سامنے نظر آتے ہوئے کوہساروں سے بھی کہیں زیادہ بلند

ہوتی ہے۔ اس نے سوچا کہ بابر اس دیوار کو ایک ہی چھلانگ میں پار کرنا چاہتے ہیں جو ناممکن ہے۔ آخر ان کے دل میں

چانک ایسی خواہش کیسے کروٹیں لینے لگی؟ یقیناً محض اس لیے کہ اب انھیں ماوراء النہر کا بادشاہ بن سکنے کی ذرا بھی امید نہیں رہ

گئی۔ کوئی اور سبب طاہر کو قابل قبول نہ معلوم ہو۔

تاہم بابر بہت سی باتوں میں عام حکمرانوں سے مختلف تھا۔

"عالی جاہ" طاہر نے کہا، "اگر آپ شاعری کو تخت و تاج پر واقعی ترجیح دیتے ہیں تو پھر مجھے بھلا سپہ گری سے سروکار

کیوں ہو؟ ... میں اپنے خاندان کے ساتھ کاشتکاری کرتا، زندگی بھر آپ کا وفادار رہتا اور آپ کو دعائیں دیتا ... لیکن

کیا یہ ممکن ہے؟"

آخرکار بابر نے طاہر سے اپنے جوتے لے لیے۔

"ممکن ہے ... تم بھی دوبارہ کھیتی کرنے لگو گے۔" ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ "ہم اپنے منصوبوں

کو عملی جامہ کیسے پہنائیں گے، یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ اس وقت تو تم جا کے بیوں کو سنبھالو، مجھے یہیں چھوڑ دو۔"

طاہر بھی ڈھلان سے تیزی کے ساتھ اوپر چڑھنے لگا۔ اسے خیال آیا کہ بابر نے سچ بڑی قریبی دلی بات کہی ہے حالانکہ یہ بڑی عجیب سی بات ہے۔ لیکن بادشاہ درویش نہیں بن سکتا۔ ہاں درویش بادشاہ بن سکتا ہے لیکن اس کا امکان بھی کم ہی رہتا ہے۔ بابر جیسے منکسر مزاج افراد جیسے کہاں ہیں جو گوشہ نشینی اختیار کر لیتے ہیں۔ رہی برہنہ پا چلنے کی بات تو وہ بادشاہ کے لیے محض ذہنی مذاق کی حیثیت رکھتی ہے۔ شاعروں کو ذہنی مذاق کا شوق ہوتا ہے۔

طاہر اب بھی جوتے ہاتھ میں لیے ننگے پاؤں ہی چل رہا تھا۔ طاہر نے سوچا ”کتنے ضدی ہیں! جو کہہ دیتے ہیں، کر کے رہتے ہیں۔“

بابر اپنے تلوؤں کے بڑھتے ہوئے درد کو برداشت کرتا، اسی طرح ننگے پاؤں چلتا ہوا چشمے تک پہنچ گیا۔ اس جگہ سے نرم مٹی پر شروع ہونے والی پگڈنڈی سیدھے گاؤں تک جاتی تھی۔

اس نے جوتے پہن لیے۔ اچانک اسے احساس ہو گیا تھا کہ لوگ اس کی سنک کو ایسے معنی پہنا سکتے ہیں جو اس کے مفاد میں نہ ہوں گے۔ گاؤں کا مقدم جس نے اس کے رہنے کے لیے اپنا گھر دے دیا تھا، بیگ اور سپاہی جو اسے ”حکمراں“ یا ”اعلیٰ حضرت مرزا“ کہہ کے کورنش بجا لاتے۔ یہ سب اسے کے سارے لوگ اسے برابر نہیں بلکہ کہیں زیادہ عالی مرتبہ فرد تصور کرتے تھے۔ یہ لوگ اس کا احترام محض اس کی سادگی پسندی کی بنا پر تھوڑی کرتے تھے۔

بابر نے سوچا کہ جیسا کہ طاہر نے اشارتاً کہا تھا، اچھا حکمراں بننا معمولی کاشتکار کی بہ نسبت کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اگر وہ مفلوک الحال افراد کی طرح رہنا پسند کرنے لگے گا تو سارے بیگ سوچیں گے کہ کسی غریب شخص کو کورنش بجا لاتے ہیں۔ تب انھیں اس کے سامنے سر جھکانے کی ضرورت ہی کیا رہ جائے گی؟ اس کی اس سادگی پسندی سے تو ان سارے لوگوں کے وقار اور خودداری کو ٹھیس ہی لگتی ہے۔

بابر کے خیالات ایک دوسرے کی تردید کرتے ہوئے آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔ پیروں کا شدید درد غائب سا ہو گیا۔
دن گزرتے گئے۔ بابر ڈھلانوں پر برہنہ پا چلتا رہا اور بتدریج اس کے تلوے نکیلے پتھروں اور سرد پتھریلی پگڈنڈیوں کے عادی ہو گئے۔

۳

دہ کات سے کوئی فرسنگ بھر کے فاصلے پر بلند کراڑے تلے جو سیدھا کھڑا تھا، آق سو یعنی سفید دریا بہتا تھا۔ اس میں پانی کی فراوانی اور دھارے کی تیزی کا یہ عالم تھا کہ پانی میں اترنے والا شخص اگر بہت محتاط نہیں رہتا تھا تو فوراً ہی چکر کھا کر بہہ جاتا تھا۔ دریا دائیں جانب مڑ جاتا تھا جہاں اس کا پاٹ نسبتاً زیادہ وسیع ہو گیا تھا اور اسے ذرا کم تیز بہاؤ والی ایک جگہ پر پایاب پار کیا جا سکتا تھا۔

بابر پہاڑی ڈھلان پر واقع ارچہ* کے درختوں کے جنگل کے بیچ سے ترچھی گزرتی ہوئی پگڈنڈی پر چلتا ہوا دریا کے قریب دریا کے اس گھاٹ پر پہنچا۔ وہاں اسے کوئی بیس گھڑ سوار دریا کو پار کرتے ہوئے دکھائی دیے۔ اس نے سرخ سمور کی ٹوپی پہنے ہوئے گھڑ سوار کو جو آگے آگے آ رہا تھا، دیکھتے ہی اپنے وفادار بیگ کو پہچان لیا۔

بابر نہیں چاہتا تھا کہ قاسم بیگ اور سپاہی اسے برہنہ پا دیکھیں اس لیے پگڈنڈی سے ہٹ کر ڈھلان سے کچھ فاصلے پر ارچہ کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔

---

* ارچہ: صنوبر قسم کا ایک درخت۔

لیکن اس شام میں قاسم بیگ نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کو جو دریا پار کرتے ہوئے پیٹ تک بھیگ گیا تھا، روکا اور پھرتی سے نیچے اتر آیا۔ سپاہی بھی کچھ بعد گھوڑوں سے اتر گئے۔ قاسم بیگ نے اپنے گھوڑے کی لگام قریب ترین سپاہی کو تھما دی، اور بیچ کے درخت تک گیا۔ بابر کو کورنش بجا لایا اور اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا

"معاف فرمایئے عالی جاہ، آپ کا یہ غلام تاشقند سے بڑی خبریں لے کر آیا ہے۔"

بابر کو مختلف واقعات یاد آ گئے جو اس کے تاشقند چھوڑنے کے بعد رونما ہوئے تھے۔ اس کے ماموں محمود خان نے شیبانی خان کے سفیر کے اعزاز میں بار بار ضیافتیں منعقد کر کے آخرکار اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ شیبانی خان سے معاہدہ ہو گیا تھا۔ شیبانی نے اوراتیپہ پر محمود خان کے حق پر قبضہ کو تسلیم کر لیا تھا اور خود اپنے لشکر کے ساتھ واپس روانہ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد بھی محمود خان نے اوراتیپہ پر حملہ نہیں کیا تھا (اوراتیپہ ان کے بھتیجے کے زیر حکومت جو تھا) اور یہ ظاہر کیا تھا کہ یہ علاقہ تو ویسے بھی اس کا یا اس کے خاندان کا ہے۔ اس نے اپنے بھائی الاچہ خان کو ساتھ لے کر احمد تنبل کے خلاف لڑائی چھیڑ دی تھی۔ دونوں بھائی تنبل سے وادی فرغانہ کو اس "جنت ارضی" کو چھین لینا چاہتے تھے۔ تاشقند سلطنت میں توسیع کے اس منصوبے کو شیبانی نے بھی شروع میں منظور کر لیا تھا۔

قاسم بیگ تازہ ترین صورت حال معلوم کرنے کے لیے بابر کے پڑاؤ سے چلا گیا تھا اور اب تقریباً تین ماہ بعد واپس ہوا تھا۔

"کیا ہوا؟ بتایئے نا بیگ!"

"شیبانی خان نے غداری کی۔ اپنے قول سے پھر گیا۔ عالی جاہ! آپ کے ماموں تقریباً نصف سال تک فرغانہ میں احمد تنبل سے جنگ کرتے رہنے کے باوجود اسے شکست نہ دے سکے، انہیں کافی جانی و مالی نقصانات برداشت کرنے پڑے اور ان کی طاقت گھٹ گئی۔ تب شیبانی خان نے اچانک ان کی پیٹھ میں چھرا بھونک دیا۔ دراصل شیبانی خان نے احمد تنبل سے خفیہ معاہدہ کر رکھا تھا۔ ان دونوں بلاؤں کا آپ کے ماموں بھلا کیسے مقابلہ کر سکتے تھے؟ ان کا لشکر تباہ ہو گیا اور انہیں شیبانی خان نے قید کر لیا۔"

بابر غیر ارادی طور پر اچھل کے کھڑا ہو گیا

"یا خدا! تاشقند بھی جاتا رہا؟"

"بس کچھ نہ پوچھئے حکمران، تاشقند میں دو ہزار سپاہی اور [illegible] تھے کم از کم چھ مہینے کے لیے کافی رسد موجود تھی۔ وہاں تو شہر کے دفاع کے لیے مستحکم مورچہ بندی کی جانی چاہیے تھی۔ لیکن محمود خان نے شرمناک سودا کر لیا، اپنی جان بچانے کی خاطر خان کی ساری شرطیں مان لیں۔ محمود خان نے تاشقند کے محافظین کو خط لکھ کر ہدایت کی کہ قلعے سے کسی لڑائی کے بغیر ہی دست بردار ہو جائیں، اور خزانے اور حرم کو فاتحین کے سپرد یہیں چھوڑ دیں۔"

"اور ساری خواتین شیبانی کے ہاتھ لگ گئیں؟"

"جی ہاں، حکمران! شیبانی کے لشکریوں نے تین دنوں تک شہر کو جی بھر کے لوٹا۔ آپ کے ماموں کی خوبصورت چھوٹی بہن دولت بیگم شیبانی خان کے بیٹے تیمور سلطان کی شاید تیسری بیوی بن کر اس کے حرم میں داخل ہو گئیں۔ محمود خان کی سولہ سالہ دختر مغل خانم کو شیبانی نے خود اپنے لیے منتخب کر لیا۔ یہ حرکت اس نے ترپن سال کی عمر میں کی ہے۔ ورنہ

یا خدا!"

کئی بار بھی بابر اوروں کے حشر پر ششدر ہو جاتا اور سوچنے لگتا تھا کہ کس پر قسمت جانے والی قسمت سے ان لوگوں پر بھی قہر ڈھا دیا جو اس کے ساتھ بے کسی سے پیش آئے تھے۔ اس نے جو کچھ سہا ہے سخت عجیب شیطانی ہو تو تصور کیا۔ نہیں، وہ کبھی بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کے بچوں میں سے ایک کا بھی یہ حشر ہو۔

قاسم بیگ نے بابر کے بہت قریب آ کر تقریباً سرگوشی کے انداز میں کہا

"شیبانی خان، اس کے بیٹے اور سپہ سالار اپنی ایک فتح کو سمرقند اور بخارا کی فتح میں تبدیل کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ اب ان کی نظریں فرغانہ پر جمی ہوئی ہیں۔ اور اتنا ہی نہیں یہ لوگ آج نہیں تو کل دھاوا بول دیں گے۔ ان علاقوں پر ہمارا قیام بہت پرخطر ہے، عالی جاہ۔ ہمیں پہاڑ کو پار کر کے حصار چلے جانا چاہیے۔"

حصار کے حکمران خسرو شاہ نے کبھی بابر کے چچیرے بھائی بایسنقر مرزا سے تخت چھین لیا تھا اور خاندان تیموری کے ایک دوسرے نوجوان رکن کی آنکھیں ہیرے کی تپتی ہوئی نوک سے پھوڑ کر اندھا کر دیا تھا تاکہ وہ کبھی تخت کو نہ دیکھ سکے۔ بابر کو یہ سب یاد تھا۔

"لیکن قاسم بیگ صاحب، یہ تو ایسا ہی ہوگا کہ ایک آفت سے بچنے کے لیے دوسری مول لے لی۔"

"محترم حکمران، میں خسرو کے ہاں پناہ مانگنے کی بات تھوڑی کر رہا ہوں۔ آپ کا یہ وفادار خادم گزشتہ سال سے حصار کے بیگوں سے خفیہ رابطہ قائم کیے ہوئے ہے۔ زیادہ تر بیگ خسرو سے سخت بیزار ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ خسرو حقیر خاندان کا رکن اور کسی مکار سپاہی کا بیٹا ہے، حصار پر حکومت کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ ہمارے وہاں پہنچتے ہی یہ سارے بیگ ہمارے ساتھ ہو جائیں گے۔"

"تخت و تاج کے لیے پھر وہی چھینا جھپٹی؟ نہیں، قاسم بیگ۔ اس سب سے میں بری طرح اوب چکا ہوں۔ مجھے تو اب گوشۂ تنہائی درکار ہے جہاں سب سے الگ تھلگ رہوں اور فکرِ سخن کروں۔ اس کے سوا کچھ بھی نہ چاہیے!"

قاسم بیگ ملاقات کے اولین لمحے ہی سے کوشاں تھا کہ بابر کے ننگے پیروں پر اس کی نظر نہ پڑے۔ حکمران جس کے سامنے وہ سر جھکاتا تھا، برہنہ پا گھومے پھرے، کیسی عجیب و غریب، کتنی واہیات بات تھی!

"عالی جاہ، آپ نے کبھی ہم لوگوں کے مقدر کے بارے میں بھی سوچا؟ آپ کے ڈھائی سو سپاہی اور بیگ، آپ کے یہ قابل اعتماد ساتھی جو آپ کی کامیابی کے خواہاں ہیں، پروردگار سے دعائیں مانگتے اور امید رکھتے ہیں کہ کامیابی ایک بار پھر آپ کے قدم چومے گی اور آپ کو پہلے سے بھی زیادہ عروج حاصل ہوگا۔ یہ سب لوگ مفلسی کی حالت میں آپ کے ساتھ ساتھ کوہساروں اور صحراؤں میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ کیا یہ سب ناحاصل ہے؟"

ایمان دار قاسم بیگ نے بابر پر واضح کر دیا کہ اگر وہ واقعی درویشی اختیار کر لینے کا فیصلہ کر چکا ہے تو پھر اسے اتنے بیگوں اور سپاہیوں کو اپنے ساتھ رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ آخر وہ ان لوگوں کو جانے کیوں نہیں دیتا؟

بابر نے سر جھکا لیا، خاموش ہو گیا اور دیر تک خاموش رہا۔

"میں اپنی اس بے رحمانہ گستاخی کے لیے معافی چاہتا ہوں، عالی جاہ لیکن یہ بات مجبوراً عرض کرنی پڑی۔"

"آپ نے ٹھیک ہی کہا۔ مجھے اپنے وفاداروں کو فراموش نہ کرنا چاہیے۔ مجھے یہ بتائیے محترم بیگ کہ کیا خسرو شاہ نے بھی آپ کو اپنے ہاں خدمات انجام دینے کی پیش کش کی تھی؟"

"جی ہاں، دوبارہ"

بابر نے قاسم بیگ کے مردانگی کے آئینہ دار چہرے پر پڑی اداس نگاہیں جما دیں۔ تب سے وہ بابر اعظم کی جڑوں کا واحد سہارا تھا۔ چھوٹی سی داڑھی پر سفیدی جھلکنے لگی تھی حالانکہ عمر ابھی چالیس کی بھی نہیں ہو پائی تھی۔

"آپ جانتے ہیں، قاسم بیگ، آپ سے جدا ہونا میرے لیے کتنا تکلیف دہ ہے۔ والد مرحوم کا سایہ جس دن میرے سر سے اٹھ گیا تھا اس دن سے آپ نے والد کی طرح میرا خیال رکھا ہے۔ میرے مقربین میں سب سے زیادہ معتبر و مقرب آپ ہی تو ہیں۔"

"بہت بہت شکریہ میرے حکمران!"

"اور میں آپ کا احترام کرتے ہوئے آپ کو جانے کی اجازت دے رہا ہوں۔ ہم میں سے ہر ایک اپنے راستے پر گامزن ہو سکتا ہے۔ آپ کا راستہ حصار کو جاتا ہے۔"

"مجھے یہ سن کر دلی افسوس ہوا۔ آپ کو چھوڑ کر جاتے ہوئے بے حد افسوس ہو رہا ہے۔ حکمران آپ بھی ساتھ ساتھ چلیں۔"

"نہیں قاسم بیگ، نہیں۔ میں نے اس وقت کوئی قدم نہ کیا تو کبھی بھی نہ کر سکوں گا۔ میں ان زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہو جانا چاہتا ہوں جو تاج داروں کی زندگیوں کو جکڑے رکھتی ہیں۔ میں ایک متحد اور عظیم سلطنت میں، اپنے متحد، طاقتور اور عظیم الشان ماوراء النہر میں ایک حقیقی تاجدار کی، ایسے تاجدار کی زندگی گزارنا چاہتا تھا جو میرے خوابوں پر پورا اترتا ہو۔ میں اس طرح کی زندگی کی تعمیر و تشکیل میں ناکام رہا اور دوسری طرح کی زندگی جس میں لوگ ایک دوسرے کو دھوکہ دیتے ہیں، ذلیل، پامال کرتے ہیں۔ مجھے نہیں چاہیے مجھے وہ حقیر زندگی نہیں چاہیے، قاسم بیگ! میں چاہتا ہوں کہ زنجیر کا ایک سرا میرے ہاتھوں سے بندھا ہے دوسرا مجھ سے، میری پرانی عادتوں اور خود پسندی سے۔ اپنے ہاتھوں کو زنجیروں سے آزاد نہ کروں گا تو خود بھی زنجیروں میں جکڑا ہی رہوں گا۔ لیکن خود آپ سے کیسے آزاد ہو سکوں گا، یہ مجھے نہیں معلوم۔ اب تو میری دلی خواہش ہے، قاسم بیگ کہ زنجیروں کے بغیر ہی آغوش فطرت میں جاؤں۔"

بابر کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا، قدم ڈگمگا گئے۔ قاسم بیگ نے اسے سنبھال لیا اور رخصت ہوتے وقت بغل گیر ہو کر رو پڑا۔

بابر نے پہلی بار دیکھا کہ قاسم بیگ رو بھی سکتا ہے۔۔

۴

کاش وہ ان بلند کوہساروں پر مسلسل چلتے چلتے ان تمام افکار و خیالات کو جو صبح سے شام تک اس کے دل کو اذیت میں مبتلا رکھتے تھے، نیچے پھینک سکتا، بے کراں آسمان میں بکھیر سکتا۔ لیکن وہ شہدوں کے درد و غم کو اپنے وجود سے الگ کر سکتا تھا ورنہ ہی جیسا کہ ایک بار اس نے خود ہی کہا تھا، زنجیروں کو۔ درد و غم کو بکھیر دینا، پھینک دینا ممکن نہ تھا۔ اسے تو صرف اشعار ہی میں ڈھالا جا سکتا تھا۔ اشعار اس کے دل کا بوجھ ہلکا کر کے اسے بچا سکتے تھے، صرف اشعار ہی اسے اس کے وجود سے جدا ہو کر دور کرنے پر قادر تھے تاکہ وہ دور سے اپنی روح کی مسلسل چیخوں کو سن سکے۔

پوچھ مت اے دوست، کس حالت میں جانِ زار ہے
روح بھی بیمار میری، جسم بھی بیمار ہے
درد و غم کے اتنے قصے ہیں، سناؤں کس طرح
مجھ پہ یہ محکوم دنیا کوہ جیسا بار ہے

غزلوں کے بعد رباعیاں۔ ایک کے بعد دوسری محبوب تخلیق ہوتی رہی۔

لاؤ، شراب لاؤ، اب رند میں بنوں گا
بنتا نہیں زاہد منبر کو کیا کروں گا
لیکن نہیں ہے رندی سے بات میرے بس کی
اور پارسائی کو بھی اپنا نہیں سکوں گا

اسے کتنی ہی بار اس بات پر شک ہوتا تھا کہ وہ صحیح معنوں میں درویش بن سکے گا، اس فانی دنیا کی آسائشوں، حسن اور عزت و شہرت سے متعلق بھاگ دوڑ کو باعث کشش بنانے والی تحریصات پر صرف سادہ طعام جیسی ظاہری چیزوں کے معاملے میں ہی نہیں بلکہ باطنی طور پر بھی غلبہ پا سکے گا۔

گوشہ نشیں ہوں، اب میں درویش بن گیا ہوں
ارمانوں کے، ہوس کے در بند دیکھتا ہوں
جاؤں کہاں، کروں کیا، پاؤں پناہ کس جا؟
بھولا ہوں اپنا رستہ، در در بھٹک رہا ہوں

اسے تیزی کے ساتھ یکے بعد دیگرے نازل ہوتے ہوئے مصرعوں میں جوشِ سخن کا احساس ہو رہا تھا، لگ رہا تھا اگر اس پر دنیا کے سارے دروازے بند ہو جائیں تو بھی ایک آخری دروازہ، حسن و لطافت، اور عزت و شہرت کی دنیا کا، دنیائے شاعری کا دروازہ کھلا رہے گا۔ خواہشات کو دبانے کی کوشش میں اسے گھبراہٹ لیکن مسرت کے ساتھ اپنے اندر کی ان قوتوں کا احساس ہوا جنھیں بروئے کار نہیں لایا گیا تھا اور تب سے خان زادہ بیگم کے الفاظ یاد آ گئے جو اس نے وقت رخصت کہے تھے "مجھے یقین ہے کہ آپ کا مستقبل بہت عظیم ہوگا۔ دوسروں کو نہیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ آپ کی جیسی غیر معمولی صلاحیت کے افراد دنیا میں شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے ہیں!"

گزشتہ روز آق سو کے کنارے آباد گاؤں میں سے ایک میں طوی ہو رہی تھی۔ بابر عام راہگیر کی طرح گلی سے گزر رہا تھا تو اس نے اچانک کسی نوجوان مغنی کو بڑے مسحور کن انداز سے اپنی غزل گاتے سنا تھا "نہ ملا دل کے سوا یار وفادار کوئی....." بابر کے سینے میں دل جیسے سرکنے سا لگا تھا، ایسا محسوس ہوا تھا جیسے ان قوتوں کے جو اس کے لیے مہیب بھی تھیں اور مسرور کن بھی، بابر کو طاقتور چشمے کا نظارہ بہت محظوظ کر رہا تھا جو دہ کات سے کچھ فاصلے پر واقع پہاڑ آسمان پائے لاد کی چوٹی پر اتنی تیزی سے ابل رہا تھا کہ اس کی دھار کو روکا نہیں جا سکتا تھا۔ پہاڑ کے دامن میں زمین سے پھوٹنے والے کئی چشمے موجود تھے لیکن بابر نے اس علاقے میں ایسا چشمہ پہلی بار دیکھا تھا جو عین چوٹی پر عقاب کی سی چیخ کے ساتھ نکل رہا تھا.....

اس جگہ سے جنوب میں عظیم الشان پہاڑ زہر تج پر جمی ہوئی دائمی برف چمک رہی تھی۔ اس پہاڑ اور آسمان پائے

اس نے پہاڑوں کی دھوپ اور پہاڑیاں دیکھی تھیں۔ بابر نے سوچا اس چشمے میں پانی کسی گلیشیر سے آتا ہوگا اس کا مطلب یہ تھا کہ پانی کی سطح سے نیچے آئے اور پھر اوپر چوٹی تک چڑھنے کے لیے دونوں پہاڑوں کے درمیان وہ تنگ گھاٹیوں کی گہرائیوں سے کہیں زیادہ گہرائی تک جانا پڑتا تھا۔ پانی کے چشمے کو اس کے لیے اتنی قوت آخر کہاں سے مل رہی تھی؟ پانی تو نیچے کی طرف ڈھلوانوں اور پہاڑی ڈھلوان سے جاتے تھے لیکن اسے پتھروں اور چٹانوں کو توڑتے ہوئے سطح پر جا کر پھوٹ نکلنے کے لیے آخر کیا چیز مجبور کر رہی تھی؟ کہیں یہ تو نہیں تھا کہ پہلے وہ وادی میں رواں دواں ہو لیکن کسی زلزلے میں ٹوٹ کر نیچے گرنے والی چٹانوں نے اس کے منبعے کو بند کر دیا ہو؟ یہی سبب تھا کہ وہ بڑی توانائی کے ساتھ۔

بابر کو اپنے چشمے سے خود اپنی زندگی کا موازنہ بہت موزوں دکھائی دینے لگا۔ وہ خود بھی تو ٹوٹ کر گرنے والی چٹان کے نیچے آ گیا تھا۔ چٹان گرنے کا یہ واقعہ ایسا ہی تھا جیسا کہ آخسی میں پیش آیا تھا اور جس سے چشمہ بند ہو گیا ہے۔ خانہ بدوش سالاروں کی فتح بھی چٹانیں ٹوٹ کر گرنے ہی کی جیسی تھی۔ اس طرح کے دور بھی جانے کتنے ہی واقعات ہو چکے تھے! لیکن چشمے کی اندرونی قوت ختم نہیں ہوئی تھی، وہ پتھروں کو توڑ کر ایک بار پھر بہنے لگا۔ وہ بے خانماں عناصر کے مد مقابل اٹھ کر مسلسل جدوجہد کرتا رہا تھا تاکہ دوبارہ منور دنیا میں سودمند ہو سکے۔

بابر نے سوچا کہ اگر یہ چشمہ آسمان پانے لائق کو چوٹی کو توڑ کر باہر نکل آیا تھا تو مجھے بھی ہمت نہ ہارنی چاہیے، امید دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیے۔ میری زندگی بھی، میری قوتیں بھی اسی چشمے کی طرح پھوٹ نکلیں گی۔ شاید مجھے بھی شعروسخن کی معرفت مل جائے؟ شاید صرف شعروسخن ہی کی نہیں؟

وہ چشمے کے کنارے بیٹھا اسی طرح کے خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ اتنے میں ایک نوجوان چرواہا اپنے دو بڑے بڑے شکاری کتوں کے ساتھ اس کے پاس آیا۔ وہ پیروں میں چاریق* پہنے ہوئے تھا اور سر پر سفید نمدے کی سرخ کنارے والی مخروطی ٹوپی۔ کمر کی پیٹی سے بڑا سا خنجر لٹک رہا تھا اور ہاتھ میں لاٹھی لیے ہوئے تھا۔ اس نے خاموشی سے بابر کی طرف دیکھا اور چشمے کے کنارے بیٹھ کر چلو سے پانی پیا۔ پھر اس نے سیدھے کھڑے ہو کر موٹے کپڑے کے بغیر استر والے چوغے کی بغلوں میں ہاتھ پونچھے۔

"ارے یار، تیرا بادشاہ، تنا کنجوس ہے کہ تجھے پہاڑوں پر بھی ننگے پاؤں چلنا پڑتا ہے؟"

یہ گستاخانہ طرز تخاطب بابر کو بہت برا لگا لیکن اس نے ضبط کرتے ہوئے پوچھا

"کون سا بادشاہ؟"

"ارے سنا ہے کہ بابر جنگل دو کات میں رہتا ہے۔ تو اس کے آدمیوں میں سے ہے کیا؟"

بابر پرانے کپڑوں میں ملبوس پہاڑوں اور گھاٹیوں میں بھٹکتا رہا تھا، چہرہ دھوپ سے بری طرح سنولا گیا تھا لیکن ناک نقشے اور ہاتھوں سے اس کی عالی نسبی عیاں تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نکل جائے اس لیے مختصر جواب دیا

"ہاں بس یہی سمجھ لو۔"

چرواہے نے جو اپنے تشنا دے سینے کو لاٹھی پر ٹکائے بابر کا غور سے جائزہ لیے جا رہا تھا، سوالات کا سلسلہ جاری رکھا

---

* چاریق۔ خام چمڑے کے مضبوط جوتے۔

"وقت سے پہلے تو اپنا بادشاہ [illegible] ہے نا؟"

وہ مسکرا دیا۔

"یہی بہت ہے کہ میں چرواہا ہوں۔"

"لیکن تیرے بادشاہ نے تجھے اتنا کنگال [illegible] تیری خواہش بھی پوری نہیں۔"

اب بابر نے بھی چرواہے کا بغور جائزہ لیا۔ وہ بیس سال کا نوجوان تھا [illegible] سے شناسا تھے لیکن اندر کو دھنسی ہوئی سی آنکھیں اس [illegible] آنکھوں کی طرح [illegible] سے محسوس ہوتا تھا کہ بہت سی تلخیاں جھیل چکے ہوں۔

"یہ تم بادشاہ کے بارے میں اتنی باتیں کیوں پوچھ رہے ہو؟ اس سے کوئی کام ہے کیا؟"

"میں اس سے ان پہاڑوں پر تنہا ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔"

"اور اگر ملاقات ہو جائے تو اس سے کیا پوچھو گے؟"

نوجوان چرواہے نے غصے سے آنکھیں سکیڑیں۔

"پوچھوں گا کہ اس نے میرے بڑے بھائی اور والد کے سروں کو کیا کیا تھا۔"

"سروں کو؟ بابر؟ تم..... کس قبیلے کے ہو؟"

"چغرک قبیلے کا۔"

بابر کو اندجان کے کوہساروں پر مویشی پالنے والے چغرک یاد آ گئے۔ اس نے حیرت سے پوچھا۔

"تو کیا یہاں بھی چغرک سے بھاگ کر آ بسے تھے۔ ان دنوں تو میں چودہ سال کا بھی نہیں ہوا تھا۔ وہاں بابر ہم لوگوں سے بھیڑوں اور گھوڑوں کے گلے چھیننے کے لیے آ دھمکا تھا۔ چرواہوں نے انکار کر دیا تھا جس کے بعد بابر نے سب چرواہوں کو قتل کر دیا تھا اور ان کے سر کٹوا کر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ میں اپنی والدہ کے ساتھ وہاں پہنچا تو بس لاشیں پڑی نظر آئیں۔ سر غائب ہو تو میت کی شناخت بہت دشوار ثابت ہوتی ہے۔ والدہ کبھی ایک لاش سے تو کبھی دوسری سے، کسی اجنبی کی لاش سے لپٹ کر بین کرتی رہیں۔"

وہ بھیانک سماں جو کبھی بابر کا پیچھا کرتا رہا تھا، خوابوں میں پریشان کرتا رہا تھا، اس وقت ایک بار پھر اس کی نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ احمد تنبل کے ہاتھوں میں خون آلود بورا، اس کے سرخ پھولوں پر لڑھکتے ہوئے انسانی سر [illegible] ایک نوجوان کا سر کہ ابھی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں، کٹا ہوا سر، [illegible] گردن پر جما ہوا خون۔ بابر لرز اٹھا۔ اس نوجوان کا چہرہ ہو بہو اس کے سامنے کھڑے ہوئے چرواہے کے چہرے جیسا تھا!

بابر شاید صدمے کے زیر اثر پتھر پر سے اچھل کر کھڑا ہو گیا اور جلدی سے کہا

"تمہارے قبیلے کے لوگوں کو تو احمد تنبل نے قتل کیا تھا احمد تنبل نے!"

"تجھے..... کیسے معلوم ہوا؟ ... تو نے سر دیکھے تھے؟"

"ہاں، چرواہے [illegible] احمد تنبل نے کوہستانی چراگاہ میں دکھائے تھے۔ اس واقعے کو پورے چھ سال ہو چکے تھے۔ چغرکوں نے بغاوت کر دی تھی، تین چار سپاہیوں کو ہلاک کر دیا تھا۔ احمد تنبل نے ان کے قتل کا بدلہ لیا تھا۔"

"تنبل نے نہیں! دیکھنے والوں نے مجھے بتایا تھا۔ میرے والد کے سر کو بابر کاٹ کر لے گیا تھا!"

"لوگوں نے تمھیں غلط بتایا تھا۔ میں ... بھی جانتا ہوں۔ ان دنوں میں بھی کم عمر ہی تھا۔ پہاڑوں ... اصل میں
دشمن کی فوج ... میں تو اوش ہی میں رہ گیا تھا ... گھبراہٹ سے ساتھ کہا ... کے ساتھ ... ثبوت ...
ہو۔ اس کی یہ بوکھلاہٹ یقیناً شک پیدا کرنے والی تھی۔
چرواہے نے غصے سے پوچھا۔
"آخر تو ہے کون؟ کہیں بابر ہی تو نہیں؟"
کتوں نے اپنے مالک کی آواز سے اندازہ لگا لیا کہ یہ اجنبی کوئی خطرناک آدمی ہے اور وہ بری طرح ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہو کر زور زور سے غرانے لگے۔ بابر کا ہاتھ غیر ارادی طور سے اپنی کمر پر گیا لیکن اب وہاں نہ تلوار لٹک رہی تھی نہ خنجر۔ وہ تو نہتا گھوم رہا تھا۔
اسے لگا کہ کتے اس کے ننگے پیروں میں دانت گاڑنے ہی کو ہیں۔ خوف کے مارے اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا لیکن اس نے چرواہے سے آنکھیں ملا کر بڑے فخریہ انداز میں کہا
"میں بابر ہوں"
چرواہے نے بابر کے ننگے پیروں کی طرف دیکھا اور اسے بات کا یقین نہ ہوا۔
"تو بابر ہے؟ بادشاہ کہیں ایسے بھی ہوتے ہیں . . ."
"ہاں اب تو میں تاجدار نہیں ہوں۔ اب تو سب ختم ہو چکا ہے۔ اب میں صرف شاعر ہوں۔"
گزشتہ روز گاؤں کی ٹولی میں چرواہا بابر کی غزل سن کر بہت محظوظ ہوا تھا جس کے مقطعے میں شاعر کا نام بھی شامل ہوا تھا:

سیکھ لوں اب تو بنا یار کے جینا بابر
خوب کی سیر جہاں پہ نہ ملا یار کوئی

چرواہے نے سوچا ٹھیک ہی تو ہے، بے چارہ پہاڑوں پر تن تنہا گھوم رہا ہے، واقعی اسے کوئی یار نہیں ملا اور اس نے اپنے کتوں کو ڈانٹ دیا۔
"بیٹھ جاؤ" بورے تاق، تورت کوز، بیٹھ جاؤ!"
کتوں کو خاموش کر کے اس نے بابر سے کہا
"اگر تو واقعی شاعر بابر ہی ہے تو اپنی کوئی غزل سنا مجھے بہت سی غزلیں یاد ہیں، تصدیق کر لوں گا"
بابر زمین پر نظریں جما کر پل بھر سوچتا رہا پھر اس نے سر اٹھایا
"اچھا تمھیں یہ غزل بھی یاد ہے؟ لو سنو

مہرباں مجھ پہ نہ اپنا ہے نہ ہے بیگانہ
خوش نہیں کوئی بھی وہ غیر ہو یا جانانہ
نیکیاں لاکھ کیں لوگوں سے مگر قائل ہو جائیں
پھر بھی بدنام ہوا بن گیا میں افسانہ"

اشعار اور بابر کی آواز کے سوز و گداز سے چرواہا بہت متاثر ہوا اور اس کی آنکھوں سے غم جھلکنے لگا۔

"ہاں ... صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ تجھے کسی طرح بھی شک نہیں ہے [illegible] تو تیری [illegible] اس کا مطلب یہ ہو کہ میرے [illegible] کو باہر سے کسی نے قتل کیا تھا [illegible] مقتول ... لیکن نوجوان اپنے سابق بچوں سے الگ ہے [illegible] تو جھگ رہا ہوں۔"

چہرے سے یک بار پھر بابر کے ننگے پیروں پر نظر ڈالی۔

"میں تیری اس بات پر یقین کرنا چاہتا ہوں۔ یقین [illegible] آپ والد اور بھائی [illegible] کتوں کو تجھ پر چھوڑ دیتا اور یہ تیری ہچکیاں [illegible]"

بابر کو کچھ یاد نہ رہا کہ [illegible] کی بولی سے نیچے [illegible] تک پہنچا۔ [illegible] ناگزیر بے انصافیوں کے ساتھ، ہوس اور غفلت کے ساتھ اس ناقابل [illegible] مظالم کو اس کے ساتھ منسوب کرتے تھے۔ بابر کا ضمیر [illegible] کے سبب کتوں کی طرح اس پر غرا رہا تھا [illegible] تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ اپنے ضمیر کو کیسے مطمئن رکھے۔

لیکن دہ کات میں تو اس سے بھی زیادہ بھیانک واقعات اس کے منتظر تھے۔

شیبانی کے دستے اوراتیپا پہنچ چکے تھے۔ دہ کات کا مقدم خریداری کرنے کے لیے شہر کے بازار گیا تھا جہاں اسے صحرائی علاقوں کے رہنے والے ان سپاہیوں نے پکڑ کر یہ معلوم کرنے کے لیے کہ بابر کہاں چھپا ہوا ہے، خوب زدوکوب کیا تھا۔

بوڑھے تاجیک نے جس کے چہرے پر چابک کی ضربوں کے نشانات پر خون جما ہوا تھا، بابر سے کہا:

"کمینہ تھوڑی ہوں، جو اپنے مہمان کے ساتھ غداری کروں! میں آپ کے دشمنوں کو آق تنگی گھاٹی میں لے گیا اور وہاں خود جھاڑیوں میں چھپ رہا۔ ان کم بختوں کو گھاٹی سے نکلنے میں سخت دشواری ہو گی لیکن میں منڈو کوہستانی پگڈنڈیوں سے گاؤں لوٹ آیا۔"

آق تنگی گھاٹی دہ کات سے مشرق میں صرف پانچ فرسنگ کے فاصلے پر واقع تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ شیبانی خاں کے کھوجی کتے آج نہیں تو کل دہ کات آ پہنچیں گے، خاص طور سے اس لیے کہ جانی بیگ نے اس کے سر کے بدلے انعام کے طور پر کافی سونا دینے کا وعدہ کر رکھا تھا [illegible] سے اب یہاں سے چل دینا چاہیے تھا۔

بابر کی والدہ قتلوغ نگار خانم نے بھی اسی بات پر زور دیا:

"بابر جان، ہم سب کی تمام امیدیں آپ ہی سے وابستہ ہیں۔ عزیز . . . سب لوگ آپ کو جلاوطن بادشاہ تسلیم کر لیتے ہیں، کسی اور بات پر کوئی بھی یقین نہیں کرتا۔ حصار میں بلکہ ہر جگہ بڑے بڑے بیگ آپ کے منتظر ہیں۔ خود شیبانی خاں کے لوگ بھی آپ کو تخت کا حق دار بادشاہ ہونے ہی کی بنا پر تلاش کر رہے ہیں . . . ہم نے تھوڑے دنوں تک دہ کات کا نمک کھایا ہے، آپ کا فرض ہے کہ گاؤں پر جو مصیبت نازل ہونے والی ہے اس سے اسے بچا لیں۔"

یہ بالکل درست بات تھی، اس کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ وہ ایک بار پھر ان لوگوں کی قیادت سنبھالے جو اس پر اعتماد رکھتے تھے، اس کی حمایت میں ہتھیار اٹھانے کو تیار تھے۔

برجستہ پڑھ کر بھی وہ اپنے مقدر سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا تھا

''محترم شیرم بیگ! میں آپ کو اپنا وزیراعظم مقرر کرتا ہوں۔'' (یہ شیرم بیگ بابر کا وہی سن رسیدہ ماموں تھا جو ایک زمانے میں اندجان سے بابر کے ساتھ والا تو بھاگ جانے کو تیار تھا۔ وہ اتنے برسوں تک وفاداری کے ساتھ خدمت کرنے کے بعد وزیر کے عہدے کے لائق تصور کیے جانے پر قطعہ رضامندی کے لیے بہماری مراسم کے بموجب کورنش بجا لایا) ''آپ ہماری اس خواہش سے سارے بیگوں اور سپاہیوں کو مطلع کر دیجئے۔ فوراً کوچ کی تیاریاں کی جائیں! ہم آج رات ہی وہ کات سے روانہ ہو جائیں گے!''

اور بابر ایک بار پھر زرہ پوش اور مسلح ہو گیا۔ اس کا دستہ اسی رات اسفرہ کی سمت، آفتاب طلوع ہونے کی سمت روانہ ہو گیا۔

۵

نشیب میں دریائے اسفرہ پتھروں سے ٹکراتا، چیختا چنگھاڑتا بہہ رہا تھا۔

بابر بلند چٹان پر بیٹھا تھا اور اس کی نگاہیں دوریوں پر جمی ہوئی تھیں۔ خوجند کے اس پار کہیں فضاؤں میں تیرتے ہوئے اجلے اجلے بربادوں کی پرچھائیاں کوہستانی ڈھلانوں اور چوٹیوں پر مرتعش تھیں۔ برف پوش چوٹیوں کی طرف سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آرہی تھیں۔ وادیاں موسم بہار کی گرم و سبز چادروں میں لپٹی ہوئی تھیں۔

افق پر چھپے ہوئے ریشمی پردے کے پیچھے کہیں دور، بے حد دور چتقول پہاڑ واقع تھے اور ان کے آگے کبھی چہل پہل اور شور و غل سے معمور رہنے والا لیکن اب تباہ، ویران، خاموش تاشقند۔ بابر نے تصور ہی تصور میں جزخ اور سمرقند کو، مرغیلان اور اندجان کو دیکھا۔ کبھی وہ ان سب علاقوں میں آزادنہ گھومتا پھرتا رہتا تھا۔

لیکن اب سارے ماوراء النہر میں اسے سکون کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے سر چھپانے کی جگہ تک میسر نہ تھی۔ تمام علاقے یا تو احمد تنبل کے قبضے میں جا چکے تھے یا شیبانی خان کے۔ شیرم بیگ کے بابر سے خراسان چلنے پر مصر ہونے کا سبب یہی تو تھا۔

بابر اس تجویز سے متفق نہیں تھا۔ اسے جیسے پہلے ہی سے معلوم ہو گیا تھا کہ اگر وہ ماوراء النہر کو چھوڑ کر چلا گیا تو اپنے وطن سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائے گا، کبھی بھی واپس نہ لوٹ سکے گا۔ وطن سے محبت جس کا ماضی میں جب وہ وطن کے کسی بھی علاقے میں رہنے یا نہ رہنے کے لیے آزاد تھا، کوئی خاص احساس نہیں ہوتا تھا، اب بہت شدت اختیار کر چکی تھی اور اس کے اقدامات اور جذبات پر قوی اثرات ڈال رہی تھی۔

''میرے محبوب ماوراء النہر! میں تیرے کونے کونے سے جا چکا ہوں، تیرے تمام راستوں پر اپنی روح کا نور بکھیرا ہے۔ اپنے خوابوں کے بیج بوئے ہیں۔ میرے وطن، تیری دھرتی میں میری جڑیں بہت گہرائی تک پھیلی ہوئی ہیں۔ میں انھیں اکھاڑ لینے کی طاقت کہاں سے لاؤں؟ میرے عزیز وطن، تجھ سے جدائی کا غم کیا میں کبھی برداشت بھی کر سکوں گا؟''

نام نہاد احباب احمد تنبل اور شیبانی خان اب ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے کوشاں تھے۔ ماوراء النہر ایک بار پھر دو ایسے حکمرانوں کی جنگ کے مصائب میں مبتلا تھا جن کے لیے جگہ کم پڑ رہی تھی، درحقیقت جو امن کے ساتھ ایک دوسرے سے نباہ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ دونوں حریص کتے آپس میں لڑ مرتے تو بابر کے لیے راستہ صاف ہو جاتا۔۔۔

بابر نے اس امید میں کہ شاید ماوراء النہر میں مقیم رہنے کی کوئی صورت نکل ہی آئے، اپنے دو مخبروں کو جنگ کی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے اندجان بھیجا تھا۔ ان کی واپسی کا وہ بڑی بے چینی سے منتظر تھا۔

ڈیڑھ مہینے کا عرصہ بیت چکا تھا لیکن ابھی تک یہ مخبر اندجان سے واپس نہیں لوٹے تھے۔ بابر سے وقت کسی طرح کاٹے ہی نہیں کٹ رہا تھا۔ وہ مسلسل پہاڑوں پر بھٹکتا رہتا، سوچتا رہتا تھا کہ کیا کرے، کیسے قدم اٹھائے۔ وزیر اعظم قاسم بیگ موجود ہوتا تو کوئی تدبیر سجھاتا لیکن قاسم بیگ تو اسے چھوڑ کر جا چکا تھا۔ اس کا دلیر رفیق ہویان کولتاش بھی موجود نہ تھا، اسے تو گزشتہ سال ہی آہن گراں میں تمبل کے سپاہیوں نے کھائی میں پھینک کر ہلاک کر دیا تھا۔

جانے کتنے ہی لوگ اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ ان میں سے کچھ ہلاک کر دیے گئے تھے اور کچھ اپنی کمزوریوں کا شکار ہو کر دشمن سے جا ملے تھے۔ کچھ کے لیے اسے افسوس ہوتا تھا لیکن اوروں پر غصہ آتا تھا۔

اسے رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ کہیں شعر گوئی کی قوت بھی اس کا ساتھ نہ چھوڑ دے۔ وہ شعر کہنے کی کوشش کرتا تھا لیکن کوئی خاص کامیابی نہیں ہوتی تھی، مصرعے موثر طور پر ہم قافیہ ہی نہیں ہو پاتے تھے۔

شام ہوتے ہوتے پہاڑ پر کہرا چھا گیا۔ ریجہ کے درختوں کے جنگل کی کہرے سے ڈھکی ہوئی پگڈنڈیوں پر چلتا ہوا گھاٹی میں اتر کر دریا کے کنارے گیا۔ اس جگہ گھٹن اور سردی محسوس ہو رہی تھی، اندھیرا چھایا ہوا تھا، کہرے کی ایسی دبیز دیوار سی کھڑی ہوئی تھی کہ دریا کا پانی نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف تیز چنگھاڑ ہی سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اسفرہ دریا کہیں غائب نہیں ہوا، پتھروں کو مسلسل لڑھکاتا ہوا بہتا جا رہا ہے۔

بابر نے اسی دریا کے کنارے ایک کشادہ میدان میں پڑاؤ ڈالا تھا۔ وسط میں ایک ٹیلے کے اوپر خود اس کا نفیس بانات کا سرخ خیمہ نصب تھا اور پاس ہی قتلوغ نگار خانم کا آٹھ کونوں والا سفید خیمہ۔ باقی سب خیمے کچھ فاصلے پر گڑے ہوئے تھے۔

بابر کو لگا جیسے سب خیمے مختلف سمتوں میں ایک دوسرے سے بالکل الگ الگ نصب ہوں۔ خیموں کے اوپر کہرا پھپھوند کی طرح پھیلا ہوا تھا۔

راستے میں ملنے والے افراد تاجداروں کو کورنش بجا لانے کے انداز میں اسے سلام کرتے رہے اور وہ اپنے سر کو قدرے خم کر کے جواب دیتا رہا۔ درباری آداب کے بموجب وہ اپنے سر کو زیادہ خم نہیں کر سکتا تھا۔

وہ محمد علی کے خیمے کی طرف مڑ گیا جو اس کی کتابوں کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔ یہ ڈھیروں نادر قلمی کتابیں جنہیں اٹھانے کے لیے پانچ چھ اونٹ درکار ہوتے تھے، مخصوص صندوقوں میں، جن پر چمڑا منڈھا تھا، رکھی رہتی تھیں۔ ان صندوقوں میں نمی نہیں جا سکتی تھی اور یہ ہمیشہ بابر کے ساتھ رہتے تھے۔ بیمار سا نظر آنے والا زرد رو محمد علی بابر کی ہر فوجی مہم میں ساتھ جاتا تھا۔ بوڑھا کتابوں کی دیکھ بھال اسی طرح کرتا تھا جس طرح ماں اپنے بچے کی کرتی ہے۔

اس وقت بابر کیا پڑھنا چاہتا تھا؟ تاریخی کتابیں۔

محمد علی کو کتابیں چھونے سے قبل ہاتھ دھونے کی عادت تھی۔

"آپ کا یہ خادم ان کتابوں کو فوراً ہی آپ کے خیمے میں پہنچا دے گا، حکمران"

کچھ ہی دیر بعد بابر اپنے خیمے میں مشہور سپہ سالاروں اور تاجداروں کی زندگیوں کے تذکروں کا مطالعہ کرنے لگا۔

داستانی اور مرصع فقروں اور تشبیہات پر ناک بھوں چڑھانے لگتا تھا۔ ان واقعات کی صداقت کا حقیقت سے کوئی نسبت نہ

اور اب اس کے جسے کو آگے بڑھاتے بعد کے واقعات کی تفصیلات قلم بند کرتے ہوئے اسے یہ لگ رہا تھا جیسے اہم
ہو رہا ہو، جیسے وہ واشی رکھ رہا ہو۔

شاہی خاندان میں پیدا ہونے کی بنا پر وہ تاج وروں کے مقدر سے پیچھا نہیں چھڑا سکا تھا اس لیے اسے اس زندگی کی ناگزیر ذمے داریوں اور آزمائشوں کے بارے میں صاف گوئی کے ساتھ لکھنا ہی تھا۔ وہ جتنے بھی بادشاہوں سے واقف تھا ان میں سے کسی نے بھی اپنے تجربات کا تذکرہ دیانت داری سے نہیں کیا تھا لیکن اس نے سوچا کہ لوگ تو ہمیشہ ہی صداقت سے واقف ہونے کی شدید خواہش رکھتے ہیں۔ اگر وہ عوام کی اس پیاس کو بجھانے میں ذرا بھی کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پروردگار نے اسے جن صلاحیتوں سے نوازا ہے وہ رائیگاں نہیں گئیں اور لوگ اس کی ناکام زندگی سے عبرت حاصل کر سکیں گے۔

عوام، دوسرے افراد   یعنی یہ کہ وہ اپنی یہ سرگزشت صرف سچے ہی لیے نہیں، صرف اپنے دل کو سکون دینے ہی کے لیے نہیں لکھ رہا ہے؟" تو یہ بات ہے۔ اس سرگزشت کی مثال بھی شاعری ہی کی جیسی ہے۔ شعرا اپنے دل کی تشنگی بجھانے کے لیے کہے جاتے ہیں لیکن وہ دوسروں کے دلوں کو بھی مسخر کرتے اور عوام کے لیے نغموں گیتوں کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ کیا کسی کا نام مسرت ہے؟ شمشیر کے زور سے جو کچھ حاصل کیا جاتا ہے وہ کسی شمشیر کے زور سے چھین بھی لیا جاتا ہے۔ لیکن شاعری تخلیقات یا دانا مورخ کی تحریروں کو کسی بھی طرح چھینا نہیں جا سکتا۔۔

بابر کو کچھ پتا ہی نہ چلا کہ خدام نے چراغ کب روشن کیے، کھانا کب لا کر دسترخوان پر لگایا۔ وہ کچھ کھائے پیے بغیر ہی تمام رات لکھتا رہا۔

۲

پو پھٹنے سے قبل ہی طاہر اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا پڑاو پر آ پہنچا۔

بابر نے گھنٹہ بھر بھی آرام کیے بغیر فوراً اسے طلب کیا تاکہ اندجان کی خبریں معلوم کر سکے۔ تقریباً ڈیڑھ مہینے تک سارے واقعات سے بالکل بے خبر رہنا کوئی مذاق تھوڑی تھا۔

طاہر بابر کے خیمے میں جہاں چراغ ابھی تک روشن تھے، دیر تک اندجان کے حالات بیان کرتا رہا۔ خاص بات اس نے سب سے پہلے ہی بتا دی تھی۔ اندجان پر شیبانی کا قبضہ ہو گیا تھا، اسے خوب لوٹا گیا تھا اور بہت سے شہری تہ تیغ کر دیے گئے تھے۔ ہلاک ہونے والوں میں بابر کا دوسرا مخبر بھی شامل تھا جو طاہر کے ہمراہ گیا تھا۔

طاہر تھکن سے بری طرح نڈھال ہونے کے باعث بڑی مشکل سے خود کو اپنے پیروں پر سنبھالے ہوئے تھا۔ بابر گدے پر بیٹھ گیا اور اس نے طاہر سے بھی بیٹھ جانے کو کہا۔

طاہر کو واقعات کی تفصیلات کیسے معلوم ہوئی تھیں؟ اس نے اندجان کے قریب ہی واقع ایک گاؤں میں کسی امیر کے ہاں گاڑی بان کی حیثیت سے ملازمت کر لی تھی۔ امیر کو ذرا بھی اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ اس کا یہ نیا گاڑی بان دراصل ہے کون۔ طاہر گاؤں میں لوگوں کی باتیں غور سے سنتا رہتا تھا اور ان سے محتاط انداز میں سوالات کر کے بھی بہت کچھ معلوم کر لیا کرتا تھا۔ پھر وہ امیر کا مال گاڑی پر لاد کر اس کی دوکان پر پہنچانے کے لیے شہر گیا تھا تو وہاں اپنی آنکھوں سے بہت کچھ دیکھ لیا تھا۔

عیاری، سنگدلی اور کھلے ہوئے وحشیانہ اندا‌ز میں۔ ایک اور بات بھی مذہبی تعصب میں بھی جو شیبانی سے شعر... زندگی کی کشش انصاف اور خود موت تک سے نفرت کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔

ہاں، اس فانی دنیا میں فاتح بننے کے لیے شیبانی خان جیسا بن جانا ضروری ہے۔ وہ بھی خوب روشن میں ... جو چاہتا تھا، اپنا بہت سا وقت اور قوت شاعری، فنون اور عمارات کی تعمیر کی نذر کر دیتا تھا، مجھے تو سیاست کی فکر... تھی اور ان ہی باتوں کی بنا پر میں شیبانی سے مات کھا گیا۔ لیکن جیت کا ہے کی ... انسانیت کی یا قنداری کی؟ یہ واضح نہیں ہے کیا؟

”میرے حکمراں“ چانک طاہر کی آواز نے بابر کی توجہ قنداری اور انسانیت کے خیالات سے ہٹا دی۔ ”آپ کے اس خادم نے سنا ہے کہ خان کے آدمی آپ کو بڑی سرگرمی کے ساتھ تلاش کر رہے ہیں۔ شاید ان کے ... میں پہنچ بھی چکے ہوں!“

واقعی اب جان کی حفاظت کی فکر کرنی تھی، جدوجہد کو جاری رکھنے کی فکر۔ تحمل کی شکست ان کے عزیز ترین چشمے پر ٹوٹ پڑنے والی ایک اور چٹان کی جیسی تھی۔ یہاں اپنے وطن میں چشمے سے پھوٹ کر باہر نکلنے کے سارے راستے بند ہو چکے تھے.... جلد از جلد پہاڑ کو پار کر کے خراسان نہ چلے جانے کا مطلب یہ ہوتا کہ اس کے یہاں سے بچ نکلنے کے واحد ممکن راستے کو بھی شیبانی بند کر دیتا۔

بابر یہ بھول کر کہ اس کے سامنے ایک عام سپاہی بیٹھا ہوا ہے، دبی ہوئی آواز سے تقریباً چیخ اٹھا: ”مجھ پر کم مصائب ٹوٹے ہیں کیا؟ اپنے وطن سے بھی محروم ہو جاؤں کیا؟“

طاہر نے دیکھا کہ بابر آبدیدہ ہو گیا ہے، اور اس نے اپنے آنسوؤں کو مشکل روکتے ہوئے مرتعش ہونٹوں سے کہا: ”جہاں پناہ، وطن سے دور زندگی گزارنا ہر شخص کے لیے دشوار ہوتا ہے، چاہے وہ بادشاہ ہو چاہے سپاہی یا کسان۔ میں تو کو اپنے وطن کو واپس نہ جاؤں گا۔ اس لیے واپس نہ جاؤں گا کہ مجھ سے آپ کی خدمت میں رہنے کا عہد لیا جائے گا اور اس لیے بھی کہ میں آپ سے بچھڑ نہیں سکتا.. اندجان سے یہاں تک کے سفر میں میرے بہت سے ارادے بدل گئے ہیں۔ اب میں آپ کے ساتھ ہی رہوں گا۔ ہمیشہ اور ہر جگہ“۔

بابر عرصے سے جانتا تھا کہ طاہر بہادر سپاہی اور دوسروں پر اعتماد کرنے والا سیدھا سادا انسان ہے، ان دہقانوں میں سے ہے جنہیں یقین ہوتا ہے کہ ہر قسم کی بدی اور بے انصافی سے صرف حکمراں کے ہاتھوں ہی نجات مل سکتی ہے۔

”لیکن آپ سب لوگ جیسا بادشاہ چاہتے تھے ویسا میں کہاں بن سکا“ چانک بابر نے کچھ یوں کہا جیسے خود اپنے خیالات کو جواب دے رہا ہو۔ ”اور کوئی بھی نہیں جانتا کہ مستقبل میں بھی ویسا بادشاہ بن سکوں گا کہ نہیں..“

طاہر خاموش ہو گیا۔ بابر نے بھی اپنی بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔ ایک جلاوطن بادشاہ، ایک سپاہی۔ دونوں خاموش آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور دبیز بانات کے خیمے کے باہر ہواؤں کے سنّاٹے سے انتہائی برہم ہو کر دریائے سُرخاب گرجتا رہا تھا۔

ایک دوسرے سے اتنے زیادہ مختلف دو افراد کو یکساں مصائب نے ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیا تھا۔ وہ دونوں جنگجوؤں کی حیثیت سے اتنے برسوں سے شانہ بشانہ برسرِ پیکار رہ چکے تھے، اس وقت پہلی بار کھل کر باتیں کر رہے تھے۔ طاہر نے شاہی خیمے کی دھندلی دھندلی روشنی میں وہ باتیں بھی کہہ دیں جنہیں کسی اور وقت ہونٹوں پر لانے کی

جرأت میں زیادہ تھا۔

"محترم مصری، یہ ایک معصوم سچائی ہے۔ لیکن آپ نے اپنے حقیقی عزیزوں کی مدد ہر گام کی ہے۔ آپ کی شرافت، آپ کی شجاعت اور دیانت داری کی بنا پر مجھے پورا یقین ہے کہ شاندار مستقبل آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ آپ کے دوستوں میں سے بہتوں کو حق تلفی ہو رہی ہے [illegible] کہتے ہی جاتے ہیں [illegible] سلطنت سے آپ [illegible] سب سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ مقدر کے سکندر ہیں۔"

طاہر اس وقت بے حد ہمدرد بڑے بھائی جیسا لگ رہا تھا جو چھوٹے بھائی کی مصیبت کی گھڑی میں اس کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کر رہا ہو۔ دراصل وہ بابر سے سات سال بڑا بھی تھا۔ بابر بھی اس وقت اسے اپنا بڑا بھائی تصور کر رہا تھا۔

"قسمت نے آپ کے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے جیسے سوتیلی ماں ہو۔ ظالموں اور سنگدلوں کا پلہ بھاری رہا ہے لیکن ان کا دور ختم ہو جائے گا، جلد ہی وہ زمانہ آئے گا جب لوگ آپ کی ہیبت اور طاقت کے قائل ہو جائیں گے مگر فی الحال" طاہر تن کر بیٹھ گیا، "فی الحال تو ہمیں سمرقند سے جلد از جلد چل دینا چاہیے۔ ہرات کی آخر آپ کے لیے کوئی غیر جگہ نہیں ہے۔ حسین بیقرا آپ کے رشتے دار ہیں۔ میرے ماموں فضل الدین بھی یقیناً ہرات ہی میں رہتے ہوں گے۔ ہمیں ایسے کوہساروں کو پار کرنا ہے جن کی نیلگوں آسمان کے پس منظر میں چمکتی ہوئی برف پوش چوٹیوں کا نظارہ انسان کو مسحور کر دیتا ہے۔ یہ پہاڑ خطرات سے خالی میدانی علاقوں کی دوریوں سے دیکھنے والوں کو کتنے مہیب اور پرخطر کہاں معلوم ہوتے ہیں جتنے ان افراد کو معلوم ہوتے ہیں جو کھڑی چٹانوں پر رینگتے ہوئے، غاروں کو پھلانگ کر پار کرتے ہوئے ان کے اوپر چڑھتے ہیں۔ بلندیوں پر چڑھتے ہوئے افراد کو تو چوٹیوں کی سفید برف کفن جیسی معلوم ہوتی ہے اور برف کے تودوں کے انبار خود موت کا دائمی مسکن۔"

"پرخطر راستوں پر میں اپنی زندگی پہلے اللہ کے ہاتھوں میں سونپتا ہوں اس کے بعد آپ کے ہاتھوں میں طاہر بیگ۔"

بابر نے تلوار جیسی تیز دھار والی برف سے ڈھکے ہوئے عظیم الشان کوہساروں پر نظر ڈالی تو اسے ایک بار پھر گری ہوئی چٹانوں کے نیچے دب جانے والا اپنا چشمہ یاد آ گیا۔ اس نے سوچا کہ کیا وہ چشمہ سلسلہ کوہ کی دوسری جانب دوبارہ پھوٹ نکلے گا؟ ان بلند کوہساروں سے آگے عظیم پامیر تھا اور پامیر سے آگے ہمالیہ اور ہندوکش

دوسرا حصہ

گردشِ فلک

ہرات اور مرو

1

ہرات کے باغات کی سینچائی کرنے والی شفاف ندیوں انجیل اور ہری رود کی سطحیں اور کنارے پیلی پیلی پتیوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ مضافات شہر میں واقع انگور کے مشہور چمنوں اور انار کے باغوں پر اداسی چھائی ہوئی تھی، برہنہ بیلوں اور شاخوں پر موسم گرما کی ہریالی کے بچے کھچے آثار عجب دردناک سماں پیش کر رہے تھے۔

لیکن شہر میں سب کچھ خزاں رسیدہ ہی نہ تھا قندھار سے ہرات آنے والی شاہراہ سے نکلتے ہوئے راستوں کے کنارے کنارے لگے ہوئے صنوبر کے ہزاروں آسمانی نقرئی درختوں کی موسم بہار کی تازگی اور توانائی جوں کی توں برقرار تھی۔

وسیع پختہ ذخیرہ آب کے جو حسین میقرا کا حوض کہلاتا تھا، چاروں طرف لگے ہوئے لسان الطائر کے سڈول درختوں کا بھی خزاں کچھ نہیں بگاڑ سکی تھی۔

طاہر نے سن تھا کہ لسان الطائر کی پتیاں پھوڑوں پھنسیوں اور زخموں کے علاج میں بہت موثر ثابت ہوتی ہیں۔ اس نے حوض کے قریب ہی گھوڑے کو روک کر لگام سپاہی کو تھمادی اور ان شفا بخش پتیوں کو توڑنے کے ارادے سے حوض کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ اتنے میں آگے سے کسی نے آواز دی،

"ارے بیگ، ذرا ٹھہر جائیے!"

ایک درخت کے موٹے تنے کے پاس کوئی شخص کھڑا ہوا تھا۔ طاہر نے غور سے دیکھا اور فوراً اس کے دل میں خیال آیا کہ کہیں فضل الدین ماموں تو نہیں ہیں؟ لیکن اس شخص کی داڑھی اس کے ماموں کی داڑھی سے لمبی تھی اور چہرے سے بھی سن رسیدگی ٹپکتی تھی۔

"فرمایئے" طاہر نے ٹھہر کر ادب سے کہا۔

وہ شخص پل بھر تک طاہر کے زخم کے نشان والے چہرے کو تکتا رہا اور پھر طاہر کی آواز بھی پہچان لی۔

"طاہر، میرے عزیز بھانجے!"

طاہر اپنے ہاتھوں کو پوری طرح پھیلا کر فضل الدین کی طرف لپکا اور حوض کے شفاف پانی میں ان دونوں کے عکس ایک ہو گئے۔

"ارے بھانجے، تم اپنے ساتھ وطن کی خوشبو کو مجھ تک لے آئے! خدا کا ہزار ہزار شکر کہ تم زندہ و تندرست ہو۔"

فضل الدین طاہر سے الگ ہو گیا لیکن اس کا ایک ہاتھ تھامے رہا اور اپنے دوسرے ہاتھ سے مسرت کے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے اس کے سڈول اور قوی جسم کا بغور جائزہ لینے لگا۔ نقرئی پٹی، بیگوں کا جیسا قیمتی خنجر اور شاندار چوغہ۔

"کتنی اچھی بات ہے! جب تو مجھے آپ کے ہاں خالی ہاتھ نہیں، تحائف کے ساتھ جانا چاہیے۔"

"ارے طاہر جان! تم سے ملاقات ہو گئی، میرے لیے اس سے اچھا تحفہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ آؤ میرے ہاں چلو!"

طاہر نے آسمان کی طرف دیکھا۔ آفتاب غروب ہونے کو تھا۔

"تو کیا آپ کہیں نزدیک ہی رہتے ہیں؟"

"نہیں گھر تو دور ہے، شہر کے سرے پر نظر گاہ محلے میں۔ چلو گے؟"

"معاف کیجیے گا، ماموں جان۔ مجھے مرزا بابر کی خدمت میں جلد ہی حاضر ہونا ہے۔ انھوں نے یہی فرمایا تھا۔"

"یہ واقعی بڑے افسوس کی بات ہے۔ خیر کچھ دیر یہیں بیٹھ جاتے ہیں۔ تمھیں کم از کم جی بھر کے دیکھ ہی لوں۔ خود تمھارے حالات کیسے ہیں؟ شادی کر لی؟"

دونوں حوض کے کنارے پتھر کی بنچ پر بیٹھ گئے۔ طاہر نے رابعہ کو تلاش کرنے کا سارا قصہ کہہ سنایا اور آخر میں بتایا!

"کابل میں قسمت ہم پر مسکرائی، بیٹا تولد ہوا۔ ہم نے اس کا نام سہراب بیگ رکھا ہے۔ اس دوران ہم مسلسل سفر ہی میں تو رہے ہیں۔"

"خدا کا شکر ہے! ... سچ پوچھو طاہر جان تو میں ایک زمانے میں بالکل ہی مایوس ہو گیا تھا۔ سوچتا تھا کہ تم سے اب کبھی بھی ملاقات نہ ہو سکے گی۔ لیکن ہوا اس کے برعکس۔ بس سر سلامت رہنا چاہیے۔ تمھیں مصائب سے نجات مل چکی ہے، غموں سے بھی نجات مل جائے گی۔ لیکن اہلِ اندجان پر کیا بیتی؟"

"ارے ماموں جان، اس داستانِ غم کو نہ چھیڑیے! شیبانی خان نے وہاں جانے کتنے ہی لوگوں کو قتل کروا دیا! آج بھی مجھے راتوں کو خواب میں خون کی ندیاں بہتی نظر آتی ہیں، سوتے میں بڑبڑانے لگتا ہوں۔"

"اس دوزخ سے نکل بھاگنے میں تم لوگ کیسے کامیاب ہو گئے؟"

واقعی وہ لوگ شیبانی خان سے بھاگ نکلنے میں کیسے کامیاب ہوئے تھے؟ ان کے سفر کا سلسلہ روز و شب جاری رہتا تھا۔ لوگ تھکن سے بری طرح نڈھال ہو گئے تھے۔ رسد ختم ہو جانے کے باعث گھوڑوں اور اونٹوں کو ذبح کرنے کی نوبت آ گئی تھی۔ خود بابر نے اپنا گھوڑا اپنی والدہ کو دے دیا تھا اور پیدل چلنے لگا تھا۔ چاروں طرف پہاڑی پہاڑ تھے، کھڑی چڑھائیاں ہی چڑھائیاں تھیں۔ جوتے گھس گئے تھے اور سر چھپانے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔

بعض معمولی معمولی عہدے دار تک بابر سے گستاخی کرنے پر اتر آئے تھے، کہتے تھے "یہاں بیٹھے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں، آگے بڑھیے، حصار پہاڑیوں کو جلد از جلد پار کیجیے"۔ طاہر کو ان پر کبھی کبھی سخت غصہ آ جاتا اور وہ تلوار نکال لیتا تھا لیکن بابر ہر بار اس کے غصے کو ٹھنڈا کرتا اور کہتا تھا "بھئی ہمیں صبر سے کام لینا چاہیے۔ یہ لوگ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ ان کی نگاہ میں ہماری وقعت ہی کیا ہے؟ چلیے رفتار تیز کیجیے۔ ہمیں جلد از جلد دریائے آمو کو پار کر لینا چاہیے"۔

طاہر کو بعد میں پتا چلا کہ بادشاہ کی بات کتنی درست تھی۔ ان لوگوں نے آمو کو پار کیا ہی تھا کہ شیبانی خان نے حصار پر حملہ کر دیا۔ حصار کا حکمران خسرو اپنی بزدلی کے باعث لڑنے کی جرأت نہ کر سکا اور اپنے لشکر کو چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ زیادہ تر بیگوں نے ایک قاصد کے ذریعے بابر کے پاس خفیہ طور پر پیغام بھیجا۔ "تشریف لے آئیے، ہم حصار کو آپ کے حوالے کر دیں گے۔" لیکن بابر نے انکار کر دیا کیونکہ اسے یقین نہیں تھا کہ بیگ اس کے وفادار ثابت ہوں گے۔ اس نے جواب بھجوایا: "آپ لوگ واقعی میرے حامی ہوں اور آپ کو میری ضرورت ہو تو خود ہی یہاں آ جائیے۔"

"میں تو پیدل چلتا ہوں..... عادی ہو چکا ہوں.."

طاہر کو سخت ندامت محسوس ہوئی کہ اپنے ماموں کے مفلس ہو جانے کا اسے اب کہیں جا کر اندازہ ہوا ہے۔ اس نے چھٹی ہوئی لگام کو فیصلہ کن انداز میں فضل الدین کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا

"تو پھر یہ گھوڑا آپ کی نذر ہے"

"لیکن تم خود کیا کرو گے؟"

"اصطبل میں میرے دو گھوڑے اور بندھے ہیں۔ آپ سوار ہو جائیے گا"

اس نے نقرئی ملمع والے دستے کا چابک بھی جو اس کی پیٹی میں ٹھنسا ہوا تھا، نکال کر فضل الدین کو دے دیا

"ایک بار آپ نے بھی تو اوش میں مجھے اپنا گھوڑا دے دیا تھا۔ نیا لباس عطا کیا تھا، یاد ہے نا؟"

"میرے عزیز بھانجے، جان سلامت رہے تو لباس مل ہی جاتا ہے بیتی ہوئی باتوں کو یاد دلانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"کل میں، ماموں جان کے سارے خاندان کے لیے تحائف پہنچا کر سب کو مسرور کر دوں گا۔ ممانی جان اور دونوں بچوں کو سر سے پاؤں تک نئے لباس پہنچا دوں گا" طاہر نے دل ہی دل میں کہا۔

کچھ دوری پر موجود نوجوان گھڑ سوار سپاہی سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا کہ یہ کیسی ملاقات ہے۔ وہ ماموں بھانجے کو حیرت سے منہ کھولے تک جا رہا تھا۔

فضل الدین "انشاء اللہ کل ملاقات ہوگی" کہہ کر رخصت ہوا اور اس نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ طاہر نے فضل الدین کو جاتے ہوئے دیکھا اور پھر سپاہی سے دھیرے سے کہا:

"ارے عقل کے نرے دشمن ہی ہو گیا؟.. سپاہی گھوڑے پر اور بیگ زمین پر؟"

سپاہی کو احساس ہوا کہ اس نے لاپروائی میں گستاخی کی ہے اور وہ فوراً ہی گھوڑے سے نیچے کود گیا۔

فضل الدین نے مڑ کر دیکھا، طاہر گھوڑے پر بڑی آن بان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا (بیگ ہو گیا، صحیح معنوں میں بیگ!)۔ سپاہی سر جھکائے دھیرے دھیرے پیدل چل رہا تھا (خدا نہ کرے کہ کہیں طاہر بھی بیگوں جیسا مغرور و متکبر ہو جائے) فضل الدین نے تشویش کے ساتھ سوچا۔

۲

بابر کو شاندار محل انسیہ میں جو کبھی نوائی کا مسکن تھا، رہتے ہوئے سترہ دن ہو چکے تھے۔ اس کے بلند دروازے، نیلگوں گنبد اور آفتاب کی شعاعوں میں چمکتی ہوئی رنگ برنگی پچی کاری سمرقند کے الغ بیگ مدرسے کی یاد دلا رہے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ محل کے چاروں کناروں پر بنے ہوئے مینار الغ بیگ مدرسے کے میناروں سے کچھ زیادہ بلند تھے اور تعمیر کو چند ہی سال ہونے کے باعث بالکل نیا سا لگتا تھا۔

انسیہ کے کئی کمروں میں نوائی کا ذاتی کتب خانہ اب بھی موجود تھا۔

بابر اس کتب خانے میں کئی کئی گھنٹے قلمی کتابوں کے مطالعے میں گزار دیتا تھا۔ بعض کتابوں کے حاشیوں پر سے اس عظیم شاعر کے لکھے ہوئے مختصر تبصرے بھی دکھائی دیتے تھے۔ بابر کو نوائی کا وہ خط بار بار یاد آتا تھا جو اسے سمرقند میں

موصول ہوا تھا، وہ سوچتا کہ تب سے اب تک کتنی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں، کتنا انسانی خون بہہ چکا ہے۔

کتب خانے کے دروازے کے قریب ہی خوبصورت منقش الماری سے مشابہ گھڑی فرش پر رکھی ہوئی تھی۔ مقررہ اوقات پر الماری کے اوپری حصے میں رکھا ہوا ننھے بچے کا چھوٹا سا چوبی مجسمہ حرکت میں آ کر طلائی ہتھوڑی سے طشتری پر ضرب لگا کر شیریں جھنکار پیدا کر دیتا تھا۔ یہ گھڑی میر علی شیر نے اپنی پسند کے بموجب بنوائی تھی۔ اس کے نمونے کی گھڑیاں ہرات میں بہت مقبول ہو گئی تھیں اور (علی شیر ساعت) کہلانے لگی تھیں۔

بابر نے کتب خانے کے دروازے کو بند کر دیا اور گھڑی کو جسے کتنی ہی بار دیکھ چکا تھا، ایک بار پھر دیکھا۔ اس کے دل میں پھر سے یہ خیال آیا: (کتنی عجیب بات ہے کہ انسان دنیا سے اٹھ گیا لیکن اس کے کارنامے، اس کی زندگی کے خواب و خیال برقرار ہیں۔ گھڑی کی گھنٹی کیا یہ نہیں بتا رہی ہے کہ حیات ثانی ممکن ہے؟"

انیسیہ کے اندرونی کمروں اور باہری حصوں میں ہر جگہ محل کو تعمیر کرنے والے کی روح کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ بابر دروازوں کو اس خیال سے بہت احتیاط کے ساتھ کھولتا تھا کہ انھیں کبھی نوائی کے ہاتھ چھو چکے ہیں۔ وہ کمروں کی مختصر درمیانی گزرگاہوں اور سیڑھیوں پر اس احساس کے ساتھ ہوتے ہوئے قدم رکھتا تھا کہ اس شخص کے نقوش قدم پر چل رہا ہے جو کچھ عرصہ قبل تک زندہ تھا۔

احاطے کے کشادہ حوض کے چاروں طرف لگے ہوئے چنار کے درختوں کی گری ہوئی پتیوں کو ملازم نے جھاڑو دے کر ایک طرف ڈھیر کر دیا تھا۔ "کیا واقعی ہماری زندگیاں بھی ان ہی گری ہوئی پتیوں ہی سے مشابہ ہیں؟ کیا انھیں بھی بعد میں کوئی آ کر جھاڑ بہار کے ایک جگہ ڈھیر کرے گا؟" بابر نے سوچا۔ وہ ایک خوبصورت روش کی طرف مڑ گیا جس کے دونوں کناروں پر سرو کے سڈول سرسبز و شاداب اشجار کھڑے تھے۔ روش کے دوسرے سرے پر دو افراد اس کے منتظر تھے۔ ان میں سے ایک تو مورخ خواند میر تھا جو نوائی کا شاگرد اور اس کا ایک قریبی رفیق رہ چکا تھا اور دوسرا سن رسیدہ شخص صاحب دار جو بڑی دیر سے اپنے ڈنڈے کی ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ نوائی کو ان دونوں سے دل کھول کر باتیں کرنا خاص طور سے پسند تھا۔

"شاہ عالی، عظیم نوائی کے انتقال کے بعد یہ محل بے جان جسم بن کر رہ گیا تھا۔ آپ نے اس میں دوبارہ جان ڈال دی" صاحب دار نے اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا اور کورنش بجا لایا۔

تیس سالہ خواند میر نے اپنی تیز، سب کچھ تاڑ لینے والی آنکھوں سے بابر کو کچھ یوں دیکھا جیسے آزمانا چاہتا ہو کہ یہ پچیس سالہ اندجانی اتنے شائستہ اور پر ستائش تخاطب کا جواب کیسے دیتا ہے۔ اپنی عمر کے بموجب سادگی سے یا شاہانہ انداز میں ستائش کو ایک عام بات تصور کرے گا؟

بابر کا دل افسردگی اور ریاں کے جذبات سے بیٹھا جا رہا تھا۔ پر تصنع شاعرانہ زبان میں جواب دینے کو اس کا جی نہ چاہا اور اس نے سیدھے سادے لفظوں میں کہا

"نہیں جناب، نئی جان تو عظیم میر علی شیر کے اس مسکن نے خود میرے جسم میں ڈال دی ہے۔ پہلے تو میں اس کے خواب ہی دیکھا کرتا تھا، صرف خواب۔"

خواند میر نے مطمئن ہو کے سر ہلایا۔ صاحب دار بھی مطمئن ہو گیا۔

"آپ نے بجا فرمایا، عالی جاہ" وہ دوبارہ کورنش بجا لایا۔ "جس چیز پر بھی اس عظیم روح کا سایہ پڑ گیا تھا اس پر اس

کی گہری چھاپ پائی ہے۔ مثال کے طور پر از راہ کرم ذرا ان میناروں ہی کو دیکھئے" اور بوڑھے نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اپنے ہاتھ کو پہلے دائیں جانب اور پھر بائیں جانب گھمایا۔ بابر نے دونوں جانب جدھر اشارے کئے گئے تھے، دیکھا۔ رنگ برنگی چینی کاری والے چمکتے ہوئے بلند میناروں کے اوپری حصے آسمان کی نیلاہٹ اور بادلوں کی سفیدی کے پس منظر میں بہت خوبصورت معلوم ہو رہے تھے۔

ایسے میناروں کے اوپری حصے بارہ دری نما بنائے جاتے تھے تاکہ ان کے اوپر سے موذنوں کے اذان دینے کے علاوہ قرب و جوار کے علاقوں کا نظارہ کرنے میں بھی آسانی ہو۔ لیکن مدرسے کے میناروں پر بیچ میں خاص قسم کے گول برآمدے بھی بنے ہوئے تھے۔ صاحب دارا نے ان ہی کی طرف اشارے کئے تھے۔

"میر علی شیر بلندیوں سے ہرات کی خوبصورتی کا نظارہ کرتے تھے تو انہیں دلی سکون محسوس ہوتا تھا۔ لیکن ضعیفی میں انہیں اتنی بلندی تک چڑھنے میں دشواری ہوتی تھی اس لیے ان کے حکم پر معماروں نے میناروں کے بیچ ہی میں گول برآمدے بنا دیئے تھے۔

"کیا ہم بھی وہاں چڑھ سکتے ہیں؟"

"ہم آپ کو بڑی خوشی سے لے چلیں گے۔ مغربی مینار کی طرف تشریف لے چلئے۔"

صاحب دارا مینار کے نیچے ہی ٹھہر گیا اور نوجوان بابر اور خواند میر چکردار سیڑھیوں کو جلدی جلدی طے کر کے برآمدے میں پہنچ گئے

وہاں سے دکھائی دینے والے مناظر آنکھوں کو کتنی فرحت بخش رہے تھے! سامنے دوریوں پر برف پوش پہاڑیاں غار اور اسکنجہ دکھائی دے رہی تھیں۔ اوپر پیچھے انجیل ندی کا چاندی کی طرح چمکتا ہوا پتلا دھارا۔ ندی کے بائیں کنارے پر نوائی کی زندگی میں تعمیر کیا جانے والا گوہر شاد بیگم کا مشہور مدرسہ تھا اور دائیں کنارے پر بالکل سامنے نوائی کی زندگی ہی میں تعمیر کیا جانے والا دوسرا اتنا ہی مشہور مدرسہ اخلاصیہ۔ اس سے تھوڑی ہی دوری پر ہسپتال شفائیہ کی عمارت واقع تھی جہاں مریضوں کے علاج کے ساتھ ہی ساتھ علم طب کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ اس سے کچھ آگے بڑھ کر مسافر خانے خلاصیہ کی شاندار گنبد والی عمارت نظر آ رہی تھی جہاں بے خانماں افراد کو بھی سر چھپانے کی جگہ مل جاتی تھی۔

کتنا شاندار تھا ہرات کا حسن! نوائی کے منصوبوں سے کیسے کیسے معجزے رونما ہوئے تھے!

دوسری سمتوں میں بھی میناری مینار، گنبد ہی گنبد نیلگوں کوہساروں کی مانند شہر کے اوپر ابھرے ہوئے تھے۔ بابر کے سینے میں ایک بار پھر سمرقند جانے کی خواہش کروٹیں لینے لگی، دل محبت، کسک اور درد سے تڑپ اٹھا۔

"اچھا یہ بتائیے" بابر نے خواند میر سے کہا، "ایسی عالی شان عمارات جنھوں نے تعمیر کیں ان میں ماوراء النہر کے معمار بھی شامل تھے؟"

"لگتا ہے کہ عالم پناہ کو ہرات کے حسن میں سمرقند کے حسن کی بھی کچھ جھلک نظر آ رہی ہے؟"

"جی ہاں، اسی لیے تو دریافت کیا ہے"

"ہرات میں ایسے بہت سے معمار ہیں جو جسون تعلیم کے لیے سمرقند گئے تھے اور واپس ہوئے تو ان کے دلوں پر سمرقند کی تصویر نقش تھی۔ اس کے علاوہ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، بہت سے باصلاحیت افراد نے ماوراء النہر کو خیرباد کہہ کے یہاں میر علی شیر مرحوم کے ہاں پناہ لی تھی۔ ۔ اور ہمارے عظیم میر علی شیر کتنی صفات کے حامل تھے۔ لیکن آپ کے اس علم

بردار کو ان کی یہ خوبی دیگر خوبیوں سے کہیں زیادہ غیر معمولی معلوم ہوتی تھی کہ وہ فطری صلاحیت والوں کو تلاش کر کے انھیں اپنی محبتوں اور عنایتوں سے نوازتے۔ وہ ان کی صلاحیتوں کے فروغ کے مواقع فراہم کرتے تھے۔ میر علی شیر سے بہتر طور پر اس حقیقت کا اور کسی کو بھی علم نہ تھا کہ عظیم کارنامے عظیم صلاحیتوں والے افراد کے بغیر انجام نہیں دیے جا سکتے۔ وہ اپنے احباب اور مجھ جیسے شاگردوں سے اکثر کہا کرتے تھے۔ یاد رکھئے کہ رشک اور خود غرضی کے جذبات عموماً جاہل، بے علم اور بے مروت افراد کے دلوں ہی میں پیدا ہوتے ہیں۔ علم و فن کے اعلا و ارفع میدانوں میں تو جہاں خاص طور سے صلاحیت مندوں کے آگے بڑھنے کی راہیں مسدود کر دیتے تھے۔ ان کے جوہر کو ابھرنے کا موقع ہی نہیں دیتے۔ اسے پامال کر دیتے ہیں۔ جاہد کا رشک اس دنیا کی بدترین شے ہے۔ تھائی بلند پایہ فیاضی ان افراد کی فیاضی ہوتی ہے جو نادر صلاحیتوں والے افراد کو تلاش کرتے اور انھیں ترقی کرنے کا موقع دیتے ہیں۔"

"یہ بالکل درست ہے!" بابر بڑے جوش کے ساتھ کہہ اٹھا۔

اس داد سے خواند میر کا حوصلہ کچھ اور بڑھ گیا

"ہم شاگردان کسی طویل سفر کے بعد یا کئی دنوں کے وقفے سے میر علی شیر کی خدمت میں حاضر ہوتے تو وہ پہلا سوال یہی کرتے تھے "بڑی خوشی کی بات ہے کہ واپس گئے لیکن کسی نادر صلاحیت والے کو بھی تلاش کیا؟" ہم جنھیں تلاش کرتے تھے ان میں سے کئی ایک پندرہ سولہ سال کے اور بعض اوقات اس سے بھی کم عمر کے لڑکے ہوتے تھے۔ ہم لوگوں کو اپنی ان "دریافتوں" کا ذکر کرتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی تھی لیکن وہ ہمیں نصیحت کرتے تھے "ارے میاں، صلاحیت تو پندرہ سال کی عمر میں بھی نمایاں ہو جاتی ہے لیکن کند ذہنی چالیس کی عمر میں بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔۔۔ آپ نے جس نا سمجھ لیکن باصلاحیت لڑکے کو تلاش کیا ہے، اسے میرے پاس لائیے نا"۔ صاحب دارا ایک تاجیک زین الدین واصفی کو میر علی شیر کے پاس لائے تھے تو ان کی عمر صرف پندرہ سال کی تھی۔ یہی زین الدین نوائی کی حکمت و دانائی سے فیضیاب ہونے کے بعد چیستاں گوئی کے ماہر کی حیثیت سے جلد ہی سارے ہرات میں مشہور ہو گئے۔ عظیم مصور کمال الدین بہزاد نے بچپن ہی سے میر علی شیر کی شاگردی میں رہتے ہوئے اپنے فن کو اوج کمال پر پہنچایا۔ شاعر ہاتفی اور خطاط سلطان علی مشہدی کی صلاحیتوں کو بھی میر علی شیر ہی نے دریافت کیا اور پروان چڑھایا تھا۔ ان ہی سب باتوں کی بدولت یہ ہرات جو اس وقت ہماری نگاہوں کے سامنے درخشاں ہے، گزشتہ تیس برسوں میں پہلے کی بہ نسبت کہیں زیادہ عالی شان اور خوبصورت ہو گیا ہے۔ درست ہے نا؟"

"آپ کا خیال بالکل درست ہے۔ میں دنیائے اسلام کے جن علاقوں میں جا چکا ہوں وہاں ہرات جیسا عظیم شہر کہیں بھی نہیں دکھائی دیا۔"

"اور جہاں پناہ، ہرات کا یہ سارا حسن، یہ ساری عظمت کیا ہمارے عوام کے جنم دیے ہوئے باصلاحیت افراد کی تخلیق کردہ نہیں ہے؟"

"یہ بھی بالکل درست ہے! ہمیں نظر آنے والی یہ شاندار عمارات دنیا کو باصلاحیت لوگوں ہی کے ذہنی و فکری خزانے کے عطا کیے ہوئے در شہوار ہیں!"

"دراصل میر علی شیر کو ان خزانوں کو تلاش کرنے اور ان خزانوں کے حامل افراد کو لائق و قابل لوگوں کی حقیقی راہوں پر گامزن کرنے میں بڑا ملکہ حاصل تھا۔ ان کی اہمیت کا سلطان صاحب قران حسین بیقرا بھی اعتراف کرتے رہتے

تھے۔ آپ نے شاید سنا ہی ہو گا، محترم حکمران کی بہت سے خود غرض اور بدطینت لوگ میر علی شیر اور سلطان صاحب قران کے درمیان نفاق ڈالنے کو کوشاں رہتے ہیں.... اور یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں'' خواندمیر کی آواز مرتعش ہو اٹھی: ''کہ عظیم میر علی شیر پارسا و پرہیزگار تھے جبکہ سلطان صاحب قران عیاش تھے۔ وہ مدہوشی کے عالم میں ان سے بعض نازیبا حرکات بھی سرزد ہو جایا کرتی تھیں.... لیکن سلطان حسین بیقرا اپنی پرہیزگاری کے ایام میں جب کہ ان کی عقل روشن ہوتی تھی، میر علی شیر کو اتنی زیادہ عزت بخشتے تھے کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے تھے''

اتنے میں خواندمیر کو کوئی دلچسپ واقعہ یاد آ گیا، وہ قدرے پر اسرار انداز سے مسکرانے لگا۔ اس راز کو جاننے کی خواہش کے تحت بابر کا چہرہ غیر معمولی تجسس کا آئینہ دار بن گیا۔

میانہ قد خواندمیر ابھی خاصا جوان ہی تھا پر مسلسل بیٹھے بیٹھے کام کرتے رہنے کے باعث چربی چھا جانے سے جسم عجب بے ڈول سا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی موٹی موٹی انگلیاں بھوؤں پر پھیریں اور خوشی بڑے موثر انداز میں قصہ چھیڑ دیا:

''میر علی شیر نے اپنا ''خمسہ'' مکمل کیا جس سے ہم سب کو بے حد خوشی ہوئی۔ انھوں نے یہ کتاب مطالعے کے لیے سلطان حسین کی خدمت میں پیش کی جو جیسا کہ آپ کو معلوم ہی ہے، شعر و سخن کا بہت اچھا تنقیدی شعور رکھتے تھے۔ ''خمسے'' کے مطالعے کے بعد ہمارے حکمران نے میر علی شیر کو دربار میں طلب کیا اور سب کے سامنے انھیں مبارکباد دی۔ حسین بیقرا اپنے ایک قیمتی گھوڑے کو دوسرے تمام گھوڑوں سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ انھوں نے حکم دیا ''میر آخور، ہمارے سفید گھوڑے کو یہاں لایا جائے'' میر علی شیر نے حیرت کے ساتھ سوچا ''کیا واقعی ایسے گھوڑے کو تحفے میں دینا چاہتے ہیں؟'' پھر سلطان نے میر علی شیر کو دیکھتے ہوئے کہا: ''آپ اس سے پہلے شاعری میں میرے استاد ہوئے اور میں آپ کا مرید۔'' میر علی شیر نے گھبرا کر جواب دیا ''عالی جاہ، استاد تو آپ ہم سب ہی کے ہیں، یہ ناچیز تو آپ کا مرید ہے'' اس اثنا میں طلائی مسیحے والے ساز سے آراستہ گھوڑا دربار میں لے آیا گیا۔ تب حسین بیقرا نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا ''یہ فرمایئے کہ مرید کو اپنے مرشد کا کہنا ماننا چاہیے نا؟'' میر علی شیر نے اثبات میں جواب دیا۔ جس کے بعد بادشاہ نے فرمایا: ''تو اس گھوڑے پر سوار ہو جایئے!'' سلطان کی حکم عدولی کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا اس لیے میر علی شیر گھوڑے کے پاس گئے۔ پر وہ گھوڑا بے حد تند خو تھا، سلطان کے سوا اور کسی کو بھی سواری نہیں کرنے دیتا تھا، فوراً ہی زین سے گرا دیتا تھا۔ میر علی شیر کے قریب پہنچتے ہی گھوڑا پھنکارنے، چکر کاٹنے اور الف ہونے لگا۔ سلطان حسین نے اٹھ کر گھوڑے کی لگام خود ہی تھام لی اور گھوڑے کو دھمکایا ''چپ چاپ کھڑا رہ'' آخر گھوڑا پرسکون ہو گیا اور میر علی شیر اس پر سوار ہو گئے۔ درباری سانس روکے ہوئے بیٹھے تھے کہ گھوڑا بس اچھلنے کودنے ہی کو ہے۔ سب کو فکر تھی کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔ اور ہوا یہ کہ سلطان حسین گھوڑے کی لگام تھامے دربار سے نکل کر محل کے احاطے میں آ گئے اور وہاں اسے ٹہلانے لگے۔ ظاہر ہے کہ تمام درباری حیرت میں پڑ گئے تب سلطان صاحب قران نے گھوڑے پر سوار نوائی سے فرمایا: 'اس بات کے لیے کہ آپ نے ہماری ترکی زبان میں ''خمسہ'' لکھا ہے، میں تازندگی آپ کے گھوڑے کی لگام سنبھالنے کو تیار ہوں!'' اس بات نے سب کو اور بھی زیادہ حیرت زدہ کر دیا اور خود میر علی شیر تو فرط استعجاب سے بے ہوش ہوتے ہوتے بچے۔ نوکروں کو انھیں گھوڑے پر سے اتارنا پڑا.... تو ایسے واقعات بھی پیش آتے رہتے تھے عالی جاہ...''

''لگتا ہے کہ مجھ پر آپ کی بات واضح ہو گئی ہے'' بابر نے ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"جہاں جلنے والے بے شعور فرد باصلاحیت لوگوں کا گلا نہیں گھونٹ پاتے اور ان لوگوں کے سبب فیض دوں وسے راستے کھول دیتے ہیں وہاں ترقی کی رفعتوں پر پہنچا جا سکتا ہے۔ سچ ہے نا؟"

بابر نے خوندمیر کے دل کی گہرائیوں میں روپوش خواہشات کا درستی اور وضاحت کے ساتھ ظہار کر دیا تھا۔ خوند میر نے محسوس کیا کہ اس اندجانی تاجدار کی شخصیت میں اپنا ایک ہم خیال مل گیا ہے اور اس نے مسرور ہو کے کہا:

"میں آپ کا قائل ہو گیا، عالم پناہ امیر علی شیر اور سلطان صاحب قران یقیناً اپنی عظمت کے اعتبار سے بے مثل تھے، ان کے دور میں آفتاب ہرات نصف النہار پر تھا۔ لیکن آفتاب نصف النہار پر پہنچنے کے بعد ڈھلنے لگتا ہے۔ میرا دل اس احساس سے لرز اٹھتا ہے کہ ہرات پستیوں کی طرف لڑھکتا چلا جا رہا ہے۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ جو تاریکی ہماری طرف امنڈتی چلی آ رہی ہے اس سے کیسے بچیں؟

خوندمیر نے پیش بینی کر لی تھی کہ ماوراء النہر سے شیبانی خان اور اس کے لشکر کے ساتھ جنگ کی تباہ کن آندھی خراسان کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہوئی ہرات کی طرف بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا بابر ان تکلیف دہ سوالات کا اوروں سے بہتر جواب دے سکے گا؟

"آپ کے شکوک بجا ہیں" بابر نے بطور تائید سر ہلایا۔ "مجھے تو ہرات کا موجودہ امن عارضی ہی لگتا ہے، خطرناک طوفان کی آمد سے قبل کے سناٹے جیسا۔ میں تاشقند پہنچا تو تو مجھے اس شہر کی فضا بھی ہرات کی موجودہ فضا جیسی ہی لگی تھی۔ میں نے بے شمار مصائب جھیل کر بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دوزخ سے نکل کر تاشقند پہنچا تھا۔ میں نے اپنے ماموں محمود خان سے کہا کہ متحد ہو کر فوجی اقدام کرنا چاہیے تاکہ آپ کو یہ مصائب نہ جھیلنے پڑیں لیکن انھوں نے میرا مذاق اڑایا اور جلد بازی سے کام لیا۔ دراصل وہ نااہل لوگوں میں سے تھے اور دوسروں سے حد سے زیادہ رشک کرتے تھے۔ شیبانی خان نے محمود خان کو کس طرح کچل کے رکھ دیا یہ آپ کو معلوم ہی ہے۔"

"تو کیا شاہ عالی، واقعی یہی سب ہرات میں بھی دہرایا جانے لگا؟"

بابر نے کوئی جواب نہ دیا، وہ صرف فضا میں معلق غبار کے باعث دھندلائی ہوئی دوریوں کو تکتا رہا جہاں ہرات کے شمال مغرب میں سے کراں ریگستان ساق سلمان کی ریت پھیلی ہوئی تھی۔

خواند میر جانتا تھا کہ ہرات میں بابر کی آمد کا مقصد خانوادہ تیموری کے بچے کھچے حکمرانوں کو ایک پرچم کے تلے جمع کر کے شیبانی خان کے خلاف طاقتور محاذ قائم کرنا ہے۔ اس سلسلے میں سترہ دنوں سے محل میں خفیہ مذاکرات جاری تھے۔

"جہاں پناہ میں نہ ریاست کے رازوں کو جاننے کی جسارت کر سکتا ہوں، اور نہ ہی اس بات کو کہ حکمرانوں کے درمیان کس مسئلے پر گفتگو ہو رہی ہے۔ تاہم خطرے کی نوعیت تو ہم سب کے لیے یکساں ہی ہے"

"یہاں ہم اکیلے ہیں" بابر نے خوندمیر کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں آپ سے کچھ راز نہیں رکھنا چاہتا۔" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے ذرا تیکھے لہجے میں کہا "آپ جانتے ہی ہیں کہ اس وقت دو حکمران، دو بھائی ہرات کے تخت پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

"جانتا کیوں نہیں۔ تخت نشینی کے جائز حقدار بدیع الزماں ہیں۔ لیکن خدیجہ بیگم کے طرفداروں نے مظفر مرزا کے دوسرے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔ تاریخ میں ایسی مثالیں کم ہی ملتی ہیں۔"

صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ خوندمیر واقعات کے ایسا رخ اختیار کر لینے سے خوش نہیں ہے۔ بابر نے محتاط انداز میں اپنی

بات جاری رکھی

''ہاں تو ... آپ کے دونوں ہی بادشاہ مہمان نوازی، مہر و محبت کی گفتگو اور شاندار ضیافتوں کے اہتمام میں اپنا کوئی جواب نہیں رکھتے۔ رہی جنگ و جدل کی بات تو کہیں سے ان کے مزاج خاک بھی لگاؤ نہیں رکھتے۔ اس بیان کا اظہار میں ذاتی تجربے کی بنا پر کر رہا ہوں۔ دریائے مرغاب کے کنارے ان دونوں سے میری ملاقات کے وقت ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا تھا ... خبر موصول ہوئی کہ شیبانی کا ایک دستہ چیچکتو کی گھاٹی میں جو خراسانی علاقہ ہے، گھس آیا ہے۔ خود خان اپنے لشکر کے خاص حصے کے ساتھ دریائے آمو کے دوسرے کنارے پر تھا۔ اس کی بہ نسبت ہم لوگ چیچکتو میں دشمن کے بس پانچ چھ سو سپاہی ہی ہیں تو ہمیں تاخیر نہ کرنی چاہیے، چلئے جلدی سے وہاں پہنچ کر حملہ آوروں کو مار بھگائیں تاکہ شیبانی خان کے دوسرے دستے خراسان پر پھر کبھی حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکیں۔ لیکن ... بدیع الزماں مرزا چاہتے تھے کہ چھوٹے بھائی مظفر مرزا اس مہم پر روانہ ہوں۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ دونوں کے وزیر، خدام، فوج و سپہ سالار سب کچھ الگ الگ ہے۔ مظفر مرزا نے کبھی کوئی جنگ نہیں لڑی ہے، وہ خائف ہو گئے اور چیچکتو جانے کی ہمت ہی نہ کر سکے۔ انھوں نے کہا ''بہتر ہوگا کہ ہمارے بڑے بھائی وہاں جائیں، ہم دوسری سرحدوں کی حفاظت کریں گے۔'' اور بدیع الزماں نے کیا سوچا؟ میرے خیال میں انھوں نے یہی سوچا ہوگا ''میں جاتا ہوں تو بہت ممکن ہے کہ لڑائی میں کام آ جاؤں، اور تب میرا بھائی تخت و تاج کا واحد مالک ہوگا''۔ چنانچہ وہ بھی جانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ ان دونوں کی یہ طویل تو تو میں میں مجھ سے برداشت نہ ہو سکی اور میں نے کہا ''مجھے اجازت دیجئے تو میں خود ہی اپنے بہادروں کے ساتھ جا کر دشمنوں کو بھگا آؤں''۔ دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، انھیں لوگوں کی موجودگی میں شاید خفت محسوس ہوئی اور مجھے جواب دیا ''آپ تو ہمارے مہمان ہیں، بہتر ہوگا کہ ہم سب ساتھ ہی ساتھ ہرات چلیں''۔ انھوں نے میری میزبانی تو خوب کی لیکن چیچکتو پر شیبانی کا قبضہ ہو گیا۔ ہے نا عجیب سی بات؟''

خوندمیر نے گہری ٹھنڈی سانس لی

''ہرات سے تقدیر نے منہ پھیر لیا ہے، جہاں پناہ... آپ اوروں سے بہتر طور پر جانتے ہیں کہ آج ہمارے سروں پر مصائب کے کیسے کیسے بادل منڈلا رہے ہیں۔ مصور بہزاد کا بھی یہی خیال ہے۔ ہرات کے تمام صاحبانِ علم و فن کی جو شہر کے سچے خیرخواہ ہیں، ساری امیدیں آپ ہی سے وابستہ ہیں۔ شاید آپ ہمارے حکمرانوں کو یقین دلا سکیں کہ خطرہ کتنا سنگین ہے جس کے بعد ہم اپنی مشترکہ کوششوں سے اس خطرے کو ٹال سکیں گے۔'

''میں کچھ کہہ نہیں سکتا، جناب، کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔'' اور بابر نے اپنی نگاہیں فرش پر گاڑ دیں۔ ''مجھے جلدی آپ کے تاجداروں سے ملاقات کرنی چاہیے۔''

''خدا کرے آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہوں، جہاں پناہ!''

''شکریہ... لیکن میں کچھ کہہ نہیں سکتا، کچھ بھی نہیں کہہ سکتا... ''

مینار سے نیچے اترتے وقت بابر نے ٹیلے پر بنے ہوئے ہرات کے شاہی محل کو معاندانہ نگاہوں سے دیکھا۔

۳

دونوں تاجدار اوران کے مقرب امرا اور وسا شاید اس وجہ سے کہ موسم خزاں کچھ گرم تھا، اپنا وقت فصیل شہر سے باہر واقع باغات میں گزار رہے تھے۔

شہر کے شمال مغرب میں واقع سفید سنگ مرمر کے محل "باغ سفید" میں جسے عہد شاہ رخ ہی سے شہرت حاصل تھی، مظفر مرزا نے بابر کے اعزاز میں ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کیا تھا۔ ہرات کے نامی رکاب دار ریگستانی ہرن کے نرم گوشت کے سیخ کباب تیار کر رہے تھے اور زیرے اور دیگر مسالوں کی سوندھی خوشبو والے مختلف کھانوں کی قابیں لیے جو دیگرے محل کی سنہرے بیل بوٹوں سے آراستہ دیواروں والی اوپری منزل میں لائی جا رہی تھیں۔ دروازے کے قریب بیٹھے ہوئے سازندوں نے مسرور کن شیریں دھنیں چھیڑ رکھی تھیں اور مشہور و معروف مغنی نیچی آواز میں نشاط و غم کے ملے جلے جذبات سے معمور پراثر گیت گا رہے تھے۔

ضیافت شباب پر پہنچ چکی تھی تو ساقی بابر کے پاس آ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اس نے صراحی سے تیز اور مسالے دار میں سالے ناب طلائی جام میں انڈیلی۔ بابر نے اس وقت تک دختر رز کو کبھی بھی منہ نہیں لگایا تھا لیکن جانے گیتوں اور موسیقی کے زیر اثر یا اپنے یا سب ہی کے دلوں پر چھائی ہوئی افسردگی کے زیر اثر اچانک اس کا جی چاہا کہ جو جام اس کی طرف بڑھایا گیا اسے خالی کر دے۔ اس نے عادتاً قاسم بیگ کی طرف دیکھا جو اس کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔

قاسم بیگ اس کی اجازت سے حصار چلا گیا تھا لیکن اسی سال اپنے سپاہیوں کے ساتھ بابر کے پاس لوٹ آیا تھا۔ کابل میں اسے ایک بار پھر بابر کے قریبی مشیر کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ قاسم بیگ مذہبی آدمی تھا، خود اس نے کبھی شراب نہیں پی تھی اور بابر کو بھی نشہ آور مشروبات سے دور رکھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔

"عالی جاہ" قاسم بیگ نے چپکے سے کہا "یہ تو آپ کو بدیع الزماں مرزا کی دعوت میں بھی پیش کی گئی تھی لیکن آپ نے نہیں پی تھی، یاد ہے نا؟ اس وقت پی لیں گے تو بڑے بھائی کو معلوم ہو گا اور شاید وہ برا مان جائیں۔"

ان الفاظ نے بابر کو دونوں بھائیوں کے الجھے ہوئے معاملات پر جو کسی طرح سلجھنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے، ایک بار پھر متوجہ کر دیا۔ اس نے بادہ نوشی کی خواہش کو دبا کر مظفر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"محترم مرزا، معافی چاہتا ہوں۔ میں نے کبھی بھی نہیں پی۔"

بادۂ ناب سے ڈرتا ہے" مظفر مرزا نے سوچا اور نشے کے اکھڑ پن میں ناشائستگی کے ساتھ زوردار قہقہہ لگایا۔

"مہمان عزیز، اندجان اور سمرقند میں لوگ شراب کی عطا کردہ مسرتوں سے خود کو محروم رکھتے ہیں کیا؟ وہاں آپ لوگوں کو اور کاہے سے مسرتیں حاصل ہوتی ہیں؟"

"میرے عزیز مرزا، سمرقند اور اندجان میں بھی اس نوعیت کی مسرتیں ضرورت سے زیادہ ہی پائی جاتی ہیں۔ لیکن آپ کے اس خادم کے لیے تو دوسری نوعیت کی فکریں اور..... مسرتیں ہی بہت تھیں .. اس سلسلے میں آپ کے برادر محترم بدیع الزماں مرزا نے بھی میری معذرت قبول کر لی تھی، انھیں ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی تھی کہ میں پابند شرع ہوں۔"

بدیع الزماں کا نام سن کر مظفر ذرا سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے سوچا ہونہہ، آخر میں بھی تو پابند شرع ہوں، یہ اندجانی نہیں پیتا تو یہ اس کی حماقت ہے۔ اس سے اصرار تھوڑی کروں گا اور اس کے اشارے پر ساقی نے بڑی مستعدی سے وہ جام بدیع

الغ مرزا کے دربار کے داستان بیگ رخن کو پیش کر دیا جسے اس نے مدعو کر لیا تھا۔ وہ کبھی یہ نہ سوچ سکتا تھا کہ چھوٹا بھائی بڑے بھائی کے خلاف کوئی سازش کر رہا ہے۔

رنگ رلیاں زور پکڑتی جا رہی تھیں۔ نشے کے عالم میں بیگ بار بار اپنی جگہوں سے اٹھ کر دیوان خانے کے بیچ میں رقص کرنے لگتے تھے۔ مشہور سکیبازوں* میرم برہنہ اور برھان ننگ کے درمیان جاری پر لطف نوک جھونک پر وقتے وقتے زوردار قہقہے بلند ہو رہے تھے کہ لگتا تھا چھت کا شاندار آرائشی پلستر اکھڑ کے گرنے ہی کو ہے۔

حسین بیقرا کے انتقال کو ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے تھے اور اس کے بیٹے اتنی بے پروائی کے ساتھ گلچھرے اڑا رہے تھے، وہ بھی ایسے زمانے میں جبکہ شیبانی خراسان کی سرحد پر پہنچ چکا تھا۔

قاسم بیگ نے اپنے غصے کو اس خیال سے کہ کہیں بھڑک نہ اٹھے، کہیں ان جاہل عیاشوں کو پتا نہ لگ جائے، دباتے ہوئے بابر سے چپکے سے کہا

"اس نکمے نوجوان بادشاہ سے تو اب آپ کی باتیں کرنے کا سوال ہی نہیں رہ گیا۔ ویسے بھی یہ اپنی مرضی کا مالک نہیں ہے، جو کچھ بھی ہوتا ہے اس کی والدہ خدیجہ بیگم کے حکم ہی سے ہوتا ہے۔ آئیے، چل کے ان ہی سے باتیں کریں۔"

"ضیافت ختم ہونے سے پہلے ہی اٹھ بیٹھنا نامناسب ہوگا، ہے نا؟"

"آپ کے اس خادم نے سب کچھ پہلے ہی سے طے کر رکھا ہے۔ بیگم صاحبہ بڑی بے صبری سے آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔"

آخر سکیبازوں کا مقابلہ ختم ہو گیا اور قہقہے تھم گئے تو بابر نے مظفر مرزا سے اس کی والدہ سے ملاقات کی اجازت مانگ لی۔

عظیم الشان محل کی تینوں منزلوں پر جگہ جگہ شمعیں روشن تھیں۔ بابر، قاسم بیگ اور مظفر مرزا کا ایک مقرب یوندوق بیگ جو ان دونوں کو خدیجہ بیگم کے پاس لے جانے کے لیے ساتھ آیا تھا، نرم اور خوبصورت قالینوں پر چلتے ہوئے تیسری منزل پر پہنچ گئے۔ بابر چند لمحوں کے بعد شروع ہونے والی دشوار گفتگو کے بارے میں سوچ رہا تھا اس کے باوجود دیوار پر بنے ہوئے نقش و نگار کو دیکھتا جا رہا تھا۔ اس طرز کی آرائش شاہ رخ کے حکم پر اس کے بیٹے بایسنقر کے لیے کی گئی جو خود بھی رنگوں اور نقاشی کا اچھا تنقیدی شعور رکھتا تھا۔

خدیجہ بیگم نے بابر سے اپنے شاندار دیوان خانے میں ملاقات کی۔ اس نے بابر کو جان بوجھ کر خود سے کچھ دور چھ پایوں کی جن پر سونے کے پتر چڑھے ہوئے تھے، میز کے پاس بٹھایا۔ میز کی چمکتی ہوئی سطح پر سیپ کا جڑاؤ کام بنا ہوا تھا۔ خدیجہ بیگم بڑی آن بان سے بیٹھی ہوئی تھی اور اپنی چالیس سال کی عمر کے باوجود خاصی سڈول اور حسین و جمیل لگ رہی تھی۔ اس کے عقب میں نمایاں ترین جگہ پر رکھا ہوا سونے کے تنے، زمرد کی پتیوں اور یاقوت کے گلبوں والا ایک عجیب و غریب پودا درخشاں تھا۔ اس کی ایک ٹہنی پر سونے کی بلبل دمکتے ہوئے ہیرے کو چونچ میں دبائے بیٹھی تھی۔ دروازوں اور دریچوں کے پردوں میں بھی چھوٹے چھوٹے قیمتی ہیرے چمک رہے تھے۔

چاندی جیسی چمک دمک والے سیاہ لباس میں ملبوس خدیجہ بیگم نے زیورات نہیں پہن رکھے تھے، صرف سر کی بلور سے مزین ٹوپی میں البتہ نادر موتی ٹنکے ہوئے تھے جو بیگم کی طرف براہ راست دیکھنے کی جرأت کرنے والے کی آنکھوں

---

* سکیبازی: حاضر جوابی کا مقابلہ

کو اپنی تابانی سے خیرہ کر دیتے تھے۔ شان و شوکت، امارت لیکن سادگی او بیوں حلقے میں موجود دوسری خواتین سادہ لباس پہنے ہوئے تھیں جو آنکھوں کو چندھیا رہے تھے لیکن جو ملکہ کی وضع قطع کہہ رہی تھی کہ وہ ان خواتین سے مختلف دولت پسند اور ذہانت کو عیش و آرام پر ترجیح دیتی ہے۔

بابر اس ماحول میں کچھ بوکھلا سا گیا اور گفتگو نہ شروع کر سکا۔ ویسے ان اجنبی خواتین کی موجودگی میں خطیر امور سلطنت پر گفتگو بھی کیسے جا سکتی تھی۔ خدیجہ بیگم پر سکون انداز میں لطف و عنایت کے ساتھ مسکرانے لگی۔

"میرے عزیز مرزا، آپ کوئی غیر تھوڑی ہیں، ہمارے رشتے دار ہیں اور یہ میری بہوئیں ہیں جو ہمارا بہت زیادہ احترام کرتے ہوئے شریک گفتگو رہیں گی" اور اس نے اچانک ناز و انداز کے ساتھ اضافہ کیا "جو باتیں کرنی ہیں، کیجئے نا۔ بھلا شرمانے کی کیا ضرورت"

"شکریہ" بابر بس اتنا ہی کہہ سکا۔

شمعوں کی مدھم روشنی میں خواتین کے متعلق جن کی آنکھیں اور نصف چہرے باریک سفید نقابوں سے ڈھکے ہوئے تھے، یہ کہنا مشکل تھا کہ کون کیسی ہے تاہم حنا آلود نازک ہاتھوں، بھرے ہوئے سینوں اور پتلی کمروں پر چپکے ہوئے ریشمی لباسوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بھی نوجوان ہی ہیں۔ تار اور بیگم نے حسن کے متعلق کہا جاتا تھا کہ مظفر مرزا کی سب سے دلکش اور بہت زیادہ محبت کرنے والی بیگم ہے، ساس کے کان کے پاس منہ لے جا کر چپکے سے کچھ کہا اور دھیرے سے ہنس پڑی۔ خدیجہ بیگم بھی ہنس پڑی لیکن زور سے، قدرے شرارت آمیز انداز سے، پھر اس نے سر جھکا کر بابر سے کہا:

"میرے عزیز مرزا، سنا ہے کہ ہرات کے اعلیٰ ترین شاہی خاندانوں کی حسینائیں بھی آپ پر محبت بھری نگاہیں نثار کرتی ہیں۔ لیکن پتا چلا ہے کہ آپ جیسا شجاع حکمران اور خوبصورت اور دلیر نوجوان بھی، آپ جیسا باصلاحیت شاعر بھی حرم کے بغیر کنواری زندگی بسر کر رہا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟"

بابر کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے نظریں پھیرتے ہوئے سوچا کہ آخر یہاں اس کے حرم یا کنواری زندگی کے تذکرے کا کیا تک ہے، سب کچھ تو جانتی ہیں پھر بھی دریافت کر رہی ہیں۔

"یہ سچ ہی ہے، ملکہ عالیہ" اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "شاید میری قسمت میں یہی لکھا تھا"

"میں تو سمجھتی ہوں کہ اب قسمت آپ پر مہربان ہو جائے گی۔ آپ ہرات میں رک جائیے، مظفر مرزا کے بھائی کی طرح رہیے۔ آپ دونوں ہی تیموری خاندان کے حکمران ہیں۔ ہرات میں ہم آپ کے لیے کوئی حسین و جمیل اور سلیقہ مند لڑکی تلاش کریں گے۔ آپ کی شادی کر دیں گے۔ اور ایسی شاندار ضیافت کا اہتمام کریں گے کہ نہ پوچھیے۔"

اس شوخ مذاق میں ایک سنجیدہ اشارہ مضمر تھا، بہت ہی سنجیدہ اشارہ۔ بابر پر فوراً ہی واضح ہو گیا کہ بظاہر سیدھے سادے معلوم ہونے والے ان الفاظ کے ذریعے چالاک اور دور اندیش خدیجہ اسے کیسی سازش میں پھانس رہی ہے۔ سلطان حسین بیقرا کے پوتے مومن مرزا کے قاتلوں کی حوصلہ افزائی کر چکی تھی اور اب لگ رہا تھا کہ بدیع الزماں کو بھی راستے سے ہٹانے کا منصوبہ بنا رہی ہے تاکہ اس کا بیٹا مظفر مرزا ہرات کا واحد حکمران بن بیٹھے۔ بابر نے سوچا کہ اگر وہ مظفر کا بھائی بن کر رہ جائے گا تو خدیجہ بیگم کے مقصد کے حصول میں وہ خود ہی معاون ثابت ہو گا تو پھر کون ہو گا۔

"میں آپ کا شکر گزار ہوں، ملکہ عالیہ کہ آپ میرا اتنا خیال کر رہی ہیں" بابر نے مصنوعی انکساری سے کہا۔ "لیکن

ہم سب کی راہ میں ایک رکاوٹ حائل ہے۔

''رکاوٹ کیسی؟''

''آپ مجھے معاف فرمائیں لیکن یہ بات ان خواتین کے نازک کانوں کے لیے قابل سماعت نہیں۔ معاف کیجیے گا۔''

اور بابر نے سر جھکا لیا۔ خدیجہ بیگم اپنی گرم کرسی پر تن کر بیٹھ گئی۔ اس نے آنکھوں سے اشارہ کیا اور خواتین باہر، کورنش بجا لاتی ہوئی دیوان خانے سے چلی گئیں۔

تب بابر نے بتدریج جوش میں آتے ہوئے وہ بات چھیڑی جس کا شادی وغیرہ سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ اس نے کہا کہ ہرات پر شیبانی خان کا حملہ یقینی ہے۔ ایسے میں جشنوں، ضیافتوں اور شادی بیاہ کی فکروں کو بالائے طاق رکھ کر سب کو زندگی اور موت کے سوال کی بنیاد پر جدوجہد کی تیاریاں کرنی چاہئیں۔

''شیبانی نے اندجان سے خوارزم تک، مرو سے ترکستان تک وسیع و عریض علاقوں پر تسلط قائم کر لیا ہے اور بے شمار سپاہی اکٹھا کر رکھے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ ہر جنگ کی تیاری بہت جی لگا کر کرتا اور میدان جنگ میں تیزی سے اپنے لشکر کو اتارتا ہے تو بہادر سے بہادر اور ہوشیار سے ہوشیار سپہ سالار بھی اس کے سامنے نہیں ٹک پاتے۔ میں یہ سب خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔''

بابر نے شیبانی خان کی فوجی طاقت اور اس کی سنگدلی کو ثابت کرنے کے لیے بہت سے دلائل پیش کیے۔ آخر کار خدیجہ بیگم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

''ارے مرزا، ہمیں یہ بتائیے کہ آخر ہم اس بلا کو ٹالیں کیسے؟''

''اس کا بس ایک ہی طریقہ ہے، اور وہ یہ کہ خاندان تیموریہ کے سب حکمرانوں کو متحد کیا جائے، صحیح معنوں میں متحد کیا جائے! جہاں جہاں ہماری حکومتیں اب بھی برقرار ہیں وہاں وہاں سپاہی بھرتی کیے جائیں۔ انھیں ایک ساتھ تربیت دی جائے تاکہ پچاس ساٹھ ہزار فوجیوں کا ایک لشکر تیار ہو جائے۔ اس لشکر سے موسم سرما کے پورے زمانے میں جنگی مشقیں کرائی جائیں اور کسی ایک سپہ سالار کی کمان میں میدان جنگ میں اتارا جائے۔''

''آپ کے خیال میں یہ 'ایک سپہ سالار' کون ہو سکتا ہے؟'' خدیجہ چونک اٹھی۔

قاسم بیگ نے فوراً ہی بابر کی طرف دیکھا۔ اس پر یہ بخوبی واضح تھا کہ مجوزہ لشکر کا ممتاز ترین سپہ سالار صرف بابر ہی ہو سکتا تھا۔ خود بابر بھی اس بات کو جانتا اور یہی چاہتا بھی تھا۔ لیکن روایات قدیم ہی سے یہ حقیقت واضح چلی آ رہی تھی کہ فوج جس کے قابو میں ہوتی تھی وہی حکومت بھی کرتا تھا۔ مشترکہ فوج کا سالار بابر کو ہرگز نہیں بنایا جا سکتا تھا، خدیجہ یہ کبھی بھی گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ اس کے بیٹے کے سوا کوئی اور حکومت کرے۔

بابر خدیجہ بیگم کو مطمئن کرنے کے لیے کہہ سکتا تھا، 'سپہ سالار مظفر مرزا بن سکتے ہیں۔' (اور وہ خود مظفر مرزا کا مشیر خاص) لیکن دیوان خانے میں دوسرے بادشاہ بدیع الزماں کا وزیر ذوالنون بیگ بھی موجود تھا۔ بھائیوں کا باہمی تنازعہ ویسے ہی کافی بڑھ چکا تھا۔

''سپہ سالار کون ہوگا اس کا فیصلہ تاجدار برادران کو کرنا چاہیے۔ ضیافتوں کا سلسلہ بند کر کے ملک کی حفاظت پر توجہ مبذول کی جانی چاہیے۔ اس وقت تو ایک دن بے حد اہمیت رکھتا ہے ملکہ عالیہ۔''

خدیجہ بیگم نے بدیع الزماں، مظفر مرزا، قاسم بیگ اور ذوالنون بیگ کی طرف دیکھا، جیسے ان کی رائے معلوم کرنا چاہتی ہو۔

ذوالنون بیگ نے اپنی بھنویں سکوڑ کر بس ایک بات کہی، جو کچھ دیر بعد ہی پیش گوئی ثابت ہوئی۔

"یہ کہ ہمارے مہمان اعلیٰ حضرت مرزا نے ہمیں شیبانی خان کی چالوں اور اس کی طاقت سے آگاہ کیا، یہ ایک اچھی بات ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ شیبانی خان نے خراسان میں قدم رکھا تو اس کی طاقت اور اس کی تلوار نے اس نے ماوراءالنہر کو فتح کیا ہے اسے یہاں توڑ دیا جائے گا۔ میں ایک بار پھر دہراتا ہوں اور مجھے اس کا یقین ہے، ملکہ عالیہ کو گھبرانے اور خوف زدہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔"

ذوالنون بیگ کی یہ بات جیسا کہ صاف ظاہر ہو رہا تھا خدیجہ بیگم کو بہت پسند آئی۔

"محترم بیگ، خدا کرے کہ شیبانی کی تلوار توڑ دیے جانے سے متعلق آپ کی پیش گوئی درست ثابت ہو۔ لیکن آپ کے ایسا سوچنے کی کوئی بنیاد بھی ہے؟" بابر نے اس بات پر متحیر ہو کر پوچھا کہ یہ لوگ اتنے زیادہ خوش امید اور ایسے شیخی باز ہیں۔

"یہ خیال صرف میرا ہی نہیں، محترم مرزا، ہرات کے معزز اولیا اور شیوخ بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔"

ذوالنون بیگ نے جھجکتے ہوئے خدیجہ بیگم کو التجا بھری نگاہوں سے دیکھا جو ازراہ کرم مسکرائی اور وضاحت کرنے لگی:

"مہمانانِ عزیز، ہمارے ہرات میں ایک بہت ہی مشہور بزرگ رہتے ہیں جو قطب کہلاتے ہیں۔ انھوں نے اب تک جتنی بھی پیش گوئیاں کی ہیں، سب سچی ثابت ہوئی ہیں۔ محترم ذوالنون بیگ کے وزیر بن جانے کے بعد ان بزرگ کو بشارت دی گئی کہ شیبانی خان کی تلوار کو ذوالنون بیگ ہی توڑیں گے۔ ہمارے ہاں کے قابلِ احترام نجومیوں نے ستاروں کے حکم سے اس پیش گوئی کی تصدیق بھی کر دی۔" خدیجہ بیگم اب کھل کر مسکرائی اور بابر کو لگا کہ وہ اس "دانش مند" وزیر کا کھلے عام مذاق اڑا رہی ہے۔ "اس کے بعد ہمارے شیوخ نے ذوالنون بیگ کے شانے پر پڑھا ہوا گنڈا باندھ دیا اور انھیں ایک لقب عطا کیا "ہزبر اللہ"۔"

ہزبر اللہ، شیرِ خدا، ہمیشہ فتح حاصل کرنے والا۔ بابر جانتا تھا کہ بہت سے عربی الفاظ کئی کئی معنی رکھتے ہیں۔ ہزبر کہ ہزبر شیر ہی کو نہیں بلکہ موٹی ٹھوس چیز کو بھی کہتے ہیں۔ اس نے سوچا کہ عربی کے لقب بھی کتنے پُرفریب ہوتے ہیں اور اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

"بھلا اس بات پر کون شک کر سکتا ہے کہ محترم ذوالنون بیگ صحیح معنوں میں ہزبر اللہ ہیں! اور ملکہ عالیہ نے بھی شیوخ اور پیرانِ دانا کی پیش گوئی کا تذکرہ بہت ہی بروقت کیا ہے۔ مجھے وہ دن یاد آ رہا ہے جب میں سرپل میں صرف اپنی طاقت کے بھروسے پر شیبانی سے کھلے میدان میں ٹکر لینے کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا۔ محترم قاسم بیگ بھی وہاں موجود تھے اور اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ اس موقع پر ایسے ہی پیروں اور نجومیوں میں سے ایک نے مجھ سے کہا تھا "خوش بختی کے آٹھ ستاروں کا سایہ ابھی آپ کے سر پر ہے۔ اگر آپ کل میدانِ جنگ میں اتریں گے تو فتح آپ کے قدم چومے گی۔" افسوس کہ اس نے مجھے ہزبر اللہ کا لقب نہیں عطا کیا تھا۔ میں نے اس لقب کے بغیر ہی، کمک کا انتظار کیے بغیر ہی اپنی فوج میدانِ جنگ میں اتار دی... اور شکست کھائی کیونکہ کیا تھا" بابر نے کسی طنز کے بغیر کہا۔ "اور اپنی اس غلطی کا خمیازہ آج تک بھگت رہا ہوں۔"

خدیجہ بیگم کے چہرے پر اداسی چھا گئی، ہونٹ بھنچ گئے لیکن ذوالنون بیگ نے بڑے تکبر کے ساتھ بابر کی بات کی

مخالفت کی

"محترم مرزا ہمارے ہرات کے پیر آپ کے سمرقند کے نجومیوں جیسے نہیں ہیں! ہرات جیسے عظیم شہر میں ہر پہلو دن غلطی نہ دہرائی جائے گی!"

"عقل کا اندھا کہیں کا!" بابر نے سوچا۔

بورندوق نے وزیر کو جو آپے سے باہر ہو رہا تھا، پرسکون کرنے کی کوشش کی

"محترم ذوالنون بیگ، ہمارے ذی جاہ مہمان ہماری خیر خواہی کے جذبے ہی سے تو دور سے یہاں تشریف لائے ہیں۔ ہمارے حالات واقعی بہت پر خطر ہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ ہمیں شیبانی خان سے ٹکر لینے کی فکر کرنی چاہیے اس معاملے میں تاخیر کی ذرا بھی گنجائش نہیں"

خدیجہ بیگم نے اس وقت دونوں بحث کرنے والوں میں سے کسی کی بھی طرف داری نہ کرنے اور انھیں نرمی سے قائل کرنے کا فیصلہ کیا

"ذی حرمت ذوالنون، آپ کو بخوبی احساس ہونا چاہیے کہ واقعی ہم لاپروائی نہیں برت سکتے اور ہمارے بورندوق بیگ کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ بار بار شکست کھانے والے کو خطرات کے معاملے میں رائی کا پہاڑ بنانے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ ہمارے عظیم مہمان بھی بالکل یہی کر رہے ہیں۔ ۔ مرزا صاحب، آپ ضرورت سے زیادہ پریشان نہ ہوں۔ اگر شیبانی خان نے ہرات پر حملہ کرنے کی حماقت کی تو اسے نتیجتاً اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا!"

"مجھے حیرت ہوتی ہے کہ خدیجہ بیگم جو زمانے کے اتنے نشیب و فراز دیکھ چکی ہیں، پیروں اور چاپلوس نجومیوں پر اعتبار کر رہی ہیں" بابر نے اگلے روز بدیع الزماں مرزا سے کہا۔

بدیع الزماں نے جو مشکل صورت دیکھ کر آنکھیں سکوڑنے کی عادت کے اعتبار سے بالکل اپنے والد حسین بیقرا پر پڑا تھا نفرت بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا

'حیرت کاہے کی۔ کچھ بھی کہیے، عورت ہمیشہ عورت ہی رہتی ہے۔ عورت کی عقل تو گدی میں ہوتی ہے۔'

'مگر اس کوتاہ بینی کے نتیجے میں تو سر پر بہت بڑی بلا نازل ہو سکتی ہے...'

"لیکن کر ہی کیا سکتے ہیں۔ ان ہی کی پر فریب سازشوں سے تو میرے لخت جگر مومن مرزا کو قتل کرا دیا گیا تھا۔"

"محترم حکمران، اس تکلیف دہ غلطی کو تو اب فراموش ہی کر دیجیے کیونکہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت آپ کے والد مرحوم نشے میں تھے۔"

"کبھی بھی نہیں فراموش کر سکتا میرے والد مرحوم کا اس میں ذرا بھی قصور نہ تھا۔ سلطان صاحب قرآں اپنے پوتے سے بے حد محبت کرتے تھے، اس کے اشعار تک انھیں زبانی یاد تھے۔۔ وہ مجھ سے بھی بہت محبت کرتے تھے۔ اس کے نزدیک میں صرف میں ہی ولی عہد تھا' خدیجہ بیگم ہم دونوں میں دشمنی کرانے کے طریقے تلاش کرتی رہتی تھیں۔ جب مومن مرزا ان کے بیٹے اور افسوس کہ میرے سوتیلے بھائی مرزا مظفر سے لڑتے ہوئے قید کر لیے گئے تھے تو وہ کسی غیر کی قید میں تھوڑی، اپنے چچا ہی کی قید میں تھے... لیکن خدیجہ بیگم کو جس طریقے کی تلاش تھی وہ انھیں مل گیا۔ انھوں نے مدہوش سلطان کے حکم سے مومن مرزا کو قتل کروایا اور اس طرح مجھے اور والد مرحوم کو ایک دوسرے کا جانی دشمن بنا دیا۔ اس کے بعد میرے بجائے خدیجہ بیگم کے بیٹے مظفر مرزا کو ولی عہد بنا دیا گیا موجودہ صورت حال ان ہی چالباز خاتون کے

کرتوتوں کا نتیجہ ہے! میں یہ جانتا ہوں کہ وہ مجھے عارضی طور پر برداشت کر رہی ہیں، مناسب موقع کی تلاش میں ہیں تاکہ مجھے ٹھکانے لگا کر مظفر مرزا کو ہرات کا واحد حکمران بنا لیں۔"

بابر نے بدیع الزماں کی توجہ شیبانی خان کی طرف مبذول کرنے کے ارادے سے پوچھا کہ کیا اسے خان کے بارے میں کوئی خبر ملی ہے۔

"خان خوارزم پر قبضہ کر کے سمرقند لوٹ گیا ہے۔"

"اور ہی حملہ کر دے گا؟ خوارزم پر لشکر کشی کے بعد سال دو سال آرام نہ کرے گا کیا؟"

ہونہہ، بابر نے سوچا، تو حیرت کا یہ دوسرا بادشاہ بھی بالکل بے خبر ہی ہے۔ اس کے پاس تو جیسا کہ صاف ظاہر ہو رہا ہے، شیبانی کے بارے کی خبریں لانے والے مخبر تک نہیں ہیں۔ دونوں بھائی اپنے اپنے مخبروں کے ذریعے ایک دوسرے کی سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ انہیں خاندان تیموری کے جانی دشمن شیبانی سے بھلا کیا واسطہ۔ اور بابر نے اس مدعے پر متحیر ہو کر بدیع الزماں کو ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی

"میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر جانتا ہوں حکمران کہ شیبانی خان کتنا دور اندیش اور مکار ہے۔ مجھے اس بات میں ذرا بھی شک نہیں کہ خان کے جاسوس درویشوں یا سوداگروں کے بھیس میں ہرات آتے رہتے ہیں اور ان کے ذریعے اسے سمرقند میں یہاں کی ساری خبریں ملتی رہتی ہیں۔"

بدیع الزماں نے اپنی لاپروائی پر بابر کے اس مخفی طنز کو محسوس کیا لیکن اسے مذاق میں ٹال دیا

"ارے مرزا صاحب، آپ کے جاسوسوں نے سمرقند سے کچھ نئی خبریں بھیجی ہیں کیا؟"

"یقین مانیے کہ میں جتنی عزت اپنے والد کی کرتا تھا اتنی ہی آپ کی بھی کرتا ہوں۔ میں آپ کا مہمان ہوں، اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر یہ عرض کر رہا ہوں کہ شیبانی اپنے دشمنوں کی لاپروائی سے فائدہ اٹھانے میں حاذق ہے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ شیبانی اس پر حملہ کر دے گا لیکن شیبانی ایک لشکر کشی کے بعد مقبوضہ علاقے میں اپنی تھکی ہوئی فوج کو چھوڑ کر فوراً ہی دوسرے اور تازہ دم لشکر کے ساتھ کسی اور جگہ حملہ کر دیتا ہے۔ اس کے حملے کی توقع نہ کرنے والا فوری طور پر اپنی طاقت کو مجتمع ہی نہیں کر پاتا۔ شیبانی کی ساری طاقت اس بات میں مضمر ہے کہ وہ اپنے سارے بھائیوں اور رشتے داروں کو جو اس کی کچھ بھی مدد کر سکتے ہیں، ساتھ لے کر لڑتا ہے۔ ایسے دشمن سے سابقہ پڑا ہے تو تیمور خاندان کے تمام حکمرانوں کو چاہیے کہ اپنے اختلافات اور جھگڑوں کو بھول جائیں۔ اگر ہم سب متحد نہ ہوں گے، ایک سپہ سالار کی کمان میں جنگ کی تیاریاں نہ کریں گے تو ہم مصیبت میں پھنس جائیں گے!"

"ایک سپہ سالار کی کمان میں، کیا مطلب؟ کون ہوگا، مرزا صاحب؟"

بابر پر اب پوری طرح واضح ہو گیا کہ دونوں بھائی یہی سوچ رہے ہیں "اگر میں نہ بن سکوں تو دوسرا بھی نہ بن پائے" خواہ وہ سلطنت جس کے لیے دونوں میں کھینچا تانی جاری ہے، ان دونوں یا ان کے چچیرے بھائی بابر کے قبضے میں رہے کی بجائے، اگر قسمت کو یہی منظور ہو تو کسی غیر کے قبضے ہی میں کیوں نہ چلی جائے۔

"تو آپ دونوں میدان جنگ میں بھی الگ الگ ہی اترنا چاہتے ہیں کیا؟" بابر نے پوچھا۔

"اور کیا صورت ہو سکتی ہے؟ دونوں کی فوجیں اور امرا الگ الگ ہی تو ہیں۔ مظفر مرزا پر مجھے ذرا بھی اعتبار نہیں۔ آپ کے ساتھ البتہ میں کسی بھی جنگ میں جانے کے لیے تیار ہوں۔ میرے عزیز مہمان، آپ ہرات میں ٹھہر جائیے

میرے لیے سامان بن جانا چاہیے۔ جس چیز کی بھی ضرورت ہو فرمائیے، انتظام کر دیا جائے گا۔'

دونوں بھائی آخر کسی بات پر متفق تھے تو صرف اپنی اس خواہش کے سلسلے میں کہ اگر حسب خواہ بابر اپنے سپاہیوں اور بیٹوں کے ساتھ ہرات میں ٹھہر جائے، اور وہ خطرے کی گھڑی میں شیبانی کے خلاف محض اس کے ساتھ مل کر میدان جنگ میں اترے، دوسرے بھائی کے ساتھ نہیں۔

بابر کو حسین بیقرا کے دو بیٹوں کا یہ مشترکہ اقتدار اس کشتی جیسا معلوم ہوا جس کے پیندے میں سوراخ ہو گئے ہوں۔
اس نے سوچا ایک کشتی پر آخر کیوں سوار ہو جاؤں جس کا غرقاب ہونا یقینی ہے؟

۴

فضل الدین آخرکار ہمت کر کے بابر سے ملاقات کے لیے الیستا یا محل میں نماز ظہر کے بعد عموماً سناٹا چھایا رہتا تھا لیکن اس روز ایسا نہیں ہوا تھا۔ سپاہیوں اور خدمت گاروں کی بھاگ دوڑ سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی طویل سفر کی تیاریوں میں مصروف ہوں۔

اسے طاہر جو خاصا متفکر اور مصروف نظر آ رہا تھا، کمروں کی درمیانی گزرگاہ میں ملا۔

"خدا کا شکر ہے کہ آپ خود ہی آ گئے، ماموں جان" اس نے فضل الدین سے کہا۔

"کیوں، کیا بات ہے، یہاں یہ بھاگ دوڑ کیسی؟"

"صرف آپ ہی کو بتا سکتا ہوں کہ ہم لوگ کل صبح ہرات سے جا رہے ہیں۔"

"کابل؟"

"جی ہاں۔ لیکن شاہ برادران کو اس کی بھنک بھی نہ لگنی چاہیے۔" طاہر نے چپکے سے کہا۔ "ان سے تو صرف یہ کہا گیا ہے کہ ہم لوگ سردیاں گزارنے کے لیے شہر سے باہر جا رہے ہیں۔"

فضل الدین کے شانے اچانک کچھ جھک سے گئے اور اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا
"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں ایک بار پھر بے یار و مددگار یتیموں کی طرح چھوڑ کر جا رہے ہو"

"سردیاں ختم ہوتے ہی آپ بھی کابل آ جائیے گا۔ خود مرزا بابر نے بھی گزشتہ ملاقات کے دوران آپ سے فرمایا تھا کہ کابل آ جائیے۔"

"ارے بھتیجے، نئی جگہ جانا کوئی ہنسی کھیل تھوڑی ہے۔ مہینے بھر بلکہ پورے چالیس دنوں کی مسافت ہے۔ بیوی بچوں والا آدمی ہوں۔۔۔"

پھر فضل الدین داخل ہو کر بابر سے ملنے گیا۔ بہت ہی کشادہ کمرے کے جو کبھی نوائی کے دیوان خانے کا کام دیتا تھا، طلائی ملمع والے منقش دروازے پر پہریدار کھڑا ہوا تھا۔ اسے شاید علم تھا کہ فضل الدین ملاقات کے لیے آنے والا ہے کیونکہ وہ اندر گیا اور فوراً ہی باہر آ کر فضل الدین کے لیے دروازہ پوری طرح کھول دیا۔

فضل الدین نے دیوان خانے میں بابر سے مصروف گفتگو افراد کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ وہ پینتالیس سالہ شاعر محمد سلطان سے جو کثر نوائی سے بات چیت کیا کرتا تھا، اچھی طرح متعارف تھا۔ محمد سلطان کے پاس ہی پالتی مارے ماہر خطاط سلطان علی مشہدی بیٹھا ہوا تھا۔ بابر کے دائیں طرف کمال الدین بہزاد اور خوندمیر بیٹھے تھے۔

ہو بدیع الزماں اور فضل الدین کے استقبال کے لیے گدے پر اٹھ کھڑا ہوا۔ دوسرے افراد بھی کھڑے ہو گئے۔ میر علی شیر نوائی نے بہزاد کو اپنے قریب بیٹھنے کی دعوت دی۔ وہ دائرے کی سب سے الگ تھلگ جگہ پر بیٹھنا چاہا لیکن خواند میر جو ملاقاتیوں میں بابر کو چھوڑ کے سب سے کم عمر تھا بول اٹھا
"آپ ہمارے دوست جاہ بہزاد کے ہم وطن ہیں" اور اس نے فضل الدین کو بابر کے قریب ہی اپنے اور بہزاد کے درمیان بٹھا لیا۔

خواند میر نے گفتگو کا سلسلہ جس میں مہمانوں کی آمد سے خلل پڑ گیا تھا فوراً ہی جاری کر دیا:
"قسمت کے مذاق بھی کتنے عجیب و غریب ہوتے ہیں اعلیٰ جاہ، آپ تو ہرات میں فنون کی ترقی اور یہاں کے ممتاز اہل علم وفن سے بہت متاثر ہوتے ہیں لیکن خود ہمیں اس بات کا افسوس ہے کہ موجودہ ہرات میں آپ کا جیسا اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باصلاحیت حکمران نہیں ہے۔"
دونوں حکمراں بھائی بابر کا بہت پرتپاک خیر مقدم کر چکے تھے اس لیے بابر نے ان کے وقار کو ٹھیس پہنچانے سے گریز کیا

"میرے خیال میں تو موجودہ ہرات کے حکمران بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔"
بہزاد کے دبلے پتلے، تیکھے ناک نقشے اور خوبصورت سی داڑھی والے چہرے پر شرارت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔
"جی ہاں، عالم پناہ، ہرات میں آج کل تعلیم کا تو خیر کچھ پتا نہیں پر روشنی بہت زیادہ ہے۔" اور مصور نے بابر کی طرف دیکھا۔ "جانتے ہیں کیوں؟ اس لیے کہ ہمارا ایک بادشاہ آفتاب ہے تو دوسرا ماہتاب۔ ان دنوں ہرات میں ایک نظم بہت مقبول ہے جس میں کچھ اس طرح کا خیال ظاہر کیا گیا ہے حسین بیقرا اصلی بادشاہ تھے۔ اصلی جنگوں میں فتوحات حاصل کیا کرتے تھے۔ ان کے بیٹے دو تختوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک کہتا ہے "میں ماہتاب ہوں" دوسرا کہتا ہے "میں آفتاب ہوں"۔ دونوں میں شب و روز یہی مقابلہ جاری رہتا ہے۔ ان کی باہمی کشاکشی شطرنج کھیلتے ہوئے دو بادشاہوں کی یاد دلاتی ہے۔ یہ دونوں اپنے والد کے نقش قدم پر نہیں چل رہے ہیں، یہ تو نقلی بادشاہ ہیں، محض شطرنج کے مہرے۔"
بابر غیر ارادی طور پر مسکرا دیا
"واقعی دونوں بھائیوں کی عداوت شطرنج کی بازی جیسی ہی ہے۔"
"مصیبت تو یہ ہے" خواند میر نے کہا جو ایک بار بھی نہیں مسکرایا تھا، "کہ بچے اس کھیل میں یہ لوگ خراسان کو ہارتے جا رہے ہیں اور یہ بات انھیں کسی طرح بھی سمجھائی نہیں جا سکتی۔"
شاعر محمد سلطان کی آنکھوں میں خون اتر آیا
"سمجھائی تو ضرور جا سکتی ہے لیکن باتوں سے نہیں شمشیر سے!"
خواند میر نے گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ہرات کے بادشاہوں کے معتبر افراد جو کسی زمانے میں بڑی مہارت کے ساتھ نوائی پر نظر رکھتے تھے، اب بابر کی باتیں بھی چھپ کر سن سکتے تھے۔
سلطان علی مشہدی نے گفتگو کا رخ اس خطرناک موضوع سے موڑنے کے لیے اپنے سامنے رکھے ہوئے چمڑے کے جزدان سے کچھ کاغذات نکالے۔
"یہ خادم عظیم مہمان کی کچھ غزلیں نقل کر کے لایا ہے۔"

ریشم جیسے چکنے ان اوراق کو سب نے باری باری ہاتھوں میں لے کر دیکھا۔ واقعی بڑی شاندار تحریر تھی۔ باریک حروف خوش نویس کی مہارت اور نفاست پسندی کے آئینہ دار تھے۔ خواند میر کچھ لمحوں تک نظر جمائے رہنے کے بعد کہا غالباً

''مرصع اور ذرا دیکھیے تو ایک سہل ممتنع ہے۔ ہمارے محترم مہمان نے کوشش کر کے کیسی سیدھی سادی زبان استعمال کی ہے

نہ ملا جاں کے سوا یار وفادار کوئی
نہ ملا دل کے سوا محرم اسرار کوئی
سیکھ لے آپ تو تنہا یار کے جینا بابر
خوب کی سیر جہاں پر نہ ملا یار کوئی

''بہت خوب'' بہزاد نے بابر کو ستائشی نظروں سے دیکھا۔

''آپ نے بالکل بجا فرمایا ہے، عالی جاہ! انسان کو خود اپنے اوپر ہی اعتبار کرنا چاہیے، صرف خود ہی سے امیدیں وابستہ کرنی چاہئیں۔''

شاعر محمد سلطان کو ایک دوسری غزل کا مطلع پسند آیا جسے اس نے بڑے جذباتی انداز سے پڑھا

مجھ کو تم جیسا جفا کار ملے یا نہ ملے
تم کو مجھ جیسا وفادار ملے یا نہ ملے

فضل الدین نے ٹھنڈی سانس بھر کے دھیرے سے کہا۔

''یہ شعر تو میرے درد کی بھی ترجمانی کر رہا ہے.....''

بابر کو داد و تحسین سے جھینپ سی محسوس ہوئی

''عزیز دوستو، میں پروردگار کا شکر گزار ہوں کہ مجھے آپ جیسے سخن فہموں سے ملاقات اور گفتگو کا موقع ملا۔ اس کی آرزو میری فطری ہیجان سے معمور تھی۔'' ''آپ کو میرے اشعار سیدھے سے مصرعے پسند آئے تو اس میں مجھ سے کہیں زیادہ ہاتھ خوش نویسی کے حقیقی استاد مشہدی صاحب کی بے مثل فن کا ہے۔ جرأت ہو تو میں آپ سب کو یادگار کے طور پر اپنی غزلوں کا خاص طور سے نقل کیا ہوا ایک ایک ورق نذر کر دوں۔''

''آپ تو حقیقی شاہانہ انداز سے ہمیں تحفے عطا کر رہے ہیں!'' خواند میر اپنی مسرت کو چھپا نہ سکا۔

پھر خواند میر، بہزاد اور محمد سلطان نے شعر اور خوش نویس دونوں کو خراج تحسین پیش کرنے کی علامت کے طور پر اپنے اپنے ہاتھوں کے ورق کو کسی مقدس اور عزیز شے کی طرح آنکھوں سے لگایا۔ بابر نے آخری ورق فضل الدین کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا

''آپ اور ہم صرف ہم وطن ہی نہیں بلکہ دونوں کا درد بھی ایک ہی ہے۔''

فضل الدین نے غزل کے ورق کو لے کر آنکھوں سے لگایا اور بڑے مخلصانہ اور جذباتی لہجے میں جواب دیا

''مجھے یقین ہے کہ ہرات میں نقل کی جانے والی یہ غزل جلد ہی سمرقند اور اندجان تک پہنچ جائے گی۔ خدا کرے کہ ان ہی غزلوں کے پیچھے پیچھے ہمارے بادشاہ اور ہم سب کو جو وطن سے دور زندگی گزار رہے ہیں، وطن واپس ہونا نصیب

"آمین!"

بابر نے قاسم بیگ کو طلب کیا اور سلطان علی مشہدی کو طلائی بٹنوں والا زری کا چوغہ پہنایا۔

"جہاں پناہ" خواند میر نے کہا، "خدا کرے کہ آپ کے نیک اور عظیم منصوبے پورے ہوں، میر علی شیر کی عظیم روح ہمیشہ آپ کے حوصلے بڑھاتی رہے۔"

سب نے اس دعا کے سلسلے میں آمین کہی۔

لوگ رخصت لے کر جانے لگے تو بابر نے میر امارت کو پل بھر کے لیے روک لیا۔

"آئندہ سال آپ سے کابل میں ملاقات ہوگی نا؟ ویسے تو ہمارے لیے فی الحال عظیم الشان عمارتیں تعمیر کرنا ممکن نہیں ہے اور کابل ہرات کے مقابلے میں ابھی گاؤں جیسا ہی معلوم ہوتا ہے لیکن خدا سے امید کرتے ہیں کہ قسمت ہم پر بھی مہربان ہوگی..."

"آپ کا یہ حکم سر آنکھوں پر، بہت بہت شکریہ۔ ضرور حاضر ہوں گا" اور فضل الدین کورنش بجا لایا۔

آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ بابر اور اس کے ہم رکاب ہرات کے باہر باغات کے درمیان واقع ایک راستے سے گزر رہے تھے۔ اینٹوں کی دیواروں کے دوسری طرف گنبددار محل کبھی کبھی اور ہرات کے ممتاز لوگوں کے گرمیاں گزارنے کے مکانات کثرت سے دکھائی دے رہے تھے۔ اچانک ایک نسبتاً اونچی دیوار کی اوٹ سے کسی نے گلاب کا چھوٹا سا گلدستہ پھینکا۔ ایک سرخ گلاب سیدھا آ کر بابر کے اگلی گھوڑے کی ایال پر بھی گرا اور کانٹوں کی وجہ سے اس میں الجھ گیا۔ بابر نے سر اٹھایا تو اسے دیوار پر ایک لڑکی کی جھلک نظر آئی۔ نہایت ہی دلکش چہرہ کمان جیسے ابرو اور سر پر پھولدار زردوزی ٹوپی۔ بابر نے گھوڑے کی گردن پر جھک کر پھول کو احتیاط کے ساتھ ایال سے نکالا اور ہونٹوں سے لگا لیا۔۔

خزاں کے آخری ایام تھے۔ دوریوں پر واقع نخچیرگاہ کوہسار پر برف کی تہیں جم چکی تھیں۔ پھر بھی کتنی شاندار تھی گلاب کی خوشبو! اس موسم میں بھی گلاب کا پودے نکھار پر ہونا کیا کسی معجزے سے کم تھا؟ بابر نے لگام کھینچ کر گھوڑے کو روکا، رکابوں میں پیر جما کر کھڑا ہو گیا اور دیوار کے اوپری حصے پر نظر ڈالی۔ لڑکی اسے دوبارہ دکھائی دی۔ آنکھیں سیاہ تھیں اور بلا کی شوخ اور تابناک۔

بابر پہلے بھی اس راستے سے گزر چکا تھا اور لڑکی شاید اس سے قبل ہی اسے دیکھ چکی تھی۔ اس وقت اس نے اپنی لمبی پلکیں جھپکائیں، چہرہ سرخ ہو گیا اور پل بھر کے بعد بابر کو دوبارہ نظر آیا تو حیا کی سرخیوں کے باعث پہلے سے بھی زیادہ دلکش معلوم ہوا۔ بابر نے سوچا کہ یہ لڑکی اس کا خیر مقدم کر رہی ہے یا اسے الوداع کہہ رہی ہے؟ اس کی عمر کیا ہوگی؟ شاید اٹھارہ سال، اس سے زیادہ ہرگز نہیں۔ اور کیسی حسین و جمیل ہے!

بابر کی سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ کیا کرے اور وہ اپنے گھوڑے کی دیوار کے قریب ہی روکے رہا۔ اتنے میں دوسرے سواروں نے بھی یہ دیکھ کر کہ بادشاہ ٹھہر گیا ہے، اپنے اپنے گھوڑے روک لیے۔ ہرات کے نیک دل داروغہ یوسف علی بیگ نے جو بابر کو رخصت کرنے کے لیے ساتھ آیا تھا لڑکی کو پہچان لیا اور حیرت سے مسکراتے ہوئے بولا

"اخاہ عزیزہ دختر ماہم، تم کتنی بڑی ہو گئیں!"

لڑکی کو جیسے ہوش آ گیا، چہرے پر کچھ اور بھی زیادہ سرخی چھا گئی اور وہ تیر نظر سے بابر کو زخمی کر کے غائب ہو گئی، دوبارہ نظر نہ آئی۔

اونٹوں پر زیادہ سے زیادہ سونا چاندی اور دیگر قیمتی اشیا جنھیں اس نے خزانے سے منگوا لیا تھا، لدوا سکے۔ اس کی بیگمات
اور بچے شہر کے اندر شاہی محل میں اس کے منتظر تھے لیکن وہ دشمنوں سے اس بری طرح دہشت زدہ ہو چکا تھا کہ انھیں لینے
کے لیے بھی شہر جانے کی ہمت نہ کر سکا۔ اس نے کہلوا بھیجا کہ ہرات کے دروازے بند کر لیے جائیں۔ محاصرہ کر لیا جائے
تب بھی نہ کھولے جائیں، بدیع الزماں جلد ہی کمک لے کر واپس آئے گا اور انھیں بچا لے گا۔ پھر وہ اپنی دولت کے ساتھ
جنوب میں قندھار کی سمت بھاگ کھڑا ہوا۔

مظفر مرزا رات کو ہرات پہنچا اور اس نے بھی بالکل وہی سب کیا جو اس کے بھائی نے کیا تھا۔ فرق بس اتنا تھا کہ
وہ شہر کے باہر ایک دوسرے باغ میں، باغ جہاں آرا میں نہیں بلکہ باغ سفید میں ٹھہرا۔ وہاں اس نے دم لیا اور بدیع
الزماں ہی کی طرح قیمتی اشیا گھوڑوں پر لدوائیں۔ شاہی محل تک نہ گیا۔ اس نے بھی تقریباً ویسے ہی الفاظ میں ہرات کے
باہری دروازے بند کر لیے جانے، شہر کے اندر محل میں مورچہ بندی کرنے اور اپنی واپسی تک محاصرے کو جھیلنے کا حکم دیا۔
پھر وہ مغرب میں استرآباد کی طرف فرار ہو گیا۔

شیبانی خاں نے توقع سے کہیں زیادہ آسانی سے ظفریاب ہونے کے بعد ہرات کی طرف کوچ کیا اور شہر کوئی
ساڑھے تین فرسنگ رہ گیا تو خوشگوار آب و ہوا کے لیے شہرت رکھنے والے سرسبز و شاداب میدان کہدستان میں پڑاؤ ڈال
دیا۔ ہرات کے شیخ الاسلام ابن سعید تفتازانی اور دیگر ممتاز افراد نے فیصلہ کیا کہ کسی امید کے بغیر محاصرے میں پھنسے رہ
کر مصائب جھیلنے کا کوئی تک نہیں۔ انھوں نے شہر کے دروازوں کی کنجیاں لے جا کر فاتح خان کے حوالے کر دیں اور ظاہر
ہے نذرانے کے طور پر قیمتی تحائف وصول کیے۔

شیبانی خاں اپنی ایک اور فتح کے نشے سے سرشار ہو کر موسم بہار کی ہریالی میں ڈوبے ہوئے کہدستان میں جشن
مسرت منانے لگا۔ اس کے دل میں کسی نئی حسینہ کو اپنی بانہوں میں جکڑنے کی خواہش کروٹیں لینے لگی۔ سب سے زیادہ
شہرہ قارا کوز بیگم کے حسن و جمال کا تھا جو مظفر مرزا کی چہیتی بیگم اور ہرات کی خوبصورت ترین عورت تھی۔ خان بخوبی جانتا
تھا کہ تاشقند اور اندجان کی قارا کوز نام کی بیگمات بے حد حسین تھیں۔ اس نے سوچا بھلا ہرات کی یہ سیاہ چشم حسینہ کیسی ہے؟

لیکن خود کو غازی خلیفہ اور امام کہلانے والا شیبانی خاں اس معاملے میں کوئی زبردستی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے
اپنے معمول کے بموجب جس سادہ بیگم سے اپنے عشق کا اظہار کرنے کے لیے چند اشعار کی ایک غزل کہی جسے شاعر محمد
صالح نے بچولیے کے فرائض انجام دیتے ہوئے اس پری پیکر تک پہنچا دیا۔ قارا کوز بیگم کو جو مظفر مرزا کی بزدلی پر سخت
حیران ہو رہی تھی، خان کی یہ غزل بہت پسند آئی۔ خدیجہ بیگم اپنی دوسری بہوؤں کے ساتھ ہرات کے سب سے مضبوط
محل قلعہ اختیارالدین کو منتقل ہو گئی اور اس کے دروازے بند کر لیے گئے۔ قارا کوز ان سب بیگمات سے الگ ہو کر اپنے
والد کے شہر سے باہر واقع مکان کو چلی گئی۔ وہاں اسے حمام میں نہلا کر دلہن کی طرح سجایا سنوارا اور خان کی بھیجی ہوئی
شاندار گھوڑا گاڑی میں کہدستان لے جایا گیا۔

شام کو شیخ الاسلام اور ہرات کے قاضی القضاۃ کو شیبانی کے خیمے میں طلب کیا گیا۔

خان اپنی عمر کے لحاظ سے کہیں زیادہ جوان نظر آ رہا تھا۔ اس نے ہرات کے ان دینی پیشواؤں کا اپنے خیمے میں خیر
مقدم کیا جہاں فرش پر بچھے ہوئے بہت بڑے اور خوبصورت قالین کے بیل بوٹے اور دلکش الفاظ کے اشعار ایک دوسرے
سے گتھے ہوئے تھے۔ عبدالرحیم نے ان دونوں کو بتایا کہ آج عظیم خان کا نکاح قارا کوز بیگم سے ہونے والا ہے۔

"نکاح؟" شیخ الاسلام نے گھبرا کر قاضی کی طرف دیکھا

"قار کوز شرعاً اب بھی مظفر مرزا کی زوجہ تھی۔ طلاق اور اس کے بعد عدت کی مدت پوری ہوئے بغیر خان سے اس کے نکاح کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔

شیخ الاسلام منہ کے بل لیٹ کر قالین کے جس پر خان کھڑا ہوا تھا، بوسے لینے لگا لیکن اس نے احکام شریعت کا ذکر چھیڑا ہی تھا کہ خان نے اسے ٹوک دیا۔

"ہمیں درس شریعت نہ دیجیے! بیگم کے رنگیلے شوہر نے انھیں چار ماہ قبل ہی طلاق دے دی تھی! آپ کو یہ بھی نہیں معلوم کیا؟"

"معلوم ہے، عظیم خان!"

"معلوم ہے!" قاضی نے بھی قالین کو چومتے ہوئے کہا۔

واقعی انھیں معلوم تھا کہ چار ماہ قبل مظفر مرزا نے شدید غصے کے عالم میں بنا سوچے سمجھے اپنی بیگم سے دوبار "طلاق" کہہ دیا تھا۔ لیکن عدت کی مدت کے دوران ہی دونوں میں صلح ہو گئی تھی اور خود شیخ الاسلام اور قاضی نے شاہ اور ملکہ کی اس صلح صفائی پر دعائیں دی تھیں، ٹھیک ٹھیک تماؤں کا اظہار کیا تھا۔ پر اس وقت غصے میں بھرے ہوئے خان کو جو جیسا کہ صاف ظاہر ہو رہا تھا، سچ سامنے قار کوز بیگم کے نوجوان شوہر کا نام لے لیے جانے سے کچھ اور بھی بھڑ گیا تھا، یہ بتانا کہ دراصل وہ طلاق رجعی تھی نہ کہ طلاق مغلظہ، خود اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا۔

چنانچہ وہ دونوں خان اور قار کوز بیگم کے نکاح اور اس نکاح کو اپنی دعاؤں سے مقدس رشتے کی حیثیت دینے کی بے عجلت تیاریاں کرنے لگے۔

صبح کو شیبانی خان نے سپہ سالار عبید اللہ سلطان، منصور بخشی اور درباری شعرا محمد صالح اور بینائی کو اپنے خیمے میں طلب کیا۔ اس نے سب سے پہلے عبید اللہ سلطان سے جو اس کا بھتیجا تھا، سخت لہجے میں پوچھا۔

"قلعہ اختیار الدین پر قبضہ ہو گیا؟"

"عظیم خان، جلد ہی قبضہ کر لیں گے"

"میں نے تمھیں اتنی بڑی فوج دے دی پھر بھی تم نے قلعے پر جسے ایک فاحشہ بند کر کے بیٹھی ہوئی ہے، قابض نہ ہو سکے! خود مجھے ہی جانا ہو گا کیا؟"

سب پر واضح ہو گیا کہ گزشتہ شب خان کو کسی ایسی ویسی بات سے سابقہ پڑا ہے۔ طویل قامت بیس سالہ عبید اللہ سلطان کچھ اس طرح کورنش بجا لایا کہ دوہرا ہو گیا

"عظیم خان، میں قلعے کو آج ہی فتح کر لوں گا! ابھی بھی جا کے حملہ کر دوں گا!"

"حملہ کر دوں گا" خان نے اس کی نقل اتاری۔ "تمھاری فوج تو پہلے ہی ساری فصلوں کو روند چکی۔ ہم ہرات میں مہمان بن کر تھوڑی آئے ہیں۔ فصلوں کی تو خود ہمیں بھی ضرورت پڑے گی۔ باغات کی حفاظت کا بھی انتظام کر دو ان کے پھل تو تم خود بھی کھاؤ گے۔" پھر وہ بلا سبب زور سے چیخ اٹھا "ہمیں خاندان تیموریہ کو جڑ سے نیست و نابود کرنا ہے۔ خراسان کے غداروں کو کچل ڈالو!"

"آپ کے احکام کی تعمیل کی جائے گی، عالی جاہ!"

''کیا یہ سچ ہے؟''

''جی ہاں، عالی جاہ'' اور بینائی نے جیسے کہ خان کو لگا جذبات پر قابو پانے کی کوشش میں سر جھکا دیا۔

''اگر یہ ہوا تھا'' خان نے ذرا اونچی آواز سے کہا ''تو بینائی صاحب، پہلی مرتبہ انصاف اور جرأت کی تلوار باندھ لیجیے۔ ہمارے فتح مند سپاہیوں میں سے ایک سو سپاہی اپنے ساتھ لے کر جائیے۔ ان لوگوں کی املاک ضبط کر لی جائیں ان شعرا کی املاک ضبط کر لی جائیں جو سونے کی بدولت مغرور اور بدحواس ہو چکے ہیں اور جو خاندان سے حکمرانوں کی شان میں قصیدے لکھا کرتے تھے! ان لوگوں کا سارا سونا چھین کر شاہی خزانے میں جمع کرا دیا جائے! شاید اس کے بعد ان لوگوں کو ہوش آ جائے اور تب ان کا پارسائی کے راستے پر لوٹ آنا آسان ہو جائے گا۔''

بینائی بوکھلا گیا۔ ہرات کے کچھ شعرا بھی اس کی توہین کا باعث بنے تھے اور یہ بھی سچ تھا کہ وہ ان شعرا کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن سپاہیوں کو ساتھ لے جا کر ان کے گھروں کی تلاشی لینے کا وہ تصور ہی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس طرح کے کام سے کوئی سروکار نہیں رکھ سکتا تھا، ضمیر کبھی اجازت ہی نہ دیتا۔ لیکن خان کے سامنے اپنی نارضامندی کیسے ظاہر کرتا؟

بینائی اپنے بوڑھے پن کے باوجود قوت ارادی سے محروم نہ تھا۔

''عظیم خان کا شکر گزار ہوں کہ مجھ پر اتنا زیادہ اعتبار کر رہے ہیں۔ بس مجھے ڈر ہے کہ....''

''ڈر کا ہے کا؟''

''...میں یہ خدمت نہ انجام دے سکوں گا، محترم حکمران کیونکہ زندگی میں تلوار کبھی بھی ہاتھ میں نہیں لی۔ اور اب تو میں کن رسیدہ ہو چکا ہوں میرے خیال میں اس نیک حکم کی تعمیل آپ کے اس حقیر غلام کی بہ نسبت محمد صالح صاحب جو بہت دلیر اور جوشیلے آدمی ہیں، سو گنا بہتر طور پر کر سکیں گے۔ میں ان کے حتی الامکان مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

لیکن محمد صالح بھی اس گھٹیا کام میں ملوث ہونے کی کوئی خاص خواہش نہیں رکھتا تھا اور کانپ رہا تھا ... غضب کا تھا

''بینائی صاحب، میں بڑی خوشی سے آپ کی اس اہم اور جائز ذمے داری کا بار اپنے شانوں پر اٹھا لیتا پر مشکل یہ ہے کہ ہراتی شعرا کے متعلق میری معلومات اتنی گہری نہیں جتنی کہ آپ کی ہیں۔''

شیبانی خان نے ان دونوں کی اس شاعرانہ بحث کا سلسلہ اپنی چیخ سے بند کر دیا اور اس کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکلنے لگیں۔

''ارے بینائی صاحب، ذرا سوچیے تو کہ آپ کا یہ طرز عمل کیسا ہے! چھ برسوں سے آپ کی کفالت آخر کون کر رہا ہے؟ ہم نے آپ کو گھوڑا عطا کیا جس پر سواری کرتے ہیں۔ ہم نے خلعت عطا کیا جسے آپ پہنتے ہیں۔ آپ کو مکان دیا، پیسے دیے، کبھی کسی چیز سے انکار کیا؟ اور جب ایک کام کرنے کا وقت آیا تو آپ انکار کر رہے ہیں؟''

خان آگ بگولا ہو گیا۔ بینائی نے سوچ کر اس کے منہ سے مخالفت کا ایک لفظ بھی نکل گیا تو شیبانی فوراً ہی جلاد کو طلب کر کے حکم دے گا کہ سر قلم کر دو۔ ایسے میں اس ''نیک'' کام کو سر جھکا کر قبول کر لینے کے سوا اور کوئی صورت ہی نہ تھی

جلد ہی اہل ہرات ایک دوسرے کو بتانے لگے کہ مشہور شاعر بینائی مسلح سپاہیوں کے ساتھ دوسرے شاعروں کے گھروں میں جا جا کر تلاشی لے رہا ہے، سپاہی سونے کی تلاش میں گھروں کی ساری چیزیں الٹ پلٹ دیتے ہیں، جن گھروں میں سونا ملتا ہے انھیں پوری طرح لوٹ لیتے ہیں اور اس طرح یہ لوگ شیبانی کے خزانے کو بھی بھرتے جاتے ہیں

اور ظاہر ہے کہ اپنی محبوبہ کو بھی۔

شیبانی خاں کے پچیس سالہ وزیر اور دست راست عبدالرحیم نے ہرات کے صاحبانِ علم و فن کا سونا صیقل کرنے کی ایک اور ہی ترکیب سوچی۔ شہر کے قرب و جوار میں فتح و فتوحات میں فاتحین کے ہاتھ جو مال لگا تھا اس میں بھیڑوں کے گلے بھی شامل تھے۔ عبدالرحیم نے ہر گلے کی ساٹھ بھیڑوں کو ہرات کے قپچاقی دروازے کے باہر لگنے والے بازار میں لے جانے کا حکم دیا۔ پھر اس نے ایک چھوٹا سا دستہ شہر میں بھیجا جس نے تقریباً دس شعرا اور دیگر اہلِ علم کو بازار میں پہنچنے کے لیے مجبور کر دیا۔ ان میں تیموری خاندان کے بادشاہوں کے عہدِ حکومت کی تعریف و توصیف کرنے والا مورخ خواندمیر، بابر سے قربت کی بنا پر شہرت رکھنے والا امیر عمارت فضل الدین اور حسین بیقرا کی شان میں قصائد لکھنے والا شاعر سلطان محمد بھی شامل تھے۔ خود عبدالرحیم بھی اپنے قدم بار گھوڑے پر بازار پہنچ گیا۔ اس کے ایک ملازم نے خواندمیر اور دیگر اہلِ علم سے کہا:

"وزیرِ اعظم نظام الدین عبدالرحیم اپنی یہ بھیڑیں صرف آپ لوگوں ہی کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتے ہیں۔"

خواندمیر نے اپنے رفقا سے نظریں ملائیں (کاش یہ معاملہ اتنے ہی پر ختم ہو جائے) اور وزیر کو کورنش بجا لاتے ہوئے سب کی طرف سے کہا:

"ہم لوگ خریدیں گے، بخوشی خریدیں گے۔ قیمت بتائیے۔" ملازم نے بڑی شان سے کہا:

"ان بھیڑوں پر کئی بار وزیرِ اعظم کی پاک نگاہیں پڑ چکی ہیں۔ اس لیے یہ مقدس بھیڑیں ہیں۔ آپ لوگ تیموری خاندان کے حکمرانوں کی خدمات انجام دیتے رہنے کی بنا پر ناپاک ہو چکے ہیں، ناپاک اور لغو زندگی گزار رہے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ان بھیڑوں کا گوشت کھا کر آپ پاک ہو جائیں گے۔ اس لیے ہر بھیڑ کی قیمت ہے چھ سو دینار!"

چھ سو دینار میں کتنی ہی بھیڑیں خریدی جا سکتی تھیں۔ لیکن وزیرِ اعظم کی متعین کردہ قیمت پر خریداری نہ کرنے کا مطلب ہے ناراض کرنا اور سخت سزائیں پانا ہوتا۔

فضل الدین نے جو اپنی مالی بدحالی سے پریشان تھا، ظالموں کو سمجھانے کی کوشش کی:

"حضور والا، ابھی حال ہی میں تو ہم نے عام محصول اور فاتحین کی ضروریات پوری کیے جانے کا خاص محصول ادا کیا ہے۔"

شاعر محمد سلطان نے مسکراتے ہوئے طنز کیا:

"ارے فضل الدین صاحب، آپ کو بتا تو دیا گیا ہے کہ یہ نایاب بھیڑیں ہیں، ان پر وزیرِ اعظم کی پاک نگاہیں پڑ چکی ہیں اور جو کچھ مقدس ہوتا ہے وہ سونے کے مول ہی بکتا ہے۔"

عبدالرحیم نے اس طنز کو محسوس کر لیا اور طیش میں آ کر سپاہیوں کو حکم دیا:

"ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ دس دس بھیڑیں فروخت کر دو! گستاخ کمینے کے نکتہ چینی کرتے ہیں اور دولت کے نشے میں کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتے۔ انھیں آسمان سے زمین پر اتارنا چاہیے۔ اپنی بھیڑیں خود ہی ہانک کر لے جائیں، خبردار جو کسی نے ان کی ذرا بھی مدد کی! تم لوگ ان کے پیچھے پیچھے جا کر طے شدہ قیمت لے آؤ۔ دینے سے انکار کریں تو ان کی تمام املاک ضبط کر لی جائیں اور انھیں زندان میں بند کر دیا جائے!"

عبیداللہ سلطان کے ڈیڑھ ہزار سپاہی دس دنوں سے قلعہ اختیار الدین پر چاروں طرف سے حملے کر رہے تھے لیکن

داخل ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ ان کی دیواروں کی بلندیوں تک تیر بھی نہیں پہنچ پاتے تھے نیزوں کا تو ذکر ہی کیا۔

قلعے کے بعض حصوں تک پہنچ کر توپوں سے گولہ باری بھی کی گئی لیکن بے سود رہی۔ آخر کار سرنگیں کھودی جانے لگیں

اس اثنا میں ہرات میں امن پوری طرح بحال ہو چکا تھا (جو کچھ لوٹا جا سکتا تھا، بڑی سرعت اور ہوشیاری سے لوٹ لیا گیا تھا)

شیبانی خان جو کہستان سے آ کر باغ جہاں آرا میں مقیم ہو گیا تھا شہر کے مشہور شاعروں، مصوروں اور دیگر اہل علم کو اپنی خدمت میں طلب کرنے لگا۔ حکومت کے علمی و فنی امور کا نگران محمد صالح بہزاد کو بھی کئی بار ہرات کے خان کی خدمت میں پیش کر چکا تھا۔ وزیر اعظم عبدالرحیم کو تو مصوری ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی لیکن شیبانی بخوبی جانتا تھا کہ حسین بیقرا کو اس کی بہزاد کی بنائی ہوئی تصویر کی بدولت کتنی شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ اب وہ چاہتا تھا کہ مصوری کی صلاحیت و مہارت سے خود اس کی شہرت بھی دوبالا ہو جائے۔

مصور کی درخواست پر خان زری کے گہرے سرخ گدے پر سیاہ مخمل کے غلاف والے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھا۔
مصور کی تجویز پر خان کی کمر میں پتلی طلائی پیٹی باندھ دی گئی اور اس کے سامنے سنہری جلد والی ایک کتاب، قلم اور دوات رکھ دیے گئے۔ خان کا مہیب چابک پہلو میں رکھا ہوا تھا۔

بہزاد اپنی تخلیقی زندگی کے تیس برسوں میں کئی بادشاہوں کو دیکھ چکا تھا اور جانتا تھا کہ ان سے گفتگو کے دوران صرف ستائشی الفاظ ہی استعمال کیے جا سکتے تھے۔ چنانچہ اس نے کہا

”آپ کا یہ حکم بردار تصویر میں آپ کو شمشیر برہنہ لیے قدم بار جنگی گھوڑے پر سوار دکھا سکتا ہے۔ لیکن یہ کون نہیں جانتا کہ آپ عظیم سپہ سالار ہیں۔ آپ کو تو دنیا کے سامنے ایسے عظیم خلیفہ کی حیثیت سے پیش کیا جانا چاہیے جس نے کئی برسوں تک دینی درس گاہ میں تعلیم حاصل کی ہے اور جس کا علم دین کے معاملے میں عہد حاضر کے تمام اماموں میں کوئی ہمسر و ثانی نہیں۔ یہی سبب ہے کہ یہ خادم تصویر میں آپ کو مقدس کتاب اور سونے کے قلم کے ساتھ پیش کرنا چاہتا ہے۔“

”مجھے منظور ہے“ خان نے جواب دیا۔

بہزاد نے تصویر مکمل کر لی تو شیبانی خان نے اس کے فنی معیار کو پرکھنے کے لیے اپنے مقربین کو بلا لیا۔ عبدالرحیم نے پہلے تصویر اور پھر خان پر نظر ڈالی اور دنگ رہ گیا۔

”عالی جاہ، یہ تو ہو بہو آپ کی شبیہ ہے۔“

تصویر یہ تاثر دے رہی تھی کہ شیبانی خان نے اپنی زندگی میں بہت کچھ دیکھا اور اپنے تجربات سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ کوئی عام آدمی اسے دیکھ کر سوچ سکتا تھا کہ یہ جس شخص کی تصویر ہے وہ بہت ہی خوددار اور پروقار ہے نیز یہ کہ مصور اس کا احترام کرتا ہے۔ لیکن محمد صالح فن کو پرکھنے کے معاملے میں بہت ذہین اور باریک بین تھا۔ اس کی توجہ فوراً ہی اس بات پر مبذول ہو گئی کہ تصویر میں خان جس گدے پر بیٹھا ہوا ہے وہ بہت ہی گہرے، خون جیسے سرخ رنگ کا ہے اور لگتا ہے کہ وہ خون سے لبالب بھرے ہوئے کسی گدے پر بیٹھا ہے۔ اسی طرح پتلی طلائی پیٹی کا سرا گہرے بھورے سر والے زرد سانپ کی طرح لٹکا ہوا تھا اور پالتی مارے بیٹھے خان کے پیروں پر سے بل کھاتا رینگتا ہوا اسے ڈسنے کو تیار لگتا تھا۔
سیاہ رنگ کا بڑا سا گاؤ تکیہ بدی کی قوتوں کی تجسیم معلوم ہو رہا تھا۔

واقعی رنگوں کا انتخاب بے حد ذہانت سے کیا گیا تھا۔ رنگ بہت کچھ کہہ رہے تھے۔ رنگوں کی سبز اسلامی زبان کو
محمد صالح نے سمجھ لیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اس اندیشے سے سہم کر رہ گیا کہ کہیں خان نے بھی رنگوں کے علامتی مفہوم کو
سرخ، سیاہ اور بھورے اشاروں کو بھانپ لیا تو کیا ہوگا؟ اس صورت میں نہ تو بہزاد کا سر سلامت رہ سکتا تھا اور نہ ہی خود اس
کا جس نے بہزاد کو بلوایا تھا۔

وہ فوراً ہی کہہ اٹھا:

"ہمارے بزرگانِ دین سبز رنگ کو پسند فرماتے تھے۔ ہمارے عظیم خلیفہ کو بھی سبز رنگ پسند ہے۔ دیکھئے نا ہمارے
عظیم ہمالی کا لباس سبز ہے اور جس دیوار سے ہمارے خلیفہ کا گاؤ تکیہ لگا ہوا ہے وہ بھی سبز ہی ہے۔"

"یہ کافی مناسب ہے" آخر کار خان کے ہونٹوں نے جنبش کی۔ "لیکن ہم نے بہزاد کی بنائی ہوئی دوسری
تصویریں بھی دیکھی ہیں۔"

شیبانی خان کی مراد حسین بیقرا کی اس تصویر سے تھی جس میں سے بہزاد نے شیر جیسا دکھایا۔ بہزاد کی بنائی ہوئی
ایک دوسری تصویر میں حسین بیقرا کو رزم گاہ میں اترتے دکھایا گیا تھا۔ لگتا تھا جیسے بادل، آسمان اور کوہسار بھی حسین بیقرا
کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے ہوں۔ یہ غیر معمولی سماں کہہ رہا تھا کہ جس کی تصویر بنائی گئی ہے وہ بھی غیر معمولی شخصیت کا
مالک ہے۔ پر اس تصویر میں؟ شیبانی نے سوچا کہ بہزاد نے تیموری خاندان کے حکمراں کو تو آسمان پر چڑھا دیا تھا لیکن خود
اسے بس یوں ہی سا ... معمولی سا آدمی بنا کر پیش کر دیا ہے۔

خان کو ان پیچیدہ سے جذبات کے اظہار کے لیے فوری طور پر موزوں الفاظ نہ مل سکے جو اچانک اس کے سینے میں
امنڈ آئے تھے اور باہر نکلنے کو بے تاب تھے۔

"اپنے قلم مجھے دیجئے!" اس نے مصور سے کہا اور سب کو احساس ہو گیا کہ خان کسی بات سے غیر مطمئن ہے۔

بہزاد نے صندوقچی جس میں رنگوں کی پیالیوں میں قلم رکھے ہوئے تھے، خان کی طرف بڑھائی اور خان نے بھورے
رنگ والی پیالی سے تیزی کے ساتھ قلم نکال لیا۔ اس نے ہی مدرسے میں تعلیم کے دوران نقاشی بھی سیکھی تھی اور قلم پکڑنا
بہرحال جانتا تھا۔

خان نے اپنی تصویر کو غور سے دیکھا کہ بھلا اس میں کیا درست کرنا ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ داڑھی مونچھیں بہت
چھدری ہیں اسی وجہ سے اس کی شان میں فرق آ گیا ہے اور وہ معمولی آدمی لگ رہا ہے۔

"داڑھی ذرا بہتر طور پر بنائی جانی چاہیے" شیبانی نے کہا اور تصویر میں اصلاح کرنے لگا۔

لیکن قلم میں رنگ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی آ گیا تھا اور داڑھی نمدے کے ٹکڑے جیسی نظر آنے لگی۔ بہزاد کے منہ
سے اچانک بڑی دردناک چیخ نکل گئی جیسے اس کا دانت کھینچ دیا گیا ہو۔ محمد صالح نے فوراً مصور کی کلائی کو دبوچتے ہوئے
کہا

"مرحبا! عظیم خان! آپ کے قلم کے لمس سے تصویر میں کیسی جان پڑ گئی!" پھر اس نے بہزاد سے مخاطب ہو کر اضافہ کیا
"یہ تو نہایت ہی اہم گھڑی ہے۔ آپ کی تخلیق کو خود عظیم خلیفہ کے، سکندرِ ثانی کے دستِ مبارک نے سنوار دیا۔ کہاں سے
کہاں پہنچا دیا۔ ارے جناب، اس واقعے کے تذکرے تو اب صدیوں تک ہوتے رہیں گے!"

"کچھ سمجھ میں نہیں آ سکا! ساری محنت پر پانی پھیر دیا کمبخت نے!" بہزاد نے خان کی اس حرکت کے متعلق سوچا تھا

لیکن محمد صالح کی اس جوشیلی تقریر کے بعد اس کے ذہن میں ایک اور ہی خیال آیا

واقعی۔ خان کو فراموش نہ کیا جا سکے گا۔ لوگ ہنس ہنس کر ایک دوسرے کو بتائیں گے کہ خان نے اپنے کانوں پر شہد کیسے چپکایا تھا۔ بہت ہو چکا، اب آگ سے کھیلنے کی ضرورت نہیں۔ اچھا ہی ہو کہ نظموں کے مفہوم کو صرف محمد صالح ہی سمجھ سکا"۔

اور بہزاد نے سر جھکا کر مخفی طنز کے ساتھ کہا

"آپ کا یہ خادم خوشی سے پھولا نہیں سما رہا ہے کہ اس کی بنائی ہوئی تصویر میں کسی مصور نے نہیں بلکہ خود خلیفہ نے ہاتھ لگایا ہے جو ہم سب کے لیے دینی پیشوا کا درجہ رکھتے ہیں۔"

"آپ لائق ستائش ہیں" خان نے ازراہ کرم کہا۔

"ارے تو اس کا مستحق ہے!" بہزاد نے تصویر میں کانوں پر چپکے ہوئے شہد کو ایک بار پھر دیکھ کر سوچا۔

۲

کبھی کبھی لوگوں کے مقدر بالکل ایک جیسے ہو جاتے ہیں، خواہ وہ نجی زندگی ہو، سلطنت کی زندگی۔

خدیجہ بیگم پوری طرح کوشاں تھی کہ اس کا حشر بھی ویسا ہی نہ ہو جیسا کہ سمرقند کے سابق حکمران سلطان علی مرزا کی والدہ زہرہ بیگم کا ہوا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ شیبانی خان عورتوں کے ساتھ بڑی مکاری اور بے رحمی سے پیش آتا ہے اسی لیے قلعہ اختیار الدین کے پھاٹک کو مضبوطی سے بند کروا کے اس کے اندر بیٹھی ہوئی تھی۔ لیکن سترہویں دن قلعہ محفوظ نہ رہ سکا۔

عبیداللہ سلطان کے سپاہی کسی نہ کسی طرح پھاٹک کو توڑ کر قلعے کے اندرونی حصے میں داخل ہونے لگے تو اچانک خدیجہ بیگم نمودار ہوئی۔ جسم پر نہایت ہی شاندار لباس تھا اور سر پر نکیلے گوشوں والی ٹوپی جس میں بڑا سا موتی ٹنکا ہوا تھا۔ شاہانہ وقار اور سانچے میں ڈھلے ہوئے بدن کی اس خاتون کو دیکھتے ہی پسینے سے شرابور سپاہیوں نے تلواریں جھکا لیں اور اس کے سامنے بے حس و حرکت کھڑے ہو گئے۔ خدیجہ بیگم دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی سپاہیوں کے قریب پہنچی تو ان لوگوں نے اس کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ اس نے سپہ سالار سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔

سپاہی اسے ساتھ لے کر حلقے میں آ گئے جہاں عبیداللہ سلطان بڑے کر و فر سے اپنے گھوڑے پر بیٹھا ہوا تھا۔

خدیجہ بیگم نے جسے کنیزیں اپنے حلقے میں لیے ہوئے تھیں، اطمینان کے ساتھ کہا

"طاقتور سپہ سالار، ہم قسمت کے مارے آپ کی قید میں ہیں۔ مہربانی کر کے مجھے اپنے حکمران شیبانی خان کے پاس لے چلیے۔"

عبیداللہ نے منصور بخشی کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور طنزیہ انداز سے مسکرایا

"ہمارے حکمران خان نے آپ کے لیے ایک پیغام بھجوایا ہے۔"

"فرمائیے، شہزادہ سلطان!"

عبیداللہ کے بیگوں میں سعید عماد اور ایک ملا بھی شامل تھا۔ اس کے اشارے پر منصور بخشی اور ملا اپنے گھوڑوں

سے تڑپ اٹھے۔ منصور بخش کو جو بچی وحشت، دوری کے چوغے اور سرخ جوتوں کی بنا پر پالگیے وہ سب جیسے ملک ریاست آٹھ جوانوں نے باریتوں کی طرح گھیرے میں لے لیا۔

تب عبیداللہ سلطان نے خدیجہ بیگم کو بڑی نفرت سے مخاطب کیا

''عظیم امام کے حکم سے ہم آپ کا نکاح منصور بیگ کے ساتھ کر رہے ہیں۔''

''بیگم تو کچھ ایسے بناؤ سنگار کے ساتھ آئی ہیں جیسے انہیں یہ سب پہلے ہی سے معلوم رہا ہو'' لوگوں نے قہقہہ لگایا۔

خدیجہ بیگم نے خوف زدہ ہو کے منصور بخش کے چیچک کے داغوں والے سانولے چہرے اور بے حد موٹے بے ڈول جسم پر نگاہ ڈالی۔

''میں... میں بادشاہ سلامت سے بات کرنا چاہتی ہوں...''

''ارے محترمہ، خان کے پاس اتنا وقت کہاں...''

''میں شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔ آپ میری توہین کرنے کی جرات نہیں کر سکتے''

''بدکردار افراد کو سزا دینا کار نیک ہے، کار ثواب ہے۔''

''محترم سلطان، آپ کے بھی شاید والدہ ہوں۔ میں عمر میں آپ کی والدہ جیسی ہوں، کم از کم اسی کا لحاظ کیجئے۔''

''میری والدہ نے آپ کی طرح سنگین جرائم نہیں کئے ہیں۔ اور پھر کیا کوئی ماں ہو سکتی ہے جو خود اپنے پوتے کو قتل کرا دے؟ آپ نے تو اپنی خون کی پیاس مومن مرزا کے خون سے بجھائی تھی''

خدیجہ بیگم کے چہرے سے تکبر کا تاثر کافور ہو گیا، شانے خمیدہ سے ہو گئے، ہاتھ کمزوری کے باعث چابکوں کی طرح پہلو میں لٹک گئے۔

عبیداللہ سلطان نے سپاہیوں کو حکم دیا

''انہیں زنان خانے میں لے جاؤ۔ اب ان کی عقل منصور بخش ہی درست کریں گے''

خدیجہ بیگم کی منظوری زبردستی حاصل کر کے نکاح کی رسم ادا کی گئی اور سب لوگ چلے گئے۔ اس کے فوراً ہی بعد منصور بخش نے کنیزوں کو باہر بھیج دیا اور خود خدیجہ بیگم کے ساتھ رہ گیا۔

نصف شب بیت چکی تھی تب منصور بخش خدیجہ بیگم کو جو مشکل ہی سے کھڑی ہو پا رہی تھی، دھکے دیتا ہوا خواب گاہ سے باہر نکال لایا۔ وہ قلعے کے چاندنی سے منور احاطے کے اندرونی حصے کی طرف بڑھنے لگے۔

''سونے کا پھول'' منصور بخش نے چلتے چلتے خدیجہ بیگم سے دھیرے سے کہا۔ ''اس پر سونے کی بلبل بیٹھی ہے۔ بلبل کی چونچ میں ہیرا دبا ہوا ہے۔ یہ پھول نہ ملا تو تمہاری حالت اس سے بھی زیادہ بگاڑ دی جائے گی۔ اسے تلاش کرو، جلدی کرو جلدی''

خدیجہ بیگم کو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے اس لیے وہ منصور بخش کو فوراً ہی قلعے کے ایک کونے میں واقع خفیہ زیر زمین خزانے کی طرف لے گئی۔ خزانے کا خفیہ دروازہ پینے کے پانی کے حوض کے گرد بنی ہوئی دیوار میں واقع تھا۔

تہہ خانے میں خدیجہ بیگم نے ٹٹول ٹٹول کے مشعل کی جگہ تلاش کی، منصور بخش نے بروقت مشعل کو جلا دیا اور اس کی روشنی میں کئی قطاروں میں رکھے ہوئے صندوق چمک اٹھے۔ تب خدیجہ بیگم نے جو بالکل بے جان ہو رہی تھی، بڑی مشکل سے کنجیاں لگا لگا کر صندوقوں کو کھولنا شروع کیا۔ وہ صندوق چاندی کے سکوں سے بھرے ہوئے تھے۔ منصور بخش کی

دیکھیں چمک رہی تھیں، ہاتھ مار مار کے پھول کے صدقوں کے مال کو الٹنے پلٹنے لگے۔ پھر دو پہر سکوں ہو کر پل بھر کے لیے کسی سوچ میں ڈوب گیا۔

لیکن وہ پھول کہاں ہے؟ زمردی پتیوں والا، گلاب کا وہ پودا کہاں ہے؟'' اس نے دھمکی آمیز لہجے میں پوچھا۔

دونوں نے ساری چیزیں الٹ پلٹ کے دیکھیں لیکن پھول کہیں بھی نہ ملا۔

"ہائے ہائے!" خدیجہ بیگم انتہائی غم زدہ ہو کر بین کرنے لگی۔ "کسی نے پھول چرا لیا مجھ سے میرا آخری سہارا بھی چھین لیا ہائے، میں مر گئی! ہائے میں لٹ گئی!"

"ارے خاموش ہو جا تو اپنی ان آہوں سے حسین بیقر کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتی تھی۔ لیکن مجھے فریب نہیں دے سکتی۔ پھول کو تلاش کر! بتا نا، کہاں چھپا دیا ہے؟"

"جھوٹ بول رہی ہے! تو نے اسے دور کہیں چھپا رکھا ہے۔ چل، بتا فوراً بتا!"

اور منصور بخشی خدیجہ بیگم کو بڑی سختی سے پکڑ کر حوض کے کنارے گھسیٹ لایا۔

"چل، بتا! تو مجھے فریب نہیں دے سکتی!"

"میں آپ کو فریب نہیں دے رہی ہوں، جناب والا۔ فریب تو خود مجھ ہی کو دیا گیا ہے! ہائے لگتا ہے میری آخری گھڑی آن پہنچی۔ مظفر مرزا کے لیے میں نے کیا کیا نہیں کیا۔ بیٹا بھی مجھے دغا دے کر بھاگ کھڑا ہوا! سگا بیٹا ان سارے مصائب کو جھیلنے کے لیے مجھے چھوڑ گیا! سگا بیٹا!"

"لیکن وہ پھول تو نے اپنے بیٹے کو تھوڑی دیا ہے۔ اسے تو کہیں چھپا رکھا ہے تو نے! خود حکمران مجھ سے فرما چکے ہیں کہ سونے کی بلبل کی چونچ میں ہیرا اٹکا ہوا ہے۔ میں ان سے وعدہ کر چکا ہوں کہ بلبل والے اس پھول کو تلاش کر کے ان کی خدمت میں نذر کروں گا۔ فوراً اسے تلاش کر کے نکال!"

"کسی نے چرا لیا ہے تو تلاش کہاں کروں؟"

"نہ تلاش کرے گی؟ تلاش کرنا ہی نہیں چاہتی! تو یہ لے!"

منصور بخشی نے خدیجہ بیگم کو دھکا دیا اور وہ سیدھی حوض کے برفیلے پانی میں جا گری۔ وہ ذرا دیر تک بپھرا ہوا کھڑا رہا، خدیجہ بیگم کو پانی نگلتے اور غوطے کھاتے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر خدیجہ بیگم کے بال پکڑ لیے، پانی سے باہر کھینچ لیا اور یونہی گھسیٹتا ہوا خواب گاہ کی طرف لے چلا۔ خدیجہ بیگم کو تین دنوں تک طرح طرح کی اذیتوں کا نشانہ بنایا گیا لیکن پھول کا نام و نشان تک نہ ملا۔ چوتھے روز رات کو وہ دنیا سے کوچ کر گئی۔

طاقتور، عاقل اور حیلہ باز شیبانی خان نے اپنے پیش رو فاتحین کے تجربات سے کچھ بھی تو نہیں سیکھا تھا۔ وہ دریائے مرغاب کے کنارے ایران کے شاہ اسمٰعیل کی تیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل بہت ہی جری فوج کے نرغے میں آ گیا۔

سردیوں کا زمانہ تھا اور دن بہت سرد اور ابر آلود۔ اس نے اس یقین کامل کے ساتھ شاہ اسمٰعیل کے لشکر پر حملہ کر دیا تھا کہ ایک اور فتح اس کی منتظر ہے۔ ایک گھنٹے، صرف ایک ہی گھنٹے قبل تک اس کی سپاہ کو تعداد اور طاقت دونوں اعتبار سے دشمن کے لشکر پر برتری حاصل تھی۔ اسے جو اطلاعات ملی تھیں (درست اطلاعات حاصل کرنے میں وہ ہمیشہ ہی کامیاب رہتا تھا) ان کے بموجب شاہ اسمٰعیل نے مرو کے گرد بارہ ہزار سپاہی مامور کر رکھے تھے اور وہ بارہ ہزار سپاہی پورے ایک مہینے سے خزاں کے آخری ایام کی سردی اور سیلن بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ موسم سرما کی سردی میں ٹھٹھر رہے تھے۔ دوسری

طرف وہ خود مرو کے قلعے کو بند کیے ہوئے اس کے اندر بچے پندرہ ہزار شکم سیر، پوری طرح مسلح اور گرم میر کوس میں رہنے والے سپاہیوں کے ساتھ مقیم تھا۔ شاہ اسمعیل کی کمزور پڑتی ہوئی فوج پر حملے کے لیے مناسب موقعے کا منتظر تھا۔

لیکن عیار کو عیار کے کان کاٹنے والے بھی مل ہی جاتے ہیں۔ شیبانی خان کو اگر معلوم ہوتا کہ اب کے اس کا پالا کتنے طاقتور اور عیار دشمن سے پڑا ہے تو وہ مرو کے قلعے سے باہر نکلنے میں جلد بازی ہرگز نہ کرتا۔ لیکن فتوحات کے نشے نے اس کی احتیاط برتنے کی حس ہی کو کند کر دیا تھا۔ ایک سال قبل شاہ اسمعیل شیبانی خان کو دباؤ کے آگے جھک جانے والا اور کمزور معلوم ہوا تھا۔ خان نے ہرات کو فتح کرنے کے بعد بچے پچاس ہزار سپاہیوں پر مشتمل لشکر سے ایران کے وسطی علاقے پر حملہ کر دیا تھا اور راستے میں استرآباد، گورگان اور کرمان پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ ان دنوں شاہ اسمعیل مغرب میں ترکی کے سلطان بایزید دوم سے جنگ میں الجھا ہوا تھا اسی وجہ سے شمال سے ہونے والے خان کے اس حملے کا مقابلہ نہ کر سکا تھا۔ حملہ آور کی ہوس برابر بڑھتی ہی گئی تھی۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو سب کچھ لوٹ لینے اور جی بھر کے قتل عام کرنے کی آزادی دے دی تھی۔ لیکن اس موقعے پر شاہ اسمعیل کو مجبوراً اپنے غصے کو دبانا اور شیبانی خان سے معاہدہ امن کرنے کے لیے اپنا ایک ایلچی قیمتی تحائف کے ساتھ خان کے پاس بھیجنا پڑا تھا۔ ایلچی کے ذریعے بھیجے جانے والے پیغام میں شاہ نے خان کو ماوراءالنہر کے علاوہ خراسان کا بھی حکمران تسلیم کیا تھا اور اچھے ہمسایوں کے جیسے تعلقات قائم کرنے کی درخواست کی تھی۔

شیبانی خان کے بھتیجے اور اس کی گھڑسوار فوج کے سالار عبید اللہ سلطان اور بیٹے تیمور سلطان کے علاوہ اس کے چچا کوچ کنچی خان نے بھی شاہ کے ایلچی کا پورے اعزاز کے ساتھ یا کم از کم اس طرح خیر مقدم کرنے کا مشورہ دیا تھا جس طرح خان نے کبھی تاشقند کے حکمران محمود خان، اندجان کے حکمران احمد تنبل اور سمرقند کے حکمران سلطان علی مرزا کے سفیروں کا کیا تھا۔ ان صلاح کاروں کا خیال تھا کہ ایلچی کے ساتھ اچھے سلوک کے ذریعے، ماہرانہ حکمت عملی کے ذریعے ایسی فضا پیدا کی جانی چاہیے جس سے شاہ اسمعیل کی چوکسی میں ڈھیل پڑ جائے اور پھر مناسب موقع ملتے ہی فیصلہ کن حملے کے ذریعے اس کا بھی اسی طرح خاتمہ کر دیا جائے جس طرح محمود خان، احمد تنبل اور دیگر مخالفین کا کیا جا چکا تھا۔

اب شیبانی خان دریائے مرغاب کے کنارے کف افسوس مل رہا تھا کہ اس نے اس صلاح کو نہیں مانا تھا اور اپنے دشمن کی طاقت کو بہت کم سمجھ بیٹھا تھا۔

اسے ماوراءالنہر سے بھی تشویش ناک خبریں موصول ہوتی رہی تھیں۔ خان کے خانہ بدوش صوبے داروں کے باعث سمرقند، بخارا اور وادی فرغانہ میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اسے خراسان سے تیس ہزار لشکریوں کو عبید اللہ سلطان اور تیمور سلطان کی کمان میں ماوراءالنہر روانہ کرنا پڑا تھا کیونکہ وہ ماوراءالنہر پر بہر قیمت اپنا اقتدار برقرار رکھنا چاہتا تھا۔

شیبانی خان کے اعلیٰ عہدے دار اور سردار بھی اس سے ناراض ہوتے جا رہے تھے۔ عام طور پر تاریخ دہرائی جا رہی تھی۔ ماضی کی طرح اس وقت بھی وسیع و عریض مقبوضہ علاقوں کے صوبے دار اپنے "آقا" سے آزاد ہونے کے کوشاں تھے، مرکز سے پیار رشتہ توڑنے پر مائل عناصر طاقتور ہوتے جا رہے تھے۔

شیبانی خان نے اس صورت حال سے نپٹنے کے لیے عبید اللہ سلطان سے بخارا، اپنے چچا کوچ کنچی سے ترکستان اور حمزہ سلطان سے حصار کو چھین کر ان کی جگہوں پر ان کے بہ نسبت کم آزاد خیال اور زیادہ فرماں بردار صوبے دار مقرر کر دیے تھے۔ اپنے بیٹے تیمور سلطان کو وہ کافی دنوں سے اپنے تخت کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتا تھا۔ ڈرتا تھا کہ کہیں جوشیلا، بے محابا فیصلے کرنے والا اور ذہین بیٹا باپ کے خلاف کسی سازش کا سرغنہ نہ بن بیٹھے۔

شاہ اسمٰعیل کو شیبانی خان کے صدر مقام پر عراق اور ماوراءالنہر میں پھیلی ہوئی بے چینی کا علم ہو گیا۔ اس نے موسم سرما کی پروا نہ کرتے ہوئے براہ راست ہرات پر جہاں شیبانی مقیم تھا، حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ خراسان میں بھی خان کی حالت زیادہ مضبوط نہ تھی اس لیے وہ شاہ کے حملے کا مقابلہ کرنے کے بجائے ہرات سے پیچھے ہٹ کر مرو چلا گیا۔ مرو کا قلعہ بہت مضبوط تھا اور یک لحاظ سے ماوراءالنہر جانے کے راستے کو روکے ہوئے تھا۔ اس کے علاوہ خان نے ماوراءالنہر کو اپنے قاصدوں کے ذریعے یہ ہدایات بھی بھیج دیں کہ بیس ہزار منتخب اور دلیر سپاہیوں کی اس فوج کو مدد کے لیے فوری طور پر واپس روانہ کر دیا جائے جو کچھ عرصہ قبل ماوراءالنہر بھیجی گئی تھی۔

اس مرحلے پر خان کے سپہ سالاروں میں لامحالہ اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ اس اندیشے کے تحت کہ کہیں سپہ سالار یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ شیبانی خان شاہ سے دہشت زدہ ہو کر بھاگ رہے ہیں، یہ دلیل دی گئی شاہ کو مرو کی طرف بڑھنے کی ترغیب دی جائے گی۔ اس اثنا میں ہماری فوج ماوراءالنہر سے واپس آ جائے گی اور تب یہ "شیخ بچہ" ہمارے منصوبے کے شکنجے میں پھنس جائے گا۔ اس منصوبے کو ہمیشہ ہی کی طرح دانشمندانہ تصور کر لیا گیا اور شیبانی اور اس کے لشکر نے مرو کے قلعے کے اندر مضبوطی سے قدم جما لیے۔ شاہ اسمٰعیل مذاق اڑانے والے انداز میں خان کو خط لکھ لکھ کر للکارنے لگا کہ ہمت ہو تو درویش کا "کشکول گدائی"* اور عصا لے کر آئے ہوئے غریب شیخ کے فرزند سے کھلے میدان میں نکل کر ٹکر لو۔ دوسرے الفاظ میں اسے خان کے فوجی اعتبار سے طاقتور ہونے پر شک ہو رہا تھا۔ اسمٰعیل کے یوں دل ہی دل میں مسرور ہونے کو متکبر خان دانت پیس پیس کر برداشت کرتا رہا۔

تاریخ دہرائی جا رہی تھی۔ کبھی بابر کو ایسا کرنا پڑا تھا اور اب اس کے دشمن شیبانی خان کو قلعہ بند ہو کر بڑی بے چینی کے ساتھ کمک کا انتظار کرنا پڑ رہا تھا۔ تجربہ کار سپہ سالار شیبانی جانتا تھا کہ چوبیس سالہ شاہ اسمٰعیل کتنا ہی جوشیلا اور بہادر کیوں نہ ہو، اس کے لیے پورے موسم سرما میں محاصرہ جاری رکھنا ناممکن ہو جائے گا۔ برف باری اور انتہائی سرد ہوائیں اسے دیر سویر محاصرہ اٹھا لینے پر مجبور کر دیں گی۔ وہ سوچتا تھا کہ جب شاہ کی تھکی ہاری اور کمزور فوج اپنے مقصد کے حصول میں ناکام ہو کر واپس لوٹنے لگے گی تب۔ اس سے پہلے ہرگز نہیں[1]۔ وہ ایرانی سپاہ پر ٹوٹ پڑے گا، اسے پوری طرح نیست و نابود کر دے گا۔ فتح کے نتیجے میں ایران پر اس کا قبضہ ہو جائے گا۔ اس کے بعد بغداد اور پھر مکہ شریف کا راستہ کھل جائے گا۔ تب ساری دنیائے اسلام اسے حقیقی خلیفہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے گی اور ساری غیر اسلامی دنیا اسے سکندر ثانی مان لے گی۔

لیکن خان کے ان شاندار خوابوں کو تیس ہزار سپاہیوں کے لشکر کا انتظار خاک میں ملائے دے رہا تھا۔ ماوراءالنہر سے مرو تک کا فاصلہ کم ہی تھا پھر بھی جانے کیوں یہ لشکر مرو پہنچنے میں اتنا زیادہ وقت لگا رہا تھا۔ فوج کے راستے میں رکاوٹ بھی بس ایک ہی تھی۔ تند و تیز دریائے آمو۔ پھر بھی ہمیشہ ہی مستعدی اور پھرتی سے کام کرنے والے عبید اللہ سلطان، تیمور سلطان اور حمزہ سلطان جانے کیوں اتنی دیر لگا رہے تھے۔ شیبانی خان ان لوگوں کی تساہلی کے اسباب کے متعلق قیاس آرائیاں کرتا رہتا تھا۔ شاید یہ لوگ ناراض ہیں کیونکہ میں نے انھیں صوبے داروں کے ممتاز اور منفعت بخش عہدوں سے ہٹا دیا ہے۔ یقیناً ان لوگوں کو مجھ سے سخت جھلاہٹ محسوس ہو رہی ہوگی۔ شاید یہ لوگ ایک دوسرے سے کہہ رہے ہوں

* یہ اس کشکول کی طرف اشارہ تھا جسے شیبانی نے اس بات پر طنز کرنے کے لیے ایلچی کے ذریعے شاہ کو بھجوایا تھا کہ اسمٰعیل ایک درویش کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔

ہے "" ساری پرخطر مہموں میں تو ہم لوگ پیش پیش رہے، ساری اہم جنگوں میں فتوحات تو ہماری تلواروں کے بل پر حاصل کی گئیں لیکن خان ان دنوں جواں بیگمات کے ساتھ عیش کر رہا ہے، اس کی نگاہوں میں ہماری خاک بھی وقعت نہیں۔ وہ تو ہمیں عہدہ و منصب سے ہٹا رہا ہے، ہمارا مذاق اڑا رہا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں، اب ہمارے بغیر ہی کام چلائے اب اس شاہ سے اکیلے ہی لڑے۔""

شیبانی خان جنگ بجو ہو کے دل ہی دل میں اپنے سپہ سالاروں کے اس طرز عمل پر معترض ہوتا تھا ""سب تو ہم کے کہیں سے انہیں، کہتے نہیں، پہ 'کیا اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ میں نہ ہوتا تو لوگ کہیں کے نہ رہتے؟ یہ بھی کوئی ناراض ہونے کا وقت ہے جبکہ نہایت ہی اہم بات کا، میرے مقدر سے کہیں زیادہ اہم بات کا فیصلہ ہونے جا رہا ہے کہ فتح ازبکوں کو حاصل ہوتی ہے یا شاہ اسمٰعیل کو۔ یہ وہ سوال ہے جس پر ہمارے شاہی خاندان کی زندگی اور موت کا انحصار ہے۔ یا تو ہمارا دشمن زندہ رہے گا یا ہم۔' خان دل ہی دل میں قسم کھاتا تھا کہ شاہ ایران پر فتح حاصل کرتے ہی ماوراء النہر کی اس فوج کے سب سالاروں کو بدل دے گا، تاخیر کرنے کے سلسلے میں جو لوگ قصور وار ٹھہریں گے انھیں سخت سے سخت سزا دے گا۔'

لیکن وہ فوج کسی طرح مرو پہنچ ہی نہیں رہی تھی۔ کوئی ایسا تھا ہی نہیں جسے وہ سر دے سکتا۔ خاص بات یہ تھی کہ کوئی ایسا بھی نہیں جس کے ساتھ مل کر وہ فتح حاصل کر لیتا۔

قیامت کی سردی پڑنے لگی، درجہ حرارت نقطہ انجماد سے بھی نیچے گر گیا۔ شاہ اسمٰعیل نے خان کو ایک اور خط بھیجا جس میں اسے بزدل قرار دیتے ہوئے کہا کہ وہ محاصرہ اٹھا رہا ہے لیکن انتقام لینے کے لیے موسم بہار میں ضرور آئے گا۔

مرو کے مضبوط قلعے کی فصیلوں کے اوپر سے بڑی دلچسپی کے ساتھ دیکھا گیا کہ شاہ اسمٰعیل کے سپاہیوں نے خیمے اکھاڑ کر اونٹوں پر لادے اور صف آرا ہو کر جنوب مغرب کی سمت روانہ ہو گئے۔

شیبانی خان نے اپنی گھڑ سوار فوج کو تیزی سے قلعے سے باہر نکل کر حملے کے لیے تیار ہو جانے کا حکم دے دیا۔ قلعے کا پھاٹک کھولنے سے قبل وہ ایک مینار پر سے کافی دیر تک دریائے آمو کی طرف دیکھتا رہا۔ کمک کی آمد کا وہ اب بھی منتظر تھا لیکن اس کی تیز نگاہوں نے بھی مخبروں کی لائی ہوئی اطلاع ہی کی تصدیق کی۔ تیس ہزار سپاہیوں کا اس کا وہ لشکر ابھی آمو دریا کے اس طرف ہی کافی دوری پر تھا۔ آخرکار خان نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ خزانے اور حرم کی حفاظت کے لیے پانچ سو سپاہی چھوڑ دیے جائیں گے اور باقی فوج کو وہ حملے کے لیے ساتھ لے جائے گا۔

شاہ اسمٰعیل کی فوج بڑی افراتفری کی حالت میں مرو قلعے سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ خان نے سوچا کہ کیا وہ جانی دشمن کو اس طرح بچ کر نکل جانے کی اجازت دے سکتا ہے؟ بعد میں لوگ اس کے بارے میں کیا کہیں گے؟ یہی نا کہ شاہ اسمٰعیل کو برتری حاصل تھی اور خان اپنے نامی گرامی سالاروں کے بغیر مقابلے سے کترا رہا تھا؟ نہیں، وہ تو خان اور خلیفہ ہے، وہ تو اپنی زندگی میں کبھی بھی بزدل نہیں رہا۔ وہ ساری اسلامی دنیا پر ثابت کر دکھائے گا کہ اپنی تمام جنگوں میں فتوحات خود اپنے بل بوتے پر حاصل کی ہیں۔ بس قسمت آج بھی اس کا ساتھ دے جائے.....

حکم کی تعمیل کی جا چکی تھی۔ گھڑ سوار حملے کے لیے صف آرا ہو چکے تھے۔ اتنے میں عبدالرحیم اس کے پاس آیا اور بے قلبی ہو ڈر سے نیچے پڑ جانے والے ہونٹوں کو بمشکل کھول کھول کر سمجھانے لگا کہ قلعے سے باہر نکلنا قرین مصلحت نہیں:

""معظم خان! ہمیں آپ کی بیش بہا زندگی کو خطرے میں ڈالنے کا کوئی حق نہیں۔ ہمیں ماوراء النہر کی فوج کے یہاں پہنچ جانے کا انتظار کرنا چاہیے۔""

"پر وہ فوج ہے کہاں؟ آخر وہ لڑتے کیوں نہیں ان کتوں کا" خان برس پڑا۔

"سردیوں میں آمو جیسے دریا کو پار کرنا لوہے کے چنے چبانا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے۔ عبیداللہ سلطان اور تیمور سلطان جلد ہی آ جائیں گے۔"

"کب آئیں گے؟ جب سردی تیز ہو جائے گی؟ میں شاہ اسمٰعیل کے قدموں کے نشانات مٹا چکی ہوں گی؟ یہ سلطان اگر یہ کرنا چاہتے تو کبھی کے یہاں پہنچ چکے ہوتے!! ان کم بختوں نے جان بوجھ کر مجھے اکیلا چھوڑ دیا ہے! سوچتے ہیں کہ ان کے بغیر میں جنگ کرنے سے قاصر ہوں۔ ڈینگ مار رہے ہوں گے کہ ساری فتوحات ان ہی کی طاقت سے حاصل ہوئی تھیں۔ میں ثابت کر دکھاؤں گا کہ فتوحات میں نے حاصل کی تھیں۔ خود میں نے اپنے ان ہی عقابوں کے سہارے!"

شیبانی نے گھڑسواروں کی صفوں کے پاس پہنچ کر بلند اور واضح آواز میں انھیں مخاطب کیا

"میرے عقابو! آپ دیکھ چکے ہیں کہ دشمن کیسی افراتفری کی حالت میں بھاگے جا رہے ہیں۔ تعداد میں وہ ہم سے کم ہیں۔ قیامت کی سردی نے انھیں کمزور کر دیا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ خدا آج ہمیں ایک اور فتح سے ہمکنار کرے گا۔ دشمنوں پر ٹوٹ پڑو میرے عقابو! انھیں مورچہ بندی کا موقع دیے بغیر ہی ان پر ٹوٹ پڑو اور کشتوں کے پشتے لگا دو! پروردگار، ہمیں ایک بار پھر فتح عطا کر! آمین! اللہ اکبر!"

"آمین! اللہ اکبر!" لشکریوں کا نعرہ گونج اٹھا۔

اور خان کی کمان میں گھڑسوار شاہ کی واپس جاتی ہوئی فوج کے تعاقب میں ہوا سے باتیں کرنے لگے۔ لیکن وہ فوج واپس کب جا رہی تھی۔ یہ تو محض ایک چال تھی۔ قزلباش* محض دکھانے کے لیے ہی پیچھے ہٹ رہے تھے۔ خان کے مخبر جو دشمنوں کے بارے میں ہمیشہ ہی درست اطلاعات فراہم کیا کرتے تھے، اس بار چوک گئے تھے۔ انھیں بھنک تک نہیں لگ سکی تھی کہ شاہ نے مرو قلعے کے محاصرے پر اپنی تھوڑی سی فوج مامور کی تھی اور بیس ہزار منتخب سپاہیوں کو مرو سے کچھ فاصلے پر دریائے مرغاب کے اس پار ریگستانی ٹیلوں کے عقب میں بڑی ہوشیاری کے ساتھ چھپا دیا تھا۔

فن حرب کی یہ وہی پرفریب چال تھی جسے خود شیبانی خان بھی بارہ سال قبل بخارا کے قریب واقع شہر قاراکول کے باغیوں کے خلاف اپنا چکا تھا۔ اس موقعے پر خان نے محاصرہ اٹھا لیا تھا، دکھاوے کے لیے پیچھے ہٹ کر قلعے کے محافظین کو باہر نکلنے کی ترغیب دی تھی اور جب وہ باہر آ گئے تھے تو انھیں ریگستان میں گھیر کر ایک ایک کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ بعد میں خان نے گھوڑوں کے بازار میں ان باغیوں کے سروں کا "مینار" کھڑا کرا دیا تھا۔

ہاں، شیبانی خان کو اپنی طاقت کا ضرورت سے زیادہ ہی یقین تھا۔ وہ تصور بھی نہ کر سکا کہ کوئی سپہ سالار خود اس کے خلاف بھی یہی پرفریب چال چل سکتا ہے۔ شاہ اسمٰعیل کے بارہ ہزار فوجی پیچھے ہٹ رہے تھے، ہٹ نہیں رہے تھے بلکہ مرو سے بھاگ رہے تھے۔ شیبانی نے تیزی کے ساتھ تعاقب کرنے کا فیصلہ کیا۔ شاہ کا لشکر راستے میں محمودی نامی جگہ پر بنے ہوئے پل کو پار کر کے دریائے مرغاب کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ خان نے سوچا کہ تعاقب جاری رکھتے ہوئے قریب پہنچ کر حملہ کر دینا چاہیے۔ شاہ اسمٰعیل دکھاوے کے طور پر پل کی حفاظت کے لیے تقریباً تین سو سپاہی مامور کر کے آگے بڑھ گیا لیکن خان کی نہایت ہی طاقتور گھڑسوار فوج کے پل کے پاس پہنچتے ہی شاہ کے یہ سب سپاہی خوف زدہ ہو

* قزلباش (ترکی)۔ لفظی معنی سرخ سر۔ شاہ اسمٰعیل نے اپنے لشکریوں کے لیے بارہ گوشوں والی سرخ ٹوپیاں بنوائی تھیں اس لیے ان کا نام قزلباش پڑ گیا تھا۔ بعد میں ان سپاہیوں کی اولاد بھی قزلباش کہلائی۔

جانے کا جان بوجھ کر تاثر دیتے ہوئے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ شیبانی نے پل کو پار کرنے کا فیصلہ کیا۔ دراصل دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچنے کی اور کوئی صورت بھی نہ تھی۔ دونوں کناروں پر عمودی ڈھلوانوں والے بلند کراڑے موجود تھے، کہیں کوئی گھاٹ نہیں تھا اور ویسے بھی برف جیسے سرد پانی میں تیر کے دریا کو پار کرنا ممکن نہ تھا۔ آگے بڑھنے کے لیے پل کا پار کیا جانا ضروری تھا۔

شیبانی کی ساری فوج جب تک دوسرے کنارے پر نہیں پہنچ گئی تب تک اسمٰعیل کے گھات میں بیٹھے دستوں نے کسی بھی طرح اپنی موجودگی نہ ظاہر ہونے دی۔ شیبانی کی فوج پل سے کافی دور تک آگے نکل گئی تب ہی یہ دستے ٹیلوں کی آڑ سے نکل کر حملہ آور ہوئے اور پہلے سے بہت ہی مہارت کے ساتھ نصب کی گئی توپوں سے پتھر کے گولے داغنے اور تیر برسانے لگے۔ قزلباشوں نے شیبانی کی فوج کو تین طرف سے گھیر لیا اور چوتھی طرف دریا تھا۔

اب کہیں جا کر خان کی سمجھ میں آیا کہ وہ پھندے میں پھنس گیا ہے۔ اسے یاد آ گیا کہ کبھی اس نے قازقوں کے [illegible]بیوں کے خلاف خود بھی یہی چال اپنائی تھی۔ اب وہ فتح کے بجائے اپنی جان کی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگا۔ وہ گھوڑے کو تیزی سے دوڑاتا ہوا پل کے قریب آیا لیکن یہ چوبی پل ٹوٹ چکا تھا۔ ایرانی دستوں کے دباؤ سے خان کی فوج کے گھوڑے اور سوار بلند کراڑے سے دریا میں گرنے لگے اور جلد ہی سطح آب پر لاشیں ہی لاشیں نظر آنے لگیں۔ خود خان اپنے کچھ دلیر سپاہیوں کے ساتھ دریا کے کنارے کنارے بھاگا اور کچھ دور جا کر جاڑوں میں بھیڑیں رکھنے کے ایک باڑے میں پھنس گیا۔ قزلباشوں نے فوراً ہی باڑے کو گھیر کر حملہ شروع کر دیا۔ خان کے نجی محافظین جانبازی کے ساتھ لڑتے ہوئے یکے بعد دیگرے ہلاک ہونے لگے۔ اسمٰعیل نے خان کو عزم و استقلال کے ساتھ اپنا دفاع کرتے دیکھا تو اس نے توپیں باڑے کے قریب ہی لگوا دیں۔

یہ کارروائی فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ زخمی گھوڑے گولوں کے دھماکوں سے غضب ناک ہو کر ایک دوسرے کو اور سپاہیوں کو روندتے ہوئے بھاگنے لگے۔ شیبانی خان نے جو ہاتھ میں برہنہ شمشیر لہرا رہا تھا، اپنی بلند آواز سے چیخ چیخ کر اس بھگدڑ کو روکنے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش ادھوری ہی رہ گئی۔ پتھر کا ایک گولا آ کر براہ راست اس کے گھوڑے کے سر پر لگا۔ دوسرے ہی لمحے گھوڑا بھی زمین پر ڈھیر ہو گیا اور سوار بھی۔

شیبانی خان رکابوں سے پاؤں نہ نکال سکا اور اس کی ایک ٹانگ گھوڑے کے نیچے دب گئی۔ اسی لمحے ایک دوسرا گھوڑا خان کے اوپر آن گرا۔ اس طرح خان جس کی پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں اور جو گھوڑے کے وزن سے زمین میں دھنسا جا رہا تھا بے ہوش ہو گیا۔

لڑائی کے بعد ایک قزلباش سردار نے جو خان کو پہچانتا تھا، اس کی لاش ڈھونڈ نکالی۔ خان کے چاروں طرف کی زمین دشمنوں اور عبدالرحیم اور منصور بخشی سمیت خود اس کے بہت سے عہدیداروں اور سرداروں کی لاشوں سے پٹی پڑی تھی۔

فاتحین نے شیبانی کی لاش سے سر کاٹ کر نیزے پر اٹھایا اور اسے شاہ کے پاس لے جا کر اس کے گھوڑے کے سموں کے نیچے پھینک دیا۔ بعد میں شیبانی خان کے بہائے ہوئے خون کے بدلے کے طور پر اس کے سر کی کھال اتروا کر اس میں بھوسا بھر دیا گیا۔ شیبانی کے کاسۂ سر پر سونے کے پتر مڑھ دیے گئے اور فاتحین نے اس "جام"* سے شراب پی۔

---

* یہ تفصیلات شاہ اسمٰعیل کے مخالفین نے بیان کی ہوتیں تو ان کی صداقت پر شک کیا جا سکتا تھا لیکن ان کا تذکرہ شاہ کے ایک طرفدار کی تصنیف "تاریخ عالم آرائے عباسی" اور خواند میر کی تصنیف "حبیب السیر" میں کیا گیا ہے۔

قندز --- اور ایک بار پھر سمرقند

۱

خان زادہ بیگم کے اپنے دس سالہ بیٹے خرم کے ساتھ مرو سے رخصت ہوتے ہوئے قندز پہنچنے کے سفر کا دوسرا ہفتہ شروع ہو چکا تھا۔

سفید اونٹ پر بندھے شاندار محمل میں جو سنہرے پھندنوں والے ریشمی پردوں سے ڈھکا ہوا تھا، بیٹھ کر سفر کرنے کے باوجود کارواں کے راستے بہت دشوار ثابت ہو رہے تھے۔ انھیں اونچے نیچے ٹیلے، جنگل، لق و دق صحرا اور نالے پار کرنے پڑے تھے لیکن قندز اب بھی کافی دور ہی تھا۔ خان زادہ بیگم اور اس کا بیٹا تھک چکے تھے۔ اسی طرح چار کنیزیں، چھ خادم اور سو قزلباش محافظ بھی جو ان دونوں کے ساتھ سفر کر رہے تھے، تھکن محسوس کرنے لگے تھے۔

شاہ اسمٰعیل شیبانی سے سخت نفرت کرتا تھا اور خان زادہ بیگم پر جو شیبانی کی بیگمات میں سے ایک تھی اس نے لطف و عنایت کی بارش اپنی فتح کے فوراً ہی بعد نہیں کی تھی۔ مرو میں خان کی بیگمات کی تقسیم کے موقعے پر شاہ کے ایک معتبر سردار نجم ثانی نے خان زادہ بیگم کو اپنے حرم میں رکھ لینے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ خان زادہ بیگم کے اکلوتے بیٹے خرم کو کچھ دنوں کے لیے زنداں میں بند کر دیا گیا تھا کیونکہ خان کے خاندان والوں پر کوئی بھی شخص رحم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سبھی اس خاندان کو مکمل طور پر نیست و نابود کر دینے پر تلے ہوئے تھے۔

لیکن اس اثنا میں قندز سے بابر کا ایک ایلچی شاہ اسمٰعیل کے نام اس کا پیغام لے کر آن پہنچا۔

بابر نے شاہ کو مبارک باد دی تھی کہ اسے حملہ اور شیبانی پر شاندار فتح حاصل ہوئی۔ اس نے شاہ سے یہ درخواست بھی کی تھی کہ اس کی بہن خان زادہ بیگم پر جو اپنی مرضی کے خلاف ظالم و جابر شیبانی کے حرم میں داخل ہوئی تھی، خاص طور سے رحم کھایا جائے۔

شاہ اسمٰعیل نے سن رکھا تھا کہ بابر ایک دانش ور بادشاہ ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ بابر بے تعصب ہے اور شیبانی اور اس کی حکمت عملی کے حامیوں کا جانی دشمن۔ شاہ ایران شیبانی خانداں کے حکمرانوں کے خلاف اپنی مہموں کا سلسلہ جاری رکھنے اور ان سے سارے ماوراءالنہر کو چھین لینے کا بھی ارادہ رکھتا تھا۔ اس جدوجہد میں بابر سے اچھا دست راست اسے اور کہاں مل سکتا تھا۔ اور پھر بابر اپنے لشکر کو کابل سے لے کر ماوراءالنہر کے نزدیک واقع شہر قندز یوں ہی تھوڑی پہنچ گیا تھا۔ قندز میں تو وہ اپنے لشکریوں کی تعداد بڑھانے کا بھی ارادہ رکھتا تھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ بابر بھی ماوراءالنہر پر قابض ہو جانے کے خواب دیکھ رہا تھا جس کا وہ اوروں کی بہ نسبت کہیں زیادہ حق دار بھی تھا۔ ان سب باتوں کے مدنظر شاہ اسمٰعیل نے موقعے سے فائدہ اٹھا کر بابر کو پناہ دی اور مہربان محسن بنا لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے سوچا کہ وہ بابر کی مدد سے ماوراءالنہر کو شیبانی کے بیٹوں سے چھین لے گا اور اس کے بعد دیکھے گا کہ ماوراءالنہر پر اپنا دعویٰ ثابت کرنے کی زیادہ طاقت کس میں ہے۔

چنانچہ شاہ نے سنگدلی کے بجائے نیکی اور رحمدلی کا مظاہرہ کیا۔ خان زادہ بیگم اور اس کے بیٹے (اس کے شوہر خود ساختہ خلیفہ کے بیٹے) کو رہا کر دیا گیا۔ ان دونوں کو نہ صرف یہ کہ سو سپاہیوں پر مشتمل دستے کی حفاظت میں بابر کے پاس

جانے کی اجازت مل گئی بلکہ شاہ کے ایک عالی نسب وزیر محمد جان کو بھی ساتھ کر دیا گیا۔

خان زادہ بیگم کو نہ شاہ کے ان خیالات کا علم تھا اور نہ ہی اس بات کا کہ اس کے ساتھ سفر کرنے والا ایرانی سفیر خفیہ فوجی معاہدہ کرنے کے مقصد سے بابر کے پاس جا رہا ہے۔ اسے تو دل ہی دل میں نامعلوم آلام و مصائب کا جو اس کو اور اس کے بیٹے کو اپنے گرداب میں کھینچ سکتے تھے، جیسے پہلے ہی سے احساس ہو رہا تھا۔ اس عورت کا جو بے شمار تکالیف جھیل چکی تھی، دل طرح طرح کے اندیشوں اور خوف سے معمور تھا۔

ویسے اسے ایرانی محافظ دستے کے سپاہیوں سے ذرا بھی خوف نہیں محسوس ہو رہا تھا۔ یہ سپاہی اس کی کنیزوں سے بھی کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ نہیں کرتے تھے۔ کئی ایسے مواقع آئے تھے جبکہ خان زادہ بیگم کو یقین ہو گیا تھا کہ بظاہر تند خو معلوم ہونے والے قزلباش خواتین کے ساتھ بڑی شائستگی سے پیش آتے ہیں۔

وہ شاہ کی بھی ممنون تھی اور اس کے سپاہیوں کی بھی۔ تاہم کسی نامعلوم خطرے کے احساس نے اسے جس خوف اور تشویش میں مبتلا کر رکھا تھا اس سے کسی طرح نجات ہی نہیں پا رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے خطرہ گھاٹیوں اور گھنے جنگلوں سے دبے پاؤں اس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہو۔ کارواں کڑی ڈھلانوں سے اترنے یا تنگ گھاٹیوں سے گزرنے لگتا تو وہ محسوس کرتی کہ چونک پہاڑ ان لوگوں کے اوپر پھٹ پڑنے ہی کو ہیں۔ طوفان برق و باراں کے دوران تو خوف کے مارے اس کی جان ہی نکل جاتی تھی، انتہائی تیزی سے شروع ہو جانے والی موسلا دھار بارش اسے واقعی بے حد خطرناک لگتی تھی۔

دوران سفر ایک بار کارواں نے دریائے آمو کے بائیں کنارے پر ایک جگہ جو سرچتال کہلاتی تھی، جنگل کے پاس رات گزارنے کے لیے پڑاؤ ڈالا۔ خان زادہ بیگم کو ہرنوں کا شکار کرتے ہوئے شیروں کی دھاڑیں سنائی دیتی رہیں اور اس نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔

غوری اور قندوز ندیاں مل کر جس جگہ دریائے آمو میں گرتی تھیں وہاں سے سرکنڈوں سے پوری طرح ڈھکا ہوا دلدلی علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ اس جگہ ہوا میں مچھر اتنی زیادہ نمی اور بدبو بسی ہوئی تھی کہ سانس لینا سخت مشکل ہو رہا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ شیبانی خان کا چھوٹا بھائی محمود سلطان جس کا بہت سے خونیں معرکے بال بھی بیکا نہیں کر سکے تھے، قندوز میں کسی عجیب نوعیت کے بخار میں مبتلا ہو کر چند ہی دنوں میں چل بسا تھا۔ خان زادہ بیگم اس مہیب بخار کو یاد کر کے اپنے بیٹے کو تشویش بھری نگاہوں سے دیکھتی رہتی تھی۔

اس نے کبھی ایک افغان کہاوت سنی تھی، ’جان سے ہاتھ دھونا چاہتے ہو تو قندوز چلے جاؤ‘۔ وہ اسے مذاق سمجھ کر ہنس پڑی تھی۔ لیکن اب یہی کہاوت اسے سچی معلوم ہونے لگی۔ اسے اپنی زندگی سے کہیں زیادہ تشویش اپنے عزیز فرزند کی زندگی کی طرف سے لاحق رہتی تھی جو دراصل اسی کا بیٹا تھا کیونکہ وہ نفرت انگیز بوڑھا شیبانی بس کہنے ہی کا باپ تھا۔ اس نے تو بیٹے کی دس سالہ زندگی میں بس کبھی کبھار ہی اسے دیکھا تھا، بیٹے سے بس برائے نام ہی دلچسپی لی تھی۔

”کہیں ایسا نہ ہو کہ بابر مرزا قندوز میں موجود ہی نہ ہوں، پہاڑ کو پار کر کے اندجان نہ چلے گئے ہوں۔ کہیں وہ کابل نہ لوٹ گئے ہوں۔ تب ہم کیا کریں گے؟“ خان زادہ بیگم بار بار فکرمند ہو کر سوچتی رہتی تھی۔

پامیر اور ہندوکش سے گھری ہوئی وادی قندوز خان زادہ بیگم کو ابھی تک پھندے کی سی لگی۔

پھر ایک دن دوپہر کو اس مقام پر جہاں آمو کے کنارے سے راستہ کوہستانی رفعتوں کی طرف جاتا تھا، کارواں کو اک

کے محافظ دستے سے نکلے بڑے اور پوری طرح مسلح دستے نے روک لیا۔ جلد ہی پتا چل گیا کہ دستہ ملک بیٹے ورید دستہ بابر کے روانہ کیے ہوئے گشتی دستوں میں سے ایک ہے۔ گشتی دستے کا سردار محمد کوکلتاش کارواں کو پہاڑی پر واقع قلعے کی طرف لے چلا۔ خانزادہ بیگم کو اب اچانک یہ وادی بہت خوبصورت معلوم ہونے لگی کوہساروں سے آتی ہوئی ہوائیں خوشگوار تھیں، ڈھلوانوں پر اگے ہوئے شجر نہایت ہی دلکش تھے، وردریا کے کنارے گزرتا ہو راستہ دلفریب۔

قندز کے سابق خانوں نے قلعے اور اس کے اندر واقع محل کی تعمیر کے لیے بہت ہی صحت افزا مقام منتخب کیا تھا" اور بڑی خوش مذاقی کے ساتھ" خانزادہ بیگم نے یہ سوچتے ہوئے کہ اسی محل میں اس کی ملاقات پیارے عزیز بھائی سے ہونے والی ہے، بڑے سکون واطمینان سے دل ہی دل میں کہا اور بے پایاں مسرتوں سے ہمکنار ہو گئی۔

پھاٹک پر محل داروں نے ان کا خیر مقدم کیا۔ وہ خانزادہ بیگم، اس کے بیٹے اور کنیزوں کو محل کے خاص طور سے آراستہ کیے گئے حصے میں لے گیا اور پھر فوراً ہی بابر کو مطلع کرنے چلا گیا۔

چند لمحات کے بعد ہی خوبصورت داڑھی اور سلیقے سے سنواری ہوئی مونچھوں والا کوئی تیس سال کا ایک جوان تقریباً دوڑتا ہوا دیوان خانے میں داخل ہوا۔ خانزادہ بیگم نے سمجھا کہ یہ بابر کا کوئی بیگ ہے کیونکہ اس کے پیچھے ہی پیچھے ایک اور جوان بھی اندر آیا تھا۔

خانزادہ بیگم کو بھائی کا اس زمانے ہی کا چہرہ یاد تھا جب وہ انیس سال کا نوجوان تھا اور داڑھی بھی ٹھیک سے نہیں نکلی تھی۔ اندر داخل ہونے والے اس شخص اور اس جوان میں کوئی خاص مماثلت نہیں پائی جاتی تھی۔ پھر چوڑے شانوں اور ترشی ہوئی ہموار مونچھوں والے اس جوان کا لباس بھی شاہانہ نہ تھا ہیروں موتیوں سے خالی روپہلی دستار اور عام ریشمی چغہ دراصل بابر بہن کی آمد کی اطلاع پاتے ہی خلوت گاہ سے جہاں وہ عموماً لکھتا پڑھتا رہتا تھا، جس حالت میں تھا ویسے ہی دوڑ پڑا تھا۔

خانزادہ بیگم جو اب بھی یقین نہیں کر سکی تھی کہ اندر داخل ہونے والا جوان بابر ہی ہے، اس کے چہرے کو غور سے تکنے لگی۔ بابر متعجب ہو کر ٹھہر گیا۔ اس کا گلا رندھ گیا اور بمشکل ہی آواز نکل سکی

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟!۔۔ میں آپ کا بھائی ہوں! ہر بات کے لیے قصوروار آپ کا بابر"

"ہاں ہاں، میرا آنکھیں تو پیارے بابر جان ہی کی ہیں! یہ آواز تو پیارے بابر جان ہی کی ہے!" اور خانزادہ بیگم لپک کر بھائی کے پاس پہنچی، اس کے سینے پر اپنی ہتھیلیاں رکھیں اور پھر چہرہ بھی ٹکا دیا۔ بابر نے بہن کو گلے سے لگا لیا اور اسے سسکیوں کے درمیان، مسرت اور غم کے آنسوؤں کے درمیان یہ الفاظ سنائی دیے

"بابر جان۔۔ میں اس وقت۔۔۔ خان کے پاس چلی گئی تھی آپ کے حکم کے برعکس میں جانتی ہوں کہ میرے اس اقدام کی وجہ سے آپ کو کیسے کیسے خباثت بھرے طعنے سننے پڑے تھے لیکن یقین کیجیے کہ اس وقت میرے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہ تھا۔"

ہاں مجھے معلوم تھا ۔۔ میں سمجھ گیا تھا کہ آپ نے میری خاطر اپنی زندگی قربان کر دی۔ میں اپنی آخری گھڑی تک آپ کا مرہون منت رہوں گا۔"

"اگر آپ اسے احسان ہی کہتے ہیں تو کیا آج۔۔۔۔ آپ نے اس کا بدلہ نہیں چکا دیا۔ آپ نے مجھے قید سے، اُجم خانی کے حرم سے بچا لیا ہے، بابر جان!۔۔۔۔ خدا کا ہزار ہزار شکر کہ اس نے مجھے یہ بھائی عطا کیا۔"

افسوس کہ والدہ محترمہ کو یہ دن، دیکھنا نصیب نہ ہوا۔"

"مجھے آپ پر فخر ہے، آپا جان!

خان زادہ بیگم کو اپنی والدہ کے انتقال کی خبر گذشتہ سال ہی مل گئی تھی لیکن اس وقت اس کا ایک بار پھر سن ناقابلِ برداشت درد سے تڑپ اٹھی کہ وہ ماں کو اب کبھی بھی نہ دیکھ سکے گی۔

"ہائے، پروردگار نے ہمیں اپنی والدہ سے کتنی جلدی یوں محروم کر دیا؟" خان زادہ بیگم نے بابر سے الگ ہٹ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "کب ہوا تھا انتقال؟ علیل تھیں کیا؟"

"پانچ سال قبل۔ محترقہ دماغی سے۔ کابل کے باغ میں سپردِ خاک کر دی گئی تھیں۔"

"افسوس، پچاس سال کی بھی نہ ہو پائی تھیں کہ چل بسیں۔"

"ہاں ویسے تو کتنے ہی لوگ اسی نوے سال تک جیتے رہتے ہیں۔"

"ہماری وجہ سے انھوں نے جانے کتنی تکالیف جھیلیں، ہر پل فکر مند رہیں۔ ورنہ آخر انھیں سب پریشانیوں نے انھیں قبر میں پہنچا دیا۔"

اتنے میں محمد کوکلتاش نے جو پیچھے خاموش کھڑا ہوا تھا، کہا:

"ارے بیگم صاحبہ، قسمت کے لکھے کو بھلا کون مٹا سکتا ہے؟ خوشی کی بات ہے کہ آپ ہمارے حکمران سے، اپنے برادرِ عزیز سے آن ملیں۔ آپ کی والدہ مرحومہ کی روح اس ملاقات سے کتنی مسرور ہو رہی ہوں گی۔ آئیے بیٹھ کر ان کے لیے دعائے مغفرت کریں۔"

وہ تینوں زربفت کے گدے پر بیٹھ گئے۔ قاسم بیگ اندر آیا اور وہ بھی خاموشی سے ان ہی کے پاس بیٹھ گیا۔ پھر اس نے قتلوغ نگار خانم کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے دھیمی اور سوگوار آواز میں لحن کے ساتھ فاتحہ پڑھا۔ اس کے بعد ہی اس نے خان زادہ بیگم کو قندوز پہنچنے پر مبارک باد دی۔

خان زادہ بیگم نے اپنے بیٹے خرم کو جو دیوان خانے کے کونے میں کنیزوں کے درمیان بیٹھا ہوا اس سب کو قدرے بے زاری سے دیکھ رہا تھا، اشارے سے بلایا۔ لڑکا آ کر ماں کے پیروں کے پاس بیٹھ گیا۔

خرم اپنے گورے چٹے چہرے، نیلی آنکھوں اور چھدری بھنوؤں کی بنا پر ہو بہو اپنے باپ شیبانی خان جیسا لگ رہا تھا۔ بابر نے شیبانی کو قریب سے کبھی بھی نہیں دیکھا تھا لیکن اسے اس مشابہت کا احساس ہو گیا۔ "ناک نقشہ ہمارے خاندان کے افراد کا سا نہیں ہے، ہرگز نہیں۔ ۔ ۔ یہ لڑکا بھی ہمارا ہو سکے گا کہ نہیں؟"

خرم ابھی سات سال کا بھی نہیں ہوا تھا، باپ نے اسے بلخ کا صوبیدار نامزد کر دیا تھا۔ اس عہدے کی ذمے داریاں اس کے سرپرست مہدی سلطان نے سنبھال رکھی تھیں لیکن خرم جلد ہی اس بات کا عادی ہو گیا تھا کہ عمر میں بہت بڑے اور ممتاز عہدے دار بھی اسے کورنش بجا لایا کریں۔

خان زادہ بیگم نے بابر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خرم سے کہا کہ یہ تمھارے ماموں جان ہیں۔ پھر بھی خرم ایک اجنبی شخص کے سلسلے میں اپنے بے تعلقی کے طرزِ عمل پر فوری طور پر قابو نہ پا سکا۔ دل ہی دل میں اسے نظر انداز کرتا رہا وہ محض اس کے عام لباس ہی کے باعث نہیں۔ اس نے بادلِ نخواستہ سر کی ایک جنبش سے بابر کو سلام کیا اور بس۔ نہ اٹھ کر بابر کے پاس گیا اور نہ ہی اس سے کوئی بات کی۔

خان زادہ بیگم نے بیٹے کے شانے کو ہلکا سا دھکا دیتے ہوئے سخت لہجے میں کہا:

"ذرا ہوش میں آیئے تا! ہم لوگ بابر مرزا کے دربار میں ہیں۔ انہی کی سفارش پر تو شاہ اسمٰعیل نے ہمیں آزاد کیا تھا۔"

خرم کو جیسے چانک ہوش آ گیا۔ اس نے آنکھیں پوری طرح کھول لیں اور متحیر سا منہ کھولے ہوئے باپ کی طرف دیکھا۔ بابر کو اب احساس ہوا کہ لڑکے کی آنکھیں ماں ہی کی آنکھوں کی طرح بڑی بڑی اور تیز ہیں۔

خرم درباری آداب کو جو اسے سکھائے گئے تھے، بھولا نہیں تھا۔ اس نے اپنے عزت والے بائیں پیر کو آگے کیا، دائیں گھٹنے کے بل بابر کے سامنے بیٹھ کر دونوں ہاتھ سینے پر رکھے اور سر جھکا کر لڑکوں کی مخصوص کھنکتی ہوئی دلنشیں آواز میں بولا

"عالی جاہ، یہ ناچیز آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔"

اور اب بابر نے دیکھا کہ خرم کی ناک بھی خان زادہ بیگم ہی کی ناک جیسی ہے۔ اس کے دل میں بھانجے کے لیے جو بہت ہی خود دارانہ سا معلوم ہو رہا تھا، محبت کے جذبات امڈ آئے حالانکہ ان جذبات میں ابھی حال ہی میں بجھائی جانے والی جنگ کے تلخ دھوئیں کی کچھ بو بھی بسی ہوئی تھی۔

"خدمت میں حاضر ہوئے ہو تو خوش آمدید، عزیز بھانجے" بابر نے کہا اور خرم کو اپنے دائیں پہلو میں بٹھا لیا۔

اتنے میں کوئی پچپاس سال کی ایک فربہ اندام عورت جو خرم کی نگران تھی، اجازت لے کر اندر آئی اور کہا کہ ملکہ عالیہ بادشاہ سلامت اور ان کی ہمشیرہ سے ملاقات کرنا چاہتی ہیں۔

بابر نے بہن کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے معنی خیز انداز میں عورت سے کہا:

"ان سے کہیے کہ مرزا ہمایوں کو بھی اپنے ساتھ لیتی آئیں۔"

بابر کی نوجوان ملکہ ماہم بیگم کو نامحرموں کی موجودگی کے باعث دیوان خانے میں آتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی تھی چنانچہ قاسم بیگ اور محمد کوکلتاش بابر سے اجازت لے کر دبے پاؤں باہر چلے گئے۔

خان زادہ بیگم کے لیے محل کا جو حصہ وقف کیا گیا تھا اس کے دروازے کے باہر متعدد افراد اکٹھا ہو چکے تھے۔ مرغینان کا خواجہ کلاں بیگ، قوا کا طاہر، تاشقند کا سعید خاں، سمرقند کا مجید برلاس اور اندجان کا سپاہی یوسف۔ سب کے سب خان زادہ بیگم سے ملاقات کر کے اپنے وطن کی خبریں دریافت کرنا چاہتے تھے۔ قاسم بیگ نے ان لوگوں کو واپس کر دیا۔

"پہلے وہ اپنے عزیزوں سے جی بھر کے باتیں کر لیں پھر آپ لوگوں کے لیے بھی اجازت حاصل کروں گا۔"

۲

چھریرا بدن اور شفتالو کے رنگ کا چست لباس۔ یہ تھی نوجوان ملکہ جو تین سالہ شہزادے (ولی عہد) کی انگلی پکڑے ہوئے دیوان خانے میں داخل ہوئی۔ خان زادہ بیگم کو فوراً ہی احساس ہو گیا کہ لڑکا بالکل بابر ہی پر پڑا ہے۔ وہ تیزی سے اٹھ کر ان دونوں کی طرف بڑھی۔ ماہم بیگم سادگی، شائستگی اور نفاست سے سر کو خم کر کے آداب بجا لائی۔ خان زادہ بیگم نے قریب پہنچ کر اپنے ہاتھ اس کے نازک اور گول شانوں پر رکھ دیے، چہرے کو دیکھا ("وہ، کتنی حسین و جمیل ہیں") اور پھر بابر کی طرف مڑ کر بڑے مسرور لہجے میں کہا۔

''مبارک ہو کتنے معصوم ہیں آپ دونوں ایک دوسرے کے لیے پروردگار ہمیشہ شاد و فرحاں رکھے''

ننھا ہمایوں ماں کا دامن تھامے اپنی اجنبی پھوپھی کا پاؤں سے سر تک بغور جائزہ لے رہا تھا۔ خان زادہ بیگم نے اسے گود میں اٹھا لیا اور حیرت کی بات تھی کہ بچے نے اس کی گود سے نکلنے کی ذرا بھی کوشش نہ کی پھر جب خان زادہ بیگم نے اپنا رخسار اس کے گال سے سٹایا تو وہ مسکرانے لگا۔

خان زادہ بیگم ہمایوں کو گود میں لیے ہوئے خرم کے پاس آئی اور اسے نیچے اتار کر بولی

''لیجیے، چھوٹے بھائی اپنے بڑے بھائی سے ملیے۔''

''ولی عہد بابر کا تین سالہ بیٹا اور شیبانی کا دس سالہ بیٹا دونوں دیر تک چپ چاپ کھڑے ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ پھر ہمایوں کی توجہ خرم کی کمر سے لٹکتے ہوئے چھوٹے سے شاندار خنجر کی طرف مبذول ہو گئی اور اس نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ خرم نے جھک کے اس کا ہاتھ تھام کر دھیرے سے دباتے ہوئے سلام کیا لیکن خنجر دینے پر آمادگی ظاہر کی اور ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

یہ دیکھ کر دوسرے سب افراد ہنس پڑے اور بابر نے سوچا ''اپنے مال سے محروم ہونا کوئی بھی نہیں چاہتا''۔ لیکن خان زادہ بیگم نے کچھ بھی نہ سوچا، وہ تو سوچنے کے بجائے مسرور ہو رہی تھی۔ جن فکروں اور اندیشوں سے وہ قندوز تک کے سفر کے دوران کانپ اٹھتی تھی ان کی جگہ اب مسرتوں نے لے لی تھی۔ اب اس کی جگہ پر قہقہے تھے، ان کم سن تاج داروں کو بھی جدا ان بچوں کو دیکھنے کی مسرت تھی، دلکش دلربا ماہم بیگم کی مسکراہٹوں کے جواب میں مسکرانے کی خواہش تھی، بھائی کے ساتھ جس سے وہ بچپن کے ان ایام سے لے کر جب وہ دونوں بھی ان ہی بچوں کے جیسے تھے، آج تک شدید محبت کرتی رہی تھی، خوشیوں کو بانٹنے کی راحت تھی۔ اس کے دل میں انتہائی سرد موسم سرما کے بعد آخر کار بہار آ گئی تھی، خوبصورت اور پرمسرت بہار۔

خان زادہ بیگم نے ایک بار پھر ماہم کو دیکھا اس کے بعد بابر پر شرارت آمیز نظر ڈالتے ہوئے کہا

''عزیز حکمراں، آپ کی تو قسمت جاگ اٹھی۔ ملکہ تو غیرت حور ہیں۔ کہاں مل گئی تھیں، کیسے شیشے میں اتارا تھا؟ آپ کہاں کی رہنے والی ہیں، ماہم بیگم؟''

''خراسان کی، آپا جان۔''

ماہم آنکھوں ہی آنکھوں میں شوہر سے التجا کرنے لگی: ''مجھے شرمندہ نہ کر دیجیے گا، یہ نہ بتا دیجیے گا کہ میں نے ہرات میں دیوار کے اوپر سے آپ کی طرف پھول پھینکے تھے'' بابر کا دل باغ باغ ہو گیا لیکن اس نے جان بوجھ کر اکتائے ہوئے سے لہجے میں گویا کہ کوئی سرکاری دستاویز پڑھ رہا ہو، خان زادہ بیگم کو بتایا کہ اس کی شریک زندگی سلطان حسین بیقرا کی رشتے دار ہے تقریباً چار سال قبل اس کے والد کو بدیع الزماں سے بدمزگی ہو جانے کے باعث ہرات سے غزنی جا کر وہیں بس جانا پڑا تھا۔ بابر نے ماہم کے والد اور بھائیوں کو غزنی سے کابل بلا لیا تھا جہاں ماہم سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔

پھر اس نے اچانک لہجہ بدل کر بہن سے پوچھا

''ہرات اور مرغاب کے درمیان ایک شہر پڑتا ہے۔ حضرت جام۔ آپ نے دیکھا تھا اسے؟''

''جی ہاں مجھے معلوم ہے کہ یہ نام شاعر جامی کے اعزاز میں رکھا گیا تھا۔ سچ ہے نا؟''

"سچ ہے۔ لیکن میں تو دوسری ہی بات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ہماری بیگم کے اعلیٰ بزرگ جامی کے رشتے دار تھے۔" پھر اس نے مذاق کے انداز میں اضافہ کیا "میں نے آپ کو یہ بات اس لیے بتائی کہ ماہم بیگم شعروسخن کا بہت اعلیٰ ذوق رکھتی ہیں، بڑی قدردان ہیں۔ انھیں تو عظیم اساتذہ عبدالرحمٰن جامی اور علی شیر نوائی کے دیوان کے دیوان زبانی یاد ہیں۔ میں جب بھی کوئی غزل کہتا ہوں تو یہ اتنی خامیاں نکالتی ہیں کہ نہ پوچھیے۔"

ماہم نے شوہر کے مذاق کا جواب بھی مذاق ہی سے دیا۔

"کوشش کرنی پڑتی ہے۔ میرے سرتاج میری تنقیدی صلاحیت کو خواہ مخواہ آسمان پر چڑھا رہے ہیں۔"

خان زادہ بیگم نے ان دونوں کی اس چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ کچھ اور آگے بڑھا دیا۔

"میں تو اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ بابر جان آپ کی جتنی بھی تعریف کریں کم ہے۔"

"شکریہ آپا جان۔" ماہم بیگم ذرا دیر خاموش رہی پھر اس نے خان زادہ بیگم سے کہا "میں نے آپ کی دلیری اور ایثار کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا اور ہمیشہ آپ سے نیاز حاصل ہونے کا خواب دیکھتی رہتی تھی۔ خدا کا ہزار ہزار شکر کہ آج وہ خواب پورا ہو گیا۔ آپا جان میں آپ کا تصور کچھ اس طرح کرتی تھی جیسے آپ قدیم داستانوں کی کوئی ملکہ ہوں لیکن آپ سے ملاقات ہوئی تو دل میں خیال آیا کہ آپ کا موازنہ کسی افسانوی ملکہ سے کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کو تو ہمیشہ ہی ہمارے گھر اور ہمارے دل میں انتہائی قابل احترام مقام حاصل رہے گا۔"

خان زادہ بیگم نے ان الفاظ میں دلی خلوص کو محسوس کیا اور اسے بے اختیار عائشہ بیگم یاد آ گئی ("اچھا ہی ہوا کہ بابر جان نے اپنی پہلی بیگم کو طلاق دے دی تھی")۔ ساتھ ہی ساتھ اسے خود اپنی حالت پر افسوس بھی ہوا کہ بھائی جیسی خوش بختی اسے نہیں نصیب ہوئی تھی۔ اسے تو مقدر نے تکالیف جھیلنے کے لیے شیبانی خان کے حرم میں دھکیل دیا تھا۔

اتنے میں بابر کی توجہ اس بات کی طرف مبذول ہو گئی کہ خان زادہ بیگم کے بالوں میں ہلکی ہلکی سفیدی نمودار ہو چکی ہے حالانکہ وہ ابھی چونتیس ہی سال کی تھی۔ بہن نے بابر کو ماں کا اس زمانے کا چہرہ یاد دلا دیا جب وہ بیوہ ہو گئی تھی۔ اور اب خان زادہ بیگم بھی بیوہ ہو چکی تھی۔

اس نے دلی ہمدردی کے ساتھ بہن سے کہا:

"میں آپ کا مرہون منت ہوں، آپا جان اور زندگی بھر رہوں گا۔ میں شاہ اسمٰعیل کی شرافت کو بھی کبھی فراموش نہ کروں گا جنھوں نے آپ کو صحیح سلامت ہمارے پاس بھجوا دیا۔"

"میں آپ کی اجازت سے شاہ کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں" خان زادہ بیگم کا چہرہ کچھ نکھر کر کھل اٹھا۔ "شاہ کی ملکہ تاجلی خانم بے حد حسین ہیں۔ وہ مجھے شاہ کے پاس لے گئیں۔ میں نے شاہ کے بارے میں عجب بھیانک سے قصے سن رکھے تھے۔ میں ان سے بہت خائف تھی پھر بھی چلی گئی۔ سوچتی تھی کہ پرانے قصوں کہانیوں میں جن دیووں کا ذکر آتا ہے بس ان ہی کے جیسے ہوں گے۔ لیکن میں نے تو تخت پر نفیس چہرے مہرے کے کوئی پچیس سال کے نوجوان کو بیٹھے دیکھا۔ داڑھی نہیں تھی، مونچھیں بہت پتلی پتلی لمبی لمبی سی تھیں۔ ناک بھی ذرا لمبی سی تھی۔ اور آنکھیں خوب بڑی بڑی سی۔ وہ آذربائیجانی زبان میں باتیں کر رہے تھے لیکن میری سمجھ میں آ رہی تھیں۔ ان کے ہاں عورتوں کی بہت عزت کی جاتی ہے۔ اس بات کو میں نے اپنے اس سفر کے دوران بھی محسوس کیا۔"

"عورتوں کی عزت تو پہلے ہمارے ہاں بھی بہت کی جاتی تھی" بابر بیچ میں بول پڑا۔ "سمرقند میں ایک مدرسے کا نام

بی بی خانم کے نام پر یوں ہی تھوڑی رکھا گیا تھا۔ اس کے سامنے ہی سرائے ملک خانم کے نام کا مدرسہ واقع تھا۔ شاہ زندہ مقبرے میں شادی ملک خانم اور ترکان آقا کی قبریں بھی موجود ہیں۔ ہرات میں گوہر شاد بیگم کے نام کا مشہور مدرسہ موجود ہے۔ یہ سب امیر تیمور کے خاندان کی خواتین ہی تو تھیں۔"

"پتا نہیں، بہت ممکن ہے کہ امیر تیمور کے زمانے میں ممتاز خواتین کی بہت عزت کی جاتی رہی ہو" ماہم بیگم بابر کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ اٹھی، "پر آج کل نہ جانے کیوں حالات کچھ بدل گئے ہیں۔"

"یہ تو قسمت کے کھیل ہیں" بابر نے کہا۔ "اس زمانے میں، علوم وفنون کی ترقی کے اس زمانے میں عورتوں کی عزت بڑھ گئی تھی کیونکہ علوم وفنون کی حقیقی ترقی عورتوں کی شرکت کے بغیر ممکن نہیں۔ وہ شعرا اور اہل علم کو تخلیقی تحریک عطا کرتی اور خود بھی تخلیقی تحریک کے تحت انجام دیے جانے والے کاموں میں اوج کمال پر پہنچنے کے جوش وخروش کی حامل ہوتی ہیں۔ عہد دوں میں جتنی تکالیف اہل علم اور مصوروں کو جھیلنی پڑتی ہیں اتنی ہی عورتوں کی حالت بھی بدتر ہوتی جاتی ہے۔"

"بجا فرمایا آپ نے۔ روحانی زندگی کے جس تنزل کا آپ نے ذکر کیا وہ آج سارے ماوراالنہر میں پھیل چکا ہے اور اسے دیکھ کر دلی اذیت ہوتی ہے۔" خانزادہ بیگم مغموم سی ہوگئی۔ "بھانت بھانت کے خانہ بدوش قبیلوں کے خانوں اور سلطانوں پر ملک بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ اس کے جسم پر مسلط ہو جانے کا جنون سوار ہے۔ انھیں ماوراالنہر کی روح کی خاک بھی فکر نہیں۔ مجھے جنگ میں ہلاک کر دیے جانے والے اپنے شوہر میں اب عیب نہ نکالنے چاہئیں لیکن مجبور ہوں..... شیبانی خان نے بکھرے ہوئے، ایک دوسرے کے جانی دشمن قبائل کو متحد کیا، ماوراالنہر پر قابض ہو گئے، اپنے نام پر مدرسہ تعمیر کرایا۔ انھوں نے دریائے زرافشان پر پل بھی بنوایا۔ یہ ان کے کچھ نیک کام ہیں۔ لیکن نہ پوچھئے کہ وہ اہل علم اور مصوروں کے ساتھ کتنے اجڈپن سے پیش آتے تھے، کتنی نفرت کرتے تھے عورتوں سے! کوئی ان سے کہہ دیتا کہ تیمور خاندان کے حکمرانوں نے عورتوں کی یاد میں مدرسے اور مقبرے تعمیر کرائے تھے تو وہ غصے سے پاگل ہو اٹھتے تھے۔ ان کا تو کہنا تھا کہ عظیم الغ بیگ نے علم وفن کے چکر میں پڑ کر مذہب اسلام ہی کو فراموش کر دیا تھا، عورتوں کی تعریف کرکے ان کے لیے مدرسے کھلوا کر اخلاق کو خاک میں ملا دیا تھا۔ ان کے حکم سے "شیبانی نامہ" اور "نصرت نامہ" دو کتابیں لکھوائی گئی تھیں۔ یہ میری نظر سے گزری ہیں۔ ان کتابوں میں ایک بھی عورت کا نام شامل نہیں ہے۔ بادشاہوں اور سلطانوں کی ماؤں اور بیٹیوں کے تذکرے بس یوں ہی فلاں کی دختر، فلاں کی بیگم کہہ کے کر دیے گئے ہیں۔ غیر عورت کا نام لینے کا حق کسی کو بھی نہیں تھا حتی کہ مورخین کو بھی نہیں۔ اور یہ وحشیانہ دلیل خان کی تھی جنھوں نے جوں توں مدرسے کی تعلیم مکمل کی تھی اور جوں توں ہی الٹے سیدھے عشقیہ اشعار کہہ لیتے تھے۔"

بابر یہ سن کر مسکرا دیا لیکن اب اس کی مسکراہٹ مسرت کی آئینہ دار نہ تھی۔ خانزادہ بیگم نے اپنی بات جاری رکھی "جہاں تک شیبانی کے بیٹوں کا تعلق ہے تو ان کی علمی استعداد تو اتنی بھی نہیں جتنی کہ ان کے والد کی تھی، بیٹے تو محض وحشیانہ طاقت ہی کے مالک ہیں۔ تمام ارباب علم وفن مطلق العنان سلطانوں کی سلطنت کو چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔ کوئی خراسان بھاگا جا رہا ہے، کوئی استنبول تو کوئی کابل..... سب کی امیدیں آپ ہی سے وابستہ ہیں، بابر جان!" خانزادہ بیگم شاہی آداب کو جیسے بھول سی گئی۔ "برادر عزیز، جانے کتنے ہی صاحبان علم ہیں جن کی نگاہیں آپ پر جمی ہوئی ہیں، جو سوچتے ہیں کہ تخلیقات کی عظیم روح کو جس کا ماوراالنہر صدیوں ہی سے حامل رہا ہے، حیات نو عطا کرنا آپ ہی کی قسمت میں لکھا ہے۔ آپ کو اپنے وطن واپس لوٹ کر آفتاب علم وفن پر چھائے ہوئے سیاہ بادلوں کو ہٹا دینا چاہیے۔"

"علم، تعلیم، حسن، شاعری... ان سب کا کیا ہوا، لیکن افسوس کہ دنیا محض ان ہی پر نہیں قائم ہے" بابر نے سوچا پر فوراً ہی اپنے اوپر معترض ہو گیا "اور یہ سب نہ ہو تو پھر اقتدار ہی کس کام کا؟"

اقتدار... ماوراالنہر پر اس کا اپنا اقتدار قائم ہو سکتا تھا۔ شیبانی خان کے ہلاک کر دیے جانے کے بعد بابر نے متعدد معتبر لوگوں کو سمرقند اور اندجان روانہ کر دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ صحرائی سلطانوں کے مظالم سے پریشان شہروں کے افراد اس کے ماوراالنہر میں قدم رکھتے ہی علم بغاوت بلند کر دینے کو تیار ہیں۔

"اندجان سے تو گزشتہ ہفتے ہی خوشخبری موصول ہوئی ہے" بابر نے کچھ یوں کہا جیسے خود اپنے ہی خیالوں کا جواب دے رہا ہو۔ "ہمارے ایک ننھیالی رشتے دار سعید محمود نے اپنے حامیوں کو منظم کر کے صحرائی سلطانوں کو اندجان سے مار بھگایا ہے۔ انھوں نے مجھے لکھا ہے "آپ تیار ہوتے ہوئے جلد از جلد اندجان آ جائیے۔ آپ کا وطن بڑی بے چینی کے ساتھ آپ کا انتظار کر رہا ہے"

"تو پھر آپ اندجان تشریف لے جائیں گے؟" خان زادہ بیگم نے رہبر سے پوچھا۔

بابر نے اسی طرح کھوئے کھوئے سے انداز میں نفی میں سر ہلا دیا۔ دراصل وہ چاہتا تھا کہ اپنے کسی معتبر بیگ کی کمان میں کچھ فوج اندجان بھیج دے اور خود حصار ہوتے ہوئے براہ راست سمرقند چلا جائے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ بیک وقت دو شہروں پر حملہ آور ہونے کے لیے اس کے پاس کافی لشکر نہیں ہے۔ اس کے لیے شاہ اسمٰعیل کو نظر انداز کرنا بھی ممکن نہ تھا جو اس سے خانہ بدوش سلطانوں کے خلاف فوجی معاہدہ کرنا چاہتا تھا۔ بابر کو معلوم تھا کہ خان زادہ بیگم کے ساتھ شاہ کا ایلچی کس مقصد کے تحت آیا ہے۔ ویسے ایلچی نہ آیا ہوتا تب بھی خان زادہ بیگم کو آنے کی اجازت دے کر شاہ نے جس فیاضی کے ساتھ بابر پر جو احسان کیا تھا اس کا مقصد واضح ہی تھا۔

نہیں، اکیلے تو وہ اندجان ہی پر حملہ آور نہیں ہو سکتا تھا، سمرقند کا تو خیر ذکر ہی کیا۔ بابر کو یہ اطلاع بھی مل چکی تھی کہ شیبانی کا بیٹا، دلیر سپہ سالار تیمور سلطان اپنے ایک سفیر کو تحائف کے ساتھ شاہ کے پاس بھیج چکا ہے۔ اس نے سوچا خدانخواستہ کہیں دونوں بڑی طاقتوں میں گٹھ جوڑ نہ ہو جائے۔ اپنی چیز سے بھلا کون محروم ہونا چاہتا ہے۔ ان دونوں کی سانٹھ گانٹھ سے نقصان صرف تیسرے ہی کو، یعنی اسی کو پہنچے گا جو فی الحال سب سے کمزور ہے۔ لیکن اگر وہ عارضی طور پر بس کچھ ہی دنوں کے لیے اسمٰعیل سے مل جائے گا تو......

بابر نے یہ سب سوچا مگر خواتین کے سامنے بات چھیڑ دی شاہ اسمٰعیل کی شاعرانہ صلاحیتوں کی

"ہمارے ایلچی مرزا خان نے جنھیں میں جلد ہی دوبارہ شاہ کے پاس بھیجنے والا ہوں، ایک بار مجھے شاہ کی کچھ غزلیں دکھائی تھیں۔ وہ آذربائیجانی ترکی زبان میں شعر کہتے ہیں اور بہت ہی خوب کہتے ہیں۔ تخلص بھی بڑی انکساری کے ساتھ "خطائی" رکھا ہے۔"

"واقعی وہ بہت اچھے شاعر ہیں" خان زادہ بیگم نے کہا۔ "میں نے ان کی کچھ غزلیں سنی ہیں، قزلباش لوگ گا رہے تھے۔ شاہ سے جب میری ملاقات ہوئی تھی تو انھوں نے بھی میرے برادر عزیز کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا: "ہم بادشاہ اور بابر شاعر کا تہ دل سے احترام کرتے ہیں۔" پھر انھوں نے آپ کی ایک غزل کا مطلع بھی سنایا تھا۔ ہمارے بادشاہ کی بہت سی غزلیں ہرات کے مغنی گاتے رہتے ہیں۔ شاہ نے آپ کا شعر سنانے کے بعد کہا تھا "آفریں! بہت خوب!"

بابر کو اپنی اس ستائش سے مسرت کا احساس ہوا۔ اس نے ذرا شرماتے ہوئے کہا

"دلچسپ بات ہے۔ لیکن وہ کون سی غزل تھی؟"

ماہم بیگم نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے اسے یاد کرنے کی کوشش کی۔ اتنے میں ماہم بولی اٹھی۔ "پہلا مصرعہ یہ تو نہیں تھا؟"

تمہیں یہ تجھ بن خون ہے صبح کا جیسا میرا دل"

"جی ہاں، جی ہاں، یہی تھا!" خان زادہ بیگم نے کہا اور دوسرا مصرعہ سنا دیا

"۔۔۔ نہیں کتنی ہی بہاریں کیا کھلے گا میرا دل"

"شاید اس شعر نے شاہ کے دل کو یوں ہی نہیں چھو لیا" بابر نے کہا۔ "اس کے سر سے بھی تو والد کا سایہ کم سنی ہی میں اٹھ گیا تھا، بہت سے مظالم سہنے پڑے تھے، تکالیف جھیلنی پڑی تھیں۔ سنا ہے کہ اب شاہ اسمٰعیل مصنفانہ انداز سے حکمرانی کرنا چاہتے ہیں۔"

بابر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس سے شاہ کے ایلچی کی ملاقات کے لیے مقرر کیا گیا وقت ہو چکا تھا۔ ماہم بیگم اسے چھوڑنے کے لیے دیوان خانے کے دروازے تک آئی۔

بابر نے چلتے چلتے مختصراً آواز بلند کہا:

"خیال رکھنے گا کہ میری ہمشیرہ ہم سب کی نگہبان جیسی ہیں؟"

ماہم پر اس الفاظ کا خفیہ مفہوم فوراً ہی واضح ہو گیا۔ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ اور عالی جاہ، میں آپ سے ایک التجا بھی کرنا چاہتی ہوں۔ ذرا محتاط رہیے گا۔ کبھی کبھی زہر بجھے تیروں کو بھی کا شاہی سمجھ لیا جاتا ہے۔"

بابر کا دل یہ سوچ کر کہ ماہم اس کا اتنا خیال رکھتی ہے، اس کی سلامتی کی طرف سے کتنی فکر مند رہتی ہے، اپنی شریک زندگی کے سلسلے میں محبت اور احسان مندی کے جذبات سے معمور ہو گیا اور اس نے یقین دلایا

"آپ فکر نہ کیجئے۔ مجھے یہ بات معلوم ہے۔"

اور اس نے دل ہی دل میں کہا "اسمٰعیل کو معاہدے پر آمادہ کرنے کے لیے مجھے سونے کی خاک بھی پرواہ نہ کرنی چاہیے، سونے کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی کام لینا چاہیے۔ شاہ کو بھی اور اس کے ایلچی کو بھی اپنی فیاضی سے جیت لینا چاہیے۔"

۳

شاہ اسمٰعیل کے بھیجے ہوئے تحائف۔ بیش بہا موتی، بدخشانی لعل، زری کے کام کے شاندار ملبوسات، بہترین طلائی دستے دار تلواریں اور عیش و آرام کی بہت سی نادر اشیاء۔ واقعی بہت شاندار تھے۔ ایسی ہی شاندار ضیافت کی تیاریاں بھی ہو رہی تھیں۔ رکاب دار اور ڈھیروں نوکر چاکر اس ضیافت کے سلسلے میں جیسی تندہی میں پہلے کبھی بھی دیکھی گئی نہیں تھی، دو دنوں اور دو راتوں سے بھاگ دوڑ میں مصروف تھے۔ اس سے زیادہ تو صرف دنبے ہی ذبح کیے گئے تھے۔ جہاں تک کوہستانی اور صحرائی علاقوں، جنگلوں اور دریا کے کناروں سے شکار کر کے لائے گئے ہرنوں، مرغابیوں

ور شہزادوں کا تعلق تھا تو ان کی تو گنتی ہی مشکل تھی۔

بابر کے مشیر مرزا خان نے جو ایران کے متعدد دوروں میں شاہ کی ضیافتوں میں شریک ہو چکا تھا، بابر کو آگاہ کر دیا تھا "قزلباش تو بادہ و جام سے خالی ضیافت کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔"

وزیر اعظم قاسم بیگ جیسا کہ پہلے بھی ذکر آ چکا ہے، شراب سے نفرت کرتا تھا۔ خود بابر نے بھی ابھی تک بادہ نوشی نہیں کی تھی، ایک بار کابل میں ابتدا میں عقد کے بعد ذرا سی چکھ لی تھی اور بس۔

اس وقت بابر کے دل پر چھائی ہوئی مسرتوں کے درمیان کوئی مبہم سی تشویش بھی کوندتی جا رہی تھی جیسے کہ اس کا دل اس پیچیدہ کھیل پر صدائے احتجاج بلند کر رہا ہو جسے اس نے شروع کیا تھا اور جس کے بغیر کام چلانا ناممکن تھا۔

وہ چاہتا تھا کہ ہر شے کو فراموش کر دے۔ اس تشویش سے کم از کم ضیافت کے دوران تو نجات ہی پا جائے۔ ویسے بھی مہمانوں کے بادہ خوار ہونے کے مدنظر میزبان کو خود تھوڑی بہت تو پینی ہی تھی۔

خوشبودار اور تیز شراب ناب اور دیگر شرابیں کافی مقدار میں (جتنی کہ قندوز میں مل سکی تھیں) محل میں پہنچا دی گئی تھیں۔

طلائی زردوزی والے چوبدار کامزوں میں جیوں سے طلائی اور نقرئی پیالوں میں شراب انڈیلنے لگے۔ سب سے پہلے جام شراب بابر، اس کے بعد اس کے پاس ہی بیٹھے ہوئے شاہ کے سفیر اور ایران کے وزیر محمد جان اور مرزا خان کو پیش کیے گئے۔

ضیافت میں سوائے راشد بیگ اور دیگر ممتاز افراد شریک تھے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ اس سے قبل کی شاہی ضیافتوں میں بابر اور قاسم بیگ سے چھپ کر مے نوشی کیا کرتے تھے۔ لیکن آج تو کچھ اور ہی عالم تھا، آج تو یہ لوگ جام تھامے ہوئے ایک دوسرے کو شرارت آمیز نگاہوں سے دیکھ دیکھ کر حکمران کے اشارے کا انتظار کر رہے تھے۔ نسبتاً غیر اہم بیگوں کے درمیان بیٹھا ہوا طاہر نقرئی جام کی طرف بار بار بڑی احتیاط سے جیسے کہ وہ کوئی جاندار شے ہو، دیکھ رہا تھا۔ اسے شراب عجیب سی لیکن پرکشش لگ رہی تھی۔

اتنے میں مرزا خان نے اپنی گھنی گھنی، ایک دوسرے سے جڑی ہوئی بھوؤں کو جنبش دیتے ہوئے شاہ کے سفیر سے سرگوشی کے انداز میں کہا

"مہمان عظیم آپ ایک غیر معمولی واقعے کے چشم دید گواہ ہوں گے۔ یہ پہلا موقع ہے جب بابر مرزا کی کسی ضیافت میں دور جام چلے گا۔ ذرا ملاحظہ کیجیے تو، شرکا پر کیسی ہیجانی کیفیت طاری ہے!"

عقاب جیسی ناک اور مہندی سے رنگی ہوئی داڑھی والے سفیر نے اپنے بڑے سے عمامے کو جس پر سرخ تاج کا نشان لگا ہوا تھا، جھٹک کر دسترخوان پر نظریں دوڑائیں اور پھر مڑ کے بابر کو ٹکٹکی باندھ کے دیکھنے لگا۔

بابر جام کو یوں تھامے ہوئے تھا جیسے وہ کوئی طائر ہو جو ہاتھ سے اڑ جانے یا اسے زور سے کاٹ کھانے کو تیار بیٹھا ہو۔ سب کو انتظار تھا کہ بابر کچھ کہے۔ آخر کار اس نے لب کھولے

"خوشی کے موقع پر عالی نسب مہمانوں کے ساتھ بہترین انگور کی شراب پینے کا رواج ہمیں اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملا ہے۔ ہماری زندگی میں اب تک مسرتیں کم تھیں اور غم زیادہ اسی لیے ہم جشنوں میں بھی بادہ نوشی سے اجتناب ہی کرتے رہے۔ ہمارے معزز بیگ صاحبان کو علم ہے کہ ہرات میں ہمارے تاجدار رشتے دار مرزا بدیع الزماں اور مرزا مظفر نے ہمارے اعزاز میں جن شاندار ضیافتوں کا اہتمام کیا تھا ان میں ہمیں مے ناب پیش کی گئی تھی لیکن

ہم نے ان دونوں سے معذرت کرلی تھی۔ دراصل ان دنوں ہمارا سیہ خوشیاں منانے کی اجازت ہی نہیں دیتے تھے۔ خوش قسمتی سے ہمیں بھی خوشی کے دن دیکھنے نصیب ہو گئے ہیں۔ ویسے ہم پر ایران کے شاہ اسمٰعیل کی حمایت وخوشنودی کا نتیجہ ہے۔ آج کی یہ مسرت ہمیں ہمارے مہمان عزیز نے بطور تحفہ عطا کی ہے۔ آیئے یہ پہلا جام شاہ اسمٰعیل کے حضور اور نام پر جس سے ہمارے دل معمور ہیں اور ان کے دانش مند سفیر اور دوست محمد جان سے دوستی کے نام پر پئیں!"

ان الفاظ سے بے حد متاثر ہو کر سفیر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ سر کو تعظیم سے جھکا کر شکریہ بجا لایا۔ پھر اس نے بیٹھ کر جام کو ہونٹوں سے لگایا اور خالی کر دیا۔ سارے مردوں نے پُرمسرت نغمہ "سرود نوا" چھیڑ دیا۔

۴

موسم بہار کے آخری زمانے میں جبکہ بابر کے لشکر کا زیادہ تر حصہ حصار پر حملہ آور ہونے کے لیے ہندوکش کے شمالی دامن میں پہنچ چکا تھا، ایک روز قاسم بیگ کو ان مغل بیگوں کی سازش کا علم ہوا جو کچھ عرصہ قبل شیبانی کا ساتھ چھوڑ کر بابر سے آن ملے تھے۔ کوئی بیس ہزار سپاہی جوان بیگوں کے ساتھ تھے، ہمیشہ ہی جنگ پر آمادہ رہتے تھے۔ پیسوں اور مال غنیمت کے لیے جنگ کرنا ان بیگوں کے لیے ایک طرح کا معمول زندگی بن گیا تھا۔ کوئی حکمران ان کی خدمات کے عوض زیادہ پیسوں کی پیشکش کرتا تو زیادہ تر مغل بیگ اس سے جا ملتے تھے، کسی جنگ میں زیادہ مال غنیمت ہاتھ لگنے کی توقع ہوتی تو اس میں لڑنے کے لیے چل کھڑے ہوتے تھے۔ انھیں بابر کی فتح کا پہلے ہی سے یقین تھا اسی لیے وہ بابر سے آن ملے تھے لیکن ان کے درمیان ایسے بیگ بھی تھے جو ابھی تک درپردہ اپنے سابق آقاؤں ہی کے حامی تھے۔

سازش کا سرغنہ قنبر علی اس بات کو عارضی طور پر راز میں رکھے ہوئے تھا کہ وہ بابر کا جانی دشمن ہے کیونکہ گذشتہ سال اس کے چھوٹے بھائی کو جو ایک دوسری سازش میں ملوث تھا، کابل میں سزائے موت دے دی گئی تھی۔ قنبر علی نے اپنے گرد ایسے لوگوں کو اکٹھا کر لیا تھا جو بابر کا تختہ الٹنے کے لیے تڑپ رہے تھے۔ انھیں شاہی خاندان کے کسی ایسے فرد کی تلاش تھی جسے بابر کی جگہ تخت پر بٹھا سکیں۔ ان لوگوں کی نظر انتخاب بابر کے ماموں الاچہ خان کے سترہ سالہ بیٹے سعد خان پر پڑی تھی جس کی پرورش بابر ہی نے کی تھی۔ قنبر علی نے اس لڑکے کو اپنے دام میں پھانسنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ ایماندار اور ہوشیار ثابت ہوا تھا۔ اس نے مغل بیگوں کی اس سنگین سازش پر کسی قسم کے اظہار رائے کیے بغیر ہی ان کی تجویز پر غور و خوض کرنے کا وعدہ کر لیا تھا اور بعد میں یہ سارا قصہ قاسم بیگ سے کہہ سنایا تھا۔

قاسم بیگ نے اس سازش کی تفصیلات بابر کو تنہائی میں اس وقت بتائیں جب وہ دونوں دامن کوہ میں لوگوں کی نگاہوں سے کافی دور نکل چکے تھے۔ بابر یہ سنتے ہی آگ بگولہ ہو گیا

"کمینے بیگ! آخر یہ کمبخت مجھ سے کب تک غداری کرتے رہیں گے؟ وہ احمد جانی احمد تنبل بھی تو مغل ہی تھا! بہت ہو چکا! گرفتار کر لیجیے ان سب کو، ٹکڑے ٹکڑے کروا دیجیے ان کے، پھنکوا دیجیے ان کی لاشوں کو تاکہ زاغ و زغن نوچ نوچ کر کھا جائیں!"

قاسم بیگ نے گھوڑے کی لگام کھینچ کر کوہستانی ڈھلانوں پر نظریں دوڑائیں جن کے دامن میں ترود سا خیمے نصب تھے۔

"لیکن حکمران کی تعداد تو بہت ہے۔ ہزاروں سپاہی ان کے ساتھ ہیں۔"

"تو کیا واقعی سارے کے سارے مغل اس سازش میں شریک ہیں؟"

"جی نہیں، سب نہیں شریک ہیں۔ سعید خان بھی تو مغل قبیلے ہی کا ہے لیکن اس نے ہم سے مکمل وفاداری کا مظاہرہ کیا۔ دوسرے کئی مغل بھی ہمارے خیر خواہ ہیں۔"

"تب ہمیں ان لوگوں پر، مغل قبیلے پر اعتبار کرنا چاہیے مگر ان سب سازشی بیگوں کو قید کر لینا چاہیے جن کا سرغنہ قنبر علی ہے۔"

"لیکن قنبر علی ہی تو سب سے زیادہ بااثر ہے۔ بہت سے بیگ اس کے رشتہ دار بھی ہیں۔ اور ان سب کے سینوں میں انتقام کی آگ ہمیشہ بھڑکتی رہتی ہے۔ اگر ہم ان دشمنوں کو کچلنے میں مصروف ہو گئے تو دوسرے دشمنوں کے خلاف لشکر کشی کیسے کر سکیں گے؟ کہیں ہمارے منصوبوں پر پانی نہ پھر جائے؟"

قاسم بیگ کا خیال درست تھا۔ ہزاروں سپاہیوں کی فوج میں مجرموں کا پتا لگانا، انھیں سزائیں دینا کوئی کھیل تو تھا نہیں۔ پھر اس کارروائی میں کافی وقت بھی لگ سکتا تھا اور تب تک دوسروں پر حملہ کرنے کا موقع ہاتھ سے نکل جاتا۔ بعد میں واپسی کے راستے بھی بند ہو سکتے تھے۔ دوسری طرف بابر کسی طرح وطن واپس پہنچنے کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے کو، سنگین سے سنگین خطرات مول لینے کو بھی تیار تھا۔

بابر نے صورت حال کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا تو اس کا غیظ و غضب ناراضگی میں تبدیل ہو گیا۔

"غدار کہیں کے! خوب جانتے تھے کہ وار کب کرنا چاہیے"

"عالی جاہ بجا فرما رہے ہیں لیکن عیارانہ چالوں کی کاٹ ایمان داری سے کرنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ آپ کا یہ خادم کچھ دوسرے ہی اقدامات کرنے کی سوچ رہا ہے۔"

"کیسے اقدامات؟"

"سعید خان آپ سے اپنی وفاداری کا ثبوت دے چکا ہے نا؟ یقیناً دے چکا ہے۔ سازشی بیگوں کی تعداد ان کے سرغنہ قنبر علی سمیت تقریباً دس ہے اور یہ لوگ سعید خان کو اپنا خان بنانا چاہتے ہیں۔ ٹھیک ہے، اسے ان لوگوں کا خان بن جانے دیجیے۔ ہم ان بیگوں سے کہیں گے، "سعید خان آپ لوگوں کا حکمراں ہے۔ آپ اپنے سپاہیوں کو لے کر اندجان چلے جائیے"۔ مغل نوجوان اب ہمارے طرف دار ہو چکے ہیں۔ سعید خان وہاں جا کر آپ کے نام سے حکومت کرے۔ اس طرح ہم قنبر علی سے نجات پا جائیں گے۔"

"اور اگر بعد میں باقی مغلوں نے بھی سازش کی راہ اختیار کر لی تو؟"

"اس کا امکان بہت کم ہے۔ باقی غیر مطمئن بیگوں سے میں خود ہی بات کر لوں گا۔ کہوں گا کہ اس بار تو آپ لوگ میری حمایت کی بدولت مرزا بابر کے قہر و عتاب سے بچ گئے ہیں لیکن اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ میں دوبارہ آپ کی حمایت کرنے سے رہا۔ ویسے جن بیگوں پر زیادہ شک ہے ان پر میرے آدمی بہر حال نگاہ رکھیں گے۔ پانی سر سے اونچا ہونے لگا تو انھیں فوراً ہی گرفتار کر لیا جائے گا"

بابر نے گہری ٹھنڈی سانس لی۔ سعید خان کو قربان کر دینے کا منصوبہ اسے پسند نہ آیا لیکن مسئلے سے نپٹنے کی کوئی بہتر تدبیر بھی اسے نہ سوجھی۔

موسم گرما کے آغاز میں بابر نے لشکر (مغل دستوں کو چھوڑ کر جو سعید خان کے ساتھ آئے ہوئے تھے) نے دریائے پنج کو پایاب عبور کیا اور وادی وخش میں تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔

شیبانی کے بیٹے جانتے تھے کہ اگر بابر کا لشکر مشرقی جانب سے آگے بڑھتے ہوئے قزل باشوں سے مل گیا تو وہ ان کے نرغے میں آ جائیں گے۔ چنانچہ بابر کے دشمنوں نے اپنی فوج کا ایک حصہ عبید اللہ سلطان کی ماتحتی میں قرشی اور سمرقند میں چھوڑ کر باقی ساری فوج حصار میں جمع کر لی تھی۔ تیس ہزار سواروں کی اس فوج نے جس کے سالار تیمور سلطان، ابو سعید سلطان، حمزہ سلطان اور مہدی سلطان تھے، صحراؤں کو تیزی سے پار کیا اور بابر کے لشکر کو دریائے وخش پار کرنے سے روکنے کے لیے پہاڑوں پر چڑھنے لگی۔

لیکن بابر کا لشکر پہاڑوں پر سے بہت تیزی کے ساتھ اترتا ہوا اپنے دشمنوں سے پہلے ہی وخش کے کنارے پہنچا اور دریا پر بنے ہوئے پل کو جو "پل سنگین" کہلاتا تھا، پار کر کے دوسرے کنارے پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد بابر کے سپاہیوں نے وادی میں آنے والے راستوں کی نگرانی کے سلسلے میں چٹانوں کے آگے کو نکلے ہوئے حصوں پر مضبوط مورچے قائم کر لیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صحرائی سلطانوں کی فوج وادی میں قدم رکھنے کی جرأت نہ کر سکی اور ٹھہر گئی۔

بابر نے کوہستانی بلندیوں سے دیکھا کہ سلطان اپنے گھوڑوں سے اترے بغیر ہی صلاح و مشورہ اور بحث مباحثہ میں الجھ گئے ہیں۔ کچھ دیر بعد کوئی دس ہزار دستے جو تیمور سلطان کے پرچم تلے ہوئے تھے، وادی میں داخلے کے راستے کی طرف چل دیے۔ ساری کارروائی کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ لوگ ان پہاڑی بلندیوں کا جن پر بابر کا لشکر قابض تھا، محاصرہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ ایک قسم کا تلغمہ تھا۔ تیمور سلطان کے ان دس ہزار فوجیوں کو روکنے کے لیے مرزا خان کی کمان میں اتنے ہی گھڑ سوار روانہ کر دیے گئے۔ تیمور سلطان کا راستہ چکر دار تھا جبکہ مرزا خان کا سیدھا اس لیے مرزا خان اپنے دشمن سے پہلے ہی منزل مقصود پر پہنچ کر اہم کوہستانی بلندیوں پر قابض ہو جانے میں کامیاب ہو گیا۔ تیمور سلطان اپنے فوجیوں کے ساتھ ڈھلانوں کی تنگ پگڈنڈیوں کے ذریعے بلندیوں پر چڑھنے کے لیے دوپہر تک بہادری سے لڑتا رہا لیکن اس کی کوششیں رائیگاں ثابت ہوئیں۔ بلندیوں سے برستے ہوئے پتھروں اور تیروں نے اس کے تلغمہ کے منصوبے کو خاک میں ملا دیا۔

تیمور سلطان کے سپاہی کھلے میدان میں لڑنے کے عادی تھے اس لیے وہ تنگ گھاٹی میں چٹانوں کے آگے کو نکلے ہوئے حصوں کے درمیان ہمیشہ کے جیسے تال میل، تیزی اور بہادری سے کارروائی نہ کر سکے۔ گھوڑے جن کے سوار اور تنگ کوہستانی علاقے کے لیے بالکل ناموزوں تھے، ہلاک اور زخمی ہو کر عمودی ڈھلانوں سے نیچے گرنے لگے اور ان ہی کے ساتھ ہلاک اور زخمی ہو جانے والے سپاہی بھی زندہ اور غیر زخمی سپاہی بھی جنھیں جنگ کے غیر معمولی حالات نے بری طرح بدحواس کر دیا تھا، نیچے گرنے لگے۔ ان میں سے ایک سپاہی کو گرفتار کر کے بابر کے پاس لے جایا گیا جس سے پوچھ گچھ کے بعد معلوم ہوا کہ عبید اللہ سلطان جو شیبانی خاندان کے سپہ سالاروں میں سب سے زیادہ باصلاحیت اور فن حرب کا ماہر تھا، وہاں موجود نہیں ہے۔ باقی سپہ سالار تلغمہ کی حربی چال کے ناکام ہو جانے کے بعد سمجھ ہی نہیں پا رہے تھے کہ لڑائی کو کیسے جاری رکھیں۔

بابر کو اطلاع مل چکی تھی کہ دشمن کی فوج نشیبی علاقے میں جہاں موجود تھی وہاں سے پانی خاصی دوری پر واقع تھا۔ گرمی بڑھتی جا رہی تھی اور صاف ظاہر تھا کہ جلد ہی فوجی اور ان کے گھوڑے پیاس سے تڑپنے لگیں گے۔ لیکن پانی وادی میں

داخل ہونے کی خاطر صف آرائی سے بھی زیادہ واسطے پر تھا۔

شام ہوتی آفتاب غروب ہونے لگا اور بابر اپنے گھوڑے سے نیچے اترا۔ اس کے ساتھ ہی پہاڑی بلندی پر جو تیب سے دکھائی دے رہی تھی، موجود کوئی ایک ہزار سوار بھی جان بوجھ کر اپنے گھوڑوں سے اتر پڑے۔

تو یہ جنگ اگلی صبح تک کے لیے ملتوی کی جا رہی تھی؟

سلطانوں نے بابر اور اس کے سواروں کو گھوڑوں سے اترتے دیکھ کر یہی نتیجہ اخذ کیا۔ لیکن وہ یہ نہ دیکھ سکے کہ وادی کے عقبی دروں میں بابر کے دستے ان پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار کھڑے ہیں۔

سلطانوں نے غلطی سے اپنی فوج کو آرام کرنے کا حکم دے دیا۔ صفیں درہم برہم ہو گئیں اور بہت سے فوجی وادی میں داخل ہونے والے راستے سے پانی کی تلاش میں پیچھے لوٹنے لگے۔

''آگے بڑھو! جلدی کرو، جلدی!'' بابر نے چیختے ہوئے حکم دیا۔ ''دشمن پیچھے ہٹ رہا ہے۔ جا کر اس پر ٹوٹ پڑو، صف آرا ہونے کا موقع دیے بغیر تہ تیغ کر دو!''

وادی سے فوراً ہی بارہ ہزار سوار آندھی کی طرح دشمن کی طرف جھپٹے۔ ان کے ساتھ ہی ساتھ کوہستانی بلندی پر موجود تین ہزار لشکریوں نے بھی یلغار شروع کر دی۔ بابر جس نے تلوار نیام سے کھینچ لی تھی، اپنے علم برداروں کے آگے گھوڑا دوڑاتا ہوا بڑھ رہا تھا۔

دشمن انتہائی بدحواسی کے عالم میں بھاگنے لگے۔ ان کے فوجی ادھر ادھر منتشر ہو گئے تیمور سلطان اس ڈر سے کہ کہیں گھیرے میں نہ پھنس جائے، دوری پر واقع ایک دوسری وادی کی سمت بھاگ کھڑا ہوا۔ اندھیرا ہوتے ہوتے محمد دولدائی کا دستہ حمزہ سلطان کے ڈھیر دل سپاہیوں کو ہلاک کرتا ہوا اس تک پہنچا اور اسے گرفتار کر لیا۔ آدھی رات بھی نہیں ہوئی تھی کہ خواجہ کلاں کی کمان والے دستے نے مہدی سلطان کو بھی زندہ پکڑ لیا۔

شیبانی کے یہ دونوں سلطان تارا کول اور اندجان میں قتل عام کے مجرم تھے۔ بابر نے حکم دیا کہ ان کے سر قلم کر دیے جائیں۔

۵

صاف و شفاف آسمان پر باریک جالی جیسی ہلکی کہر چاندی کی طرح چمک رہی تھی جس کے دھاگے سفید ریشم کی مانند نرم معلوم ہو رہے تھے۔ باغات میں انار اور سب سے میٹھے سیب جو ''نقش'' کہلاتے تھے، پک چکے تھے، ''صاحبی'' انگوروں کے خوشے بیلوں میں لٹک رہے تھے۔ یہ خزاں کے ایام تھے، سمرقند کی شاندار خزاں کے ایام۔

عظیم شہر کے تمام دروازے پوری طرح کھلے ہوئے تھے، آنے جانے کی پوری آزادی تھی۔ گذشتہ دس دنوں سے سمرقند میں نہ کوئی فوج تھی نہ کوئی حکمران۔ شیبانی کے ورثا نے دریائے وخش کے قریب اپنی شکست کے بعد غزار یا قرشی کے قریب دجو رمیں بابر سے دوبارہ ٹکر لینے کے ارادے سے فوج اکٹھا کر لی تھی لیکن یہ سنتے ہی کہ بابر کے لشکر کے ساتھ مل کر جنگ کرنے کے لیے شاہ اسمٰعیل کے بھیجے ہوئے تیس ہزار سپاہی بھی آن پہنچے ہیں، یہ سب سلطان قرشی، بخارا اور سمرقند کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے، مویشیوں کے گلوں کو ہانکتے اور جہاں جتنا غلہ مل سکا تھا اسے لوٹتے ہوئے صحرا میں

چلے گئے تھے۔ ماوراء النہر کے دہقان جو ان طویل جنگوں میں کتنی ہی بار لوٹے جا چکے تھے اور بیگوں اور خانہ بدوش سلطانوں سے نفرت کرتے تھے، اب بابر کو اپنا نجات دہندہ تصور کر کے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

بابر اپنے لشکر اور چنے اتحادی کی فوج کے ساتھ جو بڑی تیز رفتاری سے اس سے آن ملی تھی، قرشی اور بخارا پر قابض ہونے کے بعد سمرقند کی طرف جنوب کی بجائے شمال مغربی سمت سے آگے بڑھا۔

سمرقند کے بیس ممتاز ترین افراد نے قلعہ نما شاہی محل کی کنجیوں اور قیمتی تحائف کے ساتھ شہر سے باہر نکل کر بابر کا استقبال کیا۔ چاروں دروازوں سے محل کی طرف جانے والے راستے کے دونوں کناروں پر بے شمار افراد کھڑے ہوئے تھے۔ خود شہر کے اندر جگہ جگہ خوبصورت قالین دریاں اور مشجر آویزاں تھے۔ چاروں طرف مسرت، شادمانی کا دور دورہ تھا اور چھتوں اور پھاٹکوں کے اوپر قرنا، سرنا نواز بیٹھے ہوئے تھے کیونکہ سمرقند میں موسیقی کے بغیر جشن کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ شہر کے شعراء نے بابر کی حصار پر فتح اور سمرقند میں آمد کے جشن میں اشعار بھی کہے تھے جن میں سے کچھ اشعار چوڑی سفید ریشمی پٹیوں پر لکھ کر سڑکوں کے کنارے، دوکانوں کے اوپر اور محل کے سامنے لٹکا دیے گئے تھے۔ بابر نے سوچا بھی نہ تھا کہ وطن میں جسے وہ کبھی ذلیل ہو کر چھوڑنے اور بے گھر ہو جانے پر مجبور ہو گیا تھا، اس کا اتنا شاندار طریقے سے خیر مقدم کیا جائے گا۔ اس نے خاص شاہراہ سے کوک سرائے محل جاتے ہوئے ریگستان میدان میں جہاں اس کا محبوب الغ بیگ مدرسہ واقع تھا، خیر مقدم کرنے والے ہجوم کے نعرہ ہائے تحسین سنے تو فرط انبساط سے اس کا سارا جسم لرز سا اٹھا اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اس نے قاسم بیگ کی طرف جو ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی اس کے پاس موجود تھا، دیکھتے ہوئے بچپن کے انداز میں کہا:

"یقین ہی نہیں آ رہا ہے۔ یہ سب خواب ہے کہ حقیقت؟"

"حقیقت ہے، عالی جاہ! حقیقت!"

بابر کے محافظ گھڑسواروں کے پیچھے پیچھے قزلباش بیگ جن کی دستاروں پر سرخ نشانات لگے ہوئے تھے، چل رہے تھے۔ ان میں احمد بیگ، صوفی اوغلی، شاہ رخ بیگ، افشار اور روہ یار محمد جان بھی جس سے بابر پہلے ہی سے متعارف تھا، شامل تھے۔ ان بیگوں کے چہروں پر چھپا ہوا فخر واضح طور پر کہہ رہا تھا "ہم نہ ہوتے تو بابر کو سمرقند میں قدم رکھنا نصیب نہ ہوتا"۔

اہل سمرقند خوش تھے کہ انھیں شیبانی خاندان کے سلطانوں سے نجات مل گئی ہے لیکن جب قزلباش ان کے سامنے سے گزرنے لگتے تھے تو سرنے، قرنے اور نقارے خاموش ہو جاتے تھے۔ لوگ قزلباشوں پر واضح کر دینا چاہتے تھے کہ خیر مقدم صرف بابر ہی کا کیا جا رہا ہے۔

بابر نے اپنے ہم وطنوں کے دلوں میں مہمان نوازی کے جذبات بیدار کرنے کی کوشش کی اور حکم دیا کہ منادی گر شہر کے چوراہوں اور سڑکوں پر اعلان کریں "شاہ اسمٰعیل کے بہادر سپاہی ہمارے عزیز مہمان ہیں"۔ اس نے شیبانی خاندان کے سلطانوں پر اپنی فتح کی خوشی میں اہل سمرقند اور مہمانوں کے لیے ضیافتوں کا اہتمام کیا اور جشن مسرت پورے تین دنوں تک جاری رہا۔

دس سال قبل جب شیبانی نے شہر کا محاصرہ کر رکھا تھا، بابر، شاہی خاندان اور تمام دوسرے افراد کو شدید غذائی قلت کا شکار ہونا پڑا تھا۔ لیکن اب بستان سرائے محل میں، شہر کے تمام محلوں اور گھنی آبادی والے علاقوں کی کھانے کی دوکانوں میں

باغوں اور سیرگاہوں میں طرح طرح کی ذائقے دار نعمتیں پک رہی تھیں۔ ہزاروں قابوں میں خوشبودار پلاؤ دسترخوانوں پر رکھا جا رہا تھا، ہزاروں بھیڑیں ذبح کی جا رہی تھیں جن کے گوشت سے قورمے، طرح طرح کے کباب اور دوسرے کھانے پک رہے تھے۔ اور عمدہ شرابوں کی بڑی بڑی صراحیاں بھی کھولی جا رہی تھیں۔

سب کچھ ڈرامائی کیا جا رہا تھا عزیز اور وفادار اہل سمرقند کو بھی اور قزل باشوں کو بھی جو جنگ کے میدان میں اپنی جرأت و حرارت دکھا چکے تھے اور توقع کی جا رہی تھی کہ دوستی کے میدان میں بھی پیچھے نہ رہیں گے۔ خوش خبریوں کا تو تانتا بندھا ہوا تھا (تاشقند، اورگنت، سیرم اور وخش نے بابر کی اطاعت قبول کر لی تھی)۔ شراب اور خورال کے پھلوں سے لطف اندوز ہونے کا زمانہ آ گیا تھا۔ ہر کوئی کہہ رہا تھا کہ اس کی زندگی کے سب سے پر مسرت دور کا آغاز ہو چکا ہے جس میں اس کا ایک ایک خواب حقیقت بن جائے گا۔

لیکن بابر چاہتا تھا کہ سب اس کے "عزیز مہمان" جلد از جلد یہاں واپس لوٹ جائیں۔ اس نے شاہ اسمٰعیل کی شبیہ والے ہزاروں سکے ڈھلوائے اور انھیں قزل باشوں کو دے دیا۔

دراصل قزل باشوں کی موجودگی کے باعث ماوراءالنہر کے شہروں اور بستی علاقوں میں طرح طرح کی اشتعال انگیز افواہیں پھیلنے لگی تھیں۔ یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ روزِ قیامت قریب آ گیا ہے۔

سمرقند میں بازار کے بھیڑ بھاڑ والے ایک دن جبکہ خرید و فروخت پورے شباب پر تھی، پانچ ایرانی سپاہیوں نے رنگ برنگی جھلملاتی ہوئی مقامی اطلس خریدنے کا فیصلہ کیا۔ وہ ایک دوکان میں داخل ہوئے۔ دو فربہ اندام دوکاندار سے جو کھلے گریبان کا کرتا پہنے ہوئے تھا، چار کرتوں کے لیے اطلس کاٹ دینے کو کہا۔

دوکاندار نے لکڑی کا گز اٹھایا اور طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ قزل باشوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا

"لیکن آپ کے پاس سکے کون سے ہیں؟ ذرا دکھائیے تو۔"

ایک سپاہی نے جو سر پر سمور کی ٹوپی پہنے ہوئے تھا، اپنے چرمی بٹوے سے تین چار اشرفیاں نکالیں اور انھیں ذرا دور ہی سے الٹ پلٹ کے دکھایا۔ دوکاندار نے اشرفیوں پر شاہ اسمٰعیل کی شبیہ دیکھ لی اور فوراً ہی ہاتھ ہلا کر انکار کر دیا۔

قزل باش نے اپنی ہتھیلی پر رکھے ہوئے سکوں کو دیکھا اور حیرت کے ساتھ دوکاندار سے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟ آخر ان سکوں میں کیا خرابی ہے؟"

"ہمارے ہاں یہ سکے نہیں چلتے۔ انھیں کوئی بھی نہیں لیتا۔"

"آخر کیوں؟ لوگ انھیں لیتے کیوں نہیں؟" قزل باش نے غصے سے پوچھا۔

"نہیں لیتے، بس!"

اتنے میں دوکان کے دروازے کے پاس کھڑے ہوئے ایک شخص نے جس کے چہرے سے ذہانت ٹپک رہی تھی، فقرہ چست کیا

"غیروں کے سکے ناپاک ہیں!"

"ناپاک ہیں؟!" ایرانی سپاہی تیزی سے مڑا اور تلوار نیام سے نکال کر فقرہ چست کرنے والے کی طرف جھپٹا پر وہ شخص بھاگ کر بھیڑ میں کھو گیا۔ دوسرے ہی لمحے بھیڑ میں سے کسی نے سپاہی پر پتھر پھینکا۔

دوسرے قزل باشوں نے بھی تلواریں نکال لیں اور خریدار کے ایک ساتھی نے دوکاندار سے دھمکی آمیز لہجے میں

پوچھا:

"ہمارے سکے سے کام نہیں"

دوکان دار نے یہ دیکھتے ہی کہ سپاہی آپے سے باہر ہو رہے ہیں، اپنا لہجہ بدل دیا اور نرمی سے کہا

"لے لوں گا تو میرا دیوالہ ہی نکل جائے گا۔ میری مشوری کو سمجھئے نا عزیز مہمانو۔ یہاں لوگ پرانے سکوں ہی میں خرید و فروخت کے عادی ہیں۔"

"پرانے سکوں میں؟ تو تمہیں شیبانی خاں کے سکے چاہئیں؟"

بات تھی بھی یہی۔ شیبانی خان کے سکے زیادہ وزنی ہوتے تھے۔

خان نے ہرات سے تاشقند تک پھیلی ہوئی اپنی ساری سلطنت میں ایک طرح کی مالی اصلاح کی تھی اس بچارے دوکان دار کو یاد تھا کہ شیبانی نے جو اشرفی رائج کی تھی وہ تیمور خاندان کے حکمرانوں کے عہد حکومت میں رائج اشرفی سے چھ رتی زائد وزن کی ہوتی ہے۔ یہی سبب تھا کہ خراسان اور ماوراءالنہر کے بازاروں میں دوسرے سکوں کی بہ نسبت شیبانی کے سکوں کی مانگ کہیں زیادہ تھی۔ لیکن دوکان دار یہ بات غصے میں بھرے ہوئے قزل باش سے صاف نہیں کہہ سکتا تھا اس لیے مختصر جواب دیا

"شیبانی خان تو مر چکا ہے۔"

اتنے میں دوکان کی دہلیز پر سے دوبارہ کسی نے چوٹ کی۔

"ارے اجنبی، اپنا بوریا بستر سمیٹو اور سمرقند سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔" اور اس نے سپاہی کو مٹی کا ڈھیلا مارا۔

ڈھیلا قزل باش کی ٹوپی سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا اور مٹی اس کے چہرے پر بکھر گئی۔ وہ اپنی ننگی تلوار لیے ہوئے آگے بڑھا اور اس کی نگاہیں ڈھیلا مارنے والے کو تلاش کرنے لگیں۔ اسے کامیابی نہ حاصل ہوئی اور وہ مطلے دوکان دار کے پاس لوٹ آیا۔ سپاہی نے جو جملوں کے آخری الفاظ پر زور دینے کی بنا پر تبریز کا رہنے والا معلوم ہوتا تھا، چلا کر پوچھا

"نہ لے گا یہ سکہ..... کیا؟ نہ لے گا شاہ اسمٰعیل کا یہ سکہ..... کیا؟"

"ارے سورما، اسے لے لوں گا تو برباد ہو جاؤں گا۔"

"نہیں لے گا، اسے گا؟" اور قزل باش نے دوکان دار پر اتنا زوردار وار کیا کہ تلوار شانے سے جسم کو کاٹتی ہوئی تقریباً ناف تک اتر گئی۔ دوسرے ہی لمحے سپاہی کے ایک ساتھی نے تخت پر ڈھیر ہو جانے والے دوکان دار کا سر ایک ہی وار سے قلم کر دیا۔ ریشمی کپڑے خون سے تر ہو گئے۔ بھیڑ میں جو لوگ آگے کھڑے ہوئے تھے، اس نظارے سے پل بھر کے لیے بت بن کر رہ گئے پھر دہشت زدہ ہو کے پیچھے چلاتے بھاگے اور مجمع منتشر ہو گیا۔

اور اس کے بعد "عزیز مہمانوں" نے کھل کر لوٹ مار شروع کر دی...

۲

قزلباش بیگ بابر اور شاہ اسمٰعیل کے درمیان ہونے والے معاہدے پر پوری طرح عمل درآمد کی یقین دہانی سے مطمئن نہیں تھے۔ دوسری طرف ان کے خلاف عوام کی نفرت میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا جس سے وہ خائف رہتے

تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیگ تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ آخر کار ان باثر بیگوں و قیمتی ملبوسات، تیز رفتار گھوڑے، طلائی و نقرئی ظروف اور نقد رقوم نذر کی گئیں اور تب ہزار ایرانیوں کی یہ فوج ماوراء النہر سے ایران کے لیے روانہ ہوئی۔

اس کے بعد سمرقند کی زندگی تقریباً معمول پر آ گئی نئے محصول خاص طور پر نئے علاقوں سے وصول کئے جانے لگے اور شاہی خزانہ جو کچھ تو شیبانی خاندان کے حکمرانوں کے لوٹنے کی وجہ سے اور کچھ قزلباشوں کے قیام پر آنے والے مصارف کے باعث بالکل خالی ہو چکا تھا، دوبارہ بھرنے لگا۔ تب کہیں جا کر بابر کو ذرا دم لینے، جشن منانے اور اپنے محبوب منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے پر توجہ مبذول کرنے کا موقع نصیب ہوا۔

موسم بہار میں جبکہ ہلکے گلابی پھولوں سے لدے ہوئے بادام کے اشجار جنگلوں کو فرحت بخش رہے تھے، بابر یک روز بچے کھچے درباریوں کے ساتھ الغ بیگ کی رصدگاہ کی طرف سیر کو نکلا

محافظ دستے کا سربراہ طاہر کمیت گھوڑے پر سوار تھا۔ خود بابر نے اپنے پسندیدہ سفید جنگی گھوڑے کا انتخاب کیا تھا اور اس کے ایک پہلو میں قاسم بیگ اور دوسرے میں خواجہ کلاں بیگ اپنے اپنے گھوڑوں پر چل رہے تھے۔ ان لوگوں سے کچھ پیچھے پیچھے میر عمارت فضل الدین اپنے سیاہ گھوڑے پر چل رہا تھا۔ وہ ہرات سے ایک ہفتہ قبل ہی سمرقند پہنچا تھا۔ ممتاز بیگوں کے درمیان مکاتب اور مدارس سے متعلق امور کے نگران میر منشی و مدرس کا دبلا پتلا جسم مشکل ہی نظر آ رہا تھا۔

یہ لوگ آب رحمت کہلانے والی نہر سے پہلے ہی باغ میدان کی طرف مڑ گئے جو الغ بیگ کے عہد حکومت میں ماوراء النہر کا سب سے زرخیز اور مشہور باغ تھا۔ پندرہ سال قبل تک اس باغ کی خوبصورتی اور دلکشی برقرار تھی لیکن بعد میں شیبانی خان کی حکمرانی کے دوران اس کی دیکھ بھال نہیں کی گئی تھی، نالیوں میں پانی آنا بند ہو گیا تھا اور جانے کتنے ہی درخت سوکھ گئے تھے۔ باغ میں واقع دو منزلہ عمارت چینی خانہ کی جو اپنے ستونوں اور چینی مٹی پر بنے نقش و نگار کے لیے شہرت رکھتی تھی، چھتوں سے اس طرح پانی رسنے لگا تھا کہ شاندار نقاشی کا زیادہ تر حصہ خراب ہو گیا تھا۔

بابر نے میر عمارت سے مخاطب ہو کر مغموم لہجے میں کہا

''ہم نے آپ کو ہرات سے اس امید میں بلوایا ہے کہ آپ کی نگرانی میں شہر میں نئے محل اور شہر کے باہر باغات وجود میں آئیں گے۔ لیکن ذرا دیکھئے تو، جو قدیم عمارتیں دنیا بھر میں مشہور ہیں وہ بھی کیسی خراب حالت میں ہیں۔''

''عالی جاہ، مرزا الغ بیگ کی رصدگاہ بھی عالمی شہرت رکھتی ہے اور اس کی حالت بھی اتنی ہی خراب ہے جتنی کہ چینی خانہ کی'' فضل الدین نے افسوس کے ساتھ کہا۔ ''کل میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا اور میرا دل آج تک اداس ہے۔ لیکن اس کے سوا اور توقع ہی کیا کی جا سکتی تھی۔ ساٹھ برسوں سے رصدگاہ کی دیکھ بھال نہیں کی گئی۔ دیواروں سے چینی مٹی کے آرائشی ٹکڑوں اور سنگ مرمر کی پٹیوں کو لوگ اکھاڑ لے گئے۔ آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہا تو یہ شاندار عمارت کھنڈر بن کر رہ جائے گی۔''

''نہیں، ہم اس کی نوبت نہ آنے دیں گے محترم قاسم بیگ، میر عمارت کو جتنی رقم اور جتنے معماروں کی ضرورت ہو ان کا انتظام کر دیجئے۔ رصدگاہ اور چینی خانہ ہمارے بزرگ مرزا الغ بیگ کی یادگاریں ہیں۔ ہم ان کی بحالی چاہتے ہیں۔''

''یہ خادم دلی مسرت کے ساتھ حکمراں کے حکم کی تعمیل میں مصروف ہو جائے گا۔ چینی خانہ پہلے ہی کی طرح چمک اٹھے گا۔ کام زیادہ دشوار تھوڑی ہے۔ ہم باغ میں نالیوں کی صفائی کر کے ان میں پانی چھوڑیں گے پیڑ اور پھولوں کے

پودے لگا دیں گے۔"

"یہ کام نوروز تک مکمل ہو سکے گا؟"

"بابر نے مسکرا کر پوچھا۔ "اگر اس سال جشن نوروز اسی چینی خانے میں منایا جائے تو کیسا رہے؟ محترم قاسم بیگ؟"

بادہ و جام اور رقص و نغمہ والی تقریبات کا دلدادہ خواجہ کلاں بیگ خوشی سے مسکرانے لگا۔

"بڑا نیک خیال ہے، عالی جاہ! سمرقند میں اچھے سے اچھے معمار اور باغبان کافی تعداد میں مل جائیں گے۔ میر عمارت فضل الدین اپنی نگرانی میں نوروز تک باغ کو آراستہ کر دیں گے۔ تب یہیں جشن منایا جائے گا۔"

فضل الدین نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"چینی خانے کی مرمت تو کی جا سکتی ہے لیکن رصدگاہ کے معاملے میں کیا کیا جائے گا، عالم پناہ؟"

"اس کی بھی مرمت کرائی جانی چاہیے۔۔ قاسم بیگ صاحب، یہ کام کب اور کیسے شروع کیا جائے؟" بابر نے پوچھا۔

قاسم بیگ رصدگاہ کی مرمت کا کام ہاتھوں میں لینے سے ڈر رہا تھا۔ کسی زمانے میں اہل سمرقند کی کثرت اس رصدگاہ پر فخر کیا کرتی تھی لیکن مذہبی علما اس زمانے میں بھی رصدگاہ پر لعنت بھیجتے رہتے تھے۔ الغ بیگ کے انتقال کے بعد ان علما نے رصدگاہ کو مرکز کفر کہہ کہہ کر اس پر مسلسل لعنت بھیج بھیج کر زیادہ تر دیں داروں کو بھی اپنا ہم خیال بنانے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ رصدگاہ کی بحالی کا کام شروع کرانے کا مطلب یہ ہوتا کہ علمائے دین اور متعصب افراد بابر کے خلاف کچھ اور بھی زیادہ مشتعل ہو جاتے۔ اور یہ وہ لوگ تھے جو الغ بیگ کے قتل کا باعث بنے تھے اور اب بابر کے قتل کی بھی کوشش کر سکتے تھے۔

اس پس منظر میں قاسم بیگ نے تجویز کی مخالفت کرنے کا فیصلہ کر لیا

"عالی جاہ، خوابیدہ افعی کی دم پر پاؤں رکھنے میں جلد بازی درست ہو گی کیا؟۔۔ ورنہ ہم رصدگاہ کی مرمت کر دیں تو بھی ایسے اہل علم کو کہاں سے لائیں گے جو دانش و حکمت کے اس کام کو لگن کے ساتھ سنبھال سکیں؟ مرزا الغ بیگ کی رحلت کو ساٹھ سال ہو چکے ہیں۔ اس زمانے کے صاحبان علم میں سے کوئی زندہ نہیں بچا اور جہاں تک نئی نسل والوں کا تعلق ہے تو وہ دوسرے ملکوں کو جا چکے ہیں۔"

"انھیں یہاں بلوایا جا سکتا ہے، وزیر صاحب" بابر نے کہا اور اچانک کسی گہری سوچ میں ڈوب جانے سے اس کی بھویں سکڑ گئیں۔ اس کا پر عزم مزاج متقاضی تھا کہ اس معاملے میں ابتدائی کارروائی تو شروع ہی کر دی جائے۔" رے میر منشی، ہماری طرف سے تمام اہل علم کو خط لکھیے"

میر منشی نے جلدی جلدی اپنے چرمی تھیلے سے لکھنے کا سامان نکالا و ماسی جگہ فرش پر بیٹھ گیا۔ بابر نے حکم کو بولنے اور میر منشی تیزی سے لکھنے لگا۔

"ہمارے عظیم بزرگ مرزا الغ بیگ کے شروع کیے ہوئے علم ہیئت کے ماہرین کو خواہ وہ ہرات، ترکی اور تبریز میں یا اور کہیں بھی رہتے ہوں، ہماری طرف سے سمرقند آنے کی دعوت دی جائے کیونکہ ہم رصدگاہ کو دوبارہ کھولنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اور میرے اس فیصلے کا منادی گروں کے ذریعے بھی اعلان کرا دیا جائے۔ جو ہیئت دان مرزا الغ بیگ کے عظیم کام کو جاری رکھ سکیں گے انھیں اس سلسلے میں تمام ضروری سہولیات فراہم کی جائیں گی۔ ان لوگوں کے یہاں تک سفر کے

معمار آزاد کر دیے جائیں گے اور انھیں رہائش اور مشاہرے کے سلسلے میں کسی شکایت کا موقع نہ ملے گا۔ ہماری طرف سے قاصدوں کے ذریعے اس مضمون کے دعوت نامے بھیج دیے جائیں اور یہ کام میر منشی صاحب، ہم آپ کو سپرد کر رہے ہیں۔"

فضل الدین کی نگرانی میں باغ میدان کی پانی کی ٹوٹ جانے والی نالیوں کی مرمت اور صفائی کر دی گئی، سوکھے ہوئے درختوں کو کاٹ کے ان کی جگہ پر نئے پیڑ اور پھولوں کے پودے لگا کر کیاریاں بنا دی گئیں۔ فضل الدین کو چینی خانہ کی بحالی میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ اچھی اجرت دینے کی بنا پر ٹائلوں کو درست کرنے والے معمار، نقاش اور مزدور آسانی سے مل گئے تھے جنھوں نے اپنا کام محنت اور لگن کے ساتھ کیا۔ لیکن رصد گاہ کو تین منزلہ گول عمارت کی شکل عطا کرنے والی دیواروں کی مرمت کا کام بہت دشوار ثابت ہوا۔ نیم دائرے کی شکل میں بنی ہوئی سیڑھیوں کے نیچے ایک گہرا گڑھا واقع تھا جس کی تہہ میں بہت بڑے آلے دو پیالے کے بیچ لٹکے ہوئے جیسے چمک رہے تھے اور یہ ایک ایسی چیز تھی جس کی نوعیت کے متعلق مرمت کرنے والوں کو کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ معمار اس کے قریب پہنچتے ہی یوں تھر تھر کانپنے لگتے جیسے دوزخ میں پہنچ گئے ہوں۔ شیوخ نے مشہور کر رکھا تھا کہ وہ جگہ بھوت پریت کا مسکن ہے اور گڑھے میں جس نے بھی اترنے کی کوشش کی اسے شیطان ہڑپ کر لے گا۔ ان دنوں علما و شیوخ خاص طور سے نقش بندیہ سلسلے کے شیوخ بہت طاقتور اور بااثر تھے اور ان ہی کے دباؤ سے الغ بیگ کے انتقال کے بعد سمرقند کے زیادہ تر مکاتب و مدارس بند کر دیے گئے تھے۔

اس سب کے باوجود فضل الدین کو اچھی اجرت دینے کی بنا پر کوئی ساٹھ معمار اور مزدور اکٹھا کر کے رصد گاہ کی بحالی کا کام شروع کرنے میں کامیابی حاصل ہو گئی۔ دیواروں اور دوسری اور تیسری منزلوں کی چھتوں کی مرمت کے لیے پاڑیں بھی باندھ دی گئیں۔ لیکن اسی مرحلے پر نقش بندی شیوخ کے حامی درویشوں نے وہاں منڈلانا شروع کر دیا۔ یہ لوگ معماروں کے سامنے ہی حلقہ بنا کر "حق دوست یا اللہ"، "حق دوست یا اللہ!" کے نعرے لگا لگا کر ناچتے اور ایسے پر اثر شعر اور گیت گاتے تھے جن میں کہا جاتا تھا کہ چاروں خلفا کو نہ ماننے والوں پر عذاب الٰہی نازل ہوگا۔ ان درویشوں میں شیبانی خاندان کے سلطانوں کے مخبر بھی شامل ہوتے تھے، اور یہ مخبر معماروں اور مزدوروں کے درمیان بھی موجود تھے۔ ایک مخبر اینٹوں کی ڈھلائی کا کام کر رہا تھا۔ اس نے کچھ دنوں کے بعد بلند پاڑ پر سے ایک ہنرکار کو جو اپنے کام میں اوروں کی بہ نسبت کہیں زیادہ ماہر، دلیر اور بڑا وفادار بھی تھا، "انجانے" میں دھکا دے کر نیچے گرا دیا۔ یہ معمار تیسری منزل سے پتھروں کے انبار پر آن گرا اور فوراً ہی چل بسا۔

درویشوں کو جیسے منہ مانگی مراد مل گئی۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر بڑی ہی جنونی کیفیت میں چیخنے چلانے لگے "اس پر عتاب الٰہی نازل ہو گیا اور روحوں نے اس کی جان لے لی 'یا اللہ دوست، یا اللہ' حق دوست یا اللہ!"

اس واقعے کے بعد معمار اور مزدور مرمت پوری کیے بغیر ہی کام چھوڑ کر چلے گئے۔ فضل الدین اس خیال سے بازار گیا کہ نئے نئے سہی، کام چلاؤ معماروں اور مزدوروں ہی کو بلا لائے لیکن وہاں جتنے افراد بیکار بیٹھے تھے اس سے کہیں زیادہ افواہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ "رصد گاہ میں کیا ہو رہا ہے پتا ہے کہ بے دین لوگوں کے لیے وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں۔ وہاں پر عذاب الٰہی نازل ہوگا!"

فضل الدین نے رصد گاہ میں کام کرنے کی بات چھیڑی ہی تھی کہ معمار اس سے دور بھاگنے لگے جیسے کہ وہ کوئی

اس شام بستان سرائے محل میں شبانوں پر ضیافتیں منعقد ہو رہی تھیں۔
کئی ہی ایک ضیافت ارتچ اور قاراکوں کے بیگوں اور دیگر ممتاز افراد کے اعزاز میں ہوئی جو قیمتی تحائف کے ساتھ بابر کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ ایک ماہ قبل بابر نے اپنے کچھ افراد کو ان شہروں میں بھیجا تھا۔ دونوں شہروں نے جنگ کے بغیر بادشاہ کی اطاعت قبول کر لی تھی اور اب دونوں جگہوں کے بیگوں کی "آمد سے" بابر، "سمرقند کو متحد کرنے والے" (بابر دل ہی دل میں خود کو یہی کہتا تھا اور پہلے دوسروں کے منہ سے یہ الفاظ سن کر اسے فخر کا احساس بھی ہوتا تھا) کو دلی مسرت ہوئی۔ بہت سے افراد اور بہت سی شراب والی ضیافتیں جن کا سلسلہ قندوز میں شروع ہوا تھا، اب آئے دن کی ہوتی رہتی تھیں۔ پہلے یہ کامیابیوں کا جشن منانے کے لیے ہوتی تھیں بعد میں رسموں کی حیثیت اختیار کر گئیں۔ دعوتیں باری باری کبھی ایک بیگ کے ہاں تو کبھی دوسرے کے ہاں ہوتی تھیں اور ہر بیگ کو بادہ نوشی کے معاملے میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے ہی کی پڑی رہتی تھی۔

قاسم بیگ پہلے کی طرح اب بھی دختر رز سے دور دور ہی رہتا تھا۔ وہ بابر کے ہوش کے عالم میں اسے برابر احساس دلاتا رہتا تھا کہ سلطنت میں امن و امان کی صورت حال تسلی بخش نہیں، بہت سے دشمن غداری کرنے کے لیے کسی مناسب موقعے ہی کے منتظر ہیں۔ وہ یہ بھی بتاتا کہ صحرائی علاقوں میں شیبانی خان کے بچے کھچے سلطان بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے ہیں بلکہ اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے زوردار تیاریوں میں مصروف ہیں نیز یہ کہ اگلا معرکہ زندگی اور موت کی جدوجہد جیسا ہوگا۔

اس سب کے جواب میں بابر کو اپنی نشاط و انبساط کے عالم میں کہی ہوئی اپنی ایک غزل کے یہ دو اشعار سنانا بہت پسند تھا

بہار آئی ہے، وصل جاناں اور یاروں کی صحبت ہے
شراب اور شاعری ہے، درد عشق اور اس کی لذت ہے
مزہ کچھ اور ہی ہے فصل گل میں بادہ نوشی کا
یہ نشہ ہر مسرت سے حسیں، یہ نشہ دولت ہے

رواج کے بموجب غزل کی دھن تیار کر دی گئی تھی اور دعوتوں میں گویّے مغنی سازوں کے ساتھ گایا کرتے تھے۔
بعض اوقات بابر عالم کیف و مستی میں قدرے سنجیدہ مسائل کا بھی تذکرہ کرتا تھا لیکن ان کا مستقبل کی جنگوں سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا تھا

"وزیر اعظم صاحب، آپ نے سنا کہ میرے ایجاد کردہ خط بابری کو سمرقند کے مکاتب میں استعمال کیا جا رہا ہے اور اس کی مدد سے بچے دوسرے حروف کے مقابلے میں کچھ جلد ہی پڑھنا لکھنا سیکھ لیتے ہیں؟ آپ ذرا ان مدرس صاحب ہی سے دریافت کر کے دیکھ لیجیے..."

اور مدرس اپنے بڑے سے عمامے والے سر کو ہلا کر فوراً ہی تصدیق کر دیتا تھا

"محترم وزیر اعظم، خط بابری ہمارے عوام کو کاہلی اور جہالت سے نجات دلانے کا نہایت موثر ذریعہ ہے۔ عربی خط ہمارے لیے یقیناً مقدس ہے لیکن آپ تسلیم کریں گے کہ اعراب کی وجہ سے حصول تعلیم میں دشواری ہوتی ہے۔ خط بابری

ان سب پیچیدگیوں سے پاک ہے اور اسے سیکھنا کہیں زیادہ آسان۔

قاسم بیگ جانتا تھا کہ بابر نے تیس سال قبل کابل میں جو حروف تہجی بنائے تھے وہ دریائے ینی سے کے علاقے میں دریافت کیے جانے والے قدیم ترکی رسم خط کے حروف سے ملتے جلتے ہیں۔ پر جوش عالم ان حروف کی گتھیوں کو سلجھانے میں لگے ہوئے تھے اور قدیم ترکی رسم الخط کے ان بھولے بسرے حروف کی شکل پہچانتے تھے۔ پادری علما اور شیوخ، جنہیں یہ نئے ہی نہیں لگتے تھے، اسلامی روایات کے سلسلے میں اس طرز عمل کو غیر مہذب سمجھتا اور صاف صاف بیان کرتا تھا کہ حروف کی ساخت کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ قرآن اپنے رسم الخط کی بنا پر نہیں بلکہ ان احکام خداوندی کے معنی و مفہوم کا قائل کر دیتا ہے جو اس میں شامل ہیں۔ کسی نے عربی اور قدیم ترکی خطوں کی بنیاد پر ایک نیا خط ایجاد کیا تھا۔

ایسے نازک معاملات میں قاسم بیگ نہ کچھ دخل رکھتا تھا اور نہ کوئی دلچسپی۔ وہ تو عملی آدمی تھا اور اس بات چیت کے دو دن بعد فضل الدین اور خط بابری کو عام کرنے کے لیے دار المدرسین کو ساتھ لے کر بابر کی خلوت گاہ میں پہنچ گیا۔

بابر نے فوراً ہی تاڑ لیا کہ تینوں کسی بات سے فکرمند ہیں اور مطالبہ کیا کہ جو بھی معاملہ ہو فوراً بیان کیا جائے۔

"عالی جاہ، غضب ہو گیا!" مدرس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ "جس استاد نے مکتب کھول کر اس میں خط بابری کو ذریعہ تعلیم بنایا تھا، اسے جاہلوں نے مار ڈالا، سنگسار کر دیا۔"

"سنگسار کر دیا؟!" بابر فوراً ہی آگ بگولا ہو گیا۔ "کیسی وحشیانہ حرکت ہے! قاسم بیگ، آخر یہ سب کیا ہے، بغاوت بھڑک اٹھی کیا؟! آپ سب لوگ اپنی آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں کیا؟"

"عالم پناہ، میں تو آپ سے کئی بار عرض کر چکا ہوں کہ نقش بندی ہر جگہ رعایا کو بھڑکا رہے ہیں، ہمارے خلاف اشتعال پیدا کر رہے ہیں۔ رصدگاہ میں معمار پاڑ پر سے گر کے مر گیا تھا تب تو درویشوں نے اچھا خاصا ہنگامہ ہی کھڑا کر دیا تھا۔"

"آپ نے فسادیوں اور بے بنیاد افواہیں پھیلانے والوں کے فوراً گرفتار کر لیے جانے کا حکم کیوں نہیں جاری کیا تھا؟"

پل بھر میں غضب ناک اور پل ہی بھر میں مسرور ہو جانا تو بابر کا وتیرہ ہی بن چکا تھا۔

"فوج میں بھی حالات خراب ہی ہیں، عالی جاہ" قاسم بیگ نے صاف گوئی کے ساتھ اپنی بات جاری رکھی۔ "اب کے فصلیں اچھی نہیں ہوئی۔ قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ سپاہیوں کے پاس پرانے سکے ختم ہو چکے ہیں اور نئے سکوں کو آسانی سے کوئی لیتا نہیں۔ نئے سکوں میں قیمت ادا کی جاتی ہے تو چیزیں کچھ اور بھی مہنگی ملتی ہیں۔ بیگ اور سپاہی دونوں مطالبہ کر رہے ہیں کہ تنخواہیں بڑھائی جائیں۔ اور تنخواہیں بڑھا دی جائیں تو خزانے میں کچھ بچے گا ہی نہیں۔"

"تو پھر کیا کرنا چاہیے، قاسم بیگ؟" بابر نے تھکی تھکی سی آواز سے پوچھا۔

"میری تجویز یہ ہے حکمران کہ ہم سب کو مل کر اس مسئلے پر صلاح مشورہ کرنا چاہیے۔ بیگوں کو فوراً طلب کر کے انھیں بھی خواب غفلت سے بیدار کیا جانا چاہیے اور اپنے آپ کو بھی۔"

"میں خوب جانتا ہوں کہ اس سب کا مطلب کیا ہے۔ بیگوں پر صحرا نورد سلطانوں سے بدلہ لینے کا جنون سوار کی

اس بات پر ناراض تھا کہ ایرانی فوج بہت جلد سمرقند سے واپس بھیج دی گئی تھی۔ اس کے علاوہ اسمٰعیل کے مخبروں نے اسے بہت پہلے ہی یہ اطلاع بھی فراہم کر دی تھی کہ بابر ماوراءالنہر میں اپنی آزاد سلطنت کے قیام کا خواہاں ہے۔

ماوراءالنہر پر ایران کے تسلط سے متعلق شاہ اسمٰعیل اور نجم ثانی کے منصوبے کو بہت زیادہ راز میں رکھا گیا تھا اور بابر کے ساتھ کیا جانے والا معاہدہ بظاہر اب بھی برقرار تھا لیکن نجم ثانی نے بابر سے اپنی پہلی ہی ملاقات میں نخوت سے بھری ہوئی نفرت کا طرزِ عمل اپنایا جس سے بابر کو غیر ملکیوں کے عیارانہ ارادوں کا بخوبی احساس ہو گیا۔

پھر قزلباشوں اور شیبانی خاندان کے سلطانوں کی تلواریں غجدوان میں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ بابر نجم ثانی کے ساتھ گیا تھا لیکن یہ واضح ہوتے ہی کہ فتح سلطانوں ہی کی ہوگی، اس نے اپنے دستوں کو اس خونریز معرکے سے الگ کر لیا اور حصار لوٹ آیا۔

غجدوان کی اس لڑائی میں نجم ثانی مارا گیا۔ زیادہ تر قزلباش بھی مارے گئے، کچھ قید کر لیے گئے اور کچھ افراتفری کی حالت میں آمو دریا کو پار کرتے ہوئے اس میں ڈوب گئے۔

اور اس طرح نامعلوم آفات سے متعلق اندیشے سچ نکلے۔ ڈیڑھ سال قبل خانزادہ بیگم کے دل پر چھائے ہوئے خوف کے بادل جو بعد میں کچھ دنوں کے لیے چھٹ گئے تھے، شکست کے ان دشوار لمحات میں دوبارہ نمودار ہو گئے۔

بابر بائیسون ہوتا ہوا حصار کے قراتاغ علاقے میں پہنچا اور وہ دامنِ کوہ سے متصل ایک چھوٹی سی وادی میں بچے کھچے سپاہیوں اور شاہی خاندان کے افراد کے ساتھ رات گزارنے کے لیے پڑاؤ ڈال دیا۔ اس کے خیمے کے قریب ہی خانزادہ بیگم کا خیمہ بھی نصب کیا گیا جس میں وہ اپنے بیٹے اور کنیز کے ساتھ سو گئی

نصف شب کے بعد وہ گھوڑوں کی ٹاپوں اور کتوں کے زور زور سے بھونکنے کی آوازوں سے چونک کر جاگ گئی۔ اس نے شدتِ خوف سے کانپتے ہوئے سنا کہ باہر لوگ غصے سے بھری ہوئی آوازوں سے چیخ رہے ہیں

"مارو، مارو! ان بدمعاش کفار کو قتل کر دو!"

خیمے کے اندر ایک چراغ ٹمٹما رہا تھا۔

"دشمنوں نے حملہ کر دیا ہے! دشمن!"

خانزادہ بیگم، خرم اور کنیز آنا فاناً کھڑے ہو گئے۔

خانزادہ بیگم نے جلدی جلدی جوتے پہنے اور بیٹے کی بانہوں کو چوغے کی آستینوں میں ڈالنے لگی۔ اتنے میں کسی تیر کی تیز نوک خیمے کے موٹے نمدے کو چیر کر اندر آ گئی لیکن پچھلے حصے میں لگے ہوئے پروں کے باعث تیر نمدے ہی میں پھنس کر رہ گیا۔ خوف زدہ ماں نے خرم کو سینے سے لگا لیا لیکن خود خرم جس کا قد خانزادہ بیگم کے شانوں سے اونچا ہو چکا تھا، اس تیر کی نوک کو بڑی دلچسپی کے ساتھ دیکھنے لگا جو اس کی جان لے سکتا تھا۔

"ارے کچھ کہاں ہیں؟ خواجہ کلاں بیگ! قاسم بیگ! اطہر! حرم کی حفاظت کرو! بچوں کو سنبھالو! بندوقیں چلاؤ!"

بابر کے نجی محافظین کے پاس کچھ چقماقی بندوقیں موجود تھیں جو اس زمانے میں غالباً سب سے بھیانک، نادر اور مہنگے اسلحے کی حیثیت رکھتی تھیں۔ یہ بندوقیں بابر نے قزلباشوں سے خریدی تھیں۔

اتنے میں کہیں قریب ہی ایک بندوق اور پھر یک ساتھ کئی بندوقوں کی آوازیں سنائی دیں۔ خانزادہ بیگم کی ہمت اب اتنی بڑھ گئی کہ اس نے اطمینان کے ساتھ بیٹے کو کپڑے پہنائے اور چوغے پر وہ پٹی باندھ دی جس میں شاندار

خنجر لٹک رہا تھا۔

خیمے کی نمدے کی دیوار پر "خرم شاہ" کا تحریر کیا ہوا تیروں والا ترکش بھی ٹنگا ہوا تھا۔ لڑکے نے ترکش اٹھا کے پہن لیا اور کمان ہاتھ میں لے لی۔

لڑائی کی آوازوں سے گیارہ سالہ لڑکا یقیناً سہم گیا لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کے اندر لڑنے کا جوش بھی جاگ اٹھا تھا۔ اس پر بچپن ہی میں باپ کے جنگ وجدل سے گہرا لگاؤ رکھنے والے مزاج کی چھاپ پڑ گئی تھی اور وہ جلد از جلد بڑا ہو کر شجاعت کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بابر کی بخارا کی لڑائی کے دوران بھاگ کر اپنے ماموں کے لشکر میں شامل ہو جانے کی بھی کوشش کی تھی لیکن بابر نے فن حرب سے اس کی دلچسپی کی تعریف کر کے اسے اس کے استاد کے ساتھ واپس بھیج دیا تھا۔ خرم اپنی ماں کی اس شدید محبت سے بھی متاثر ہوا تھا جو وہ بہن کی حیثیت سے بابر سے کرتی تھی۔ وہ اپنے اساتذہ سے جو بابر سے دلی عقیدت رکھتے تھے، بار بار اس کی جرأت وشجاعت کے تذکرے بھی سن چکا تھا۔ اس طرح شیبانی خان کے بیٹے کے دل میں اپنے ماموں کے سلسلے میں محبت اور اس کے دشمنوں یعنی شیبانی خاندان کے سلطانوں کے خلاف نفرت کے جذبات روز بروز بڑھتے جا رہے تھے۔

وہ ان لوگوں سے نفرت کرتا تھا جنھوں نے ابھی ابھی "مارو" کے نعروں کے ساتھ پڑاؤ پر حملہ کر دیا تھا اور چاہتا تھا کہ اپنے "شاہی" ترکش کے سارے تیر ان لوگوں پر برسا دے۔ وہ باہر جانے کے لیے لپکا اور خیمے کے دروازے کے پردے کو جھٹکے سے ایک طرف ہٹا دیا۔ بوڑھی کنیز چلائی "میرے شہزادے، آپ کہاں جا رہے ہیں، ٹھہر جائیں" اس نے خرم کو خیمے میں واپس کھینچنے کے لیے اس کی پیٹی پکڑی لیکن دلیر لڑکے کو روکنے میں ناکام رہی۔

"چھوڑ دیجیے مجھے جانے دیجیے، میں اپنے ماموں جان کی مدد کرنا چاہتا ہوں، جانے دیجیے"

باہر کے محافظ دستے نے بندوقوں کی گولیوں اور تیروں کی بوچھاڑ سے دشمنوں کو عورتوں اور بچوں کے خیموں کے قریب نہ آنے دیا۔ طاہر دوڑ کر گھوڑے سے اتر کر خان زادہ بیگم کے خیمے کے سامنے آیا اور سخت لہجے میں بولا

"عالی نسب بیگم صاحبہ، شہزادے، فوراً سوار ہو جائیے"

خان زادہ بیگم نے صندوقوں اور گٹھڑیوں پر نظر دوڑائی۔

"اور سارا سامان چھوڑ دیں کیا؟"

"جان سلامت تو سامان پھر مل جائے گا فوراً سوار ہو جائیے عالی جاہ نے یہی حکم دیا ہے۔"

آسمان پر ماہ کامل چمک رہا تھا۔ اس کی روشنی میں ماہم بیگم پانچ سالہ ہمایوں کو گود میں لیے ہوئے سفید خیمے سے باہر نکلی گھوڑے پر سوار قاسم بیگ نے جھک کر ہمایوں کو تھاما اور اپنے آگے بٹھا کر اپنے چوغے سے ڈھک لیا۔

خان زادہ بیگم گھوڑے پر سوار ہو گئی (خرم سب سے پہلے ہی اچھل کر گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا) تو طاہر نے اپنی بیوی اور دس سالہ بیٹے سنجر کو گھوڑوں پر سوار کرایا۔

عورتوں اور بچوں کو قاسم بیگ کے زیر کمان سپاہیوں نے حفاظتی گھیرے میں لے لیا اور یہ لوگ پہاڑ سے اس واحد سمت میں بڑھے جدھر ابھی تک لڑائی نہیں ہو رہی تھی۔ باقی تینوں سمتوں سے گولیوں کی ٹھائیں ٹھائیں، تلواروں کی جھنکاروں، زخمیوں کی کراہوں، اور گھوڑوں کی پھنکار اور ہنہناہٹ کے درمیان غصے سے بھری ہوئی آوازیں ابھر رہی تھیں

"کمبخت بابر مردہ باد!"

طاہر نے فوری خرم کو اس کے گھوڑے پر سے کھینچ کر اپنے آگے بٹھا لیا لیکن اس دوران وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔
آخر کار پو پھٹنے لگی۔ لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ بابر محاصرہ توڑ کے قلعہ حصار کو جانے والے راستے کی طرف نکل جانے میں ناکامی کے بعد دوبارہ وخش میں لوٹ آیا تھا۔ باقی اب اس حالت میں نہیں رہ گئے تھے کہ اس کا تعاقب کرتے۔

شاہی طبیب صاف ستھرے چوغے پر لیٹے ہوئے خرم کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے زخم پر مرہم لگایا، خون بہنے کا سلسلہ روک دینے میں بھی کامیاب ہو گیا لیکن خرم کسی طرح ہوش میں نہ آ سکا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کراہتا رہا اور بس۔

پھیپھڑے اور معدے کے درمیان داخل ہونے والے تیر سے اندرونی اعضا بری طرح متاثر ہو گئے تھے۔ طبیب نے پانی کے ذریعے بہترین قسم کی مومیائی کھلانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا کیونکہ بے ہوش لیٹے ہوئے لڑکے کے حلق میں انڈیلا جانے والا پانی اور اس کے ساتھ ہی وہ بھی باہر نکل آتی تھی۔ خان زادہ بیگم یہ دیکھ کر بدحواس ہو گئی، بیٹے پر جھکی اور اس کے بے حس جسم سے لپٹ کر رونے لگی۔

"خرم جان! ہائے میرے اکلوتے بیٹے! میرے لخت جگر!"

اچانک لڑکے کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں لیکن وہ کچھ دیکھ نہیں رہی تھیں۔ پتلیاں ادھر ادھر گھومیں اور پھر تھم گئیں، پلکیں بے حس و حرکت ہو گئیں۔

بابر سمجھ گیا کہ خرم دم توڑ چکا ہے۔ اس نے بہن کے شانوں کو پکڑ کر اسے الگ لے جانے کی کوشش کی لیکن خان زادہ بیگم نے خود کو اس کی گرفت سے آزاد کرا لیا۔ وہ بیٹے کی میت سے لپٹ گئی، اسے پیار کرنے اور کچھ اوپر اٹھ کر روندھے ہوئے گلے سے پکارنے لگی

"خرم! کہاں چلے گئے تم، خرم جان؟ کہاں ہو تم، میرے جگر گوشے؟ اٹھو، بیٹے! بولو نا! کچھ کہو نا!"

آخر کار بابر نے جو خود بھی اشکبار تھا، میت کو کسی طرح اس کی گرفت سے چھڑایا اور دوبارہ چوغے پر لٹا دیا۔ قاسم بیگ نے آنکھیں بند کرنے کے لیے اپنی انگلیاں دھیرے دھیرے بھوؤں پر سے نیچے پھیریں لیکن لڑکے کی آنکھیں نیم وا ہی رہ گئیں۔ اب کہیں جا کر خان زادہ بیگم کو یقین ہو گیا کہ بیٹا دنیا سے کوچ کر گیا۔ وہ ہیجانی کیفیت میں سر پیٹ پیٹ کر بڑے دردناک انداز سے بین کرنے لگی۔

"ہائے بیٹا! میں تمھاری حفاظت نہ کر سکی، میرے لاڈلے! اس سے تو کہیں اچھا تھا کہ مجھ ہی کو موت آ جاتی! ہائے، میں مر جاؤں! آخر تمھیں یہاں لائی ہی کیوں تھی، آخر کیوں؟!"

بابر نے بہن کی بھنچی ہوئی مٹھیوں کو تھام کر اس کا منہ زبردستی اپنی طرف پھیرا۔

"اس سانحے کے لیے کسی کو کوسنا ضروری ہو تو مجھے کوسیے،" اس نے تلخی کے ساتھ کہا۔ "آپ پر مصیبت کا یہ پہاڑ میری ہی وجہ سے ٹوٹا ہے۔ موت اگر منصف ہوتی تو پہلے میری جان لیتی کیونکہ ہر بات کے لیے سب سے زیادہ قصوروار میں ہوں! میری ہی وجہ سے تو یہ معصوم لڑکا دو تلواروں کی چپیٹ میں آ گیا۔ میں نے ہی تو آپ سب کو پھنسایا ہے اس جنگ میں!"

قاسم بیگ نے اظہار ہمدردی کے طور پر بابر کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اسے چمٹا لیا۔ وہ دل ہی دل میں اپنے اوپر لعنت بھیج رہا تھا کہ گزشتہ سال قندز میں مغل بیگوں کی سازش کا علم ہوا تھا تو اس نے بابر کو سخت کارروائی کرنے سے روک

دیا تھا۔ آج کی یہ بغاوت اسی پرانا پھوڑا تھا جو پھوٹ گیا تھا۔

قصور وار تو ہم سبھی ہیں، علی جاہ!" آخر کار قاسم بیگ نے کہا۔ "دنیا کا تو ہمیشہ سے یہی چلن رہا ہے، غدار لوگ ایمان، اور بے قصور افراد کو یوں ہی برباد کرتے رہے ہیں۔"

تنے میں خانزادہ بیگم دوبارہ چیخ مار کر خرم کی میت کی طرف جھپٹی

"میں عاجز آ چکی ہوں آپ کی اس دنیا سے! بہت ہو چکا! مجھے بھی میرے بیٹے کے ساتھ ہی دفن کر دیجیے! میں دوسری دنیا میں چلی جاؤں گی، خرم کے ساتھ چلی جاؤں گی!"

ان لوگوں نے صنوبر کے تنے اور شاخوں سے ایک پلنگڑی بنا کر میت کو اس پر رکھ دیا اور اس پلنگڑی کو تھامے ہوئے باری باری کندھا دیتے ہوئے دن بھر چلتے رہے۔ شام کو اسے ایک سرسبز و شاداب ٹیلے پر جہاں سے عظیم الشان کوہ پامیر دکھائی دیتا تھا، دفن کر دیا گیا۔ چھوٹی سی قبر پر ایک سفید جھنڈی لہرانے لگی جو اس بات کی علامت تھی کہ وہاں ایک معصوم روح ابدی نیند سو رہی ہے۔

خانزادہ بیگم کو جو زندہ درگور ہو رہی تھی، کسی طرح قندز لے جایا گیا پھر وہاں سے کابل

کابل

ا

شام سے ذرا قبل جھیل سے لمبی چونچ والی مرغابیوں کے ایک غول نے اوپر کی طرف پرواز کی۔ مرزا ہمایوں اس لمحے کے انتظار میں کافی دیر سے جھاڑیوں میں چھپا بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کمان کی تانت کھینچ کر ایک اور پھر فوراً ہی دوسرا تیر چلایا۔ غول کی ایک مرغابی کی رفتار دھیمی پڑ گئی اور وہ بازو ہلاتے ہوئے تیزی کے ساتھ نیچے آ کر مخالف سمت والے کنارے کے قریب پانی میں گر گئی۔

وہیں آٹھ چپوؤں والی شاہی کشتی جس پر سائبان پڑا ہوا تھا، ہلکی ہلکی لہروں پر ڈول رہی تھی۔ ہمایوں گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے اتالیق اور سپاہیوں کے ساتھ جھیل کے کنارے کنارے چلتا ہوا دوسری جانب پہنچا لیکن اس سے قبل ہی بادشاہ کے کچھ درباری کشتی پر سوار ہو کر مرغابی کو پانی سے نکال لائے تھے اور اب ولی عہد کی طرف چلے آ رہے تھے۔

ہمایوں نے دیکھا کہ مرغابی کو جسے کسی درباری نے ذبح کر دیا تھا، خود بابر ہاتھ میں لیے غور سے جائزہ لے رہا ہے۔ وہ جلدی سے گھوڑے پر سے اترا اور شاہی آداب کے بموجب دور ہی سے اپنے والد کو کورنش بجا لایا۔

بابر نے ایک ہی جھٹکے سے پرندے کے سینے میں چبھے ہوئے تیر کو نکالا اور بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا

"یہ آپ کا تیر ہے؟"

ہمایوں فوراً سمجھ گیا کہ والد پر اس وقت بھی ہلکا ہلکا سرور طاری ہے۔ گذشتہ کچھ دنوں سے بابر خاص بدنوش ہو گیا تھا اور آج بھی درباریوں کے ساتھ کشتی پر سے تاب پی تھی۔ ہمایوں کو یاد آ گیا کہ جھیل اور اس کے ارد گرد کا علاقہ بادشاہ کے آرام کرنے کے لیے وقف ہے۔ اس نے ندامت کے ساتھ آنکھیں جھپکاتے ہوئے جواب دیا

"معاف فرمایئے، جہاں پناہ میں یہاں شکار کھیلنے گیا تھا سب وقت۔"

"لیکن نشانہ خوب لگایا" بابر نے مسکراتے ہوئے کہا "لیجیے اپنے پرندے کو تھامیے۔"

ہمایوں بائیں ہاتھ کو سینے پر رکھ کر والد کے پاس گیا اور دائیں ہاتھ سے مرغابی لے کر فوراً ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

بابر کے مصاحبین میں شامل بڑی بڑی آنکھوں والا ایک دبلا پتلا سانولا نوجوان جو ہندو بیگ کہلاتا تھا، مسکرایا کہ اس کے اجلے اجلے دانت دکھائی دینے لگے

"ولی عہد، جوان، نشانہ بازی اور ہاتھ کی مضبوطی کے معاملے میں بالکل بادشاہ ذی جاہ ہی پر گئے ہیں۔"

خواجہ کلاں بیگ نے فوراً ہی قدرے بے دلی کے ساتھ جو شراب ناب کا نتیجہ تھی، تائید کی کہ شہزادہ اپنے مشہور و معروف والد کے شایان شان ہے۔

بابر نے مطمئن ہو کر قاسم بیگ کی طرف دیکھا جو ہمیشہ ہی کی طرح اس وقت بھی بابر کی طرف بہت زیادہ توجہ دیے چپ چاپ ایک طرف کھڑا ہوا تھا۔ اس کی عمر ساٹھ سے تجاوز کر چکی تھی، وزیر اعظم کے عہدے سے خود اپنی مرضی سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور اب ہمایوں کے اتالیق کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ بابر نے سوچا "قاسم بیگ کسی زمانے میں میرے اتالیق بھی تھے۔ ان کا جیسا وفادار شخص نہ ہوتا تو مجھے جانے کتنی مشکلات جھیلنی پڑتیں۔"

"ہمایوں کی اس کمال کی تیر اندازی کے لیے ان کے محترم اتالیق، حق ستائش ہیں" بابر نے کہا۔ "لیکن ولی عہد کے لیے نشانہ بازی کی مہارت ہی کافی نہیں ہوتی۔ میرے ولی عہد کو گھڑ سواری کے فن پر کتنا عبور حاصل ہے؟"

قاسم بیگ نے ہمایوں کو حوصلہ افزا نگاہوں سے دیکھا اور لڑکے نے اس سوال کا جواب عملی طور پر دینے کی آنکھوں ہی آنکھوں میں اجازت مانگی۔

"اچھی بات ہے، دکھا دیجیے۔"

تیرہ سالہ ہمایوں قد میں تقریباً اپنے والد کے برابر ہو چکا تھا اور صورت شکل اور وضع قطع سے بابر کے لڑکپن کی جیتی جاگتی تصویر لگ رہا تھا۔

قاسم بیگ کے اشارے پر دو سپاہی دو گھوڑوں کو جن پر کاٹھیاں کسی ہوئی تھیں، پکڑ کر ایک سیدھ میں ایک دوسرے سے کوئی پچاس قدموں کے فاصلے پر کھڑے ہو گئے۔ ہمایوں بڑی پھرتی سے اچھل کر کمیت بادامی ماتھے پر سفید نشان والے اپنے گھوڑے پر سوار ہوا، اسے کچھ دور تک پیچھے لے گیا پھر ایڑ لگا کر دوڑاتا ہوا پہلے گھوڑے کے برابر پہنچا، اپنی لگام چھوڑی، رکابوں سے پاؤں نکالے، دوسرے گھوڑے کی کاٹھی تھامی اور پلک جھپکتے میں اپنے گھوڑے کی کاٹھی پر سے اچھل کر اس پر سوار ہو گیا۔ اس گھوڑے کی لگام فوراً ہی تھام کر اسے سرپٹ دوڑاتے ہوئے اس نے اگلے گھوڑے کو پکڑ کر کھڑے ہوئے سپاہی کو آواز دی "اپنی جگہ سے نہ ہٹنا" اور اتنی ہی پھرتی سے اچھل کر تیسری کاٹھی پر بھی سوار ہو گیا۔

بیگ جنھیں نشے نے خاصا بے باک بنا دیا تھا تقریباً ایک ساتھ چیخ اٹھے

"آفریں صد آفریں!"

"نہ کبھی سنا نہ دیکھا! بے نظیر!"

"بالکل جہاں پناہ ہی کی طرح!"

بابر کو یاد آ گیا کہ لڑکپن میں جبکہ وہ بہت دلیر تھا، گھڑ سواری کی ایسی ہی مشقیں خود بھی کیا کرتا تھا۔ اندجان کے باہر

واقعی دریا میں یوں ہی ایک گھوڑے کی کاٹھی سے اچھل کر دوسرے کی کاٹھی پر سوار ہو جاتا تھا۔ ایسے ہی پیچھے بھی آ گیا۔ ایک بار دو چوک گیا تھا اور پیر میں سخت چوٹ آ گئی تھی۔

"چشم بد دور۔ گھڑ سواری سے متعلق پھرتی کے معاملے میں تو لگتا ہے کہ مرزا ہمایوں تم سے بھی آگے بڑھ گئے۔"

"مرزا ہمایوں تو ہر معاملے میں آپ کو نمونۂ تقلید تصور کرتے ہیں، عالی جاہ" قاسم بیگ نے صدق دل سے کہا۔

اس کا جواب بابر نے بھی صدق دل سے ہی دیا

"ہر معاملے میں تو میں شاید ہی ان کے لیے نمونۂ تقلید بن سکوں۔"

اتنے میں ہمایوں دوبارہ ان لوگوں کے قریب آ گیا۔ اسے والد کے معلوم دلوں چہرے کو دیکھ کر حیرت ہوئی اور اس نے کہا

"کیوں نہیں، عالم پناہ! میرے محترم اتالیق مجھے آپ کی ان جنگوں کے بارے میں بھی جن میں آپ کو فتح حاصل ہوئی اور ان کے بارے میں بھی جن میں قسمت نے آپ کا ساتھ نہیں دیا، سب کچھ بتا چکے ہیں۔ دشمنوں کا مقابلہ آپ نے جس شجاعت سے کیا اس سے تو شاید رستم، سہراب اور الپامش* نے بھی نہ کیا ہوگا۔"

"ارے شہزادے، جنگیں زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ دیکھنے نا، جنگوں سے کیسے کیسے نتائج رونما ہوتے ہیں" بابر نے کہا اس کا اشارہ اپنی شکستوں اور ان کے نتائج کی طرف خاص طور سے اپنے ماوراء النہر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھو بیٹھنے کے سنگین ترین نتیجے کی طرف تھا۔

لیکن ہمایوں کے نزدیک خاص بات کچھ اور ہی تھی اس کے والد نے خونیں معرکوں میں جانے کتنی ہی بار موت سے ٹکر لی تھی اور ہر بار اس مقابلے سے زندہ و سلامت نکل آیا تھا۔ کیا یہ حقیقی شجاعت کا مظاہرہ نہ تھی؟ ہمایوں حال ہی میں قاسم بیگ سے سن چکا تھا کہ بابر نے ہرات اور کابل کے درمیان بلندیوں پر واقع درے کو کیسے پار کیا تھا۔ سردیوں کے ایام تھے، لہو کو منجمد کر دینے والی سردی پڑ رہی تھی۔ ورنہ بہت ہی بھیانک برفانی طوفان بھی آیا ہوا تھا۔ ایسے میں اس درے کو جہاں موسم گرما تک میں برف کی موٹی موٹی تہیں جمی رہتی تھیں، پار کرنے کا کوئی دوسرا شخص تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن بابر نے اسے اپنے سپاہیوں کے ساتھ پار کیا اور تمام مشکلات پر قابو پایا۔ ایسے بہادرانہ اقدام کا تصور وہی شخص کر سکتا تھا جو خود کو قربان کر دینے کا عزم رکھتا ہو، اس بات کی خاک بھی پروا نہ کرتا ہو کہ وہ برف کے گرتے ہوئے تودوں میں دفن ہو سکتا ہے۔ اتالیق نے ہمایوں کو بتایا تھا "ہم لوگ سینے سینے تک برف میں دھنس جاتے تھے۔ گھوڑوں کے لیے قدم اٹھانا سخت دشوار ہو گیا تھا، برف پر گر گر پڑتے تھے۔ پھر بھی لوگ باری باری آگے نکل کر برف کو اٹھا اٹھا کے دونوں جانب پھینکتے اور کوہستانی بلندیوں پر ہوا کی کمی کے نتیجے میں ہو جانے والی بیماری کے باعث چلنا تقریباً ناممکن ہو گیا۔ تب ہمارے حکمران آگے بڑھے۔ سردی میں برابر اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا، حکمراں کا چہرہ اور کان اکڑ کے سوج گئے لیکن انھیں اس کا احساس تک نہ ہوا۔ وہ ہم سب کو لیے ہوئے آگے بڑھتے ہی رہے اور آخرکار ہم نے موسم سرما میں انتہائی پرخطر بن جانے والے اس درے کو پار کر لیا"۔

قاسم بیگ نے ان آفتوں کے جو بابر کے سر پر مسلسل نازل ہوتی رہی تھیں، قصے سنا سنا کر ہمایوں کو یقین دلا دیا تھا کہ اس کے والد کے آگے موت بھی بے بس ہو جاتی ہے۔ ہمایوں اسی جوش، عقیدت و عشق کے سائے میں پروان چڑھا ہے۔

---

* الپامش ترکی بولنے والی اقوام کی لوک کہانیوں کا ایک بہادر کردار۔

تھا اور اس وقت اس نے بچوں جیسی بے اعتباری اور سادگی کے ساتھ بابر سے پوچھا

"عالی جاہ، کیا یہ سچ ہے کہ جب کابل میں جب سازش کرنے والوں سے لڑائی ہو رہی تھی تو دوست نام کے پہلوان جیسے کسی سپاہی نے جو آپ کو پہچان نہیں سکا تھا، آپ پر تلوار چلا دی تھی؟"

بابر مسکرانے لگا

"ہاں شہزادے، یہ سچ ہے... قیامت کی سردی میں درے کو پار کرتے وقت میرا چہرہ اکڑ کے سوج گیا تھا اور غالباً ہے کہ جب یہاں پہنچا تو صورت خاصی بگڑی ہوئی تھی۔ لیکن کابل میں غداروں نے ہمارا استقبال تلواروں سے کیا۔ انھوں نے جن سپاہیوں کو فریب دیا تھا ان میں دوست بھی شامل تھا۔ یہ سپاہی مجھ سے بخوبی واقف تھا۔ میں نے عین وقت پر اسے للکارا: "دوست ذرا ہوش میں آؤ" لیکن اٹھی ہوئی تلوار کو روک لینا بہت مشکل ہوتا ہے۔ تو اس کی تلوار میرے خود پر آن پڑی۔ میں سمجھتا ہوں کہ دوست نے میری آواز سنتے ہی مجھے پہچان لیا تھا اور اس کا ہاتھ لرز اٹھا تھا اسی لیے وار زیادہ زوردار نہ ہو سکا۔ ویسے تو اس کی تلوار کی ضرب ہمیشہ ہی جان لیوا ثابت ہوتی تھی لیکن میرے صرف سر اور گدی میں زخم آئے اور بس۔"

"اور اس سپاہی کا کیا حشر ہوا تھا؟"

"وہ مارے ڈر کے تلوار پھینک کر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ میں نے تعاقب نہیں کیا تھا۔"

یہ سن کر ہمایوں اور سب بیگ بے حد مسرور ہوئے۔ انکساری انسان کی شان بڑھاتی ہے لیکن بابر کے موجودہ وزیر اعظم محمد دولدائی نے جو چالیس سال کا بہت ہی وجیہہ و شکیل بیگ تھا، قدرے لڑکھڑاتے ہوئے ایک ایسی بات کہنے کا فیصلہ کیا جو اس کے خیال میں سچ تھی۔

"وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ پروردگار نے ہمارے عظیم بادشاہ کو ایسا بنایا ہے کہ ان کا نہ تلوار کچھ بگاڑ سکتی ہے نہ قیامت کی سردی، اور نہ ہی تیر۔"

ہمایوں اس چاپلوس وزیر کے قریب سے، جس کا چہرہ نشے کے باعث سرخ ہو رہا تھا، بڑی رکھائی کے ساتھ الگ ہٹ گیا۔ وہ اس وقت صرف اپنے والد ہی سے باتیں کرنا چاہتا تھا جس کی شخصیت کچھ دنوں سے اس کے لیے زیادہ سے زیادہ پرکشش ہوتی جا رہی تھی۔ خود بابر امور سلطنت میں، فرامین و احکام جاری کرنے، تنہائی میں پڑھنے لکھنے اور فرصت کے وقت اپنے معتبر بیگوں کے ساتھ ضیافتوں میں مصروف رہتا تھا۔ اس کے نزدیک ہمایوں تو ابھی کل کا لڑکا تھا جس کے معقول ہم کلام ثابت ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ لیکن ہمایوں اپنے والد سے باتیں کرنے کے لیے بے تاب رہتا تھا۔ اس کی دلچسپی لڑکپن کی شرارتوں میں شامل ہونے والے اپنے دوستوں سے بھی اور قاسم بیگ سمیت اپنے سب ا دینے والے اساتذہ سے بھی روز بروز کم ہی ہوتی جا رہی تھی۔

"والد محترم، لوگ کہتے ہیں کہ گذشتہ سال آپ دریائے سندھ کے کنارے کسی شیر سے لڑ گئے تھے..."

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"میں نے آپ کی خواب گاہ میں شیر کی کھال دیکھی ہے۔"

بابر نے سر کی جنبش سے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے بیگوں کی طرف اشارہ کیا

"اس شیر کا کام تو ہم سب نے مل کر تمام کیا تھا۔"

ہندو بیگ نے مسکراتے ہوئے اس بات کی تردید کی

"ارے نہیں، عالی جاہ ہمارے ساتھ نہ ہوتے تو ہم شیر کے قریب پھٹکنے کی بھی جرات نہ کرتے"

اور ہمایوں نے والد کے چہرے پر پرستش نگاہیں جمائیں

لیکن بابر بیٹے سے باتیں کرتے ہوئے تصور ہی تصور میں ماوراالنہر پہنچ چکا تھا۔ شیبانی اور شیبانی خاندان کے سلطانوں کے ہاتھوں اپنی ہزیمت کی یادیں آج بھی اس کے ذہن پر مسلط تھیں، آج بھی دل کو پارہ پارہ کیے دے رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا۔ "مجھے حصار تک سے محروم ہونا پڑا۔ یہ مطلب ہوتا ہے طاقت کا۔ طاقت نہیں رہتی تو کامیابی بھی قدم نہیں چومتی۔۔۔۔ طائر خوش بختی ہما جانے کتنی ہی بار میرے شانوں سے دور اڑ گیا"۔ وہ خود کو بھول جانے کے لیے، درد اور غم کو جو کہیں زیادہ بڑھ چکے تھے، معدوم کرنے کے لیے بار بار بادہ و جام کا سہارا لیتا تھا لیکن بے سود۔ ان پر تشدد طاری ہوتا تھا لیکن درد و کرب سے نجات نہیں ملتی تھی۔ یہ پست حوصلہ انسان اپنے بیٹے کو دیکھتا تو اسے لگتا کہ اس کی زندگی سے ہمایوں کی دلچسپی بڑھ گئی ہے۔

بابر نے ایک لمحے کے لیے خود کو اپنے کم سن بیٹے کی نگاہوں سے دیکھا۔ وہ سب جس پر اس کے خت تجربہ تازہ تھا، واقعی پیش آیا تھا اور اس کی آپ بیتی میں لکھا بھی جا چکا تھا۔ بیگ اسے خوش کرنے کے لیے اس کی شجاعت کو کوئی بڑی چیز، اللہ کے اس پر مخصوص فضل و کرم کی ایک علامت قرار دیتے تھے لیکن اللہ ہی تو اسے سزا بھی دے رہا تھا۔ دراصل اچھائیوں اور برائیوں کا، فتوحات اور شکستوں کا انحصار رضی اور عام لوگوں پر ہوتا تھا اور وہ خود بھی رضی اور عام آدمی ہی تو، یہ الگ بات کہ وہ کچھ غیر معمولی صلاحیتوں کا بھی حامل رہا ہو جیسا کہ ہمایوں کا سادہ و معصوم ذہن سوچتا تھا۔

بابر کو غالباً پہلی بار احساس ہوا کہ وہ باپ کی حیثیت سے ہمایوں کا سہارا نہیں بلکہ اس کے برعکس اس کا تیرہ سالہ بیٹا ہمایوں اس کا سہارا ہے، اس کے حوصلے بڑھانے والا ہے۔ بابر کو زندگی شب تیرہ و تار جیسی معلوم ہو رہی تھی لیکن اس رات کو اپنے بیٹے کی نگاہوں سے دیکھنے پر اسے اس میں ستاروں سے مشابہ تابندہ نقطے نظر آنے لگے۔

اتنے میں ہمایوں نے دھیمی آواز سے، تقریباً سرگوشی کی سی طرح جیسے کہ اس وقت وہ اپنے والد کے ساتھ اکیلا ہو، کہا:

"آپ نے مجھے جو دیوان عطا کیا تھا اس کے تمام اشعار میں نے یاد کر لیے۔ آزمانا چاہتے ہوں تو پوچھ لیجیے۔۔۔"

بابر کے پیچھے اس کے بیگ، اس کے مقربین کھڑے ہوئے تھے۔ اس وقت انھیں سب سے زیادہ دلچسپی کاہے سے تھی؟ محض اس بات سے کہ جلد از جلد کشتی پر واپس چل کر محفل بادہ کو جاری رکھیں۔

بابر نے بیگوں کی طرف مڑ کر اچانک سخت لہجے میں کہا

"حضرات، ہم نے آج جتنی سیر کی، جتنا دل بہلایا وہ میرے خیال میں کافی ہے اب میں کچھ وقت مرزا ہمایوں کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔ گھوڑا لاؤ"

بابر گھوڑے پر سوار ہو گیا تو ہمایوں بھی بڑی خوشی سے اچھل کے اپنے گھوڑے پر پہنچا اور باپ بیٹے نے شہر کا رخ کیا۔ قاسم بیگ اور دوسرے لوگ ان دونوں کے پیچھے پیچھے درمیان میں کچھ فاصلہ چھوڑ کر چلنے لگے۔

بابر کی آنکھوں میں معمول سے زیادہ چمک تھی لیکن کسی کسی وقت وہ اچانک بند بھی ہو جاتی تھیں۔ سے تاب اتنی

بہت تیز تھی۔

اس نے شراب کے اثر پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے نشے میں مسکرا کر ہمایوں سے کہا

"ہاں تو شہزادے..... میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

ہمایوں نے جس کا چہرہ والد کے ہم رکاب ہونے کے احساس سے دمک اٹھا تھا، جلدی جلدی ایک رباعی سنائی

ہم اپنی باتوں سے اوروں کے دل دکھاتے ہیں

تلاش کرتے ہیں غم اور انھیں بڑھاتے ہیں

دلوں کو اپنے کچلتے ہیں جب بہت آزار

تو بادہ نوشی میں ہر شے کو بھول جاتے ہیں

نہیں، ہمایوں اتنا بھولا نہیں ہے، بابر نے سوچا۔ اشعار بھی کیسے منتخب کیے! کہنا چاہتا ہے کہ وہ بادہ و ساغر سے والد کے گہرے لگاؤ کی وجہ کو سمجھتا ہے نیز یہ کہ آج کی اس نشے کی حالت کے لیے اسے معاف کر رہا ہے۔

"بالکل درست .. بس پہلے مصرعے کو بحر کے اعتبار سے پڑھنے میں ذرا سی غلطی ہو گئی اور ہاں، ان اشعار میں جو طنز مضمر ہے، اسے بھی آپ پوری طرح نہیں سمجھ سکے۔"

"کیا نہیں سمجھ سکا؟ طنز کس پر؟" ہمایوں نے حیرت سے کہا۔

"اس بات پر، ان لوگوں پر جو خیر، ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے ہیں، ایسے الفاظ تلاش کرتے ہیں جو عزیزوں کے دلوں میں کانٹے کی طرح چبھ جائیں۔ اور پھر اپنے دل کے درد سے نجات حاصل کرنے کے لیے خود کو شراب میں غرق کر دینا چاہتے ہیں، اور ایک بار پھر دوسروں کو، اپنے عزیزوں کو برا بھلا کہنے لگتے ہیں کبھی کبھی خود اپنا مذاق اڑانا بھی مفید ہی ہوتا ہے۔

ہمایوں دوبارہ متحیر ہو گیا۔

"مفید ہوتا ہے؟ وہ کیسے؟"

"آپ کی عمر میں اس بات کو سمجھنا مشکل ہوگا جانتے ہیں، تیس سال کی عمر تک مجھے شراب سے خاک بھی رغبت نہیں تھی۔ اور آپ؟ آپ کا جی چاہتا ہے پینے کو؟"

اس سوال سے ہمایوں بالکل بوکھلا گیا پھر اس نے اپنے والد کے پھولے ہوئے ہونٹوں پر تیز اور اداس نظر ڈالتے ہوئے کہا

"مجھے شراب پسند نہیں ہے۔"

خود بابر بھی تیرہ سال کی عمر میں شراب سے نفرت کرتا تھا۔ اس نے سر ہلا کر اظہار پسندیدگی کرتے ہوئے پوچھا

"تو پھر آپ کو کیا پسند ہے؟"

"کیا پسند ہے؟" ہمایوں چند لمحات کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ "مجھے گھڑ سواری پسند ہے، نئی نئی چیزوں کو دیکھنا اور معلومات میں اضافہ کرنا پسند ہے۔ سب سے زیادہ پسند ہیں بہادروں کی حکایات والی اچھی اچھی کتابیں۔ انھیں تو میں صبح سے شام تک پڑھتا رہوں تب بھی جی نہ بھرے..."

"بالکل مجھ ہی پر پڑا ہے" بابر نے سوچا۔ اس نے ہمایوں کو غور سے دیکھا اور اس کی نگاہیں چابک کو تھامے ہوئے

ہاتھ پر ٹھہر گئیں۔ "ہمایوں کی رنگت سانولی ہے شاید اس لیے کہ جنوبی علاقے میں پیدا ہوا اور بڑھا پلا ہے۔ ہتھیلی کا لکیریں بھی کوئی جیسی ہی ہے"۔ اور بابر نے لپک کر اپنا ہاتھ بیٹے کی کلائی پر رکھ دیا

"ذرا اپنا ہاتھ تو دکھائیے۔"

ہمایوں نے چابک کو کمر کی پیٹی میں ٹھونس کر ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ بابر نے اپنی ہتھیلی ہمایوں کی ہتھیلی کے قریب کر کے ہموار کر دی۔ دونوں کے ہاتھوں کی چھوٹی اور بڑی لکیریں یکساں تھیں۔ ہمایوں خوشی سے ہنس پڑا لیکن بابر نے ٹھنڈی سانس بھری

"خدا کرے کہ آپ کا ان آلام و مصائب سے کبھی بھی سابقہ نہ پڑے جو میں نے جھیلے ہیں۔"

"میں وہ سب کرنا چاہتا ہوں جو آپ کر چکے ہیں۔ آپ کا وارث جو ہوں۔"

بابر نے گھبرا کر بیٹے کی طرف دیکھا

"لیکن اس معاملے میں عقل و ہوش سے کام لیجئے گا۔ میں نے تو کچھ ایسے اقدامات بھی کیے ہیں جو کرنے کے لائق نہیں اور نہ ہی ورثے میں دینے کے لائق۔"

"وہ کون سے اقدامات ہیں، عالی جاہ؟"

"نہایت ہی تلخ اقدامات... بے رحمی اور بے انصافی کے اقدامات۔ جانے کتنے ہی!"

ہمایوں نے سوچا والد محترم نے جن آلام و مصائب کا تذکرہ کیا ان کی ترجمانی کیا ان کی شاعری میں بھی کی گئی ہے؟ ہاں، لگتا ہے کہ کی گئی ہے۔ اور اس نے یہ اشعار پڑھے

جس کام سے بھی نکلوں ہمراہ رہے محنت
جس سمت بھی منہ پھیروں آتی ہے نظر حسرت
سو جور و ستم جھیلے، راحت نہ کبھی پائی
کاہے کو کوئی ہوگا مجھ جیسا بھی بدقسمت!

ان اشعار کی تلخ حقیقت نے بابر کے دل میں ہلچل مچا دی۔

"بہت خوب پڑھا آپ نے، مرزا ہمایوں" اس نے متاثر انداز میں کہا۔ "میں نے آپ سے پہلے جو کچھ کہا تھا اسے آپ سمجھ گئے۔ میں نہیں چاہتا، قطعاً نہیں چاہتا کہ میں نے جو مصائب جھیلے ہیں وہ آپ کو بھی جھیلنے پڑیں۔"

"میں سمجھ گیا، والد محترم... آپ کی زندگی میرے لیے بہت کشش رکھتی ہے لیکن اب میں اس کے صرف خوشگوار واقعات ہی کا تذکرہ کیا کروں گا۔ ٹھیک ہے نا؟!"

شہر پہنچنے کے بعد قلعے میں بھی ان دونوں کی گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ کشادہ اور روشن دیوان خانے میں جس کی کھڑکیاں شاہ کابل کوہسار کی طرف کھلتی تھیں، کافی دیر تک بیٹھے رہے۔ اچانک ہمایوں نے قلم کاغذ لے کر بابر کی یہ بیت خط بابری میں لکھ دی:

مقدر میں نہیں ترکوں کے اپنا بھلا ہی کیا کیجیے
ہے مشتاق یہ خط بابری میرا بھی کیا کیجیے

بابر کو سمرقند کے جاہل اور متعصب فرد یاد آ گئے جنھوں نے خط بابری کے ذریعے بچوں کو تعلیم دینے کی جسارت

سا ر ہا ہے۔ شاید وہ تکالیف کی آگ میں تپ کر نکلے ہوئے اس رگ میں مضمر مفہوم پوری طرح سمجھ نہ سکنے کے باوجود اسے اپنی اس بات کی سچائی کے ثبوت کے طور پر ابھار رہا ہے۔ کہ سپہ گری کے معاملے میں ہی نہیں علوم و فنون کے معاملے میں بھی اپنے والد کی تمام صفات کو پہنچے گا۔ اور یہ خواہش شہزادے کے لیے بری ہے کیا؟

بابر موسیقی سے محظوظ ہو رہا تھا، اپنے بیٹے کے متعلق مسرت اور جوش کے ساتھ سوچ رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ خیال بھی اس کے ذہن میں کروٹیں لے رہا تھا کہ وہ خود کیسی پستیوں میں گر چکا ہے جو ہر بات کا منفی پہلو ہی دیکھتا ہے، ہر شخص پر خود غرض ہونے ہی کا شک کرتا ہے۔ لیکن آخر ہمایوں کی کیا غرض ہو سکتی ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ اس خیال کے بعد بابر کو لگا کہ اس کی زندگی محض افکار کی کان کانی گھٹاؤں ہی میں محصور نہیں ہے کیونکہ ہمایوں ہی کی طرح کبھی اس کے سینے میں بھی نیک اور اعلیٰ وارفع خواہشات امڈتی رہتی تھیں اور تب اس کی زندگی شفاف چشمے کی مانند بہہ رہی تھی۔ بعد میں جتنے پہاڑی تودوں کے گرنے سے اس چشمے کا پانی گدلا ہو گیا تھا تاہم یہ چشمہ آج بھی برقرار تھا شعر و سخن اور موسیقی کی شکل اختیار کر کے پھوٹ نکلا تھا۔ اور بابر نے سوچا کہ کاش اس چشمے کا دھارا ہمایوں کے دل کی آبیاری کرتا رہے۔ بابر کو آج پہلی بار واضح طور پر احساس ہوا کہ اس کی زندگی اور اس کے بیٹے کی زندگی ایک دوسرے سے کتنا گہرا، کیسا غیر معمولی رشتہ رکھتی ہیں۔ اس نے سوچا ظاہر ہے کہ بیٹا ہر معاملے میں باپ کے نقش قدم پر نہیں چل سکتا لیکن اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔ بیٹا اگر باپ سے گہرا لگاؤ رکھتا ہے، اور اگر وہ جیسا کہ لوگ کہتے ہیں، بالکل باپ ہی پر پڑا ہے تو وقت گزرنے کے ساتھ ہی ساتھ باپ اور بیٹے کی زندگیاں مل کر ایک ہو جائیں گی۔ باپ جو کچھ نہ کر سکے گا اسے بیٹا کر دکھائے گا۔ اور یہی وہ بات تھی جس کا بابر اب یقین کرنا چاہتا تھا۔

پھر اس کے دل میں خیال آیا کہ ہمایوں کے اتالیق اور والدہ اس کے دل میں باپ سے محبت اور عقیدت کے جذبات کو تقویت پہنچانے کی کوشش میں باپ کی زندگی کے صرف روشن پہلوؤں کو پیش کر کے اچھا ہی کر رہے ہیں۔ یہ لوگ ہمایوں کو چاپلوسی کرنا نہیں بلکہ برائیوں سے اجتناب کرنا سکھا رہے ہیں۔ وہ خود بھی تو ہمایوں کو اس امید کے ساتھ محض اپنی خوبیاں ہی دینا چاہتا ہے کہ جو غلطیاں اس سے سرزد ہوئی ہیں ان کا ہمایوں اعادہ نہ کرے گا، جو تکالیف اس نے جھیلی ہیں وہ ہمایوں کو نہ جھیلنی پڑیں گی۔

اسی روز شام کو بابر نے قاسم بیگ کو بلا کر اسے شاہی تحفے کے طور پر طلائی بٹنوں کا پوستین اور ساز سمیت ایک خوبصورت گھوڑا عطا کیا۔ ولی عہد کے دوسرے اساتذہ کو بھی طلائی اور نقرئی چیزوں کے تحفے دئے گئے۔

"اور آپ کو کیا تحفہ دوں؟ خود ہی بتائیے" بابر نے ایک روز ہمایوں کے رہائشی حصے میں جا کر کہا۔ اس وقت کمرے میں ان دونوں کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔

ہمایوں کو کتابوں کا بڑا شوق تھا اور وہ ایک مخصوص کمرے میں واقع اپنے کتب خانے کو بڑے سلیقے سے رکھتا تھا جہاں ڈھیروں قلمی کتابیں موجود تھیں۔ کتابوں کے لیے اخروٹ کی لکڑی کی بنی ہوئی ایک خوبصورت الماری اس کی خواب گاہ میں بھی رکھی ہوئی تھی۔ اس نے الماری کھول کر اس کے سب خانوں سے بہتر نقاشی والا خانہ بابر کو دکھایا جس میں صرف ایک ہی کتاب رکھی ہوئی تھی۔ بابر کا دیوان۔

"یہ خانہ میں نے آپ کی لکھی ہوئی کتابوں کے لیے چھوڑ رکھا ہے" ہمایوں نے کہا۔ "خدا سے دعا کرتا رہتا ہوں کہ وہ آپ کو بہت سی کتابیں لکھنے کے مواقع عطا کرے۔ میری دلی آرزو ہے کہ کسی دن یہ سارا خانہ آپ کی کتابوں سے بھر

بابر نے اسے معنی خیز نگاہوں سے دیکھا

"ایسی عجلت بھی کیا، شہزادے۔ ہاں، یہ جان لیجیے کہ کتاب کے خاتمے کا مطلب ہوگا میری زندگی کا خاتمہ۔

"خدا کے لیے ایسا نہ فرمائیے، والد محترم!"

"بابر نامہ" لکھنے کا سلسلہ دراصل رک گیا تھا۔ شاہ اسمٰعیل سے معاہدہ کرنا، پیر ولی شکر کو اپنے وطن میں بلانا وہاں کے بعد بری طرح ہزیمت اٹھانا۔ یہ سب ایسے واقعات تھے جن کے بارے میں کچھ لکھنا تو کیا سوچنا تک اذیت دہ ہوتا تھا۔ لیکن اس نے سوچا کہ کیا یہی واقعات اس کی کتاب زندگی کا آخری باب بن کر رہ جائیں گے؟ یہاں کابل میں رہتے ہوئے اپنی سلطنت کے مختلف قبائل سے جنگ یا صلح کرنا اور کابل کے قابل دید مقامات کے بارے میں لکھنا (یہ سب تو وہ کر چکا تھا، کوہساروں، دریاؤں، درختوں، پودوں اور جانداروں کے بارے میں تو وہ لکھ چکا تھا) کیا اس کے لیے ناکافی نہیں ہے؟ کیا وہ اپنی زندگی کو یہیں ختم ہو جانے دے، چھوٹی چھوٹی، غیر اہم فکروں میں ڈوب کر دھیرے دھیرے بجھ جانے دے؟ پھر اس کے دل میں خیال آیا کہ اس کتاب کو آگے بڑھانے اور شایان شان طریقے سے ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اور بہت سی شاندار فتوحات حاصل کرے تاکہ شیبانی اور اس کے خاندان کے سلطانوں کے ہاتھوں اپنی شکستوں کے داغوں کو دامن سے دھو سکے۔ اب اس کا بیٹا ہمایوں، اس کا قابل، عقلمند ساتھی و مددگار بن رہا ہے۔ تو کیا وہ ایک عظیم الشان، طاقتور اور مکمل طور پر متحد سلطنت کے قیام کے عزیز ترین مقصد کو جسے اپنے مختلف اتحادیوں اور بیگوں کے ساتھ مل کر نہیں حاصل کر سکا تھا، اب اپنے بیٹے کے ساتھ مل کر حاصل کرے گا؟

یہ سارے خیالات اس کے ذہن میں بگولوں کی جیسی تیزی سے ابھرے لیکن اس نے اپنے بیٹے کو بیان نہ کرنے کے لیے بآواز بلند صرف یہ کہا

"زندگی کے خاتمے کی جو بات میں نے کہی اس سے آپ پریشان نہ ہوں۔ دراصل میرا مطلب یہ تھا کہ میں "تزک" کو آخری دم تک لکھتے رہنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ دلی آرزو ہے کہ اس کے اگلے حصوں میں آپ کے نیک کاموں کے بارے میں بھی لکھنے کا موقع نصیب ہو۔"

"عالی جاہ اگر یہ بات ہے تو خدا کرے کہ آپ "بابر نامے" کو لکھنے کا سلسلہ مزید پچاس بلکہ سو برسوں تک جاری رکھیں۔"

"تو کیا آپ اتنی طویل مدت تک انتظار کر سکیں گے؟" بابر کے ہونٹ متبسم ہو گئے۔

ہمایوں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا

"خدا گواہ ہے، اس وقت تک انتظار کرتا رہوں گا جب تک کہ قسمت میں جینا لکھا ہے!"

۲

سنگ مرمر کے نیلگوں محل کا نام باغ دل کشا رکھا گیا تھا۔ اسے بابر نے دریائے کابل کے کنارے خان زادہ بیگم کے لیے تعمیر کرایا تھا۔

اس محل کے دیوان خانے میں میر عمارت فضل الدین کچھ یوں اکڑ کر بیٹھا ہوا تھا جیسے فراشی سلام کرنے والا ہو۔

پہلو میں اس کا بیٹا گھٹنوں پر ہاتھ رکھے نظریں جھکائے قالین سے چپکا ہوا بیٹھا تھا۔ اس دوران کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔

ان دونوں کے سامنے گہرے نیلے لباس میں خان زادہ بیگم بیٹھی ہوئی تھی جس کے چہرے کو سفید ریشمی نقاب سے ڈھک رکھا تھا۔

دیوان خانے میں بڑی پر درد خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ آخر کار اس سکوت کو خان زادہ بیگم نے اپنی جیسی وحشت جذبات سے رندھی ہوئی آواز سے توڑ دیا اس نے جیسے خود اپنے خیالات کا جواب دیتے ہوئے، جیسے رک جانے والی گفتگو کا سلسلہ جاری کرتے ہوئے کہا:

''سب سے زیادہ خسارے میں بالآخر وہ رہتا ہے جو اس دنیا سے اٹھ جاتا ہے، فضل الدین صاحب۔ مرنے والا واپس تو نہیں آ سکتا نا۔۔۔ جو زندہ رہ جاتے ہیں وہ آہیں بھرتے ہیں، آنسو بہاتے اور مغموم و ملول ہوتے ہیں لیکن اس سب کے باوجود خود کو تسلی دے لیتے ہیں، غموں سے سمجھوتا کر لیتے ہیں۔ آپ میری ہی مثال لے لیجئے نا۔۔۔ میں اب بھی زندہ ہوں''

''لیکن بیگم صاحبہ، ہمارے زمانے میں جو زندہ ہیں ان کے لیے بھی زندگی کوئی ہنسی کھیل تھوڑی ہے۔ مجھے اندجان کو چھوڑے ہوئے کوئی تئیس سال ہو چکے ہیں۔ اس دوران مصائب کے کیسے کیسے پہاڑ ٹوٹ چکے ہیں مجھ پر کیسے کیسے غموں کو جھیل چکے ہم سب۔''

خان زادہ بیگم پل بھر کے لیے سب کچھ بھول کر تصور ہی تصور میں اندجان میں گزرے ہوئے اپنے عہد شباب تک پہنچ گئی جو سوچنے میں بہت قریب ہوتے ہوئے بھی بہت دور جا چکا تھا۔ اب تو اس بات کا یقین کرنا بھی دشوار تھا کہ فضل الدین ان دنوں قوی و شکیل جوان تھا۔ فضل الدین، میر عمارت فضل الدین، جوان بانکا فضل الدین تیزی سے گزر جانے والے ان تئیس برسوں میں جانے کتنی ہی تکالیف نے اسے اپنا نشانہ بنایا تھا۔ صرف چہرے ہی پر نہیں بلکہ ساری گردن پر بھی جھریاں ہی جھریاں نظر آ رہی تھیں۔ ہاتھ سوکھ گئے تھے، ان پر نسیں ابھر آئی تھیں اور قامت خمیدہ ہو گئی تھی۔ لگتا تھا کہ اس کی عمر ساٹھ سال سے تجاوز کر چکی ہے حالانکہ خان زادہ بیگم اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ ترپن سال کا ہے۔ ''اور خود میں؟'' خان زادہ بیگم نے اپنی شکل صورت کا جسے وہ آئینے میں ہر روز کئی بار دیکھا کرتی تھی، تصور کرتے ہوئے سوچا۔ چند گلے دانت گر چکے تھے، لبوں پر پژمردگی چھا چکی تھی، ڈھیروں بال جھڑ گئے تھے اور جو بچے تھے ان میں سفیدی جھلکنے لگی تھی۔

بہترین سال، شباب اور نسوانی حسن کے عہد زریں کے سال مسلسل مرجھاتے ہوئے بیت گئے، پھول کھلنے سے قبل ہی سوکھ گیا یہ خیال آتے ہی خان زادہ بیگم کی آنکھوں میں دوبارہ آنسو آ گئے جنھیں پونچھ کر اس نے پوچھا

''آپ کے صاحبزادے کتنے سال کے ہو گئے؟''

''اکیس سال کے محترمہ۔''

خان زادہ بیگم کو فوراً ہی یاد آ گیا کہ اس کا خرم زندہ ہوتا تو اس وقت بائیس کا ہو گیا ہوتا۔ ناقابل برداشت درد نے جو کبھی اس کے دل کا پیچھا ہی نہیں چھوڑتا تھا ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے اشک جاری ہو گئے اور اس نے روتے ہوئے بات جاری رکھی

"خدا آپ کے فرزند کی عمر دراز کرے۔ خدا آپ کو اس مہیب ترین غم سے محفوظ رکھے جو اولاد کی موت سے ہوتا ہے۔ میں تو اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ ہی دنیا سے اٹھ جانے کو تیار تھی پر لوگوں نے مرنے ہی نہ دیا۔"

فضل الدین جانتا تھا کہ وہ خان زادہ بیگم کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو کسی بھی طرح روک نہیں سکتا۔ اس نے بیٹے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا لیکن بیٹے نے آنکھیں جھکا لیں۔ مگر اس نے خان زادہ بیگم کی توجہ اذیت دہ یادوں کی طرف سے کسی طرح ہٹانے کی کوشش میں اپنی تکالیف اور مصائب کا ذکر چھیڑ دیا

"آپ کو تو معلوم ہی ہے، محترمہ کہ ہرات میں کیسی افراتفری پھیل گئی تھی۔ پہلے تو شاہ اسمٰعیل نے شہر پر قبضہ کیا اور قزلباشوں نے لوٹ مار شروع کر دی۔ لیکن زیادہ دن نہیں بیتے تھے کہ حکومت بدل گئی اور شیبانی خان کے بیٹے اور سپہ سالار انتقام لینے لگے۔ مرو میں قبریں کھودی گئیں اور وہاں جن قزلباشوں نے شیبانی خان کو ہلاک کر دیا تھا ان کی ہڈیاں توپوں میں بھر بھر کے داغی جانے لگیں۔ لیکن قزلباشوں نے ہرات پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور ایک بار پھر انتقام لیا جانے لگا۔ اب کے شیبانی خاندان کے سلطانوں کے حامیوں سے۔ چاروں طرف خون کی ندیاں بہہ نکلیں، بربریت کا دور دورہ ہو گیا ... کمال الدین بہزاد تو شاہ اسمٰعیل کے دربار میں ملازمت اختیار کرنے کے لیے ہرات سے تبریز پہنچا دیا گیا۔ مورخ خواندمیر آئے دن کے ہنگاموں سے جان بچانے کے لیے شہر سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ سنا ہے کہ وہ دور دراز واقع اپنے آبائی گاؤں کو چلے گئے۔ ہم لوگ سمرقند سے دوبارہ ہرات لوٹ آئے تھے لیکن ہمیں اپنے اس اقدام پر بے حد پچھتانا پڑا۔ ہمارے ہاتھ اپنے پیشے کے کام کرنے کے لیے ترس رہے تھے پر نہ میرے لیے کوئی کام تھا نہ میرے بیٹے کے لیے۔ میرا بیٹا علاؤالدین بہت اچھا سنگ تراش ہے لیکن آج ہرات میں فنون کی ضرورت بھلا کسے ہے؟ آخر میں نے شاعر محمد سلطان سے مشورہ کیا اور مرزا بابر کی سلطنت میں پناہ لینے کے لیے کابل چلا آیا۔"

فضل الدین کی اس درد بھری سرگذشت کو سنتے سنتے خان زادہ بیگم نے اپنے آنسوؤں پر قابو پا لیا تھا اور وہ کچھ پرسکون ہو گئی تھی۔

"آپ نے بہت اچھا کیا جو یہاں آ گئے" وہ گہری ٹھنڈی سانس بھر کے بولی۔ "مجھے بھی آپ کی ایک امانت واپس کرنی تھی۔ یاد ہے نا، آپ نے مجھے کچھ سونپا تھا، سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کروں۔"

فضل الدین نے آنکھیں جھپکائیں

"امانت کیسی، بیگم صاحبہ؟"

خان زادہ بیگم بڑی اداسی کے ساتھ مسکرائی "بھول گئے، سب کچھ بھول گئے۔ واقعی سب کچھ فراموش کر دیا؟

"ابھی، بس ابھی دیکھ لیجئے گا۔" وہ ایک اندرونی چھوٹے دروازے کو کھول کر دیوان خانے سے باہر چلی گئی اور تھوڑی ہی دیر کے بعد لوٹی تو اس کے ساتھ ایک کنیز بھی تھی جو سفید ریشمی کپڑے میں لپٹی ہوئی کوئی چیز ہاتھ میں لیے ہوئے تھی۔ خان زادہ بیگم کے اشارے پر کنیز نے اس چیز کو دونوں ہاتھوں پر رکھ کر فضل الدین کی طرف بڑھا دیا اور خود سر جھکا کر الٹے قدموں پیچھے ہٹتی ہوئی باہر نکل گئی۔ کم سخن علاؤالدین بھی اپنے والد کے اشارے پر اسے خان زادہ بیگم کے ساتھ اکیلا چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

فضل الدین نے کاغذات کو جن کے کنارے زرد پڑ چکے تھے، بڑی احتیاط کے ساتھ کھولا۔ اوہ خدا! یہ تو اس کے لگائے ہوئے تخمینے تھے، ان عمارتوں کے نقشے تھے جنھیں مدجان میں تعمیر کرنے کے لیے کسی زمانے میں اس نے نہیں اس

ے اور خان زادہ بیگم سے مل کر تیار کیا تھا۔ فضل الدین کے رگ و پے میں بجلی سی دوڑ گئی آنکھیں جوش و خروش سے چمک اٹھیں۔ وہ حیران ہو گیا کہ خان زادہ بیگم اتنا سب جھیلنے کے باوجود اس کے کاغذات اتنے برسوں تک سنبھال کر رکھے رہی۔ فضل الدین کو وہ تمام کی تمام پرانی جگہیں اور واقعات نظر آنے لگے تھے ان دنوں کی جب وہ اس پر مہربان تھا۔ وہ ماضی کے مصوری لمحات جیسے واپس آ گئے جب اوش کے قریب واقع پہاڑی سے جہاں اس نے بابر کے لیے پہلا حجرہ تعمیر کیا تھا وہاں پتھریلی پگڈنڈی کے ذریعے اترتے وقت خان زادہ بیگم کا پیر پھسل گیا تھا اور تب اس نے خان زادہ بیگم کو گرنے سے بچانے کے لیے اس کی کمر بانہوں میں لے لی تھی

سب کچھ فضل الدین کی نگاہوں کے سامنے پھر گیا اور تب اس نے خان زادہ بیگم سے کہا

''اوہ آپ نے تو مجھے میرے ان بھولے بسرے زمانے کی روح واپس کر دی! معجزہ ہے معجزہ! جانے کتنے برسوں کے بعد، جانے کتنے راستوں کی مسافت کے بعد میرے، لیکن ہمارے یہ خواب دوبارہ یہاں مل گئے''

خان زادہ بیگم بھی اپنے ان ایام شباب کی یادوں سے سرشار ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور یہ مسرت اس کے لہجے سے جھلکنے لگی۔

''بجا فرمایا آپ نے فضل الدین صاحب یہ پوٹلی واقعی میرے ساتھ ساری قیمتی چیزوں کے ساتھ جو یہ دونوں ہیں پر مجھے بے حد عزیز ہیں، نہ جانے کتنی مصیبتوں سے گزر کر یہاں تک پہنچی ہے۔ صرف ایک ہی بار جب ہم لوگ قندز سے سمرقند جا رہے تھے تب کوہستانی دروں اور دریاؤں کو پار کرنے کی مشکلات کے مدنظر میں نے کچھ صندوق قندز ہی میں چھوڑ دیے تھے اور انھیں میں سے ایک میں آپ کے یہ کاغذات بھی رکھے ہوئے تھے۔ سمرقند میں ہر وقت میرا دھیان ان کاغذات میں لگا رہتا تھا اور سوچا تھا کہ گرمیوں میں کسی معتبر شخص کو قندز بھیج کر انھیں منگواؤں گی لیکن سمرقند میں تو ایک بار پھر ہمارے سر پر آفت نازل ہو گئی خیر یہ اچھا ہی ہوا کہ میں انھیں قندز میں چھوڑ گئی تھی کیونکہ میرے دوسرے صندوق سازشی بیگوں کے ہاتھ لگ گئے تھے ذرا دیکھ لیجیے سارے کاغذات صحیح سلامت ہیں نا؟؟''

اور اس نے اپنے چہرے سے ریشمی نقاب کو ہٹا کر کاغذات کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''جی ہاں، سب موجود ہیں'' فضل الدین نے پیاسی نگاہیں جن سے احسان مندی جھلک رہی تھی، خان زادہ بیگم کے چہرے پر جمائیں اور بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا ''سمرقند میں آپ سے ملاقات کرنے کو بہت جی چاہ رہا تھا لیکن آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی ہمت نہیں کر سکا تھا''

میں خود ہی آپ کو بلوانا چاہتی تھی لیکن آپ کے کاغذات قندز میں رہ گئے تھے اس لیے فیصلہ نہ کر سکی....

فضل الدین کا جی خان زادہ بیگم کی اس تصویر کا ذکر چھیڑنے کو چاہا جو اس نے اندجان میں بنائی تھی (اور خدا! کیا کیا جھیلنا پڑا تھا اس تصویر کے باعث اس کے مصور کو)۔ کاغذات میں وہ تصویر نہیں تھی۔

اس نے سب کاغذات کو دوبارہ ایک ایک کر کے دیکھا۔

خان زادہ بیگم سمجھ گئی کہ وہ کیا ڈھونڈ رہا ہے اس نے شرماتے ہوئے پوچھا

''اور مصوری کا کیا حال ہے؟ اب بھی تصویریں بناتے ہیں؟''

''بیگم صاحبہ، برسوں تک تصویریں نہ بنائی جائیں تو ہاتھوں میں صفائی کیا خاک رہے گی۔ اب تو بس عمارت سازی ہی سے دلچسپی رہ گئی ہے، نقشے بنایا کرتا ہوں۔''

"آپ نے اندجان میں جو کچھ بتایا تھا میرا مطلب عمارتوں سے نہیں ہے ... اس میں نے الگ رکھ چھوڑا ہے" خان زادہ بیگم نے کہا اور مسکرا کر نظریں پھیر لیں۔

فضل الدین سمجھ گیا کہ وہ اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لایا تھا اس لیے خان زادہ بیگم نے اپنی تصویر کو اجاگر کرنا مناسب نہیں تصور کیا۔ ویسے بھی عہد شباب کی محبت کی یادوں کو تازہ کرنے میں اب رکھا ہی کیا تھا؟ صرف پرانے زخم ہی ہرے ہو جاتے اور وہ بھی بے سود!

"آپ نے بجا فرمایا، بیگم صاحبہ وہ تصویر ہمیشہ آپ ہی کے پاس رہنی چاہیے۔" اور فضل الدین نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر جھکا لیا۔

پھر اس نے سوچا کہ تعمیرات کے منصوبوں، عمارتوں کے تخمینوں اور نقشوں کی گفتگو ہی بہتر رہے گی۔

"میں اب اس کام کو آگے بڑھانا چاہتا ہوں" اس نے کاغذات کو دھیرے سے چھوتے ہوئے کہا۔ "ہرات میں اس فن کے بارے میں جو کچھ سیکھ چکا ہوں اسے ملحوظ رکھتے ہوئے ان منصوبوں کو بڑی خوبی کے ساتھ عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔ پر یہ بتایئے، بیگم صاحبہ کہ مدرسے اور محل کہاں تعمیر کیے جا سکتے ہیں؟ اندجان تو دور ہے۔ تو پھر کیا کابل میں؟"

خان زادہ بیگم نے چند لمحات کی خاموشی کے بعد نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں، کابل میں بھی یہ ممکن نہ ہو سکے گا۔"

"لیکن میں تو ان نقشوں کی مدد سے یہ مدرسہ تعمیر کرنے کا خواب دیکھ رہا ہوں جو سمرقند کے بی بی خانم مدرسے کی ٹکر کا ہو۔ میری دلی خواہش ہے کہ اس مدرسے کا نام آپ کے نام پر رکھا جائے 'خان زادہ بیگم مدرسہ'۔"

"اس تجویز کے سلسلے میں زندگی بھر آپ کی شکرگزار رہوں گی لیکن صد افسوس کہ الغ بیگ کی بات سچ نکلی۔ یاد ہے نا، انہوں نے کہا تھا کہ عظیم الشان عمارتیں تعمیر کرانے کے لیے عظیم الشان سلطنت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ مرزا بابر اپنے اس خواب کو حقیقت بنانے کے لیے برسوں سے جدوجہد کر رہے ہیں لیکن کابل کی سلطنت زیادہ بڑی نہیں ہے، وسیع پیمانے پر عمارتوں کی تعمیر اس سلطنت کے بس کی بات نہیں۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اپنے خوابوں کو پورا کرنا ہماری قسمت ہی میں نہیں لکھا ہے۔"

خان زادہ بیگم جانتی تھی کہ بابر کچھ برسوں سے خراسان، بدخشاں اور خاص طور سے شمالی ہندوستان کو ملا کر ایک عظیم الشان سلطنت قائم کرنے کا خفیہ طور پر منصوبہ تیار کر رہا ہے۔ دہلی سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ مقامی راجا ایک دوسرے سے عداوت رکھتے تھے۔ ہندو مسلمان حکمران طبقوں کو قبول نہیں کر رہے تھے اور مسلمان حکمران طبقوں نے ہندو مذہب کو نہ تسلیم کر کے ہندوؤں کو اپنا مخالف بنا لیا تھا۔ بابر ان دنوں حریف کی فوجی طاقت کا اندازہ لگانے کی مہم پر دریائے سندھ کے کنارے واقع علاقوں کو گیا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ جاسوس بھی لودھی حکومت کے بارے میں اسے معلومات فراہم کرتے رہتے تھے۔

"میں تو اب کسی چیز کا خواب دیکھتے ہوئے بھی ڈرتی ہوں" خان زادہ بیگم نے اعتراف کیا۔ "میں جانتی ہوں کہ عظیم الشان عمارات کی تعمیر کی بھی کتنی بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ اب میرے لیے اپنے اس دیرینہ خواب کو ٹھکرا دینا آسان ہو گیا ہے کیونکہ میں اپنے بھائی اور عزیز وں اس سلطنت کے مستقبل کو ایک بار پھر خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتی۔"

فضل الدین نے گہری ٹھنڈی سانس لی اور سب کچھ سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا:

"آپ نے بالکل درست فرمایا، بیگم صاحبہ، خود مقدر ہی ہمارے خوابوں کی مخالفت کر رہا ہے۔ میں بوڑھا ہو چکا ہوں" اور اس کی آواز میں واقعی بوڑھوں کی "آواز جیسی خرخراہٹ پیدا ہو گئی" "اور مقدر تمام عمر مجھ سے منہ پھیرتا رہا ہے۔ جنگ و جدل، حکومتوں میں روز روز کا تغیر و تبدل، ہنگامے، تباہیاں اور بربادیاں ... کیا یہ سب واقعی ہمیشہ یوں ہی جاری رہے گا؟ ایک مجھ ہی کو نہیں، جانے کتنے ہی صاحبان علم، شعرا اور ماہرین عمارت سازی کو، مجھ سے کہیں زیادہ تعلیم یافتہ اور باصلاحیت افراد کو ماوراء النہر اور خراسان سے جلاوطن کر دیا گیا ہے۔ اس سب کو قربا کش جنگوں اور مذہبی جھگڑوں کی آندھیاں خانہ بدوشوں کی طرح آخر کس دیار کو اڑائے لیے جا رہی ہیں؟ اگلے وقتوں میں ایسا ہوتا تھا کہ مصائب کی کالی آندھی کسی کو مدجان چھوڑنے پر مجبور کرتی تھی تو اسے سمرقند میں پناہ مل جاتی تھی۔ کوئی شخص سمرقند چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا تھا تو ہرات جا کر اپنی جان بچا لیتا تھا۔ پر اب تو ان کالی آندھیوں نے ہر جگہ دہشت پھیلا رکھی ہے۔ جان نہ سمرقند میں بچ سکتی ہے نہ ہی ہرات میں۔ ہم سب کے سب جلاوطن ہیں جیسے کوئی دریا اپنے راستے سے بچھڑ کے ادھر ادھر بھٹکنے لگے ... خدا کیسے کیسے باصلاحیت، کیسی کیسی جاں فزا لہریں، ریگزار حیات میں گم ہوتی جا رہی ہیں، ضائع ہوتی جا رہی ہیں! کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں دریائے جیحون* بھی اسی طرح ریگزاروں میں بھٹکنے اور دم توڑنے لگا تھا لیکن بابا خراس نے سمندر تک پہنچنے کا ایک نیا راستہ بنایا۔ تو کیا ہم لوگ بھی ایسا ہی کوئی نیا راستہ تلاش کریں گے؟ ... رحم کر پروردگار، ہمارے بچوں پر۔ نئی نسلوں کو نیا راستہ تلاش کرنے اور سمندر تک پہنچنے میں کامیاب کر، پروردگار!"

خان زادہ بیگم کو میر عمارت سے دلی ہمدردی کا احساس ہوا۔ اس نے جو کچھ کہا تھا وہ ایسے شخص کے دل کی فریاد تھی جسے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے کام لینے کا زندگی میں کبھی بھی موقع نہیں نصیب ہوا تھا۔

"فضل الدین صاحب، صرف آپ ہی نہیں مرزا بابر بھی اسی نئے سمندر کے متلاشی ہیں تاکہ صلاحیتوں کے سارے دریا آکر اس بحر علوم و فنون میں مل جایا کریں۔"

"میں جانتا ہوں بیگم صاحبہ کہ قسمت نے مرزا بابر پر کیا کیا ستم ڈھائے ہیں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ میرا آخری سہارا وہی ہیں۔ اسی لیے تو یہاں حاضر ہوا ہوں۔"

"لیکن آپ ٹھہرے کہاں ہیں؟"

"کوئی مستقل انتظام تو ابھی تک نہیں ہو سکا، عارضی طور پر اپنے بھانجے طاہر بیگ کے ہاں ٹھہر گیا ہوں۔ ویسے خود طاہر ان دنوں مرزا بابر کے ساتھ مہم پر گیا ہوا ہے۔"

خان زادہ بیگم سمجھ گئی کہ میر عمارت اور اس کے خاندان کا کوئی کفیل نہیں۔ اسی وجہ سے وہ اتنا مفلوک الحال، اتنا نحیف و لاغر نظر آ رہا ہے جیسے فاقے کرتا رہا ہو... اس نے سوچا خدانخواستہ کہیں واقعی ایسا ہی تو نہیں؟

وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور فضل الدین کو چند لمحات کے لیے تنہا چھوڑ کر جانے پر اظہار معذرت کر کے دیوان خانے سے ملحق کمرے میں چلی گئی۔ وہاں اس نے کنجی لی اور دیوار میں بنی ہوئی خفیہ الماری کو جس پر ریشمی پردہ پڑا ہوا تھا، کھولا۔

بابر نے اپنی بہن کے مصارف کے سلسلے میں سلطنت کے اعلیٰ ترین عہدے داروں کے مشاہرے کی جیسی کثیر رقم

---

* جیحون ۔ موجودہ دریائے آمو

بادشاہ آ رہے ہیں۔"

آٹھ سالہ ہندال نے سر پر چھوٹی سی ریشمی دستار باندھی تھی اور خوبصورت پیٹی سے ننھی سی تلوار لٹک رہی تھی۔ وہ بڑی عجلت سے گر کے اونچے برآمدے پر پہنچا اور بڑوں کی طرح انتہائی ادب سے سینے پر ہاتھ رکھ کر کورنش بجا لایا۔ بابر اس سے مسکراتا ہوا شہزادے کے پاس گیا، اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اس جگہ تک لے گیا جہاں وہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور مخملوری کے گدے پر اپنے قریب ہی بٹھا لیا۔

"ارے شہزادے، تلوار کمر سے باندھ رکھی ہے تو کسی مہم پر جانے کا ارادہ ہے کیا؟"

لڑکے نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے ماں پر سوالیہ نگاہیں ڈالیں اور ماہم بیگم نے اثبات میں سر ہلا کر اسے گفتگو میں حصہ لینے کی جرات دے دی۔

"شاہ عالی، مہربانی کر کے مجھے اپنے ساتھ میدان جنگ میں لے چلیے۔"

"کہاں؟"

"ہندوستان۔" اور لڑکے کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"ہندوستان میں ہم لوگ کیا کریں گے؟"

"میں شیروں کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"بہت خوب!" بابر ہنس پڑا۔ "آپ دیکھنا چاہتے ہیں؟ صرف دیکھنا ہی چاہتے ہیں؟"

لڑکے کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے اپنی "اصلی" تلوار کا دستہ مضبوطی سے تھام لیا۔

"جی نہیں، اگر شیر نے مجھے ہڑپ کرنا چاہا تو اس تلوار سے اس کے دو ٹکڑے کر دوں گا۔"

"شاباش! تب تو یقیناً ہمیں ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے جانا ہوگا . . ."

اتنے میں خادم شراب کی صراحی لیے ہوئے دروازے میں کھڑا ہوا۔ ماہم نے اسے چپکے سے اشارہ کیا گویا کہہ رہی ہو حضور ان باتوں میں لگ کر شراب کو بھول چکے ہیں، واپس جاؤ۔ اور خادم دبے پاؤں لوٹ گیا۔

بابر نے ہندال سے دریافت کیا کہ اس نے حروف تہجی سیکھ لیے کہ نہیں نیز یہ کہ اسے کوئی غزل بھی یاد ہے۔

"میں نے قرآن شریف کی کچھ سورتیں یاد کر لی ہیں" لڑکے نے فخریہ بتایا۔

"ہندال کی دلچسپیاں ہمایوں کی دلچسپیوں سے مختلف ہیں" ماہم نے وضاحت کی۔ "انھیں جنگ کے کھیل اور تیر اندازی پسند ہیں لیکن کتابوں سے رغبت ابھی ذرا کم ہے۔"

"ابھی بہت کم سن ہیں، یہی سبب ہے نا؟"

"کچھ عرض نہیں کر سکتی۔ ویسے گل بدن تو ہندال سے بھی چھوٹی ہیں لیکن آپ خود ہی دیکھ لیجیے انھیں پڑھنے کا شوق ہمایوں سے بھی زیادہ ہے۔"

"تو کیا ہندال واقعی اپنے ماموؤں پر پڑے ہیں؟" بابر نے کہا اور خیالوں میں ڈوب گیا۔

ماہم بیگم پر بابر کی اس بات کا مفہوم فوراً ہی واضح ہو گیا۔ دراصل ہندال کی سگی ماں وہ نہیں بلکہ چھوٹی ملکہ، بابر کے چچا سلطان محمود کی دختر دلدار بیگم تھی۔ بابر کے تین بیگمات تھیں جو کابل میں الگ الگ محلوں میں رہتی تھیں۔ ماہم بیگم نے اس حقیقت کو بلا چون و چرا تسلیم کر لیا تھا لیکن دل سے نہیں۔ اسے دلی صدمہ بابر کی دوسری شادی سے پہنچا تھا جو کابل کی ایک

وہیں کچھ تیر اندازی جیسے کھیل [illegible] بھی خیال رکھتے [illegible]

ہندال کے جانے کے بعد بولی ماہم بیگم خاص [illegible] عورت ایک پاکی [illegible]
تالی۔ عورت کورنش بجالائی جس کا ماہم نے سر کی جنبش سے جواب دیا۔ یہ عورت رابعہ تھی [illegible]
کے انتقال کے بعد ماہم بیگم کی [illegible] میں شامل ہو گئی تھی اور گل بدن کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ گل بدن کی پرورش بھی ماہم
بیگم کی نگرانی ہی میں ہو رہی تھی۔ بابر کا اکلوتا بیٹا [illegible]
کی ہمالئین کا راستے دار تھا۔

گڑیا کی طرح سجی ہوئی گل بدن ناک نقشے کے اعتبار سے اپنی والدہ دلدار بیگم کی [illegible] معصوم ہو رہی تھی۔
دلدار بیگم کے ماہم بیگم کے سپرد کیے جانے پر ذرا بھی معترض نہیں ہوئی تھی۔ اسے تو خوشی ہی ہوئی تھی وہ دیکھ چکی تھی کہ
ماہم بیگم ہندال کا کتنا زیادہ خیال رکھتی ہے۔ ویسے ماہم بیگم کی ذہانت، شرافت اور [illegible] کا بھی اسے یقین ہو چکا تھا۔ اس میں
اور مہ طرح اور صندلی گل رخ بیگم میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ بابر کی یہ منجھلی بیگم صرف ماہم بیگم ہی سے نہیں بلکہ دلدار بیگم
سے بھی خار کھاتی تھی۔ یہی سبب تھا کہ یہ دونوں گل رخ کے خلاف متحد ہو گئی تھیں۔ [illegible] دونوں کے بیچ [illegible] اب
"مشترک" ہو گئے تھے اور یہ ایسی صورت حال تھی جو ان کے "اتحاد" کو کچھ اور بھی [illegible] مستحکم کرتی جا رہی تھی۔ اس کے
علاوہ خود بابر بھی اب گل رخ بیگم سے بے رخی اختیار کرتا جا رہا تھا۔

معصوم اور دلکش گل بدن جس کے ماحول میں انسانی تعلقات واقعی بے حد الجھے ہوئے تھے، اپنے والد کو مختلف اور
بھونڈے انداز سے کورنش بجالائی۔ بابر نے اسے بڑی محبت کے ساتھ اٹھا کر اپنے گھٹنوں پر بٹھا لیا۔ اتنے میں ان لوگوں
کے سامنے دستر خوان بچھا کر اس پر تیتر کے گوشت کے سیخ کباب، طرح طرح کے حلوے، صندلی طشتریوں میں کھجور کے
گچھے، انار اور باغ وفا (بابر نے آدینہ پور میں واقع اس باغ کا نقشہ خود ہی تیار کیا تھا) میں پیدا ہونے والی نارنگیاں اور
لیمو رکھ دیے گئے۔ بابر نے نارنگیوں اور بادام کے حلوے کی طرف اشارہ کیا جیسے گل بدن سے کہہ رہا ہو "چکھئے، بہت
ذائقے دار ہیں" لیکن لڑکی نے مسکراتے ہوئے انکار کر دیا۔ وہ بابر کی عبا کے سونے کے بٹنوں سے کھیل رہی تھی۔

ہر بٹن کے اوپر کسی جاندار کی شبیہ کندہ تھی۔ ایک بٹن پر یاقوت کی دمکتی ہوئی سرخ آنکھوں والا ننھا سا شیر بنا ہوا تھا
اور دوسرے پر کوئی عجیب و غریب طائر جس کی چونچ میں سفید موتی دبا ہوا تھا۔

"آپ کو یہ بٹن پسند ہیں کیا؟"

لڑکی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

بابر نے اپنی طاقتور انگلیوں سے دو پروا بٹن کو عبا سے توڑ دینے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا کیونکہ بٹن بہت مضبوطی
سے ٹنکا ہوا تھا۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں، محترم حکمران؟" ماہم بیگم نے اس کے ارادے کو بھانپ کر حیرت کے ساتھ مخالفت کی۔
"اسے توڑنے کی زحمت نہ کیجئے۔ شاہی عبا بیکار ہو جائے گی۔"

"کوئی قیامت تھوڑی آ جائے گی۔ مرصع [illegible] سے دوسرا سجوا کر ٹانک دیا جائے گا۔"

بابر نے پیٹی میں لٹکتے ہوئے چاقو سے جسے وہ قلم بنانے میں استعمال کیا کرتا تھا، دھاگے کاٹ کر اس بٹن کو نکال لیا
جس پر چڑیا بنی ہوئی تھی۔

س نے یہ کہتے ہوئے گل بدن کو دیتے ہوئے کہا

''کہیں اسے کھو نہ دیجیے گا۔ اس پر خوش بختی کے پرندے ہما کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ خدا آپ کو خوش نصیب بنائے، دختر عزیز۔''

لڑکی نے بھولے پن سے بر وقت کہا

''شکریہ، اعلیٰ حضرت بادشاہ سلامت۔''

''صرف ابا جان کہیے نا۔''

گل بدن نے اجازت مانگنے کے انداز میں مڑ کر ماہم بیگم کی طرف دیکھا۔

''ہاں ہاں، ضرور'' اس کی منہ بولی ماں نے ہمت بڑھائی۔

تب گل بدن نے اپنے والد کی گردن میں ہاتھ ڈال کر کہا

''شکریہ، ابا جان'' اور اس نے بابر کو پیار کر لیا۔

بابر اور ماہم بیگم نے بیٹی کی اس محبت سے متاثر ہو کر نگاہیں چار کیں۔

''اچھا گل بدن، اب اپنے ابا جان کو کوئی حکایت تو سنائیے۔''

گل بدن، اپنے والد کی گود سے نکل کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی اور اپنے استاد کی جیسی رعب دار آواز میں اس گڈریے کی سبق آموز کہانی سنانے لگی جو جھوٹ موٹ ''بھیڑیا آیا! بھیڑیا آیا!'' کی چیخ پکار سے لوگوں کو پریشان کیا کرتا تھا۔ لوگ دوڑے دوڑے اس کی مدد کے لیے پہنچتے تھے تو وہ ان کا مذاق اڑانے لگتا تھا۔ پھر ایک بار ایسا ہوا کہ بھیڑیوں کا ایک غول سچ مچ اس کے گلے پر ٹوٹ پڑا۔ گڈریے نے لوگوں کو مدد کے لیے پکارا لیکن اس بار کسی کو بھی یقین نہ آیا اور ''بھیڑیے اس کی ساری بھیڑوں کو چٹ کر گئے'' لڑکی نے پرجوش انداز سے حکایت ختم کی۔

''واہ واہ، کتنے مربوط اور پرجوش انداز سے سناتی ہیں!'' بابر نے گل بدن پر نظریں جما کر تعریف کی۔

''ماشاءاللہ بڑی ذہین ہیں، جو کچھ سنایا جاتا ہے اسے یاد کر لیتی ہیں اور لفظ بہ لفظ سنا دیتی ہیں۔ انھیں حکایت شاعری سے زیادہ پسند ہیں۔ خود بھی جو کچھ دیکھتی ہیں اسے بڑے دلکش اور مربوط انداز سے بیان کرتی ہیں۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ ہمارے ہاں شاعرات تو ہیں، کئی خواتین تو موجود ہیں جو اشعار تخلیق کر رہی ہیں لیکن آپ کی تزک کی طرح آپ بیتی سرگزشت لکھنے والی خواتین نہیں ہیں۔ اس میدان میں شاید گل بدن آپ کے نقش قدم پر چلیں، شاید پہل کریں؟''

''اوہ کیا کیا جھیلنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر...'' بابر کی نگاہیں اچانک گل بدن پر پڑیں جو اپنے والدین کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ کتنے یقین کی، بچوں جیسی کتنی دلچسپی کی آئینہ دار تھیں اس کی بہت کچھ کہتی ہوئی آنکھیں۔ کان کیسے کھڑے کر لیے تھے! بابر نے فوراً ہی اپنی بات کا رخ بدل دیا ''بیگم صاحبہ، آپ کو گل بدن کی اس صلاحیت کا اندازہ ہو گیا ہے تو آپ کو چاہیے کہ اس صلاحیت کے فروغ پر متوجہ ہوں۔ جب تک یہ بڑی ہوں گی اس وقت تک شاید میں تزک کا پہلا حصہ مکمل کر لوں گا اور اس کے کچھ مناسب اجزا کی نقل ان کے لیے تیار کر لی جائے گی۔''

''میں خود بھی آپ سے یہی عرض کرنا چاہتی تھی'' ماہم اچانک جوش میں آ گئی۔ ''میری دیرینہ آرزو ہے کہ شہزادے

ہی نہیں بلکہ شہزادی ماں بھی اپنے نام* روشن کریں۔"

اور ماہم کے پیار کا، اس کی نیکی اور شرافت کا کہاں ہی پیار کی سند تھی تو ہوتے۔ تخیل میں وہ ایسی ہوتی جو بچے کو پیار کرتی ہے بلند ہوتی ہے جو سے پروان چڑھاتی اور انسان بناتی ہے۔ ان خیالوں کے ساتھ ہی ساتھ بابر کے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ جب انسان کی عمر پچیس سے تجاوز کر جاتی ہے جیسا کہ خود ان کی ہو چکی ہے تو ان کی زندگی میں اس کے بچے بھی زیادہ اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔ بچے باپ سے انگاورتے ہیں تو باپ اس سے بڑی مسرت کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ اور خود اس کی زندگی میں یہ مسرت بھی ماہم ہی کی دین ہے۔ اس سے ماہم ہی کی بے کراں محبت کا ثبوت ہے۔ ماہم اس سے اس حقیقت کے باوجود شدید محبت کرتی ہے کہ وہ قصوروار ہے۔ گل رخ اور دلداری کی وجہ سے ماہم کے سامنے قصوروار ہے۔

بابر تیزی سے اٹھ کر ماہم بیگم کے پاس گیا۔ اسے بڑی گرمجوشی کے ساتھ بھینچ لیا اور ویسی ہی گرمجوشی سے اس کی آنکھوں کے بوسے لے لیے۔

"ماہم بیگم، میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ مجھے آپ میسر ہیں! بادشاہ ہوں تو کیا ہوا، آپ کے لیے تو محض خادم ہوں! حکم دیجیے، آپ کی ہر خواہش کی تکمیل کے لیے حاضر ہوں!"

ماہم نے شرماتے ہوئے چپکے سے کہا

"گل بدن! گل بدن دیکھ رہی ہیں! ..."

"ارے ہاں، گل بدن!" اور بابر نے زور سے تالی بجا کر خادم کو آواز دی "ننھی شہزادی کے لیے وہ ہندوستانی طوطے لے آؤ!"

خوبصورت پنجرے میں بند رنگ برنگے چمکتے ہوئے پروں والے طوطے فوراً ہی گل بدن کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ یہ طوطے بولتے بھی تھے۔ ایک نے جلدی سے کرخت آواز میں کہا، "السلام علیکم، بیگم!" گل بدن نے خوش ہو کر جواب دیا

"وعلیکم السلام!"

شاد ملک، خادم اور رابعہ سب ہی ہنس پڑے اور گل بدن نے ایک بار پھر اپنے والد کا رخسار چوم لیا۔

بابر اور ماہم بیگم اکیلے رہ گئے اور جب برآمدے کی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے افراد کے قدموں کی آوازیں بند ہو گئیں تو وہ دونوں اٹھ کر اندرونی کمروں کی طرف چلے گئے۔

ایک دیوان خانے میں جو سب سے بڑا اور نسبتاً کہیں زیادہ آراستہ تھا، شہ نشیں پر ایرانی قالین اور قالینوں پر زردی کے گدے بچھے ہوئے تھے بابر نے جو ماہم بیگم کی کمر میں ہاتھ ڈالے ہوئے دھیرے دھیرے چل رہا تھا، ہنچی اور جذبات سے معمور آواز میں کہا

"ماہم جان، آپ کی کمر تو آج بھی اتنی ہی پتلی ہے جتنی کہ شادی کے فوراً ہی بعد تھی۔"

"اس کا سبب صرف یہ ہے کہ آپ بھی میری نظروں میں پچیس سال کے نوجوان ہی ہیں۔"

---

* ماہم بیگم کا یہ خواب سچ ثابت ہوا اور گل بدن بیگم نے سن شعور کو پہنچنے کے بعد اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے نثر میں تذکرہ لکھا۔ یہ گل بدن کے بڑے بھائی ہمایوں کی سوانح عمری تھی "ہمایوں نامہ"۔ یہ تذکرہ نویسی کی صف میں اس زمانے کی کسی مسلمان خاتون کی قلم بند کی ہوئی واحد تصنیف ہے۔

سکتے ہیں۔ مجھے ہر وقت طرح طرح کے اندیشے گھیرے رہتے ہیں۔ میری پریشانی کو محسوس کیجیے نا۔"

"آپ کے یہ اندیشے بے بنیاد ہیں، بیگم۔ میں تو آپ سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ مرزا ہمایوں کے پاس تیس ہزار منتخب سپاہیوں کا لشکر موجود ہے۔ جہاں تک شیبانی کے بیٹوں کا تعلق ہے تو وہ ان دنوں خود ہی باہمی جھگڑوں میں الجھے ہوئے ہیں اور ان سے ہمارے تعلقات بھی پرامن ہیں۔ لیکن آپ کو شوہر کی یاد آتی ہے، یا وہ ستا رہی ہے تو آپ تین چار ہفتوں میں ان سے ملاقات کر لیجیے گا۔"

"کہاں؟" ماہم چونک، جوش میں آ گئی۔ "کابل میں؟"

"نہیں، آدینہ پور میں۔"

آدینہ پور۔ ماہم بیگم نے سوچا کہ یہ جگہ تو سلطنت کے جنوبی علاقے میں ہندوستان کے قریب واقع ہے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ بابر اپنے سارے لشکر کو وہاں لے جانا چاہتا ہے اور صاف ظاہر تھا کہ ہمایوں کے لیے کابل ہو کر جانے کے بجائے اپنی فوج کے ساتھ براہ راست آدینہ پور پہنچنا کہیں زیادہ آسان ہوتا۔

"تو آپ مرزا ہمایوں کو بھی ہندوستان لے جائیں گے؟"

بابر نے جواب میں اس مہم کو آخر وقت تک راز میں رکھنا چاہتا تھا، غیر شعوری طور پر ادھر ادھر نظریں دوڑائیں اور کان لگا کر آوازوں کو سننے لگا... کہیں آس پاس کوئی اور موجود نہ تھا... لیکن بابر کی تمام احتیاط کے باوجود اس انتھک حکمران کے نئے منصوبوں کا، مجوزہ لشکر کشی کا جانے کتنے ہی لوگوں کو علم ہو چکا تھا... اس کے ماوراء النہر کو دوبارہ فتح کرنے کے خواب چکنا چور ہو چکے تھے اور اب وہ اپنے مستقبل کو جنوبی علاقوں میں سنوارنے کا کوشاں تھا۔ وہ گزشتہ دس برسوں سے اپنے جاسوس یکے بعد دیگرے ہندوستان کی مختلف سلطنتوں میں بھیجتا رہا تھا جنھوں نے وہاں اس کے خیر خواہوں سے روابط قائم کر لیے تھے۔ ان خیر خواہوں کی تعداد خاصی بڑی تھی کیونکہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں اور ہندو راجاؤں کے ایلچی چھ بار کابل آ چکے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر دہلی کے سلطان ابراہیم سے تنگ آ چکے تھے۔ ابراہیم کے متعلق کہا جاتا تھا کہ اس نے عوام کو مفلوک الحال بنا دیا ہے، ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہیں، ہندوستان کی دولت اس کے خزانے میں بھری ہے جہاں وہ بیکار پڑی ہے اور اسے ملک کے حالات کو بہتر بنانے کی خاک بھی فکر نہیں ہے۔ مہیب خانہ جنگیوں نے عظیم ملک کو تباہ و برباد کر دیا تھا اور اب یک ایسی طاقت کی، ایک ایسے نام کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جس کے گرد سارا ملک متحد ہو سکے۔ "یہ نام آپ کا ہے، ظہیر الدین بابر" ہندوستان سے آنے والے ایلچی کہتے تھے۔

"ماہم بیگم! یقین کیجیے کہ میں وہاں مال غنیمت کی ہوس میں نہیں جا رہا ہوں۔ میں تو وہاں ایک طاقتور سلطنت قائم کرنا چاہتا ہوں۔ یہ خواب میں زندگی بھر دیکھتا رہا ہوں اور آپ کو اس کا علم ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ علوم و فنون کو جو ماوراء النہر اور خراسان میں زوال کا شکار ہو گئے ہیں، میری ہندوستان کی سلطنت میں حیات نو نصیب ہو۔ پنجاب کے حکمران دولت خان نے اپنے بیٹے دلاور خان کو بھیجا تھا۔ ہندو راجا رانا سنگرام سنگھ کا ایلچی بھی میرے پاس آیا تھا۔ ہمارے درمیان ابراہیم لودھی کے خلاف متحدہ طور پر لشکر کشی کا معاہدہ ہو چکا ہے۔"

بابر اب خاوند و دلبر کی حیثیت سے نہیں بلکہ مدبر اور حکمران کی حیثیت سے گفتگو کر رہا تھا اور ماہم بیگم نے بھی غیر شعوری طور پر شاہی آداب کو ملحوظ رکھا

"اعلیٰ حضرت، علوم و فنون اور جنگ کے درمیان تو گہری خلیج حائل ہوتی ہے۔"

ہم اس خلیج کو پار کر لیں گے۔''

''لیکن کتنی بیوؤں اور بیٹیوں کے آنسو بہہ جائیں گے اس خلیج میں؟'' جب ماتھم بیگم کی آواز اتنی پست ہو گئی (''شیبانی کی بہنوں کی طرح'' الفاظ اس کے منہ سے نکلتے نکلتے رہ گئے) اس ملک کی بیویاں اور بیٹیاں کیا آپ کو اپنے بیٹوں اور شوہروں کے ہلاک کیے جانے کے سلسلے میں معاف کر سکیں گی؟''

''کہاں، وہاں کی بیویوں کے ہزاروں بیٹے اور شوہر ان کی اپنی اقربا کشی کی جنگوں میں ہلاک نہیں کیے جا رہے ہیں؟ ابراہیم لودھی ہر سال پنجاب کے حکمران سے لڑتا ہے اور پنجاب کا حکمران خود اپنے رشتے دار عالم خان کو تباہ کرتا رہتا ہے۔ سلطان علاؤ الدین اپنے پڑوسی راجاؤں سے نفرت کرتا ہے، وہ سلطان علاؤ الدین سے۔ ان کے علاوہ خود یہ راجا بھی ایک دوسرے کی عداوت پر کمر بستہ رہتے ہیں۔ ہندوستان کے حالات تو اس وقت ماوراء النہر کے حالات سے بھی بدتر ہو رہے ہیں۔'' بابر نے یہ دیکھ کر کہ ماہم بیگم اس دلیل سے بھی متاثر نہیں ہوئی، ایک دوسری بات چھیڑ دی ''وہاں سے بہت سے لوگ بھاگ بھاگ کے پناہ لینے کے لیے ہمارے پاس آ رہے ہیں، ہمارے پاس، سمجھیں؟ آپ جانتی ہیں کہ ہمارے امرا و روسا میں دہلی سے بھاگ کر آئے ہوئے ہندو بیگ بھی شامل ہیں جو گزشتہ پانچ برسوں سے ہمارے ہاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ نہیں؟ تو ہندو بیگ ہی کی بات سنیئے نا بیگم۔ وہ برابر کہتے رہتے ہیں کہ ہندوستان کے عوام نفاق اور اقربا کشی کی تباہیوں سے نجات پانے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔ وہ دہلی کے تخت پر ابراہیم لودھی کے بجائے کسی ایسے تعلیم یافتہ بادشاہ کو دیکھنا چاہتے ہیں جو ملک کو متحد کر سکے، اس کی شان کو دوبالا کر سکے، علوم و فنون کو حیات نو عطا کر سکے۔''

''یہ بادشاہ اگر اسی ملک کا ہوتا تو اس کی تلوار کا زخم جلدی بھر جاتا، عوام اس سارے خون خرابے کو جس سے میرے خیال میں بچنا ممکن نہ ہوگا، نسبتاً جلدی ہی فراموش کر دیتے۔ لیکن کسی غیر ملکی حملہ آور کی تلوار کے زخم، خواہ وہ حملہ آور کتنا ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو، صدیوں تک نہیں بھرتے۔ ان زخموں کے لیے اسے صدیوں تک معاف نہیں کیا جاتا۔ کیا یہ درست نہیں ہے، اعلیٰ جاہ؟''

ان لفظوں نے بابر کی دکھتی ہوئی رگ کو چھو دیا۔ اسی کشمکش میں تو وہ رات رات بھر جاگتا رہتا تھا، دل ہی دل میں موافق اور مخالف دلیلیں دیتا رہتا تھا کہ ہندوستان پر حملہ کرے یا نہ کرے۔

وہ تیزی کے ساتھ گدے پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''قسمت کی تلوار کے گھاؤ کبھی نہ بھرنے والے زخم خود ہم نے کچھ کم کھائے ہیں کیا؟'' اس نے جھلا کر کہا اور اچانک اسے دوبارہ شراب یاد آ گئی۔ ''میں نے تو بڑی دیر ہی میں شراب طلب کی تھی، ابھی تک کیوں نہیں لائی گئی؟''

اس نے خادم کو بلانے کے لیے بڑی برہمی کے ساتھ تالی بجائی لیکن جانے کیوں اس وقت آس پاس کوئی موجود نہ تھا۔ ماہم بیگم جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ اس نے پردہ ہٹا کر منقش طاق سے شراب کی طلائی صراحی، چینی کے چھوٹے چھوٹے دو پیالے اور ایک طشتری جس میں نارنگیاں رکھی ہوئی تھیں، نکال کے انھیں شہ نشین پر رکھ دیا۔ پھر اس نے بابر سے شہ نشین پر بیٹھنے کو کہا۔

پیالے میں سنہری شراب انڈیلتے ہوئے، ماہم نے مسکرا کر کہا:

''آج میں ساقی کی خدمات انجام دینے کی اجازت چاہتی ہوں۔ قبول فرمائیے، اعلیٰ حضرت! آپ کی زندگی پر

ملکہ کے بڑھائے ہوئے پیالے سے خوشبودار شراب چھلک رہی تھی۔ بابر نے بھانپ لیا کہ ماہم اس سے کچھ پر خلوص الفاظ کی توقع کر رہی ہے لیکن اس قسم کے الفاظ اس وقت اس کے دل سے نکل ہی نہیں رہے تھے۔ اس کے دل میں تو اس وقت جارحانہ خیالات کا ایک سیل طوفان امنڈ رہا تھا۔ کبھی اس کی نگاہوں کے سامنے ہزارہ قبیلے کے تیر سے گھومنے لگتے جو کابل آنے والے قافلوں کو لوٹ لیا کرتے تھے اور ان پر حملہ کر کے ہی ان کی اس لوٹ مار کا سلسلہ ختم کیا جا سکتا تھا۔ کبھی وہ اپنے ذہن میں ان کاموں کو شمار کرنے لگتا تھا جن کا انجام دیا جانا ضروری تھا تاکہ اس کے لشکریوں کی خاطر جاڑے بھر کے لیے کافی رسد اکٹھا کر لی جاتی۔ کبھی اس کے خیالات اسے پنجاب اور وہاں کی خانہ جنگی کی [illegible] کی طرف جو روز بروز سنگین تر ہوتی جا رہی تھی، کھینچے جاتے تھے اور اس کا جی چاہتا تھا کہ جلد سے جلد وہاں پہنچ کر نظم و ضبط کو بحال کر دے۔ اس کے بعد وہ خود اپنی ہی سلطنت کے بے شمار خانہ بدوش قبائل کے درمیان کابل کے مغربی علاقوں میں ہونے والی لڑائیوں کو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں، تصور کر کے کانپ اٹھتا تھا۔ آخر میں نئی اور بڑی بڑی توپوں کی گذشتہ روز کی آزمائش کا سماں اس کی نگاہوں میں پھر گیا جبکہ تخمینوں میں کوئی نقص رہ جانے کے باعث نالیں پھٹ گئی تھیں اور پانچ توپچی ہلاک ہو گئے تھے۔

آخر کار بابر نے خود کو برف کے اس مہیب طوفان سے بہ دقت نجات دلا کر ماہم بیگم سے اپنی بات چیت کی طرف توجہ مبذول کی اور دلراحت لہجے میں کہا

"طویل پر مسرت زندگی تو میرے لیے ایک ایسے خواب کی حیثیت رکھتی ہے جو کبھی بھی حقیقت نہ بن سکے گا، ماہم۔"

"نہیں نہیں! اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو، یہ خواب ضرور حقیقت بن جائے گا!"

"بن جائے گا... یقیناً حقیقت بن جائے گا۔"

بابر نے پیالہ خالی کر دیا، نارنگی چھیل کر ایک پھانک کھائی اور کہا

"تھوڑی سی اور عنایت کیجیے، بیگم۔"

دوسرے پیالے کے بعد سے محسوس ہوا کہ طوفان کہیں دور چلا گیا ہے اور اس کے دل کو کچھ سکون مل گیا۔

"آپ کو معلوم ہے، ماہم کہ میں امور سلطنت سے، ان سارے وزیروں، سپہ سالاروں اور منشیوں سے کتنا اوب چکا ہوں؟ کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ خود میرا وجود بھی دو حصوں میں منقسم ملک جیسا ہے جہاں بڑی بے رحمی کے ساتھ اقربا کش لڑائیاں جاری ہیں۔ اس کے ایک حصے میں بیگ، سفیر اور امرا و وزرا اکٹھا ہو گئے ہیں اور یہاں موت کی سزاؤں، چھاپوں اور جنگوں کا بول بالا ہے۔ حکمرانی آدمی سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ سرد مہر اور سنگ دل ہو جائے، دوسروں کے مصائب کی خاک بھی پروا نہ کرے... میں حکمرانی کا عادی ہو چکا ہوں۔ حکومت کرنے میں مجھے زیادہ سے زیادہ مزا آنے لگا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ سنگ دل ہو گیا ہوں اور شعر گوئی میرے بس کی بات نہیں رہی۔ شراب مجھے اپنی اس سرد مہری سے نجات دلاتی ہے۔"

"اور دوسرے حصے میں؟"

"دوسرا حصہ بھی ہے... یہ بات گویا کہ آج ہی مجھ پر واضح ہوئی ہو کہ میرے وجود کا دوسرا حصہ بھی ہے۔ اس میں

آپ ہیں، ماہم ہیں، ہندال اور گل بدن ہیں... آپ سب کی قربت میں مجھے زندگی پُر حرارت اور پاک و صاف لگتی ہے۔"

"تو پھر آپ اسی حصے میں رہیے نا جس میں ہم لوگ ہیں۔ ہمیں یہ سب کچھ تسلیم کر کے ہمارے ساتھ ہی رہیے۔ ہمارے لیے اس سے بڑھ کر پُر مسرت بات اور کیا ہو سکتی ہے۔"

"یعنی یہ کہ تخت و تاج کی ذمے داریوں کو ٹھکرا دوں، حکومت کسی دوسرے کو سونپ دوں؟"

"ٹھکرانے کی کیا ضرورت ہے؟" ماہم بیگم ان خیالوں سے متفق نہ ہوئی۔ "آپ نے یہاں کوئی معمولی سلطنت تھوڑی قائم کی ہے۔ کابل کے قرب و جوار کے علاقوں کو جو ایک دوسرے کی عداوت پر کمربستہ رہتے تھے آپ نے قندھار اور بدخشاں سے سندھ تک ملا کر ایک کر دیا ہے۔ کابل میں آپ نے کتنے ہی باغات لگوائے ہیں، کاروان سرائیں تعمیر کر لی ہیں۔ نئی نہریں کھدوا کر بنجر زمینوں کی آبپاشی کا انتظام کیا ہے... کیا اس سب کے باوجود کابل آپ کو عزیز نہیں ہے؟"

"ہاں، مجھے مقدر کا شکر گزار رہنا چاہیے کہ کابل میں ابھی تک شکست نہیں کھانی پڑی۔ کابل ہی میں تو مجھے آپ ملیں، ماہم بیگم اور یہیں ہمارے بچے پیدا ہوئے۔ میں نے یہاں جو کچھ حاصل کیا اس پر مطمئن ہونا چاہتا تھا... لیکن در اصل جو کچھ حاصل کیا وہ بہت کم ہے۔ میں اب بھی خود کو مجبور و بے بس پا رہا ہوں۔ چاروں طرف سرکش خانہ بدوش قبائل موجود ہیں۔ ہماری آمدنی کم ہے، تنگی سے گزر بسر ہو رہی ہے۔ اس پتھریلے ملک میں تعمیرات کا سلسلہ کس طرح شروع کراؤں، شہر سے کیسے آراستہ کروں؟... غزنی میں محمود غزنوی کے باندھ کا کچھ حصہ اب بھی برقرار ہے۔ اس کی مرمت کرا دی جائے تو وسیع و عریض وادی میں جو آج ریگستان ہے، کھیت لہلہانے لگیں۔ میں اس باندھ کی مرمت کرانا چاہتا تھا لیکن تخمینہ لگوانے پر پتا چلا کہ میرا حقیر خزانہ اس کے لیے ناکافی ہوگا، ماہم.... میں ہنرمندوں کی تنخواہیں کہاں سے ادا کروں گا؟ دینے کے لیے میرے پاس کچھ بھی تو نہیں۔ شاہ اسمٰعیل کمال الدین بہزاد کو اپنے ساتھ تبریز بلا لے گئے تھے۔ میں بھی مدعو کروں تو بہت سے صاحبانِ علم، اچھے سے اچھے معمار اور شاعر بخوشی یہاں آ جائیں۔ لیکن میں تو ابھی تک صرف ایک میر عمارت فضل الدین ہی کے لیے کوئی مناسب کام نہیں فراہم کر سکا حالانکہ وہ خود ہی کابل آ گئے ہیں۔ ہم غریب ہیں۔ ہم آج بھی دنیائے اسلام کے ایک کونے ہی میں پڑے ہوئے ہیں، سمجھیں، ماہم؟ میں اس سے زیادہ کا مستحق نہیں ہوں کیا؟ میرے لیے کوئی اس سے وسیع تر جگہ نہیں ہو سکتی کیا؟"

"میں جانتی ہوں کہ ہندوستان آپ کے لیے بہت سی باتوں کی بنا پر باعث کشش ہے۔ لیکن آپ ایک پرائے ملک میں تلوار لے کر جا رہے ہیں۔ آپ اس طرح نہیں جا رہے ہیں جیسے آپ کے ہم وطن، خوارزم کے البیرونی ہندوستان گئے تھے جن کی کتاب "ہندوستان" کا آپ مطالعہ بھی کر چکے ہیں۔ آپ اس طرح بھی نہیں جا رہے ہیں جس طرح آپ کے محبوب شاعر امیر خسرو دہلوی کے بزرگوں نے سمرقند اور شہر سبز کے درمیانی علاقے سے مجبوراً ترکِ سکونت کر کے ہندوستان کا رخ کیا تھا۔"

بابر کو اچانک محسوس ہوا کہ اس کے دل میں ایک درد بھرے [illegible] کا طوفان اٹھ رہا ہے۔

"تو کیا، ماہم، آپ مجھے ہندوستان پر لشکر کشی سے روکنا چاہتی ہیں؟"

ماہم بیگم یقیناً اس مہم کی مخالف تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کے لیے اپنی بات کو منوانا ممکن نہ ہوگا اس کے باوجود

اس نے بڑے عزم کے ساتھ اپنی دلیل جاری رکھی

"میر خسرو کے بہت سے اشعار آپ کو زبانی یاد ہیں۔ آپ نے ان کے اشعار کو اپنے رسالہ عروض میں مثالوں کے طور پر بھی استعمال کیا ہے۔ آپ خود بھی حقیقی اور عظیم شاعر ہیں۔ صاحب علم بھی ہیں۔ میری دلی آرزو ہے کہ آپ عوام کے ذہنوں میں نیک نشانیاں ہی چھوڑیں، بیرونی کی طرح امیر خسرو کی طرح!"

طوفان زور پکڑنے لگا۔

"اچھا! تو آپ یہ کہنے سے کترا رہی ہیں کہ میں بھی صرف بادشاہی ہوں" بابر نے مزاحیہ انداز سے کہا۔ "ماہم، بیچے عوام کسی بادشاہ کو ہمیشہ نیک اور اعلیٰ بادشاہی سے تو یاد کرتے ہیں۔ ماہم بیگم صاحبہ، یہ کہاں ہوتا ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں پہلے بے شمار تعریفیں بھی سن چکا ہوں اور بے شمار برائیاں بھی اور میں اس سب سے بلند ہو چکا ہوں۔ اب نہ تعریفوں کی پروا کرتا ہوں اور نہ ہی برائیوں کی۔"

ماہم کو یاد آ گیا کہ بابر اپنے ایک شعر میں بھی اسی خیال کا اظہار کر چکا ہے۔ وہ اس خیال سے متفق نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ خود بابر بھی ہمیشہ ایسا نہیں سوچتا ہے تاہم اس خیال میں بابر کی روح اور اس کی سچائی کا ایک جزو مضمر ہے اور وہ اس وقت اسی میں یقین رکھتا ہے۔ اور ماہم نے محسوس کیا کہ وہ بابر کے اس یقین کو اس وقت کسی بھی طرح بدل نہیں سکتی ہے۔ ابرار یا تحمل تک وہ اپنے آپ سے کہہ سکتی تھی "وہ میرے ہیں، صرف میرے ہیں!" لیکن اب نہیں۔ اب تو اس کے سامنے اس کا شوہر نہیں بلکہ پرعزم بادشاہ بیٹھا ہوا تھا۔

"شاہ عالی، تب آپ سے میری التجا ہے کہ مرزا ہمایوں کو کابل میں چھوڑتے جائیے۔ آپ کی مہم کے دوران آخر کسی نہ کسی کو تو یہاں فرماں روائی کرنی ہی ہوگی نا؟"

"فرماں روائی آپ کیجئے گا، ماہم بیگم!"

"میں؟ میں تو عورت ہوں۔ شرعاً شہزادوں کو بیگمات کی بہ نسبت زیادہ حقوق حاصل ہیں۔ مرزا ہمایوں آپ کے ساتھ چلے جائیں گے۔ مرزا کامران اور مرزا عسکری یہاں رہیں گے اور ظاہر ہے کہ قانوناً انہیں مجھ سے زیادہ حقوق حاصل ہوں گے۔"

بابر نے فوراً ہی ٹھنڈے دل سے فیصلہ کیا:

"مرزا کامران کو میں قندھار کا صوبے دار بنا دوں گا۔ وہ اپنے ساتھ مرزا عسکری کو بھی لے جائیں گے۔ یہاں امور سلطنت کی دیکھ بھال میں سن رسیدہ قاسم بیگ آپ کے معاون ہوں گے۔"

یہ تحمل اعتماد کا مظاہرہ تھا۔ یہ دور اندیشی بھی تھی کیونکہ ماہم بیگم اتنی بلندیوں پر پہنچ جانے کے بعد گل رخ بیگم کی سازشوں کی رسائی سے باہر ہو جاتی۔ وہ ایسے عظیم اعتماد کے بعد بابر سے مزید بحث بھلا کیسے کر سکتی تھی۔

"عالی جاہ نے تو اپنے بے پایاں اعتبار سے اس ناچیز کو آسمان پر چڑھا دیا۔ لیکن آپ جانتے ہی ہیں کہ مجھے فرماں روائی کی ہوس نہیں۔"

"عنان حکومت سونپی ہی اسی کو جانی چاہیے جسے فرماں روائی کی ہوس نہ ہو۔ کابل سلطنت کے قبائل سے تعلقات اور اندرونی معاملات سے قاسم بیگ نپٹیں گے۔ لیکن وہ صرف احکام کی تعمیل کریں گے اور احکام آپ صادر کریں گی۔ آپ مرزا ہندال کی سرپرست ہوں گی، ان کے نام سے احکام جاری کریں گی اور یہ شریعت کے مطابق ہی ہوگا۔"

ماہم بیگم سمجھ گئی وہ اس کا دل کچھ اور بھی مغموم ہو گیا۔ اس نے ہندوستان کو جیسے نیٹ پہ ملک تصور کیا جہاں سے کوئی واپس نہ ہوتا ہو۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"پروردگار، تیری یہ دنیا اتنی بے رحم کیوں ہے؟"

بابر خاموش رہا۔

نئے کنارے۔ لاہور، پانی پت، دہلی

۱

لشکر جیسے جیسے آگے بڑھتا جا رہا تھا ویسے ویسے درخت اور جنگل کچھ اور بھی زیادہ گھنے ہوتے جا رہے تھے۔ برگد کے دبیز اونچے اشجار کی پتلی شاخوں سے پھوٹنے والی جڑیں نیچے آ کر زمین میں سما گئی تھیں۔ کہیں کہیں موٹی موٹی جنگلی بیلوں نے درختوں کے تنوں سے لپٹ کر ان کے درمیان خاردار جھاڑیوں کی اونچی اونچی دیواریں سی کھڑی کر رکھی تھیں جنہیں پار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پیروں تلے کسی قسم کی رینگتی ہوئی سی گھاس اور جھاڑیوں نے زمین کو پوری طرح ڈھک رکھا تھا۔

فضا میں کچھ اتنی گھٹن اور نمی تھی کہ سانس لینے میں سخت دقت ہو رہی تھی، سر چکرائے جا رہے تھے۔

بابر صرف ہلکا ریشمی کرتا ہی پہنے ہوئے تھا کیونکہ زرہ اس کے لیے بھی بار ثابت ہو رہی تھی وہ اس کے گھوڑے کے لیے بھی۔ اس کے باوجود وہ پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ اس نے برگد کے بلند اشجار کی پھنگیوں پر نظر دوڑائی۔ ہوائیں پھنگیوں کو ہلا رہی تھیں لیکن نیچے گھنی گھنی جھاڑیوں کے اندر ان کا گزر نہیں ہو پا رہا تھا۔ بابر کا سر بری طرح چکرا رہا تھا ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی غیر مرئی طاقت اس کے گھوڑے کو کبھی ایک طرف، کبھی دوسری طرف لیے جا رہی ہے۔

کہیں شاخوں پر بندر رہ رہ کر چیخ رہے تھے۔ کبھی کبھی موروں کی ناخوشگوار اور کرخت آوازیں بھی فضاؤں میں گونج اٹھتی تھیں۔

اچانک ایک سپاہی جو دوستوں کو گھنی جھاڑیوں سے نکال کرلے جا رہا تھا، چیخ اٹھا۔

"کیا ہوا؟"

"سانپ نے ڈس لیا!"

"ارے ناگ ہے، ناگ!..."

فوجیوں اور ان کے گھوڑوں کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اور لگتا تھا کہ ان ریوں کو بھی گھسیٹنے میں دشواری پیش آ رہی ہے جن پر بھاری توپیں لدی ہوئی تھیں۔

اتنے میں استاد علی قلی جو کیچڑ سے لت پت گھوڑے پر سوار تھا، بابر کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا۔

"عالی جاہ، ان جنگلوں سے بھاری توپوں کو نکال لے جانا ہمارے بس کی بات نہیں رہی۔ ایک جگہ دلدل میں

سارے سوار اُسے پھنس کر رہ گئے ہیں۔۔۔۔"

بابر نے مڑ کر اپنے پیچھے موجود طاہر سے کہا

"طاہر بیگ، ہمارا راستہ بتانے والا کون ہے۔"

راستہ بتانے والا راج چند لشکر کے آگے آگے ہاتھی پر چل رہا تھا۔ وہ ہاتھی پر بیٹھے بیٹھے ہی وہاں آ گیا کیونکہ طاہر نے اسے بتا دیا تھا کہ اس طرح جلدی پہنچ جائے گا۔ ہاتھی کو دیکھ کر بابر کا کمیت گھوڑا اچھل کر پھنکارنے لگا لیکن راج چند نے ہاتھی کو بابر سے کچھ فاصلے ہی پر روک لیا۔ پھر اس کی ہدایت پر ہاتھی نے سونڈ بلند کی اور وہ سونڈ کے سہارے نیچے اتر آیا۔ راج چند نے ہاتھوں کو جوڑ کر بابر کے آگے تعظیماً اپنا سر جھکا لیا۔ بابر نے اس سے فارسی میں کہا

"یہ راستہ ہمارے لیے موزوں نہیں ہے، کسی دوسرے راستے سے چلو۔"

"عظیم شہنشاہ، ہم پنجاب کے علاقے میں ہیں۔ یہاں کے پانچوں دریاؤں میں طغیانی آئی ہوئی ہے۔ دوسرے سب راستوں پر پانی بھر گیا ہے۔"

"ہمیں معلوم ہے کہ پنجاب میں اور بھی بہت سے راستے ہیں۔ ایسے راستے بھی ہیں جن سے راہی گزر سکتے ہیں۔ کیوں، راستے سے بھٹک گئے ہیں کیا؟"

"نہیں، بھٹکے نہیں ہیں بادشاہ سلامت! راہی کس جگہ پھنس گئے ہیں؟ آپ کا حکم ہو تو میرا ہاتھی انہیں کھینچ کر باہر نکال دے۔ ہمیں سفر جاری رکھنا چاہیے ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔ آج مسافت پوری رہے گی تو کل اگلے راستے پر پہنچ جائیں گے۔ دلدل یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

"ہاتھی لے کر جاؤ اور راہیوں کو باہر نکلوا دو۔" بابر نے استاد علی قلی سے کہا جس نے بادشاہ کے سامنے تعظیماً اپنا سر خم کر دیا۔ راج چند بے حد پھرتیلا تھا۔ وہ اپنے بھاری بھرکم ہاتھی کی مدد سے فوراً ہی اس کی گردن پر سوار ہو گیا اور اسے کانوں پر ایڑیاں لگاتا اور کبھی کبھی آنکس کو چبھوتا ہوا استاد علی قلی کے پیچھے پیچھے راہیوں کی طرف لے گیا۔

ہاتھی نے راہیوں کو بآسانی کھینچ کھینچ کر کیچڑ سے باہر نکال لیا۔

ایک راہی پر وہ سپاہی لیٹا ہوا کراہ رہا تھا جسے ناگ نے ڈس لیا تھا۔ اس کا جسم نیلا پڑ گیا تھا اور بچنے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہی تھا پھر بھی اس کے ساتھیوں نے پیر میں اس جگہ جہاں سانپ نے کاٹا تھا، کوئی بوٹی پیس کر لگا دی تھی تاکہ دوران خون رک جائے اور زہر سارے جسم میں نہ پھیل سکے۔

توپوں والے راہی ایک بار پھر آگے بڑھنے لگے۔ سپاہی گھنی جھاڑیوں میں بدقت راستہ بناتے ہوئے دوبارہ گامزن ہو گئے۔ راج چند کا ہاتھی آگے آگے چل رہا تھا۔

لشکر دھیرے دھیرے کافی دیر تک چلتا رہا۔ فضا کی اُمس اور گھٹن میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ سانس لینے میں کچھ اور بھی زیادہ دقت محسوس ہو رہی تھی۔

دوپہر کے بعد ہندو بیگ اپنے مسلح سپاہیوں کے ساتھ دریائے راوی کے کنارے پر لشکر سے آن ملا۔

ہندو بیگ دہلی کے ممتاز لوگوں میں سے تھا۔ وہ ابراہیم لودھی سے اپنے اختلافات کی بنا پر سات سال قبل کابل آ کر بابر کے دربار سے وابستہ ہو گیا تھا۔ اس کی عمر چالیس سے تجاوز کر چکی تھی لیکن اب بھی بہت شجاع تھا اور بابر اس کی دلیری اور شجاعت کا ہندوستان پر اپنی گزشتہ آزمائشی مہم کے دوران قائل ہو چکا تھا۔ بابر ہندو بیگ کی قدر صرف اس کی دلیری کی

بنا پر ہی نہیں بلکہ اس وجہ سے بھی کرتا تھا کہ ہندو بیگ اپنے ملک میں نزاقی اعدادت سے واقف ... کا شکی تھا اور چاہتا تھا کہ یہ مقصد فضول خون خرابے کے بغیر ہی حاصل ہو جائے۔ وہ ترش اور بد مزاجی ... پر مجبور رہتا تھا ... بھی خاص دلچسپ تھا اسی لیے ان بیگوں میں شمار ہوتا تھا جن سے بے تکلف گفتگو کر کے بابر کو خاص مسرت ہوتی تھی۔ پچھلی گزشتہ مہم کے دوران ہندو بیگ کے دانش مندانہ مذاکرات کی بدولت ہی دریائے جہلم کے کنارے واقع شہر بھیرہ نے جنگ کے بغیر ہی شاہ کابل کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ اس کے بعد ہندو بیگ کو اس علاقے کا صوبے دار بنا دیا گیا تھا۔ اب بابر یہ چاہتا تھا کہ اسی طرح پر امن طریقے سے لاہور پر بھی اس کا قبضہ ہو جائے۔ ہندو بیگ اس سلسلے میں لاہور کے امیر دولت خان سے بات چیت کر رہا تھا اور یہ لگتا تھا کہ امیر بابر کی اطاعت قبول کر لینے کی طرف مائل ہے۔

بابر نے ہندو بیگ کو دور ہی سے پہچان لیا اور اپنے گھوڑے کو ایک طرف ہٹا کر سپاہیوں کو آگے بڑھ جانے دیا کیونکہ وہ ہندو بیگ سے تنہائی میں بات چیت کرنا چاہتا تھا۔

"محترم حکمران، دولت خان کی نیت لگتا ہے کہ بگڑ گئی" ہندو بیگ نے فوراً ہی بتایا۔ "وہ تو مجھے قتل کرا دینا چاہتا تھا۔ خیریت ہوئی کہ میں بھاگ نکلا۔"

"آخر اس کی نیت کیوں بگڑ گئی؟" بابر نے پر سکون رہنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ "اس نے تو خود ہی اپنے بیٹے دلاور خان کو ہمارے پاس کابل بھیجا تھا جس سے بات چیت میں سارے معاملات طے پا گئے تھے۔ میں دولت خان کی عزت محض اس کے سفید بالوں ہی کی بنا پر کرتا تھا۔"

"دولت خان کو یہ سب کہاں یاد رہا۔ اب تو وہ کمر میں دو تلواریں باندھتا ہے۔ اس کا مطلب اس نے خود ہی مجھے بتایا تھا۔ ایک تلوار سے سلطان ابراہیم کو سبق سکھانا چاہتا ہے اور دوسری سے آپ کو۔"

"اس کا بیٹا بھی عداوت پر اتر آیا؟"

"جی نہیں۔ دلاور خان ہمارا خیر خواہ ہے۔ اس نے معاہدے کو فراموش نہیں کیا اور جنگ کے بغیر ہی لاہور کو ہمارے حوالے کر کے اپنی وفاداری کا ثبوت بھی پیش کرنا چاہتا ہے۔ اسی نے تو مجھے موت سے بچا کر آگاہ کر دیا کہ اس کا باپ میرے قتل کا منصوبہ بنا رہا ہے... بڑا بیٹا غازی خان البتہ اپنے باپ کا طرف دار ہے۔"

"اور عالم خان؟"

"عالم خان تو دہلی کے سلطان سے بری طرح سہما ہوا ہے۔ ایک بار شکست کھانے کے بعد ابراہیم سے دوبارہ ٹکر لینے کی ہمت نہیں رہی۔ ویسے جب آپ لاہور پہنچیں گے تو میرا خیال ہے کہ عالم خان اظہار وفاداری کے لیے آپ کے پاس آئے گا۔ دراصل ہمارے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ غازی خان ہی ہے۔ وہ تو بیگوں پر اپنے باپ سے بھی زیادہ اثر رکھتا ہے۔ اسے شکست دے دیں گے تو سب بیگ ہمارے حامی ہو جائیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جنگ کے بغیر لاہور پر آپ کا قبضہ ہو جائے گا... لیکن، لاہور پہنچنے کے لیے آپ نے اتنا خراب راستہ کیوں منتخب کیا؟"

"راستہ تو ہمیں لاہور کے صوبے کا بھیجا ہوا ایک آدمی دکھا رہا ہے۔"

"وہ آدمی ہے کہاں؟ مجھے اس سے کچھ اگلوانے کی اجازت دیجیے۔"

راستہ بتانے والے کو ایک بار پھر طلب کیا گیا۔

لال چند متعدد زبانیں جاننے والے ہندو بیگ کی اجازت سے اپنے ہاتھی ہی پر بیٹھا رہا۔ اس نے ہندو بیگ کو ہاتھ

جوڑ کر سلام کیا۔ ہندو بیگ نے بھی ہندوؤں کے اسی انداز سے سلام کا جواب دیا پھر اپنے گھوڑے کی کاٹھی پر بیٹھے بیٹھے

سیدھا ہو کر ہندوستانی میں پوچھا

''کہاں کے رہنے والے ہو؟''

''آگرے کا صاحب۔''

''یہاں پنجاب میں کیسے آنا ہوا؟''

''کام کی تلاش میں پیٹ تو کسی طرح بھرنا ہی ہے۔''

''ایسے ہاتھی کے مالک ہو کر بھی تمھیں ابراہیم لودھی کے ہاں کام نہ مل سکا؟''

''ابراہیم لودھی تو صاحب، بے حد کنجوس بادشاہ ہے۔ اس نے سارا سونا سمیٹ کر اپنے خزانے میں بند کر رکھا ہے،

کچھ خرچ ہی نہیں کرنا چاہتا۔ ہم سب مایوس ہو چکے ہیں اس سے۔''

''سچ کہہ رہے ہو، بالکل سچ'' ہندو بیگ بے اختیار کہہ اٹھا۔ ''میں خود بھی ان ہی لودھیوں کے مظالم سے تنگ آ کر

بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ ابراہیم کے باپ سکندر نے میرے والد پر نافرمانی کا الزام لگایا تھا۔ انھیں بپھرے ہوئے ہاتھی کے

سامنے پھینک دیا گیا تھا جس نے روند ڈالا۔''

لال چند کے چہرے پر ہندو بیگ کے لہجے میں ہمدردی کے جذبات چھا گئے اور اس نے پوچھا:

''آپ کھتری ہیں؟''

''ہاں، میرا اصلی نام اندر ہے۔ بادشاہ نے مجھے ہندو بیگ کہنا شروع کر دیا تھا۔ یہ نام سب کو اچھا لگا اور مجھے بھی

۔ تمھارا کیا نام ہے؟''

''لال چند۔''

''اچھا تو لال چند، تمھارے خیال میں لودھی کے مظالم سے ہمیں کون نجات دلا سکتا ہے؟''

''بھگوان۔''

''اس کا کوئی بندہ نہیں دلا سکتا؟''

لال چند سوچ میں پڑ گیا۔

''اور دولت خاں؟ ہندو بیگ نے سمجھایا۔

''دولت خاں بزدل اور بے دل ہے غازی خاں بہر حال ابراہیم سے اچھا ہے۔''

ہندو بیگ نے نیچی آواز سے پوچھا

''اچھا سچ بتاؤ، تم نے شاہی فوج کے لیے یہ راستہ کیوں منتخب کیا؟''

''غازی خاں نے یہی حکم دیا تھا۔''

''لیکن غازی خاں نے لشکر کو اتنے زیادہ دشوار راستے سے لانے کو کیوں کہا تھا؟''

''لشکر کے لیے یہی بہترین راستہ ہے۔ ضروری راستہ!''

''آخر ان لوگوں نے تمھارا کیا بگاڑا ہے؟''

''ہمارے لیے ابراہیم لودھی کچھ کم ہے کیا جو ایک اور غلام آ دھمکا؟ وہ بھی غیر ملکی!''

"غازی خاں نے تمھیں فریب دیا ہے۔"

اچانک لال چند ہاتھی کو گھنی جھاڑیوں کی طرف بڑھاتے ہوئے چلایا۔

"یہ غیر ملکی حملہ آور جلد وہیں جلا دو! انھوں نے باجوڑ قلعے میں ہمارے تین ہزار سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ شہر اور گاؤں سب لوٹ لیے تھے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ہاتھی کو گھنے جنگل میں داخل کر دیا۔

"عالی جاہ، حکم دیجیے کہ اس آدمی کو گرفتار کر لیا جائے۔ اسے دشمنوں نے بھیجا تھا۔ یہ آپ کے لشکر کو جان بوجھ کر پرخطر رستے سے لے جا رہا تھا۔"

"پکڑ لو" بابر غصے سے چلایا۔ "جانے نہ پائے۔ فوراً گرفتار کر لو۔"

کچھ سپاہی گھوڑے دوڑاتے ہوئے لپکے اور ان میں سے تین نے ہاتھی کے آگے پہنچ کر اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ اتنے میں لال چند نے جلدی جلدی آنکس گڑتے ہوئے ہاتھی کو سواروں کی طرف موڑ کر چند ہدایات دیں۔ دوسرے ہی لمحے ہاتھی نے سونڈ سے حملہ کر کے تین میں سے دو سواروں کو زمین پر ڈھیر کر دیا۔ یہ دیکھ کر سب بکا بکا رہ گئے۔ تیسرے سوار نے اپنے گھوڑے کو روکا اور تیزی سے پیچھے ہٹا کر جنگل میں جا چھپا۔

ہاتھی نے جو اس بھیڑ اور بغاوت کی للکارتی ہوئی آوازوں سے بپھر اٹھا تھا، زور سے چنگھاڑ ماری اور جنگلی بیلوں کو چیرتا اور درختوں کی شاخوں کو چرمراہٹ کے ساتھ توڑتا ہوا جنگل میں داخل ہو گیا۔

"تیر چلاؤ" بابر چیخ اٹھا۔

لیکن گھنے جنگل نے تیروں کے رستے میں دیوار کا کام کیا۔ صرف چند تیر ہی شاخوں میں الجھتے الجھتے بمشکل ہاتھی کے لگے جن سے اسے کوئی نقصان نہ پہنچ سکا۔ بندوقچیوں کو بھری ہوئی بندوقوں کے فلیتوں میں چقماق رگڑ کر آگ لگانے اور نشانہ درست کرنے میں اتنا وقت لگ گیا کہ لال چند ان کی گولیوں کی پہنچ سے باہر ہو گیا۔

"زخمی سپاہیوں کو اٹھا لے جاؤ اور مرہم پٹی کرو اور ان کے گھوڑوں کو پکڑ لاؤ" بابر نے حکم دیا۔ "اور اس بدمعاش کو اس کے کرتوت کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔ کمبخت کو گھیر لو۔ جنگل کا محاصرہ کر لو۔ فوراً"

ساری کوششیں رائگاں گئیں کیونکہ چاروں طرف گھنے جنگلات پھیلے ہوئے تھے۔

"ہندو بیگ، اب آپ راستہ دکھائیں گے۔"

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر، عالی جاہ۔"

شام ہوتے ہوتے ہندو بیگ لشکر کو سرسبز و شاداب میدانی علاقے میں لے آیا۔ بابر نے جو تھکن سے نڈھال ہو رہا تھا، حکم دیا کہ اس کا خیمہ وہیں نصب کیا جائے اور لشکر پڑاؤ ڈال دے۔ جلد ہی لال چند کا تعاقب کرنے والے سپاہی بھی واپس آ گئے۔ ان بے چاروں کے لباس تار تار ہو چکے تھے۔ گھوڑے کیچڑ میں لت پت تھے اور خود ان کی تھکن کا یہ عالم تھا کہ کاٹھیوں پر بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔

صبح کو دولت خاں اور دلاور خاں کوئی پچاس افراد کے ساتھ بابر کے پڑاؤ کے قریب آ کر ٹھہر گئے۔ یہ لوگ بابر سے اپنی وفاداری کے اظہار اور اس کی اطاعت قبول کرنے کے سلسلے میں لاہور سے آئے تھے۔ پہرے داروں کو حکم دے دیا گیا کہ ان افراد کو لشکر گاہ میں آنے دیا جائے لیکن بابر نے ملاقات کے لیے صرف دلاور خاں ہی کو اپنے خیمے میں طلب کیا۔ اس نے دلاور خاں کو اپنے معزز و مقرب بیگوں کے درمیان بٹھا کر خیریت پوچھی اور پھر تخت سجے میں براہ راست

۔۔۔ دولت خان نے
"محترم ذرا یہ تو بتائیے، آپ کے والد نے جن کی میں تقریباً اپنے والد کے برابر عزت کیا کرتا تھا، آخر معاہدے
کی شرائط کا پاس کیوں نہ کیا، دشمنی پر کیوں آمادہ ہو گئے؟ آخر وہ ہمارے خلاف ہتھیار کیوں اٹھانا چاہتے ہیں؟"
دلاور خان نے بھی اسی طرح براہ راست جواب دیا
"محترم صفدر میرے والد دراصل میرے بھائی غازی خان نے گمراہ کر دیا تھا۔ اس نے ان کو خائف کیا تھا،
کہا تھا کہ یہاں کسی غیر کا تسلط ہے گا تو ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ شاہ بابر بھی ہمارے
لیے ویسا ہی دشمن ہے جیسا کہ ابراہیم لودھی۔"
"دور سفید دولت خان نے راستہ بتانے کے لیے ایک زخمی کو اس لیے بھیجا تھا کہ ہم گھنے جنگلوں میں پھنس کر
جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں؟"
"یہ بات درست نہیں ہو گی، عالم پناہ۔ میرے والد کو اس کمبخت چال کی بھنک تک نہیں لگی۔ یہ بھی غازی خان ہی کی
حرکت ہے۔ والد نے اب یہ سنا تو وہ یہاں کیوں آتے... وہ تو آپ کے خیمے کے دروازے پر کھڑے ہوئے شرف باریابی
کے منتظر ہیں... میرے والد خون خرابہ نہیں چاہتے، یقین کیجیے۔ وہ تو اب بھی آپ کے لطف و عنایات کی امید رکھتے
ہیں..... اور ہم سب بھی۔"
"لطف و عنایات کے مستحق تو آپ ہیں صرف آپ دلاور صاحب۔ آپ کے والد کو سزا دی جائے گی جو نقصان
پہنچا ہو گی۔ ہمارے بزرگان دین کی ہدایت ہے کہ دشمنوں کو سزا دو اور دوستوں کی مدد کرو۔ ٹھیک ہے نا؟" بابر نے
پہرے داروں کے سردار کی طرف مڑ کر کہا "سنا ہے کہ دولت خان کمر سے دو تلواریں باندھنے لگے ہیں۔ ذرا ہم
بھی تو دیکھیں..... انہیں ان کی تلواروں کو مناسب جگہ پر ٹانگ کر یہاں لے آئیے۔"
دو تنومند سپاہی سفید ریش دولت خان کے ہاتھوں کو مضبوطی سے پکڑ کر تقریباً ہانکتے ہوئے خیمے کے اندر لے آئے وہ
سپاہیوں کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا تھا جس کی وجہ سے اس کی گردن میں لٹکی ہوئی دونوں لمبی لمبی تلواریں
ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ بیگ دبی دبی آوازوں میں ہنس پڑے دولت خان بابر کو گھورتے ہوئے غصے سے چیخ
پڑا
"مجھے قید کر کے نہیں لایا گیا۔ خود اپنی مرضی سے آپ کے پاس آیا ہوں! اپنی مرضی سے! آپ نے مجھ سے غداری
کی! اور بے دردی!"
"یہ غداری کی بات کون کر رہا ہے؟" بابر نے اونچی آواز سے کہا۔ "آپ تو ہمارے بیگ کو دھوکے سے قتل کرا دینا
چاہتے تھے، کیونکہ وہ میرے ایلچی کی حیثیت سے آپ کے ہاں آئے تھے.. کس کو پھنسا دیا تھا جنگل اور دلدل میں
غازی خان نے؟ کس کا بیٹا ہے وہ؟ کس کی اجازت سے کی تھی یہ کارروائی اس نے؟ جو بے رحم ہوتے ہیں ان سے ہم بھی
بے رحمی سے پیش آتے ہیں۔" بابر چند لمحات تک خاموش رہا پھر اس نے اپنے وزیر سے مخاطب ہو کر فیصلہ کیا "اس
شخص کو قید کر کے اس کے خاندان سمیت بھیرا بھیج دیجیے، وہاں اسے ملوٹ قلعے میں بند کر دیا جائے، اور اس شخص کے
بغیر ہی کام چلا لے گا۔"
دولت خان اتنا حیران و ششدر اور نڈھال ہو گیا کہ اس کے پیر قابو میں نہ رہے اور وہ فرش پر بیٹھ گیا۔ سپاہی

طاہر کو کابل میں اپنے قیام کے ابتدائی برسوں میں اندجان اور قوا کی یاد بہت ستاتی رہتی تھی۔ اب وہ کافی دیر
کے اداس ہو جاتا تھا۔ کابل میں اس کا مکان تھا جس میں وہ اپنی بیوی رابعہ، بیٹے سمراد اور ماموں فضل الدین کے ساتھ مدتوں
پندرہ برسوں سے زندگی گزار رہا تھا۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب طاہر کسی جنگ میں شرکت کے موقعے پر موت کا خیال بھی
دل میں نہیں لاتا تھا لیکن آج وہ بار بار دعائیں مانگ رہا تھا۔ "پروردگار مجھے اس جنگ میں ہلاک ہونے سے محفوظ رکھ۔
اگر میں اس بار بھی زندہ بچ نکلا تو ملازمت چھوڑ دوں گا۔ یقیناً میں کافی اونچے عہدے پر مامور ہوں لیکن اب میری عمر بھی تو
پچاس کے قریب ہو چکی ہے۔ آخر میں اس طرح کب تک دربدر مارا مارا پھرتا رہوں گا؟ سمراد جوان ہو چکا ہے۔ اس سال
مدرسے کی تعلیم مکمل کر کے میر عمارت بن جائے گا۔ اب تو اس کی شادی کی جانی چاہیے۔ یا اللہ کیا مجھے بیٹے کا سہرا دیکھنا
نصیب ہو سکے گا؟ میں اپنی رابعہ کو ایک بار پھر دیکھ سکوں گا کہ نہیں؟ مجھے جنگ میں ہلاک ہونے سے بچا، پروردگار!"

شراب، اداسی، خوف اور اذیت دہ خیالات سے کسی حد تک نجات دلا دیتی تھی۔ ہندوستان میں انگور بہت کم پیدا
ہوتے تھے اس لیے انگوری شراب بہت کم بنتی تھی۔ بیگ مہوے کی تیز شراب سے کام چلا رہے تھے۔

جنگ چھڑنے سے قبل والے دن طاہر نے یہ تند و تیز شراب کافی مقدار میں پی لی تھی۔ علی الصباح اس کی آنکھ کھلی تو
خاصی گرانی محسوس ہوئی۔ بدن بری طرح ٹوٹ رہا تھا، منہ کڑوا ہو رہا تھا، سر بھاری لگ رہا تھا، بخار سا تھا۔ اس نے دوبارہ
سو جانے کی کوشش کی لیکن نیند نہ آئی، لیٹ کر وہ بدتر رہا۔ تب اس نے اٹھ کے شراب کے چند قطرے جو صراحی میں باقی
رہ گئے تھے، حلق میں انڈیل لیے۔

اتنے میں نقاروں اور صوروں کی آوازوں سے سارا ماحول گونج اٹھا۔ "صف بندی کرو! صف بندی کرو!" حکام
سنائی دیے۔ گشتی دستے نے آ کر اطلاع دی تھی کہ ابراہیم لودھی کا لشکر تیزی کے ساتھ بڑھتا ہوا قریب آ گیا ہے۔

طاہر نے نشے کے باعث کپڑے اور جوتے پہننے میں کافی وقت لگا دیا۔ اس کا پستہ قد سائیس محمد جو طاہر سے بے
پایاں دوستی اور عمر میں بڑے ہونے کی وجہ سے کبھی کبھی بڑبڑانے کی حماقت کر بیٹھتا تھا، اس وقت بھی ضبط نہ کر سکا

"ارے بیگ، آخر منہ اندھیرے ہی پینے کی کیا ضرورت تھی؟"

"خاموش رہو! پہلے میرا گھوڑا لے کر آ۔ اور زیادہ جلدی کر، ہڈیوں کے ڈھانچے!"

محمد اس مہم کے دوران واقعی بے حد دبلا ہو گیا تھا۔ "اچھا ہی ہوا، گھوڑوں کے پیچھے دوڑنے میں آسانی ہو گی کمبخت
کو!" طاہر نے رکھائی کے ساتھ دل ہی دل میں کہا۔

گھوڑے پر رات بھر کاٹھی کسی رکھنے کی ضرورت پڑتی تھی تو عموماً اس کا تنگ کچھ ڈھیلا کر دیا جاتا تھا۔ اس وقت محمد
گھوڑے کو جو رات میں کھل گیا تھا، کچھ دیر کے بعد ہی پکڑ سکا اور جلدی میں اسے تنگ کو کس دینے کا خیال نہ رہا۔ طاہر
عجلت میں تھا، اسے چونکہ جلد بابر کے سامنے حاضر ہونا تھا اس لیے رکابوں پر نظر ڈالے بغیر ہی، اچھل کر گھوڑے پر سوار ہو
گیا۔ کاٹھی کھسکنے لگی اور اگر طاہر نشے میں نہ ہوتا تو فوراً ہی سمجھ جاتا کہ کاٹھی ڈھیلی ہے لیکن اس وقت اس نے سوچا کہ یہ محض
وہم ہے۔ اس نے رکابوں پر پاؤں جما کر گھوڑے کو تیزی کے ساتھ موڑا لیکن شکم بند ڈھیلا تھا، وہ صاف ہو گیا، کاٹھی اس کے
کولہوں کی طرف کھسک گئی اور طاہر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ محمد نے لپک کر ایک ہاتھ سے گھوڑے کی لگام تھام لی اور دوسرے
سے طاہر کو کھڑے ہونے میں سہارا دیتے ہوئے مسکرا کر کہا

"ارے طاہر جان، آپ تو بیگ بن جانے کے بعد علی الصباح ہی مے نوشی کرنے لگے۔ میں نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ

زیادہ شد یا کیجیے اس زہر کو۔"

نرم مٹی پر گرنے کی وجہ سے طاہر کو چوٹ تو نہیں آئی تھی لیکن ایسی اہم جنگ سے قبل گھوڑے سے گر پڑنا شگون بد تھا۔ اس نے غصے سے گالی بکی اور کاٹھی اور ڈھیلے تنگ کی طرف اشارہ کیا۔

محمد نے مذاق کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے ماتھا ٹھونکا

"جلدی میں بھول گیا تھا، احمق جو ٹھہرا۔"

شراب نے طاہر کی عقل پر چھاڑو پھیر دی تھی۔ اسے سائیس کا مذاق تحت نا گوار گزرا اور اس کے دل میں خیال آیا کہ محمد نے "عالی نسب" بیگ کو گھوڑے سے گرانے کی چال جان بوجھ کر بنائی تھی۔ طاہر ماضی کی طرح سپاہی ہوتا تو اس واقعے پر خود بھی ہنس پڑتا لیکن اب تو وہ بیگ تھا، بیگ

"ارے ہڈی کے ڈھانچے، تو نے یہ حرکت جان بوجھ کر کی تھی؟ میرے بیگ بن جانے سے تیرے سینے پر سانپ لوٹتا ہے نا؟ تو میری جان لینا چاہتا تھا، بول؟"

وہ غصے سے کانپنے اور چیخنے کو دیکھے بغیر اس سے چابک نکالنے کے لیے ٹٹولنے لگا۔ لیکن چابک زمین پر پڑا ہوا تھا۔ قصور وار سپاہی کو گالیاں دینا اور مارنا پیٹنا ایک عام بات تھی۔ طاہر بیگ بھی اس دستور کو ایک حد تک اپنا چکا تھا لیکن محمد سے اپنی پرانی دوستی کو ملحوظ رکھتے ہوئے ابھی تک اس پر ایک بار بھی ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔

محمد نے جھک کر چابک کو اٹھا لیا اور اسے طاہر کی طرف بڑھایا

"لیجیے، سزا دیجیے مجھے میری غلطی کی لیکن یہ بات نہ کہیے۔ آپ کی جان کیوں لینا چاہوں گا، نمک حرام تھوڑی ہوں!"

طاہر کو ایک بار پھر ایسا لگا جیسے محمد اس کا مذاق اڑا رہا ہو، اپنی شرافت اور ایمان داری پر زور دے کر خود کو بیگ سے برتر ثابت کرنے کی کوشش ہو۔

"جنگ سے قبل مجھے گھوڑے سے گرا دینے کا مطلب میری موت کے خواہاں ہونے کے سوا کیا ہے؟!" طاہر کچھ اس طرح چیخ اٹھا جیسے محمد پر تھوک رہا ہو اور دوسرے ہی لمحے محمد کے سر پر زور سے مکا مار دیا۔

مکا پڑتے ہی محمد پیچھے لڑھکا، پیروں پر ٹک نہ پایا اور زمین پر گر پڑا۔ طاہر کو انگوٹھا چٹخنے کی آواز سنائی دی، پورے دائیں ہاتھ میں تیز درد کی لہر دوڑ گئی اور سر چکرا گیا۔ "انگوٹھا ٹوٹ گیا، ٹوٹ گیا! اب تلوار کیسے اٹھاؤں گا؟ یہ سب اسی کمبخت کی وجہ سے ہوا.... اسی کی وجہ سے" طاہر نے اب کے محمد پر جو ٹھوکر مارنے کی کوشش کی تو اپنے بائیں ٹخنے سے وار کیا اور بیچارا سائیس دوبارہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

اتنے میں ایک قوی الجثہ سپاہی محمد کی طرف سے بول پڑا

"رہنے بھی دیجیے، بیگ صاحب، اس بار انھیں معاف کر دیجیے۔ محمد تو آپ کی خاطر جان دینے کو بھی تیار رہتے ہیں۔ تنگ کو میں خود ہی کسے دیتا ہوں.... چند لمحے ٹھہر جائیے ... یہ لیجیے ٹھیک ہو گیا۔ سوار ہو جائیے۔۔"

طاہر گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔ وہ اپنے سوجے ہوئے انگوٹھے کو جس میں ہلکی سی جنبش سے بھی ناقابل برداشت درد محسوس ہوتا تھا، بار بار دیکھے جا رہا تھا۔

اور جب وہ بابر کے نجی محافظین کے اکٹھا ہونے کی جگہ کے قریب پہنچا تو اس کے دل میں خیال آیا "بس، اب اور

کامیابی میرے مقدر میں نہیں!'

کم و بیش بیس سپاہی طاہر کے پیچھے پیچھے گھوڑے دوڑاتے چلے آ رہے تھے۔ ان میں محمد بیگ بھی، جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، شامل تھا۔ دراصل قاعدہ ہی یہی تھا بیگ سپاہی کو کتنا بھی کیوں نہ زدوکوب کرتا، سپاہی کو بیگ کے ہم رکاب رہنا ہی پڑتا تھا۔

آفتاب طلوع ہو کر سلطان دہلی کے بے شمار لشکریوں کی صفوں کو دھوپ میں نہلاتا ہوا تیزی سے سمت الراس کی طرف بڑھنے لگا۔ ان بیکساں اور ایک دوسرے سے قریب قریب واقع صفوں سے لگتا تھا کہ سارے افق کو ڈھک لیا ہے۔ ان ہی صفوں کے درمیان جنگی ہاتھی بھی موجود تھے جن کے بھاری بھرکم جسم تو اس لیے پرے جہاں بڑے بڑے کمانڈر کے دستے کے ساتھ کھڑا ہوتا تھا، پوری طرح نظر نہیں آ رہے تھے لیکن ان کی تعداد دیکھ کر روح لرز اٹھتی تھی۔ وہیں کہیں سب سے بڑے ہاتھی پر ابراہیم لودھی بیٹھا ہوا تھا۔ یہ ہاتھی اس کے لیے جائے مشاہدہ کا بھی کام دے رہا تھا کیونکہ وہ اس کی پیٹھ پر سے سارے میدان جنگ پر نظر رکھ سکتا تھا۔

مہیب دشمن قریب آتا جا رہا تھا لیکن بابر کو کسی قسم کی گھبراہٹ نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے رابوں اور دمسوں کی دیوار مضبوط تھی۔ اس کے میمنہ کی کمان اس کا ذہین اور ہونہار بیٹا ہمایوں کر رہا تھا جس کے ساتھ خواجہ کلاں بیگ، ہندو بیگ اور دیگر معتبر اور تجربہ کار سپہ سالار بھی موجود تھے۔ قلب توپچیوں، بندوقچیوں، تیراندازوں اور پیدل دستوں پر مشتمل تھا۔ میمنہ اور میسرہ کے گھڑسوار دستے طوفانی حملوں کے لیے تیار کھڑے تھے۔ جنگی ہاتھی پر سوار سلطان ابراہیم کے ساتھ ساتھ بے شمار پیدل سپاہی آگے بڑھ رہے تھے۔ اتنی کثیر تعداد کے لیے میدان تنگ ثابت ہونے کی بنا پر سپاہی اپنی صفوں میں ایک دوسرے کے جسم سے جسم سٹا کر چلنے پر مجبور ہو گئے تھے اسی وجہ سے ان کی رفتار بہت دھیمی تھی۔ یہ بہترین موقع تھا تلغمہ کے لیے جو ایک زمانے میں شیبانی کا سب سے موثر حربہ رہ چکا تھا اور اب بابر کا بھی سب سے موثر حربہ بن گیا تھا۔ میمنہ اور میسرہ کے کناروں پر انتہائی مہارت رکھنے والے گھوڑوں والے دستے غنیم پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار تھے۔

طاہر بابر سے کچھ پیچھے شاہی محافظین اور دیگر افراد کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ بادشاہ سے تھوڑی ہی دوری پر پیغام رسانوں کے ساتھ وہ بیگ کھڑے ہوئے تھے جنہیں فوج کے مختلف حصوں کے درمیان تال میل قائم رکھنے کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔ بابر خود اعتمادی سے معمور اور واضح لہجے میں احکام جاری کر رہا تھا۔ "ہم لوگ اس شخص کے پیچھے پیچھے چلتے رہے ہیں اور کتنی ہی جنگوں سے صحیح و سلامت بچ نکلے ہیں" طاہر نے خود کو تسلی دیتے ہوئے سوچا۔ "اگر مرزا بابر زندہ رہے تو میں اس بار بھی زندہ بچ نکلوں گا۔"

سیل آدمی کا جو قریب سے قریب تر آتی جا رہی تھی، کسی جوابی اقدام کے بغیر بے حس و حرکت کھڑے انتظار کرتے رہنا بے حد دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ بہت سے بیگ شکر وضطرب ہونے لگے۔ بابر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد پُرسکون، واضح اور تحکمانہ آواز سے کہہ اٹھتا تھا

"صبر سے کام لو... انتظار کرو..... کوئی آگے نہ بڑھے..."

ابراہیم لودھی نے یہ دیکھ کر کہ بابر رابوں اور دمسوں کی دیواروں کے پیچھے ہی کھڑا ہوا ہے، آگے بڑھ ہی نہیں رہا ہے، اپنے لشکر کو بھی آگے بڑھنے سے روک دیا۔ وہ اس سوچ میں پڑ گیا کہ کیا اسے براہ راست بابر کے قلب پر حملہ کرنا چاہیے؟ آخر اس نے اپنے سپہ سالاروں کے مشورے پر اپنے لشکر کو مڑنے کا حکم دیا تاکہ خاص حملہ قلب کے بجائے بائیں

کے میمنہ پر کیا جائے اور اسے توڑتے ہوئے شہر کی طرف سے نکل کر بابر کے لشکر کا محاصرہ کر لیا جائے۔

لیکن ایک لاکھ سپاہیوں کے اس لشکر کے مختلف حصوں تک احکام پہنچانے میں، دستوں نے یکجا ہو کر بابر کے میمنہ کی اور شہر کی جانب مڑنے میں کافی وقت لگ گیا۔

اس اثنا میں بابر نے جوابی کارروائی کر دی۔ اس کے دو ہزار سوار ابراہیم لودھی کے میمنہ والے دستے قریب سے دشمن کی مدد کرنے والی مرکزی قوت یعنی ہاتھیوں اور پیدل سپاہیوں کے قریب سے جو قلب سے بائیں جانب مڑ رہے تھے، انتہائی تیزی کے ساتھ گزرتے ہوئے دشمن کے پیچھے پہنچ گئے۔ میمنہ سے دائیں سے ... بائیں جانب مڑتے ہوئے دشمن سے سپاہیوں کی طرف بڑھے تاکہ انہیں دوبارہ صف بندی کا موقع دیے بغیر ... ان کے عقب میں رہنے کے درمیان نصب توپیں کرنے لگیں۔

دراصل بابر پانی پت کے میدان میں اپنے ان سارے حربی تجربات سے فائدہ اٹھا رہا تھا جو اسے ... شاندار فتوحات اور المناک شکستوں میں حاصل ہو چکے تھے۔ ایک متعین وقت تک اس کا ... دشمن سے ... کرنا۔ خواہ یہ محاصرہ کمزور ہی کیوں نہ ہو۔ دشمن کے میمنہ و میسرہ کو غیر موثر بنانا اور ان دونوں پہلوؤں نے دستوں کو میدان کے اندرونی علاقے کی طرف مڑنے پر مجبور کر دینا اور عام کھلبلی مچا دینا۔ لیکن محاصرین کی نسبت ان کے محصورین کی تعداد میں کئی گنا زیادہ تھے۔ محاصرین کے گھوڑے یقینا تیز رفتار تھے لیکن ان کے پاس ہاتھی نہ تھے جس کی وجہ سے وہ کچھ کمزور پڑ رہے تھے۔ یہی سبب تھا کہ ابراہیم لودھی کے سپاہی محاصرے کو کبھی دائیں جانب سے توڑ کر باہر نکل آتے کبھی بائیں جانب سے۔ بابر جس پہلو پر بھی اپنے گھڑسواروں کو زیادہ مشکلات میں گھرا ہوا دیکھتا تو فوراً اپنے قلب میں مامور دستوں کی کمک بھیج دیتا تھا۔ لیکن دراصل یہ کمک دشمن کو ترغیب دینے کی ایک چال بھی تھی۔ وہ جان بوجھ کر دشمن کو دکھا رہا تھا کہ اس کے لشکر کا وسطی حصہ جہاں ارابے کھڑے تھے، غیر محفوظ ہو چلا ہے۔ اور ابراہیم لودھی آخر کار اس چال کا شکار ہو گیا۔ اس نے اپنے میمنہ، میسرہ اور عقب پر ہونے والے حملوں کو پسپا کر کے اپنی خاص طاقت یعنی جنگی ہاتھیوں کو بابر کے قلب کی طرف آگے بڑھایا اور جنگ کا فیصلہ اپنے حق میں کرنے کے مقصد سے دھاوا بول دیا۔ عین اسی وقت بابر نے حکم دیا کہ گولہ باری تیز کر دی جائے۔ توپیں اور بندوقیں سلطان دہلی کے ہاتھیوں اور پیدل سپاہیوں پر جو اب بہت قریب آ چکے تھے، آگ برسانے لگیں۔ توپوں کی گھن گرج سے کانوں کے پردے پھٹنے سے لگے، دھوئیں اور سیاہی کے باعث آنکھوں کے لیے کچھ دیکھنا محال ہو گیا اور گولیاں اور گولے زرہوں اور ڈھالوں کی دھجیاں اڑانے لگے۔ ابراہیم لودھی کے سپاہی اس سب کے لیے بھلا کہاں تیار تھے۔ زخمی اور خوف زدہ ہاتھی تڑپنے اور زور زور سے چنگھاڑنے لگے۔ مہاوتوں نے انہیں موڑنے کی کوشش کی جس سے کچھ اور بھی زیادہ ابتری پھیل گئی اور دھکا پیل میں سپاہی اور گھوڑے زمین پر گرنے اور روندے جانے لگے۔

توپوں اور بندوقوں نے اپنا مہیب اور تباہ کن عمل جاری رکھا۔ ڈھلان پر بہت سے مردہ یا شدید زخموں کے باعث دم توڑتے ہوئے ہاتھی پڑے ہوئے تھے ان کے گرنے سے بہت سے سپاہی ان کے نیچے دب کر ہلاک ہو گئے تھے۔ اس اثنا میں عقب سے سپاہی اور سوار مسلسل جوق در جوق چلے آ رہے تھے اور لاشوں اور زخمیوں کے ڈھیر پر ڈھیر لگتے جا رہے تھے۔

آخر کار ابراہیم لودھی کے لشکر میں بھگدڑ مچ گئی۔ سپاہی ہتھیار پھینک پھینک کر گرنے والوں کو روندتے ہوئے

میدان جنگ سے بھاگنے لگے۔ میدان کے مختلف حصوں اور دشمن کے عقب میں موجود بابر کے فوجی جن کی تعداد گھٹ چکی تھی، بھاگنے والوں کے ریلے کو روکنے میں ناکام رہے۔ ہاتھی ان کے محاصرے کو آسانی توڑتے ہوئے باہر نکلے اور ان کے پیچھے پیچھے دشمن کی پیدل فوج کا انبوہ بھی میدان سے نکل بھاگا۔

بابر نے اپنے ٹیلے پر سے دشمنوں کو فرار ہوتے دیکھ لیا۔

"دشمن دہلی لوٹ کر شہر کے دروازے بند کر کے بیٹھ سکتا ہے" وہ چیخ اٹھا اور ان ٹیلوں کی طرف مڑا جنھیں اس کی فوج کے مختلف حصوں کے درمیان رابطہ قائم رکھنے کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔ لیکن یہ سب بیگ اور پیغام رساں کب کے بعد دیگرے میدان جنگ میں بھیج دیے گئے تھے اور ابھی تک واپس نہیں لوٹے تھے۔ یہ کہنا بھی مشکل تھا کہ اس خونی جنگ میں ان میں سے کتنے لوگ زندہ بچے ہوں گے۔ بابر نے اپنا گھوڑا اپنے محافظین کے دستے کی طرف موڑا۔

"طاہر بیگ، مجھے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ خود ابراہیم لودھی بھاگ کھڑا ہوا یا ابھی تک میدان جنگ میں موجود ہے۔ اگر بھاگ کھڑا ہوا ہے تو ہمیں اپنی محفوظ فوج کے دستوں کو اس کے تعاقب کے لیے روانہ کرنا چاہیے۔"

طاہر نے میدان پر نظریں دوڑاتے ہوئے دھوئیں اور غبار کے اس جہنم کا جائزہ لیا۔ اس کے طاقتور جسم میں عجیب جھرجھری سی پیدا ہوئی جسے اس نے چھپانے کی کوشش کی تاہم اس کی آواز سے ارتعاش نمایاں ہو گیا

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر، عالی جاہ!"

اتنے میں ایک پیغام رساں گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا آن پہنچا۔ اس کے زخمی پیر سے رکاب پر خون ٹپک رہا تھا۔ اس نے گھوڑے سے اترے بغیر ہی چلا کر تیزی سے کہا

"محترم حکمران، ہمیں فتح حاصل ہو گئی، دشمن بھاگ کھڑا ہوا!"

"ابراہیم بھی؟"

"جی ہاں۔ میں نے دیکھا ہے کہ بھاگتے ہوئے ہاتھیوں میں ابراہیم کا سفید بھورا ہاتھی بھی شامل تھا۔ ابراہیم بھی بھاگ رہا ہے۔"

"طاہر بیگ، ٹھہر جائیے۔ قاسم تائے مرزا!"

کوئی چالیس سال کا ایک ہٹا کٹا بیگ بابر کے سامنے آیا۔ یہ بیگ ترکستان میں پیدا اور بڑا ہوا تھا اور تیمور خاندان کا دور کا رشتے دار بھی تھا۔ قاسم تائے گزشتہ پندرہ برسوں سے بابر کے دربار سے وابستہ تھا۔

"اگر ابراہیم بھاگتا ہوا دہلی یا آگرہ پہنچ کر قلعہ بند ہونے میں کامیاب ہو گیا تو جنگ بہت طول کھینچ جائے گی" بابر نے قاسم تائے سے کہا۔ "ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ دہلی اور آگرہ پر لڑائی کے بغیر ہی قبضہ ہو جائے.... قاسم تائے مرزا، آپ محفوظ فوج کے ایک ہزار لشکریوں کو ساتھ لے لیجیے بابا چوہرا کو ان کے سپاہیوں سمیت اور طاہر بیگ کے دستے کو بھی ساتھ لے لیجیے اور تیز رفتاری سے ابراہیم کا تعاقب کیجیے۔ دہلی تک پیچھا کیجیے اور اگر وہ آگرہ کی طرف بھاگے تو آگرہ تک پیچھا کیجیے!"

"یہ خادم اپنی جان پر کھیل کر آپ کے حکم کی تعمیل کرے گا"

"اس معاملے میں میری ساری امیدیں آپ ہی سے وابستہ ہیں۔ اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔ تباہ کر دیجیے ابراہیم کو۔ خدا کرے آپ کا بال بھی بیکا نہ ہو"

"آمین!"

فاتح فوج کے ہراول میں رہنا کتنے فخر کی بات تھی، طاہر کو لگا جیسے اس کے انگوٹھے کا درد یکلخت بند ہو گیا ہو۔ وہ پچھلے دستے کے ساتھ تیزی سے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا قاسم تائے کے لشکریوں کی اگلی صف میں پہنچ گیا۔

آفتاب سمت الراس پر پہنچ چکا تھا۔ بلا کی گرمی پڑ رہی تھی جس سے بھاگنے والے بھی پریشان تھے اور تعاقب کرنے والے بھی۔ دشمن فراتفری کے عالم میں پیچھے ہٹ رہا تھا لیکن اب بھی کافی طاقتور تھا۔

آخر سفید جھول والا ہاتھی کہاں تھا؟ کہیں سلطان ابراہیم ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر تو نہیں سوار ہو گیا تھا؟

قاسم تائے اور طاہر نے دشمن کی ہاری ہوئی، بے ترتیبی سے پیچھے ہٹتی ہوئی فوج کے دونوں بازوؤں سے آگے نکل کر کئی سپاہیوں کو پکڑ لیا۔ ان قیدیوں سے قاسم تائے نے بابر کی فوج میں شامل ایک ہندوستانی کے ذریعے بات چیت کی۔

"ان سے کہو کہ اگر یہ بتا دیں گے کہ ابراہیم لودھی والا دستہ کدھر گیا ہے تو ہم انھیں آزاد کر دیں گے۔"

ایک قیدی فوراً ہی بول پڑا:

"کہتے ہیں کہ ابراہیم کا ہاتھی گھمسان کی لڑائی کے دوران ہی زمین پر ڈھیر ہو گیا تھا اور خود سلطان بھی لڑائی میں کام آ گیا۔"

دو زبانیں جاننے والے ہندوستانی نے ترجمہ کر دیا لیکن قاسم تائے کو یقین نہ آیا اور اس نے سخت لہجے میں کہا

"ہمارے سپاہیوں نے ابراہیم کو بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس شخص سے کہو کہ سچ بتائے ورنہ سر قلم کر دیا جائے گا!"

لیکن قیدی نے ایک بار پھر کہا کہ ابراہیم میدان جنگ میں ہلاک ہو چکا ہے۔ ایک دوسرے قیدی نے قیاس ظاہر کیا کہ بہت ممکن ہے ابراہیم ہارے ہوئے دستوں کے اس ہجوم میں موجود ہو جو جان بچا کر بھاگا جا رہا ہے۔ ایک اور قیدی نے دائیں جانب بھاگتے ہوئے دستوں کی طرف اشارہ کر دیا۔

قاسم تائے نے ان قیدیوں کو ان کے ہاتھیوں سمیت اپنے سپاہیوں کی نگرانی میں ٹیلے کی طرف بابر کے پاس روانہ کر دیا اور خود دشمن کی فوج کی طرف لپکا۔ قریب پہنچ کر اس نے دیکھا کہ یہ فوج خاصے منظم انداز سے واپس جا رہی تھی کیونکہ ہاتھی اور گھوڑے اس کے دونوں پہلوؤں پر چل رہے تھے۔ یہ راجپوت تھے جو واقعی بہت بہادر اور کامیاب فوجی تسلیم کیے جاتے تھے۔ قاسم تائے ایک پہلو سے اس فوج کے آگے جا پہنچا اور بابا چوچک اور طاہر دوسرے پہلو سے۔ راجپوتوں نے یہ دیکھ کر تعاقب کرنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے، تیر کمان اور تلواریں سنبھالیں اور مقابلے پر آمادہ ہو گئے۔

طاہر نے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے کمان پر تیر لگا کر نشانہ درست کیا لیکن تانت کو کھینچتے ہی اسے پتا چلا کہ انگوٹھا تو بیکار ہو چکا ہے۔ اسے تانت اور تیر کے پر والے سرے کو انگوٹھے بغیر دو انگلیوں ہی سے پکڑنا پڑا تاہم تیر نشانے پر لگا اور ننگی تلواریں لیے سامنے سے حملہ آور ہونے والوں میں سے ایک سانولا سوار اپنے گھوڑے کی ایال پر منہ کے بل گر پڑا۔ لیکن طاہر کو دوسرا تیر چلانے کا موقع نہ مل سکا کیونکہ راجپوت اپنے گھوڑوں کو تیزی سے دوڑاتے ہوئے بہت قریب آ گئے۔ ان میں سے ایک جسیم شحیم گھڑسوار گرز اٹھائے ہوئے تھا۔ طاہر نے فوراً ہی تلوار نیام سے نکالی اور دشمن کے اٹھے ہوئے ہاتھ پر وار کرنے کے لیے گھوڑا اس کی طرف بڑھایا۔ حریف نے خود کو اس وار سے بچا لیا، اس نے گرز سے طاہر کی

تلوار دور سے ٹکرائی اور دوسرے ہی لمحے طاہر کو صرف انگوٹھے ہی میں نہیں بلکہ ... ناقابل برداشت درد کا احساس ہوا۔ اسے پتا بھی نہ چلا کہ کب اس کی تلوار ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ طاہر نے بڑی پھرتی سے دوسرے راجپوت کے وار سے بچ کر کمر میں لٹکتے ہوئے خنجر کو نکالنے کی کوشش کی لیکن اتنے میں ... محسوس ہوا کہ شدید درد کی ایک لہر اس کے شانے سے گردن اور کھوپڑی کی طرف بڑھتی جا رہی ہے۔ انگوٹھے کا درد غائب سا ہو گیا اور آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ وہ بھی چیخ کے بل اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر ڈھیر ہو گیا ... حالت سے ایک اور زوردار وار دیا جو خالی گیا۔ طاہر نے سوچا "یہ تو مجھے گرا کر ہی دم لے گا" اور اس سے جانے کیوں دل ہی دل میں دعا مانگی "خدا کرے میں جلد ہی بے ہوش ہو جاؤں"

طاہر کو تیسرے وار سے جو مہلک ثابت ہو سکتا تھا، محمد نے بچایا۔ اس نے اپنے تیر کی زوردار ضرب سے راجپوت کو مار گرایا۔ پھر اس نے گھوڑے سے نیچے جھکتے ہوئے طاہر کو فوراً ہی پکڑ لیا اور اس طرح وہ دونوں اس تصادم کی جگہ سے بھاگ نکلے۔

۳

ہمایوں نے دہلی پہنچ کر کسی لڑائی کے بغیر ہی شہر اور قلعے پر اپنا قبضہ قائم کر لیا اور ابراہیم لودھی کے خزانے پر قابض ہو گیا۔ پھر وہ اپنے تین سو سپاہیوں کے ساتھ شہر کو دیکھنے کے لیے نکلا۔

وسیع و عریض اور بے کراں ملک، عظیم الشان اور دور دور تک آباد شہر

دہلی میں اونچے نیچے ٹیلے بھی موجود تھے لیکن شہر کا زیادہ تر حصہ ہموار اور ہرے بھرے علاقوں پر مشتمل تھا۔ مکانات بے شمار تھے لیکن سڑکوں پر لوگ برائے نام ہی نظر آ رہے تھے۔ دراصل بیرونی حملہ آوروں کے خوف سے اہل شہر اپنے گھروں میں بند بیٹھے تھے، دروازوں کے شگافوں سے کبھی کبھی باہر جھانک لیتے تھے اور بس۔

ہندوؤں کے مختلف گروہ اپنے مقدس دریا جمنا کے کنارے اپنے مردوں کی آخری رسوم ادا کر رہے تھے۔ مردوں کو خوشبودار لکڑی والی چتاؤں پر نذر آتش کر کے ان کی راکھ دریا میں بہا دی جاتی تھی۔ یہ راکھ ابدیت کا جز بن جاتی تھی۔ آخری رسوم ادا کرنے میں کچھ اس طرح کھوئے ہوئے لوگ گویا کہ خود ان کی روحیں بھی دوسری دنیا میں پہنچ گئی ہوں، اس فانی دنیا کی فکروں سے اتنے بے نیاز تھے کہ اپنے شہر پر قابض ہو جانے والے غیر ملکیوں کی طرف بھی توجہ نہیں مبذول کر رہے تھے۔

ہمایوں کو بازار میں برہنہ پا عورتیں اور بچے ہاتھوں میں پھول لیے کہیں جاتے دکھائی دیے۔ اسے کچھ سفید ریش بوڑھے بھی نظر آئے اور ان کے ہاتھوں میں بھی پھول تھے۔ برہنہ پا افراد اور ہاتھوں میں پھول، ہمایوں کو یہ نظارہ عجب سا لگا۔

"ہم لوگ شہر کے ایک خاص بازار سے گزر رہے ہیں" اسے ہندو بیگ نے بتایا جو ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔
"آج کوئی مذہبی تہوار ہے۔ یہ لوگ بت خانے میں عبادت کرنے جا رہے ہیں۔ دیوتاؤں سے ان کے فضل و کرم کی دعائیں مانگیں گے۔ ویسے ہندوستان میں بہت سے تہوار ہوتے ہیں تقریباً ہر مہینے میں۔"

"عجیب ملک ہے" ہمایوں نے شانے اچکائے۔

ایک جگہ کسی بہت بڑی پرانی عمارت کے اوپر بھی ناگوں، دموں والے کالے منہ والے پھرتیلے بندر اچھل کود رہے تھے۔ ان کے بچے بڑی تیزی کے ساتھ چھلانگ لگا کر چھت سے پیپل اور برگد کے درختوں پر جاتے اور دوبارہ چھت پر لوٹ آتے تھے۔ بندر ایک دوسرے کا پیچھا کرتے ہوئے زمین پر بھی اتر آتے تھے۔ عمارت کے آس پاس اور احاطے سے گزرتے ہوئے لوگ ان لنگوروں کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں دے رہے تھے

ہمایوں کے ہمراہیوں میں شامل ایک بیگ کی آنکھیں آسان شکار کو دیکھ کر چمک اٹھیں۔ اس نے تیر کمان سنبھالی لیکن ہندو بیگ نے اسے فوراً ہی ٹوک دیا

"بندر پر ہتھیار چلانا بہت بڑا گناہ تصور کیا جاتا ہے۔ جو ایسا کرتا ہے اس پر مصیبت نازل ہو سکتی ہے۔" ہندو بیگ کی آواز بظاہر بڑی غیر جذباتی تھی۔

خواجہ کلاں بیگ نے جو ہمایوں کے دائیں جانب چل رہا تھا، مسکراتے ہوئے پوچھا

"اور محترم بیگ، ہمیں گایوں کی بھی حفاظت کرنی چاہیے نا؟"

"بہت مشکل سے حاصل کی جانے والی چیز بہرحال مقدس ہوتی ہے" ہندو بیگ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "ہندوستان کی گرمیوں میں گائے پالنا آسان نہیں ہوتا۔ اور اس سے حاصل ہونے والی پانچ چیزیں ہندوؤں میں مقدس بھی مانی جاتی ہیں۔"

ہمایوں نے اس نوک جھونک کو روکنے کے لیے کہا

"ہمیں اپنے بادشاہ کے اس حکم کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ ہمیں ہندوستانی رسوم و رواج کا احترام کرنا چاہیے، ایسی کوئی بھی حرکت ہرگز نہ کرنی چاہیے جس سے رعایا کی عزت اور مذہب کو ٹھیس پہنچے۔"

خواجہ کلاں بیگ نے اپنا دایاں ہاتھ سینے پر رکھ کر کہا

"عالی جاہ کا ارشاد ہمارے لیے قانون کی حیثیت رکھتا ہے، ولی عہد۔ میں تو اپنے دوست ہندو بیگ سے مذاق کر رہا تھا۔"

اتنے میں ان گھڑسواروں کو اونچے اونچے درختوں کے درمیان کوئی بلند مینار دور سے چمکتا ہوا نظر آیا

"وہ قطب مینار ہے۔" ہندو بیگ نے احترام کے ساتھ بتایا۔

یہ لوگ قطب مینار کے پاس پہنچے تو ہمایوں گھوڑے سے اتر کر بیگوں کے ساتھ مینار کی بلندترین منزل تک چڑھ گیا۔ وہاں سے صاف طور پر دکھائی دیا کہ مینار کے قریب ہی واقع ایک سیاہ ستون کے اردگرد کچھ لوگ کھڑے ہوئے ہیں۔

"اور وہ کیا ہے؟"

"وہ ایک آہنی ستون ہے جو چھ سو سال پرانا بتایا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ کوئی شخص اس ستون سے پیٹھ لگا کر پہلوؤں سے اپنے ہاتھوں کو اس کے پیچھے لے جائے اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے کو چھو لیں تو وہ بہت خوش نصیب ہوگا اور اس کی دلی مراد بر آئے گی۔"

ہمایوں جو بیگوں کے درمیان اپنے چہرے پر سنجیدگی طاری کیے ہوئے تھا، یہ سنتے ہی نوجوانوں کے سے جوش کے ساتھ کہہ اٹھا

"چلیے... آزما کر تو دیکھیں!" وہ دو پہریدار سیڑھیوں سے جلدی جلدی نیچے اترنے لگا۔

ان دونوں کے قریب پہنچتے ہی ستون کے قریب موجود لوگ ایک طرف ہٹ گئے۔

"ہندو بیگ صاحب، ذرا دکھائیے تو کیسے کیا جاتا ہے۔"

ستون کے نیچے اور اوپر کے حصے سیاہ تھے لیکن درمیانی حصہ بے شمار شخصوں اور ہاتھوں کی رگڑ کھاتے کھاتے سنہری ہو کر چمک رہا تھا۔

ہندو بیگ نے ستون سے پیٹھ لگا کر ہاتھ پیچھے کیے لیکن لاکھ کوشش کے باوجود ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے سے چھونے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

بیگ یہ دیکھ کر قہقہے لگانے لگے۔

ہمایوں بھی ہنس پڑا۔ اس نے خود بھی کوشش کی لیکن ہندو بیگ ہی کی طرح ناکام رہا۔ بیگوں اور سپاہیوں نے بھی قسمت آزمائی کی لیکن بے سود۔ آخر میں لمبے ہاتھوں والے ایک دبلے پتلے سمرقندی نوجوان کو کامیابی نصیب ہوگئی۔

ہمایوں نے اسے انعام کے طور پر مٹھی بھر چاندی کے سکے دیے دیے۔

دہلی کی گلیوں میں منڈلانے والے فاتحین کے درمیان کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنھیں ہر وقت عمدہ سے عمدہ مال غنیمت ہی کی فکر لگی رہتی تھی۔ ان میں یار حسین بھی شامل تھا جو کبھی درہ خیبر کے جنوب میں واقع رستوں پر مسافروں کو لوٹنے والا ڈاکو تھا لیکن معاف کر دیے جانے کے بعد اب بیگ بن چکا تھا۔ وہ سوتے جاگتے ویسے ہی مال کے خواب دیکھتا رہتا تھا۔ کئی بار سن چکا تھا کہ ہندوؤں کے مندروں میں دولت بھری ہوئی ہے اس لیے اپنے سپاہیوں کو لے کر دہلی کے سرے پر واقع ایک مندر میں پہنچ گیا۔ کتنی دولت بھری تھی یہاں! کیسے بیش بہا موتی جڑے ہوئے تھے دیویوں دیوتاؤں کی مورتیوں میں!

مندر کی مرمریں دیواروں پر آفتاب کی شعاعیں رقصاں تھیں۔ سن رسیدہ پجاری حس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے، بھگوان کرشن کے بہت بڑے بت کے سامنے ہاتھ جوڑے محویت کے عالم میں کھڑا تھا۔ عورتیں، بوڑھے اور بچے بھی بت کے سامنے سر جھکائے خاموش کھڑے ہوئے تھے۔

"منتشر کر دو ان کفار کو!" یار حسین کا حکم گونجا اور اس کے سپاہی پوجا میں کھوئے عقیدت مندوں کو دھکیلتے اور گراتے ہوئے بت کی طرف لپکے۔ انھوں نے جلدی سے سیڑھی لگائی اور بت میں لگے ہوئے جواہرات کو اکھاڑنے اور زیورات کو اتارنے لگے۔

ہمایوں نے ان لٹیروں کو عین واردات پر دیکھ لیا۔

"میں شاہ بابر کی طرف سے حکم دے رہا ہوں!" وہ آگ بگولا ہو کے چیخ رہا تھا۔ "خبردار جو کسی نے ہیروں موتیوں کو ہاتھ لگایا! فوراً نیچے اترو!"

یار حسین مندر کے اندر زیادہ اجالا نہ ہونے کے باعث ہمایوں کو پہچان نہ سکا

"یہ چیخ کون رہا ہے؟ تجھے ان کفار کے بتوں کی حفاظت کرنے کی کیا پڑی ہے؟" اور اس نے سیڑھی پر چڑھے ہوئے سپاہی کو حکم دیا: "خنجر سے اکھاڑ لو جواہرات کو!"

سپاہی نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اتنے میں ہمایوں کا چلایا ہوا تیر اس کی کلائی میں آن لگا اور خنجر جھنکار کے ساتھ فرش پر

گر گیا۔ سپاہی نے درد کی شدت سے چیختے ہوئے اپنی کلائی تھام لی اور تیزی سے پیچھے ہٹتے ہٹتے گرتے بچا۔
یار حسین نے تلوار نیام سے کھینچ لی۔
”ارے تو ہے کون؟“ وہ ہمایوں کی طرف جھپٹا۔
ہندو بیگ فوراً ہی تلوار کھینچ کر آگے آگیا۔
”ارے بیگ، ہوش میں آؤ۔ یار حسین بیگ، تمھارے سامنے شہنشاہ بابر کے ولی عہد کھڑے ہوئے ہیں!“
یار حسین فوری طور پر ہمایوں کو نہ پہچان سکا۔ اس بات کا یقین ہمایوں کے چوغے کو غور سے دیکھ کر ہی ہوا۔ یہ چوغہ جس میں موتی ٹنکے ہوئے تھے، پہلے بابر پہنا کرتا تھا۔ پانی پت کی جنگ سے قبل ہمایوں نے ابراہیم لودھی کے سپہ سالار حمید خان کو ایک تصادم میں بری طرح شکست دے دی تھی اور بابر نے اس کی شجاعت اور پرعزم سپہ سالاری سے خوش ہو کر فوری اپنا یہ شان دار چوغہ اتار کر ہمایوں کو پہنا دیا تھا۔ اس موقعے پر سب بیگوں کے ساتھ یار حسین بھی موجود تھا۔
ہمایوں اس وقت وہی چوغہ زیب تن کیے ہوئے تھا جس کے شانے ڈھیلے ہونے کی بنا پر کچھ لٹکے ہوئے سے تھے۔
”معافی کا خواستگار ہوں محترم ولی عہد۔ یہ خادم آپ کو پہچان نہیں سکا تھا“ یار حسین نے کہا اور اپنی جگہ سے پیچھے ہٹ گیا۔
”اپنی تلوار مجھے دے دیجیے!“ ہمایوں نے حکم دیا۔
”لیکن ولی عہد، میں تو ان بیگوں میں سے ہوں جو انتہائی وفاداری کے ساتھ شاہی خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔“
”عبادت گاہوں میں نیام سے کھینچی جانے والی تلوار باعث ننگ ہے۔ میں یہ تلوار فرماں روا کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔ آپ سے صرف یہ کہوں گا کہ... آپ نے لوٹ مار سے جو توبہ کی تھی وہ شاید وقتی ہی تھی۔ کیا آپ کو اس شاہی فرمان کا علم نہیں ہے کہ ہندوستان میں، خاص طور سے ہندوؤں کے مقدس مقامات پر کسی ایسی کارروائی کی اجازت نہ دی جائے گی جو رضائے الٰہی کے مطابق نہ ہو؟ ارے بیگ، آخر اتنی ہوس کاہے کے لیے؟ ہم نے اپنے دشمن ابراہیم لودھی کو شکست دی ہے، اس کے خزانے سے ہمارے سارے سپاہیوں کو حصہ ملے گا۔ آپ کو بھی حصہ ملتا جو آپ کی ضروریات سے کہیں زیادہ ہوتا۔ یہ لوگ“ ہمایوں نے ہندوؤں کی طرف اشارہ کیا، ”ہمارے دشمن تھوڑی ہیں۔ یہ لوگ بھی عبادت کر رہے تھے، اپنے خدا ہی کی سہی لیکن بہرحال عبادت کر رہے تھے۔ ہم قانون کے بموجب حکومت کرنے آئے ہیں جبکہ آپ لوٹ مار پر اتر آئے ہیں۔ ہندوؤں کے بتوں سے ہیرے تو ابراہیم لودھی کے سپاہیوں تک نے نہیں اکھاڑے تھے۔ ایسی کمینی حرکت کی جرأت تو صرف آپ ہی نے کی ہے۔ یہ بات کیا ہم سب کے لیے باعث شرم نہیں ہے؟ یار حسین کی تلوار چھین لو! اسے اور اس کے سپاہیوں کو زنداں میں بند کر دو! ہمارے سارے سپاہیوں کو اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیے!“
ہمایوں کے حکم کی تعمیل کر دی گئی تو اس نے ہندو بیگ کے ذریعے پجاری، اور پوجا کرنے کے لیے آئے ہوئے افراد کو مخاطب کیا۔
”شہنشاہ بابر آپ سب پر واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم لوگ آپ کے دشمن نہیں ہیں۔ آپ کا مذہب البتہ مختلف ہے اور آپ کو ہمارے قانون کے مطابق جزیہ ادا کرنا ہوگا۔ تاہم جو لوگ ہمارے خلاف تلوار اٹھائیں گے وہ اطمینان

ے ساتھ زندگی گزار سکیں گے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ تمام انسان ایک ہی خدا کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ [illegible]
ساتھ ہندوستان آئے ہیں۔ ہم اس عظیم ملک کو ہندوؤں کے ساتھ مل کر خوشحال بنانا چاہتے ہیں۔ [illegible]
شانہ ملا کر [illegible] اور ہم آپ کی عبادت گاہوں کا احترام کریں گے۔

ہمایوں کی اس بات کو جس کا ہندو بیگ نے ترجمہ کیا، انتہائی خاموشی سے سنا گیا۔ لوگوں نے بڑی توجہ سے سنا
اور تائید و پسندیدگی کے اظہار کے طور پر اپنے سر ہلا دیے۔ ہمایوں مندر سے چلا گیا تو پجاری ایک بار پھر [illegible] سامنے
ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے اب اپنی حفاظت کے سلسلے میں حسن مندی کا اظہار کر رہا تھا [illegible] آنے والوں
یقین دلا رہا تھا کہ دیوتا کے جواہرات اتارنے کی ذلیل کوشش کرنے والے [illegible] مرضی سے مطابقت رکھتی
ہے۔

۴

ہندوستان سے دور، زرفشاں دریا کے کناروں پر بہار کا موسم شروع ہو کر اپنے جوبن پر تھا اور پھولوں کے نمودار ہونے کا زمانہ شروع ہی ہوا تھا لیکن جمنا کے کناروں پر موسم گرما کے شدید گرمیوں کے ایام کی سی گرمی پڑ رہی تھی۔

بابر دن بھر چلچلاتی دھوپ میں گھوڑے پر سوار رہا تھا اس لیے شام ہوتے ہوتے اس کا جسم تمام دن دھوپ میں رکھے رہنے والے تانبے کے برتن کی طرح تپنے لگا۔ اس نے قیامت کی گرمی سے عاجز آ کر جمنا کے کنارے جانے کا فیصلہ کیا۔

گرمی کے علاوہ شراب نے بھی جسے وہ دوپہر کے بعد ڈھیروں چڑھا گیا تھا، بدن میں آگ سی لگا رکھی تھی۔ اس کے بیگ کابل میں بادہ نوشی کے عادی ہو گئے تھے اور اب ہندوستان میں بھی ''عظیم بادشاہ'' کو پانی پت میں حاصل ہونے والی ''عظیم فتح'' کی خوشی میں تقریباً روز ہی پینے پلانے کی محفلیں منعقد کرتے رہتے تھے۔

بابر نے تاب اور دوسری شرابیں یکے بعد دیگرے مسلسل پیتا رہتا تھا جو اس کے سینے میں ناقابل برداشت درد پیدا کرتی اور گرمی و گھٹن بھری راتوں میں نیندیں حرام کر دیتی تھیں۔ شبانہ بادہ نوشی کے بعد صبحوں کو کھانسنے پر اکثر اس کے منہ سے خون نکل آتا تھا۔ طبیب یوسفی جو بابر کے قیام ہرات کے زمانے ہی سے اس کا علاج کرتا آ رہا تھا، بار بار ترک مے کی التجائیں کرتا رہتا تھا۔ خود بابر بھی بے خوابی سے پریشان ہو کر کئی بار عہد کر چکا تھا کہ بادہ و جام کو اب کبھی ہاتھ نہ لگائے گا۔ لیکن دن میں اس کا جی ذرا بھی کہیں سے کوئی خوش خبری موصول ہوتی تو وہ فوراً ہی مے نوشی کے لیے تڑپ اٹھتا تھا۔ پینے کا سلسلہ شروع کرنے کے بعد اس پر ہلکا ہلکا نشہ طاری ہو جاتا تو اس کے بیگ کسی نہ کسی خوشی کے موقعے کا تذکرہ کر کے اصرار کرنے لگتے تھے کہ شغل مے جاری رہے۔ ان لمحات میں بابر بیگوں کی اس تجویز کو فوراً ہی مان لیتا تھا۔ آج بھی یہی ہوا تھا۔ دوپہر کو اس نے نشے کے عالم میں خود ہی بیگوں کو شام ہی کی نہیں بلکہ تمام شب کی بادہ نوشی کی دعوت دے دی تھی۔ ''پیئے، رات کو دریا پر جشن منائیں'' اس نے شام کو کہا حالانکہ اس کا بدن تھکن سے چور چور تھا اور دوپہر کی پی ہوئی مے کے خمار سے سر ابھی تک بھنا رہا تھا۔

بابر اپنے مقربین اور محافظین کے ساتھ جمنا کے کنارے پر پہنچا تو وہاں اسے ایک برہمن، کچھ عورتیں اور جوان و بوڑھے مرد دکھائی دیے۔ کسی مردے کی آخری رسومات ادا کر رہے تھے۔ بابر نے سوچا کہ دیکھیں یہ رسوم کیسے ادا کی

جاتی ہیں۔ وہ گھوڑا اس طرف بڑھا دیا جہاں لوگ اکھٹے

لیکن یہ لوگ جو پانی پت کی جنگ کے بعد تک قصبے میں نہیں رہ سکے تھے ... تھے بلکہ وہ بھیجے گئے تھے
ہوئے۔ آخری رسوم ادا کرنے کے لیے آئے ہوئے افراد میں سے صرف تین ہی افراد وہاں رہ گئے۔ ... چتا کے قریب
کھڑی ہوئی نوجوان بیوہ، ایک بوڑھی عورت اور برہمن جس کی کمر جھکی ہوئی تھی۔ چتا پر لیٹے ہوئے مردے کے سر اور
پیشانی کے زخم سے اندازہ ہوتا تھا کہ موت تلوار کے وار سے واقع ہوئی ہے۔ دراصل وہ بابر کے سپاہیوں کا دلیری کے
ساتھ مقابلہ کرنے والوں میں سے ایک تھا۔ نوجوان بیوہ اپنے سنگھار کی وجہ سے بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ بابر نے اس
کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں دنیاوی راحتوں کو ٹھکرانے اور سر پر منڈلاتی ہوئی موت سے
بغل گیر ہونے کے عزم کی آئینہ دار تھیں۔

رواج کے بموجب مرنے والے کی بیوی بچی کچھی زندگی بیوگی کی حالت میں گزارتی تھی یا پھر شوہر کی لاش کے ساتھ
چتا پر ستی ہو جاتی تھی۔ اس عورت نے دوسرے راستے کا انتخاب کیا تھا۔

بابر نے ہندو بیگ سے پوچھا

"کیا یہ عورت واقعی اپنے شوہر کی میت کے ساتھ جل مرے گی؟ مردے کی خاطر یہ جیتی جاگتی خوبصورتی تباہ ہو
جائے! آخر یہ کیسی بے انصافی ہے؟ اس برہمن کو میری طرف سے حکم دیجئے کہ عورت کو یہاں سے واپس لے جائے!"

ہندو بیگ نے شک کے ساتھ سر ہلا دیا پھر اپنے گھوڑے کو چتا سے کچھ دور قریب بڑھا لے گیا اور برہمن کو بابر کے حکم
سے مطلع کیا۔

عورت تیزی کے ساتھ بابر کی طرف مڑی۔

"تو ہی ہے حملہ آوروں کا بادشاہ؟" اس نے پوچھا اور بابر زبان نہ جاننے کے باوجود عورت کے اس سوال کو بھی سمجھ
گیا اور اس بات کو بھی جسے عورت نے فوراً ہی چیختے ہوئے کہا

"آخر تو یہاں کیوں آ گیا؟ تیرے ہی حکم پر تو میرے شوہر کو ہلاک کر دیا گیا تھا! تیرے بس میں ہو تو میرے شوہر کو
دوبارہ زندہ کر دے، کر دے نا زندہ! اس صورت میں میں بھی زندہ رہوں گی!"

اس کے بعد عورت نے فوراً ہی برہمن کی طرف مڑ کر جلدی جلدی کہا

"میں شوہر کے سر کو گود میں رکھ کر جیسے ہی چتا پر بیٹھوں ویسے ہی آپ آگ لگا دیجئے!"

ہندو بیگ بادلِ ناخواستہ عورت کی ان باتوں کا ترجمہ کر کے بابر کو بتانے لگا۔ اس اثنا میں برہمن نے گھبراہٹ کی
حالت میں چتا میں آگ لگا دی۔ نوجوان عورت لپک کر چتا پر بیٹھ گئی اور اس نے شوہر کے سر کو اپنی گود میں رکھ لیا۔

"روکو، روکو اسے، عورت جل مرے گی؟" بابر زور سے چلایا!

"چلا جا حملہ آور، دور ہو جا میری نگاہوں سے! لوٹ جا اپنے ملک کو!" بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گھری عورت چیخ
اٹھی۔

بابر نے یہ دردناک چیخ سنی اور دیکھا کہ عورت شعلوں کی پروا نہ کرتے ہوئے شوہر کی میت کو لپٹائے ہوئے ہے۔
اسے تیز چراند کے باعث متلی آنے لگی۔ گھوڑے کا رخ موڑ کے چابک مارا اور وہاں سے چل دیا۔

جمنا کی ایک بند کھاڑی میں جہاں شام کے وقت ماحول ٹھنڈا اور پر سکون تھا، بہت بڑی اور آراستہ دو منزلہ کشتی بابر کی

منتظر تھی۔ بیچے کا باب وارا واغ، قسم کے کھانے پکائے گئے تھے اور ضیافت کی تیاریوں کو آخری شکل دی جا رہی تھی۔
معصوم اور خاموش بابر کشتی کی چھت پر گیا جہاں بڑے سے چھتر کے نیچے اس کے بیٹھنے کے لیے ایک چبوترہ خاص طور سے آراستہ کیا گیا تھا۔

لیکن وہ خوبصورت بیوہ اپنے کھلے ہوئے بالوں اور ترک دنیا کے جذبات سے معمور آنکھوں کے ساتھ اب بھی اس کی نگاہوں میں منڈلا رہی تھی، ابھرتے ہوئے شعلوں میں لپٹی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ نیچے سے تیتے سالنوں کی عجیب خوشبوئیں فضا میں پھیل رہی تھیں لیکن بابر کے ذہن و دماغ پر اب بھی وہی گھن پیدا کرنے والی چتا سوار تھی۔ اس نے حکم دیا کہ کھانوں کی تیاری فوراً بند کر دی جائے۔

"لیکن اعلیٰ حضرت، ضیافت کا کیا ہوگا؟" میر مطبخ نے حیرت سے پوچھا۔

"سب روک دیجیے! یہ ساری بھاگ دوڑ بند کرا دیجیے!"

چند لمحات کے اندر ہی کشتی پر سناٹا چھا گیا۔

لیکن سناٹے میں کچھ اور بھی زیادہ واضح طور پر بابر کے کانوں میں ہندو بیوہ کے ستی ہونے سے قبل چیخ چیخ کر کہے ہوئے الفاظ گونجنے لگے "... تو یہاں کیوں آ گیا، حملہ آور؟ دور ہو جا میری نگاہوں سے! لوٹ جا اپنے ملک کو!"

کتنا مسرور ہوا تھا وہ پانی پت کی جنگ میں اپنی فتح پر! یقیناً وہاں ایک خلیج منہ پھاڑے ہوئے اس کی منتظر تھی لیکن اس نے دلیری کے ساتھ چھلانگ لگا کر اسے پار کر لیا تھا اور پھر جنگ اور خون خرابے کے بغیر ہی دہلی اس کے قبضے میں آ گئی تھی۔ اسے کتنا زیادہ یقین تھا اس بات کا کہ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا! لیکن جو کچھ اس کے وجود کے اندر پنہاں تھا۔ جنگی مہم کے دوران اس کے سپاہیوں کے ہاتھوں ہونے والی لوٹ مار اور قتل و غارت کی یادیں، موت کا شکار ہو جانے والوں کا غیر ارادی شمار، صرف انھیں کا نہیں جو مسلح ہو کر اس کے مقابلے کے لیے نکلے تھے بلکہ ان پرائے بچوں کا بھی شمار جو اس کی فتوحات کے نتیجے میں یتیم ہو گئے تھے، ان نوجوان عورتوں کا بھی شمار جو بیوہ ہوئی تھیں (یا خدا! کیا وہ عورتیں بھی اسی عورت ہی کی طرح زندہ جل کر خاک ہوئی جا رہی تھیں؟!)۔ ساری پنہاں اذیتیں، دل کے تمام پنہاں ناسور ایک دم ہرے ہو گئے، چیخ اٹھے، لعنت ملامت کرنے لگے، کچوکے لگانے لگے۔ اس تاسف کے سامنے "سچے مذہب" اور یہاں تک کہ مختلف ذاتوں اور مذاہب والے عظیم ملک کو متحد کرنے اور پر آسائش بنانے کے خیال کی بھی وقعت ہی کیا تھی!

فاتح کی نخوت و تکبر پر بھی دانائی اسے تسلی دینے لگی، حق بجانب ثابت کرنے لگی لیکن اس کی روح ... بابر کو یاد آیا کہ وہ اپنی اس مہم پر روانہ ہو رہا تھا تو ماہم بیگم نے کتنی تشویش ظاہر کی تھی کتنی پریشان تھی وہ۔ اس نے سوچا کہ ماہم کو بیوی اور ماں کی حیثیت سے آج کی ان تکالیف کا یقیناً پہلے ہی سے علم ہو گیا تھا۔

"تیرے ہی حکم پر تو میرے شوہر کو ہلاک کر دیا گیا تھا! تیرے بس میں ہو تو میرے شوہر کو دوبارہ زندہ کر دے، تب میں بھی زندہ رہوں گی!" بابر کو دل میں چبھتی ہوئی سی محسوس ہوئی۔ اس نے سوچا نہیں، خطرناک ترین خلیج پیچھے نہیں چھوٹ گئی ہے، یہ پانی پت کے میدان تک ہی تھی ہی نہیں۔ خلیج تو آگے ملنے والی ہے! پنجاب میں راستہ بتانے والا وہ آدمی جو جان بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا... کیا نام تھا؟... رام چند... اس نے بھی تو چیختے ہوئے کہا تھا: "حملہ آور! غیر ملکی جلاد! تو نے میرے ہزاروں بھائیوں کو قتل کرا دیا!"... ٹھیک ہی تو ہے، بھلا وہ لوگ جنھیں حملہ آوروں کے ہاتھوں آلام و مصائب کا شکار ہونا پڑا، جو حملہ آوروں سے ہونے والی لڑائیوں میں اپنے اعزا و اقارب سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو

گے، اور سوچ بھی کیا سکتے ہیں؟ ہو نہ ہو یہ تیرے شہر کیسے ہیں، تیرے گاؤں کیسے ہیں۔" اپنے ملک کو چلا جا!
کس ملک کو؟ کہاں؟ بھلا وہ کسے قائل کر سکتا ہے، بھلا کون قائل ہو جائے گا کہ وہ نیک مقاصد کے تحت ہندوستان آیا ہے؟
بدقسمتی کی اس خلیج کو کیا وہ آج نہیں تو کل پار کر سکے گا؟

بابر کے دل میں مکمل مایوسی اور بے بسی کے تکلیف دہ جذبات کی ایک نامحسوس سی جذبات سر اٹھا رہے تھے
جس کے افعال سے ہمیشہ ہی توقعات کے برعکس نتائج رونما ہوتے ہوں، جس کی فتوحات تلخ شکستوں میں بدل جاتی
ہوں۔ آخر مقدر نے اسے فتح ماوراءالنہر میں کیوں نہیں دلائی تھی؟ وہ جانتا تھا، محسوس کرتا تھا کہ پانی پت میں جو فتح
حاصل ہوئی ہے اسے صدیوں تک سراہا جاتا رہے گا لیکن آج ... ایک ایسا ... داغ تھا جسے وہ اپنی
پیشانی سے مٹا نہیں سکتا تھا۔ آج اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اپنی فتح کے سلسلے میں وہ ... شدت مسرت کی ترجمانی
کرنے والی غزل کہنے میں کیوں ناکام رہا تھا۔

اس کی بیاض میں صرف قلم زد کیے ہوئے مصرعے ہی باقی رہ گئے تھے۔ دراصل وہ ... حقیقی مسرت سے ہم
کنار نہیں ہو سکا تھا۔ اس مسرت میں تلخی مضمر تھی جواب واضح ہو گئی تھی۔

یہ تلخی ہی حقیقت تھی۔

بابر نے قلم اٹھایا اور پہلا مصرعہ چشمے کی طرح پھوٹ نکلا

بدبختی میری جان کی دشمن بلا ہوئی

اس نے اپنی نگاہیں دوری پر، سطح دریا پر جما دیں۔ دھارا بڑے پرسکون انداز سے بہہ رہا تھا، غروب ہوتے ہوئے
آفتاب کی ارغوانی شعاعیں سطح آب پر رقصاں تھیں، آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہی تھیں۔ ہر طرف پرخون دکھائی دے رہا تھا،
چاروں طرف خون ہی خون۔

بابر نے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا:

بدبختی میری جان کی دشمن بلا ہوئی
ہر کام میرا گمراہ، خطا پہ خطا ہوئی
بدقسمتی سے چھوڑا وطن، ہند آ گیا
یا رب میں کیا کروں، مری حالت یہ کیا ہوئی

شام کے جھٹپٹے میں چار چپوؤں والی ایک ناؤ جس کے اوپر شاندار چھتر تنا ہوا تھا، شاہی کشتی کے قریب آ کر ٹھہر گئی۔

پہرے دار نے پکارا

"کون ہے؟"

بابر کان لگا کر سننے لگا۔

"مرزا ہمایوں شہنشاہ سے ملاقات کی اجازت چاہتے ہیں" ناؤ پر سے کسی نے جواب دیا۔

بابر خود بھی بیٹے سے تنہائی میں دل کھول کر باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے میر خدم کو بلا کر حکم دیا

"کہہ دیجیے کہ مرزا ہمایوں فوراً ہی میرے پاس آ سکتے ہیں۔"

جلد ہی سیڑھیوں پر قدموں کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دیں اور ہمایوں اس کے قریب آ گیا۔ آنکھیں جوش و شباب کی

آئینہ دار تھیں، موچھیں ابھی تک گھنی نہیں ہوئی تھیں لیکن چوڑے چکلے شانوں اور سینے سے مردانگی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ ابھی ہمایوں کا دل نہ کسی درد سے آشنا تھا اور نہ جسم کسی قسم کی کمزوری سے۔ "اٹھارہ سال کی عمر میں تو میں بھی ایسا ہی تھا۔ اس زمانے کے بانکپن میں سے اب مجھ میں بچا ہی کیا ہے؟" بابر نے سوچا۔ اور دوسرے ہی لمحے سے محسوس ہوا کہ سینے اور پر کے درد میں اضافہ ہو گیا ہے۔

صاحب سلامت کے بعد ہمایوں نے اپنے والد کے سامنے بیٹھ کر کمر کی پیٹی کچھ ڈھیلی کی اور مسکراتے ہوئے سیپ کے کام کا ایک ڈبا نکالا، جسے وہ لباس کے نیچے سینے پر چھپا کر رکھے ہوئے تھا۔

"اسے کھول کر ملاحظہ کیجیے، عالی جاہ۔"

بابر نے ڈبے کو کسی عجلت کے بغیر کھولا تو دیکھا کہ اس کے اندر مخمل کے اوپر ستارے کی طرح جگمگاتا ہوا کوئی جوہر رکھا ہوا ہے۔ وہ حیرت میں پڑ گیا۔ ہیرا ہے کیا؟ ہیرا اور اخروٹ جتنا بڑا؟ وہ اپنی زندگی میں کتنے ہی ہیرے دیکھ چکا تھا لیکن اتنا بڑا کبھی نہیں دیکھا تھا اور تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ہیرا اتنا بڑا بھی ہو سکتا ہے۔

"یہ کون سا جوہر ہے؟"

"ہیرا۔"

"وزن کتنا ہے؟"

"کوئی سات* سو مثقال*"

"ہیرا اور اتنا بڑا؟"

"عالی جاہ، میں نے ایک جوہری کو طلب کر کے اس ہیرے کو دکھایا تھا۔ پتا چلا کہ یہ تو مشہور ہیرا کوہ نور ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا ہیرا۔ اس کی قیمت تو سونے سے بھرے ہوئے کئی صندوقوں سے بھی زیادہ ہے۔"

"میں نے سنا ہے کہ بنگال کے سلطان علاؤالدین کے پاس کوئی بہت شاندار ہیرا ہے جو دوسرے ہیروں سے کہیں زیادہ خوبصورت اور قیمتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی قیمت اتنی زیادہ ہے کہ کسی بڑی سلطنت کے پورے مہینے بھر کے اخراجات کے لیے کافی ہو سکتی ہے۔"

"اور جوہری کا کہنا ہے کہ کوہ نور کی قیمت اتنی زیادہ ہے کہ دنیائے اسلام کے سارے ملکوں کے ڈھائی دنوں کے اخراجات کے لیے کافی ہو سکتی ہے... واقعی اس نے یہی کہا تھا۔" اور ہمایوں نے قہقہہ لگایا۔

"لیکن یہ آپ کو کہاں مل گیا؟"

ہمایوں نے قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ جواب دیا

"مجھے بطور تحفہ ملا ہے... گوالیار کے مہاراجہ کے خاندان کی طرف سے۔"

"کس خوشی میں؟"

ہمایوں نے یہ قصہ شرماتے ہوئے شروع کیا لیکن دھیرے دھیرے اس کی جھجک ختم ہو گئی۔

"عالی جاہ کو یہ تو معلوم ہی ہے کہ مہاراجہ وکرماجیت جن کا خاندان متمول سلطنت گوالیار پر سو برسوں سے حکومت کرتا رہا ہے، ابراہیم لودھی کی اطاعت قبول کرنے پر کسی بھی طرح تیار نہیں ہوئے تھے اور سلطان دہلی سے عرصے تک جنگ

---

* مثقال تقریباً ۲۸ سو گرام

[illegible] تھے [illegible] تو وہ [illegible] والے [illegible] تھے [illegible] چلا آئے
تھے جہاں ان کا قیام ہو گیا تھا۔

پانی پت کی فتح کے بعد بابر نے [illegible] سے [illegible] قلعہ [illegible] سے قلعہ میں
مہاراجہ کی بیوہ بچیاں اور ایک بیٹا مقیم تھے [illegible] بیٹے [illegible] آگرہ [illegible] تھا [illegible]
آپ ہی کا [illegible] بھی [illegible] تھا [illegible] بھی خوش ہوئی [illegible] آپ [illegible]
سے بچے [illegible] واپس لوٹ جانے کی اجازت دے [illegible] ہمایوں نے نوجوان مہاراجہ سے [illegible]
لیکن اس نے کہا کہ مہاراجہ کے خاندان کو گوالیار واپس لوٹ جانے کی اجازت دے دی گئی [illegible] اللہ
کے ہاتھوں میں ہے اس لیے مہاراجہ کے خاندان کو بابر کے [illegible] تک انتظار کرنا چاہیے۔ ہمایوں نے یہ کہہ کر
مہاراجہ کے قلعے کی حفاظت کے لیے ویس بیگ کی نگرانی میں پچاس بہترین سپاہی مامور کر دیے تھے۔ رات کو
ہمایوں جو قلعے کے باغ میں نصب کیے جانے والے خیمے میں سو رہا تھا، قلعے کے اندر ہونے والے شور اور چیخوں سے
بیدار ہو گیا۔ وہ اپنے محافظین کے ساتھ فوراً ہی تیزی سے قلعے کے اندر داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ دیوان خانے
دروازے پر ویس بیگ کا ایک سپاہی خون میں لت پت مردہ پڑا ہوا ہے اور نوعمر راج کماری جس کے بدن پر کچھ نہیں تھا
اپنے برہنہ شانوں کو ڈھکنے کے لیے فرش پر گرے ہوئے ساڑھی کے پلو کو مرتعش ہاتھوں سے اٹھانے کی کوشش کر رہی ہے۔
ہمایوں نے یہ بھی دیکھا کہ پانچ سپاہی، راج کماری کے بھائی کو گھیرے ہوئے اس کے ہاتھ سے تلوار چھین رہے ہیں۔
دراصل ویس بیگ کو دونوں راج کماریوں میں سے ایک پسند آ گئی تھی جسے اس نے کچھ سپاہیوں کی مدد سے زبردستی
اپنے کمرے میں اٹھا لے جانے کی کوشش کی تھی۔ نوجوان مہاراجہ اپنی بہن کی حفاظت کے لیے آن پہنچا تھا اور اس نے
تلوار کے وار سے اس سپاہی کو مار گرایا تھا جو راج کماری کو اٹھائے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہمایوں نے فوراً حکم دیا کہ مہاراجہ کو چھوڑ دیا جائے۔

"بہن کی عزت بچانے والے بہادر کا احترام کیا جانا چاہیے" ہمایوں نے ظالم سپاہیوں کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے
ہوئے کہا۔ "کیا تم لوگوں نے اس شاہی فرمان کو نہیں سنا کہ ہندوستان کے عالی نسب افراد کے ساتھ ادب و احترام سے
پیش آنا چاہیے؟ ویس بیگ کو شاہی فرمان کی خلاف ورزی کرنے کے جرم میں کال کوٹھڑی میں بند کر دو اور زور زبردستی
میں اعانت کرنے والے ان سپاہیوں کو دس دس درے مارو!"

اس کے بعد ہمایوں نے بیوہ مہارانی سے ملاقات کی۔ اس عالی نسب اور تعلیم یافتہ عورت نے جو کئی زبانوں پر عبور
رکھتی تھی، ہمایوں سے فارسی میں کہا:

"شہزادے، اس ڈبے میں ہماری سب سے قیمتی چیز رکھی ہوئی ہے۔ لیکن میرے لیے میرے بچے دنیا کی ہر شے
سے زیادہ عزیز ہیں۔ آپ نے میری بیٹی کی عزت اور میرے بیٹے کی جان بچائی اور اس طرح مجھے میری زندگی لوٹا دی۔
اظہار ممنونیت کے طور پر یہ ہیرا آپ کی خدمت میں پیش کر رہی ہوں۔ مہربانی کر کے قبول فرمائیے..."

ہمایوں نے اس قصے کو ختم کرتے ہوئے اپنے والد کی طرف قدرے تشویش کے ساتھ دیکھا۔ "میں نے ٹھیک تو کیا"
اس نے سوچا، "لیکن ہمارے سپاہی کے ہلاک کیے جانے کا بدلہ نہ لیا جا سکا اور ویس بیگ کو بھی شاید ضرورت سے کچھ
زیادہ ہی سخت سزا ملی۔ کچھ بھی ہو، وہ بہر حال ہمارا بیگ ہے۔"

"صد افسوس کہ اتنے خوبصورت ہیرے پر بھی خون اور ظلم و جبر کے داغ لگ گئے!"

عالی جاہ، اگر مجھ سے اس معاملے میں غلطی سرزد ہوگئی ہے تو مجھے معاف کر دیجئے۔ میں نے تو سوچا تھا کہ جن لوگوں کے نزدیک عزت اور آن دنیا کے سب سے قیمتی ہیرے سے بھی زیادہ اہمیت رکھتے ہوں وہ خواہ بے دین ہی کیوں نہ ہوں، غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں۔۔۔ پھر بھی۔۔۔"

"میرے فرزند عزیز، آپ کو اپنی صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کا طرز عمل انتہائی شریفانہ تھا۔ اس ملک میں بھی فیاض اور بے لوث لوگ پائے جاتے ہیں۔ آخر ہم یہاں یوں ہی تھوڑی آئے ہیں۔ ہمیں فوجی نیک نامی تو چاہیے لیکن ایک اور طرح کی بھی، غیر فوجی نوعیت کی بھی نیک نامی کی ضرورت ہے۔ کچھ بیگ، خود غرض اور چند سپاہی میرے اعلیٰ وارفع مقصد کو نہیں سمجھتے۔ ان لوگوں کو تو کسی بھی قیمت پر بس ٹھونس ٹھونس کر پیٹ بھرنے، خوبصورت رقاصاؤں کے ساتھ رنگ رلیاں منانے، ہیکڑی جتانے اور مال دولت بٹورنے ہی کی پڑی رہتی ہے۔ یہ لوگ اپنی سفاکی، خود غرضی اور جہالت سے ہندوستانیوں میں خوف و ہراس پھیلا رہے ہیں جبکہ ہم یہاں ایک طاقتور سلطنت کے قیام کی، اس سلطنت کی اچھی اور مستحکم بنیاد رکھنے کی فکر میں ہیں۔ یہ ہے ہمارا اہم ترین مقصد۔ جب یہ مقصد پورا ہو جائے گا تو یہاں خانہ جنگیاں ختم ہو جائیں گی، چاروں طرف امن و سکون کا دور دورہ ہوگا اور علوم و فنون کی ترقی کی راہیں ہموار ہو جائیں گی۔ ہندوستان میں ایسے مسلمان اور غیر مسلم حکمراں بھی پائے جاتے ہیں جو ہمارے اس مقصد کو سمجھتے ہیں اور اسی لیے ہم سے تعاون کر رہے ہیں۔ ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ ہم زیادہ سے زیادہ ہندوستانیوں کا اعتماد حاصل کریں، ان کے دلوں کو مسخر کر لیں۔"

"دلوں کو مسخر کر لیں؟ اعتماد حاصل کر لیں؟" ہمایوں نے سوال کیا۔ "کہیں ہارنے والے بھی جیتنے والوں سے محبت کیا کرتے ہیں! وہ جزیہ بھی ادا کریں اور ہم سے تعاون بھی کریں۔ بھلا ہم ایسے لوگوں کا اعتماد کیسے حاصل کر سکتے ہیں جو ہمیں غیر تصور کرتے ہیں، جو اپنے شہروں اور گاؤں کو چھوڑ چھوڑ کر جنگلوں کو بھاگ رہے ہیں تاکہ ہماری اطاعت نہ قبول کرنی پڑے؟"

بابر کو ایک بار پھر روتی ہوئی وہ عورت یاد آگئی جس نے اسے بددعا دی تھی۔ اس نے سوچا ہاں، ہمارے اور ان لوگوں کے درمیان واقعی ایک خلیج حائل ہے۔

"ہاں، ہمارے اور ان لوگوں کے درمیان،" بابر نے نرم لہجے میں جواب دیا، "جنھیں ہمارے سپاہیوں کے ہاتھوں مصائب کا شکار ہونا پڑا، ایک گہری خلیج حائل ہے۔ ہم اس خلیج کو ایک ہی کوشش سے تو نہیں پار کر سکتے۔ اور فرزند عزیز، سچ پوچھئے تو مجھے بھی کبھی کبھی شک ہونے لگتا ہے کہ ہم اس خلیج کو کبھی پار بھی کر سکیں گے۔ لیکن مایوسی کے لمحات گزر جاتے ہیں تو میں سوچتا ہوں کہ۔۔ اور آپ نے جو واقعہ بیان کیا اس سے بھی میرے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ ہم صبر سے کام لیں گے تو دھیرے دھیرے اس خلیج کے اوپر پل تعمیر کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یہ بہت دشوار اور پیچیدہ کام ہے۔" بابر نے چوکی کے اوپر سے سیپ کے کام والے ڈبے کو اٹھایا، "پھر بھی مجھے امید ہے کہ اس مقصد کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ آخر آپ بھی تو گوالیار کے مہاراجہ کے خاندان والوں کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے نا؟ اور یاد ہے نا آپ کو کہ دہلی کی ایک عبادت گاہ میں آپ نے ہندوؤں کے جذبات کو ٹھیس نہیں لگنے دی تھی؟ آپ کے صبر و تحمل اور دانشمندی کا سب سے مناسب انعام یہی ہیرا ہے۔ اسے لے لیجئے۔۔۔"

"نہیں عالی جاہ" ہمایوں نے ڈبے کو چھوا تک نہیں اور ہاتھ سینے پر رکھ لیے۔ "یہ میں خاص آپ کے لیے لایا ہوں۔"

بابر نے ڈبے کو دوبارہ چوکی پر رکھ دیا اور بڑے جذباتی لہجے میں کہا

"خدا کا ہزار ہزار شکر کہ اس نے آپ کو دیں دار اور نیک بنایا اور ساتھ ہی ساتھ شجاعت بھی۔ پانی پت کی جنگ میں آپ نے ہی تو اپنے گھڑ سوار دستوں کے حملے سے قسمت کے ترازو کا پلڑا ہمارے حق میں کر دیا تھا۔ آپ ہی کی بدولت ہمارے لشکر کے حوصلے بلند ہو گئے تھے اور ہمیں فتح نصیب ہوئی تھی۔ ان سب کے بدلے میں تو میں آپ کو کچھ بھی نہیں دے سکا ہوں۔"

"آپ اس سے قبل ہی جو تحائف مرحمت کر چکے ہیں وہ میری زندگی بھر کے لیے کافی ہیں" ہمایوں نے بابر کی کتابچہ "مبین" کی یاد دلانے کے لیے کہا۔ "اسی وجہ سے عرصے سے میری یہ آرزو تھی کہ آپ کی خدمت میں کوئی شایان شان تحفہ پیش کر سکوں۔"

"خیر ٹھیک ہے، میں اس تحفے کو قبول کرتا ہوں۔ اب یہ میرا ہو گیا؟"

"یقیناً"

"خدا نے مجھے آپ جیسا فرزند عطا کیا ہے۔ یہ تحفہ دنیا کے سارے ہیروں سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ آپ کو خوب علم ہے کہ حکمران اور ان کے بیٹے تخت و تاج اور مال و زر کے لیے ایک دوسرے سے کس سفاکی سے، کیسے مکر و فریب سے پیش آتے رہے ہیں۔ میری تمنا ہے کہ میرے اور میری اولاد کے درمیان اس قسم کی صورت حال ہرگز پیدا نہ ہو۔ آپ میرے ولی عہد ہیں۔ خدا کرے کہ مجھ سے آپ کو اور آپ سے آپ کی اولاد کو صرف نیک منصوبے اور دوستی کا ایثار ہی بطور میراث ملے۔ ایسا ہوگا تو ہمارے وہ مقاصد پورے ہو جائیں گے جن کے لیے ہم ہندوستان آئے ہیں۔"

"ان مقاصد کی تکمیل کے لیے آپ کا بیٹا سب کچھ حتیٰ کہ اپنی جان تک قربان کرنے کو تیار ہے۔"

"مجھے اس کا یقین ہے۔ اور آپ یقین مانیے کہ اس نایاب ہیرے کے مستحق صرف آپ ہی ہیں۔ میری طرف سے اسے قبول کیجیے۔"

ہمایوں نے اس لمحے کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے فوراً ہی کھڑے ہو کر تعظیماً سر جھکایا اور ڈبے کو اپنے والد کے ہاتھ سے لے کر آنکھوں سے لگا لیا۔

"بیٹھیے، بیٹھیے" بابر نے کہا اور زور سے تالی بجائی۔ ایک خدمت گار حاضر ہوا تو بابر نے جوانوں جیسی جوشیلی اور کھنکتی ہوئی آواز سے حکم دیا "ہندو بیگ اور خواجہ خلیفہ کو یہاں بھیج دیجیے، یہ لوگ کشتی ہی پر کہیں ہوں گے۔" پھر اس نے رازدارانہ انداز سے ہمایوں کی طرف جھکتے ہوئے کہا "آگرہ کے قلعے میں سلطان ابراہیم کی ماں، اس کا بیٹا اور دیگر خاندان والے پھاٹک بند کیے بیٹھے ہیں۔ کوئی ایک ہزار سپاہی بھی قلعے میں موجود ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے آخر دم تک لڑتے رہنے کی قسم کھائی ہے۔"

خواجہ خلیفہ اور ہندو بیگ آ کر کورنش بجا لائے۔ بابر نے انھیں اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پہلے ہی کی طرح جوانوں جیسے پرجوش لہجے میں کہا:

"آپ لوگ میرے سفیر ہوں گے۔ آپ کو آگرہ جانا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ لڑائی کے بغیر ہی قلعے پر قبضہ ہو جائے

۔ جو لوگ قلعے میں موجود ہیں ان سب کی جان بخش دی جائے گی۔ سلطان ابراہیم کی والدہ کو جمنا کے کنارے ایک جاگیر دے دوں گا۔ سنا ہے کہ ابراہیم کا بیٹا کافی تعلیم یافتہ ہے۔ عربی فارسی پر کافی عبور رکھتا ہے۔ اسے میں اپنے درباریوں میں شامل کروں گا۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ ملک دادکرانی بہت لائق وزیر ہے۔ اسے میں ہندوستان کے پیچیدہ معاملات میں اپنا مشیر بناؤں گا۔ ان لوگوں سے باتیں کر کے انھیں میرے ان فیصلوں کا یقین دلا دیجیے گا اور کہیے گا کہ اگر ان کی کوئی اور خواہش ہوگی تو اس سلسلے میں بھی میں حتی الامکان ان کی مدد کرنے کو تیار ہوں۔ ان پر واضح کر دیجیے گا کہ قلعے پر دھاوا بول کر قبضہ کرنے کے لیے ہمارے پاس ضرورت سے زیادہ ہی فوج موجود ہے لیکن ہم خون خرابے اور لوگوں کے ہلاک کیے جانے پر، بیواؤں اور یتیموں کی تعداد میں اضافہ کرنے پر، باہمی مصالحت کو ترجیح دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ آپ کا کام قلعے کی تسخیر کے بجائے وہاں موجود افراد کے دلوں کو مسخر کرنا، ان کا اعتماد حاصل کرنا ہے۔'

آگرہ

۱

ابراہیم لودھی کی ماں بیدہ پانی پت کے میدان میں کام آجانے والے بیٹے کے غم میں ماتمی لباس پہنتی تھی تاہم اس نے ہندو بیگ اور خواجہ خلیفہ سے گفتگو کے دوران اپنے مفادات کی دانش مندی اور عزم سے حفاظت کرنے میں اپنے مغموم دل اور ماتمی لباس کو ذرا بھی رکاوٹ نہ بننے دی۔ یہ دونوں بیدہ کو آگرہ چھوڑنے کے لیے بڑی مشکل ہی سے راضی کر سکے۔ شاہی آن بان والی یہ متکبر سن رسیدہ عورت جمنا کے کنارے بابر کو قلعے کے پھاٹکوں کی کنجیاں سپرد کرنے لگی تو اس کی آنکھیں تو ضرور نم ہو گئیں لیکن ضبطنے میں ذرا بھی فرق نہ آیا۔

اسی ابھری چوڑی پیشانی، ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ایسی بھنویں شاید کہیں پہلے بھی تو دیکھی تھیں؟ بابر نے سوچا اور اسے اچانک پانی پت کا میدان یاد آگیا۔ کشتوں کے پشتوں میں ابراہیم لودھی کی لاش تلاش کر لی گئی تھی۔ رواج کے بموجب سر قلم کر کے نیزے پر اٹھایا گیا تھا اور لا کر بابر کے سامنے پیش کر دیا گیا تھا۔ اس وقت اسے ایسا لگا جیسے خود ابراہیم لودھی اپنی مفتوح ماں کی شکل میں فاتح کے سامنے آن کھڑا ہو۔ بابر بری طرح بوکھلا سا گیا۔ اس نے عجیب ناقابل فہم سی پرعقیدت خفت محسوس کرتے ہوئے اس مغرور عورت کی طرف دیکھ کر پوچھا کہ اس کی کوئی اور خواہش تو نہیں ہے۔

بیدہ نے جلدی سے آنسو پونچھ کر دھیرے سے جواب دیا:

''مجھے اب اور کوئی اذیت نہ دی جائے۔''

بابر نے اپنے درباریوں سے کہا:

''آپ صاحبان ان عالی نسب خاتون کو میری منہ بولی والدہ تصور کر کے احترام کریں۔''

درباریوں نے اپنے سروں کو خم کر کے اس شاہی حکم کی تعمیل پر آمادگی ظاہر کی۔ بیدہ نے بھی اظہار ممنونیت کے طور پر پل بھر کے لیے سر خم کر لیا۔ لیکن یہ کوئی بھی نہ دیکھ سکا کہ اس کی نم آنکھوں میں نفرت کی خنجر کی سی چمک نمودار ہو کر دوسرے ہی لمحے غائب ہو گئی۔ اسے پانی پت کی شکست فاش اور سلطان ابراہیم کے کام آجانے کی خبر موصول ہوتے ہی ایسا لگا تھا

بیٹے آنسوں پھوٹ پڑا ہو... اس کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی تھی کہ بیٹے کی میت ہی کو ایک بار دیکھنا نصیب ہو جائے، اس کی تجہیز و تکفین کا انتظام کرے اور اس کی قبر پر آنسو بہا کر اس کو کچھ تسکین دے سکے۔ لیکن آگرہ سے پانی پت تک تیز رفتار گھوڑے پر بھی پورے تین دنوں کا سفر تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس کے بھیجے ہوئے معتبر افراد جنگ کے ایک ہفتے بعد ہی میدانِ جنگ تک پہنچ سکے تھے۔ تب تک ہلاک ہونے والوں میں سے بیشتر کو دفن کر دیا گیا تھا اور کچھ درندے گدھوں کا شکار ہو چکے تھے۔ اس کے بھیجے ہوئے آدمیوں کو ابراہیم کی لاش نہیں مل سکی تھی، صرف اتنا ہی پتا چل سکا تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد ابراہیم کا سر قلم کر کے بابر کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔

بیٹے کی میت کی اس بے حرمتی کی خبر سن کر ماں کو کچھ اور بھی زیادہ اذیت پہنچی لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کے سینے میں انتقام کی آگ بھی بھڑک اٹھی۔ ''ہائے میرے لختِ جگر، تجھے دنیا میں قبر بھی نہ مل سکی، مجھے تیری میت سے بھی محروم کر دیا گیا'' اس کے دل سے برابر یہی آہ نکلتی رہتی تھی۔ وہ پانچوں وقت کی نماز کے بعد یہی ایک دعا مانگا کرتی تھی: ''بابر کو موت آ جائے، پروردگار! جس نے میرے بیٹے کی جان لے لی ہے میرے بیٹے کی موت سے ہزار گنی بھیانک موت نصیب ہو۔''

بیدہ کی کنیزیں اور خادمائیں شہر میں سنی ہوئی افواہیں سنا سنا کر اسے تسلی دینے کی کوشش کرتی تھیں۔ اور افواہوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ کہا جا رہا تھا کہ چارے کی قلت کی وجہ سے بابر کی فوج اپنے گھوڑوں کو کسانوں کا بچا کھچا غلہ کھلانے پر مجبور ہو گئی اور کسانوں نے بغاوت کرتے ہوئے بہت سے غیر ملکی سپاہیوں کا بیلچوں اور کلہاڑیوں سے کام تمام کر دیا۔ یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ ہندوستان کی شدید گرمی نے فاتحین کو پریشان کر رکھا ہے اور سرد کوہستانی آب و ہوا کے عادی سپاہی اور گھوڑے یکے بعد دیگرے دم توڑتے جا رہے ہیں۔ یہ افواہ بھی گرم تھی کہ لشکریوں میں طاعون اور بخار کی وبائیں پھیل رہی ہیں جن سے برابر اموات واقع ہو رہی ہیں۔ اس طرح کی افواہوں سے لوگ یہ تصور کر رہے تھے کہ ان کی دلی مراد پوری ہو رہی ہے۔

بیدہ نے اپنے پوتے بہادر سے جو بابر کے دربار سے وابستہ تھا، یہ معلوم کرنے کا فیصلہ کیا کہ آخر ان افواہوں میں کہاں تک صداقت پائی جاتی ہے۔ اس نے یہ سوچ کر کہ صرف دادی سے ملاقات کے لیے پوتے کو آنے کی اجازت نہ مل سکے گی، اپنی ایک خادمہ کو ایک خط کے ساتھ محل بھیجا جس میں کہا گیا تھا کہ وہ بیمار ہے اور پوتے کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہے۔

سترہ سالہ سلطان بہادر فارسی اور سنسکرت زبانوں سے بخوبی واقف تھا اور اسے بعض دستاویزات کے جن کی بابر کو ضرورت تھی، ترجمے کا کام سونپ دیا گیا تھا۔ فاتح حکمران کی خدمات انجام دینے کے لیے دوسرے مترجمین بھی موجود تھے اور بہادر پر کام کا زیادہ بار نہیں ڈالا جاتا تھا پھر بھی وہ فرصت کے اوقات اپنی مرضی کے مطابق نہیں گزار سکتا تھا۔ اس کی حفاظت کی جاتی تھی تاکہ کچھ دن قبل تک کے دشمن کے بیٹے کی کوئی توہین نہ کر دے۔ اس پر نظر بھی رکھی جاتی تھی کیونکہ ڈر تھا کہ کوئی سازشی گروہ سابق سلطان کے اس وارث کو اپنا سرغنہ نہ بنا لے۔ یہی سبب تھا کہ بہادر کو شاذ و نادر ہی محل سے باہر نکلنے دیا جاتا تھا۔

لیکن وزیر محمد دولدائی نے بیدہ کا خط پڑھا تو اس نے بابر کی اس ہدایت کے مدنظر کہ بیدہ کو اس کی سوتیلی ماں تصور کر کے احترام کیا جائے، بہادر کو دادی سے ملاقات کے لیے جانے کی اجازت دے دی۔ احتیاطاً اس نے بہادر کے ساتھ

رہنے والے سپاہیوں کی تعداد دوگنی کر دی، اور اسی روز محل واپس لوٹ آنے کا سختی کے ساتھ حکم بھی دے دیا۔

بیدو نے پوتے کو اپنے محل کی نیم روشن خواب گاہ ہی میں بلا لیا جہاں وہ علالت کا بہانہ کیے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی اور نگاہیں چھت کو تکے جا رہی تھیں۔ وہ دو تکیوں کی ٹیک لگا کر کچھ اٹھ بیٹھی اور بہادر سے اپنے سامنے اونچی جگہ پر بیٹھنے کو کہا۔

وہ دیر تک پوتے کی پسینے سے تر پیشانی کو دیکھتی رہی پھر شکایت کی کہ اس سال قیامت کی گرمی پڑ رہی ہے اور چند لمحات تک خاموش رہنے کے بعد پوچھا:

"یہ سچ ہے کیا کہ غیر ملکیوں سے ہمارے ہاں کی گرمی برداشت نہیں ہو رہی ہے؟ سنا ہے کہ وہ لوگ مر رہے ہیں۔ یہ سچ ہے؟"

"جی ہاں، کچھ لوگ مر بھی رہے ہیں۔" بہادر نے بجھی ہوئی آواز سے جواب دیا۔

"سنا ہے ان میں بہتوں کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں نہ ٹھہریں گے، اپنے سرد علاقوں کو لوٹ جائیں گے۔ یہ بھی سچ ہے کیا؟"

"بھلا ان کا بادشاہ انھیں ایسا کرنے بھی دے گا؟ غیر ملکیوں کی کثرت اس کے کہے پر عمل کرتی ہے۔ اور پھر بادشاہ اپنی باتوں سے لوگوں کو قائل کر دینے میں بھی ماہر ہے۔ اس کی خوش بیانی کا کہنا ہی کیا۔ جو لوگ واپس لوٹ جانے کی خواہش کا کھلم کھلا اظہار کرتے رہتے تھے ان کو بادشاہ نے محل میں طلب کر کے باتیں کیں اور اب وہ سب بھی خاموش ہو گئے ہیں۔"

"آپ اپنے والد کے قاتل کی ستائش کر رہے ہیں؟"

بہادر نے فوراً ہی چوکسی کے ساتھ دروازے کی طرف دیکھا تو بیدو نے دھیرے سے پوچھا:

"تو بیٹے، آپ کے اوپر نظر رکھی جاتی ہے کیا؟"

"جی ہاں" پوتے نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا: "مجھے کسی کے ساتھ اکیلے رہ جانے اور بات کر لینے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ ہر وقت لوگ مجھے گھیرے ہی رہتے ہیں۔ چھپ چھپ کر میری باتیں سنتے ہیں میں ذرا بھی نکتہ چینی کر دوں گا تو فوراً ہی بادشاہ تک پہنچا دی جائے گی۔"

"آپ فکر نہ کیجیے ہم دونوں کے سوا یہاں اور کوئی بھی نہیں۔ شاہی محل میں ہمارے آدمیوں میں سے بھی کوئی ہے یعنی کوئی ایسا شخص جو ہماری خدمات انجام دے چکا ہو؟"

"جی ہاں، ایسے لوگ ہیں۔۔ مثلاً ملک داد کرانی صاحب ان کے علاوہ وہ اہل علم جو شاید آپ کو یاد ہو ہمارے کتب خانوں میں کام کیا کرتے تھے دراصل بادشاہ ہمارے آدمیوں کو اپنی طرف جھکا لینا چاہتا ہے، ہندوؤں اور ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں کو جیت لینا چاہتا ہے۔ اس نے تو والد مرحوم کے سارے چاشنی گیروں کو بھی بلوایا تھا اور ان میں سے چار کو اپنے محل میں رکھ لیا ہے"

"اچھا؟ ... اور وہ ان کے پکائے ہوئے کھانے بھی کھاتا ہے؟"

"سنا ہے کہ کھاتا ہے۔ وہ تو ہندوستانی کھانوں کی تعریف بھی کرتا رہتا ہے۔"

"یہ تو بہت اچھا ہے کہ وہ ان کے پکائے ہوئے کھانے بھی کھاتا ہے!" بیدو نے اپنے پوتے کی بات کاٹتے ہوئے

وہ بڑی پھرتی کے ساتھ پلنگ سے نیچے اتر آئی۔

اس کا دل پہلے ہی کی طرح درد و غم سے سرشار تھا لیکن غم سے پیدا ہونے والی انتقامی خواہش سے مسکرا رہی تھی۔ اسے اپنا مقصد واضح طور پر نظر آنے لگا۔ ابھی تک لیکن بہت واضح اور اس بات سے بیدہ دل تو تانی حاصل کر لی۔ ''اگر بابر کو ہلاک کر دیا جائے تو اس کے لشکری یہاں نہ ٹھہر سکیں گے واپس لوٹ جائیں گے۔ واقعی چلے جائیں گے'' اس نے سوچا۔ ''جاشنی گیروں میں سے اگر ایک بھی مجھے مل جائے تو اسے تمام کام سمجھایا جا سکتا ہے۔''

بیدہ نے پوتے سے سرگوشی کی

''جاشنی گیروں کو آپ نے خود دیکھا ہے؟''

''جی ہاں۔''

''ان میں احمد بھی شامل ہے؟''

بہادر ابھی تک اپنی ''علیل'' دادی کے منصوبے کو ذرا بھی نہیں بھانپ سکا تھا۔

''جی نہیں۔ جاشنی گیر احمد تو آگرہ سے چلا گیا ہے۔ کوئی خاص بات؟'' اور اس نے تعجب بھری نظروں سے دادی کی طرف دیکھا۔

بیدہ مسکرا دی۔ ''صاحبزادے خاصے بودے ہیں ویسے بھی ان پر کتنے ہی لوگ نظر رکھتے ہیں۔ کہیں ان کے منہ سے اچانک بھانڈا پھوڑ دیا تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور میرا منصوبہ بھی خاک میں مل جائے گا'' اس نے سوچا اور فیصلہ کیا کہ بہادر کو ایسے پرخطر معاملے سے دور ہی رکھے گی۔ وہ ایک بار پھر علالت کا ڈھونگ رچا کر کراہنے لگی

''ہائے ری دنیا، کتنی مکار ہے تو! جو لوگ کل تک ہماری وفاداری کا دم بھرتے تھے وہ آج ہمارے دشمنوں کی جوتیاں سیدھی کر رہے ہیں! اللہ درد کرائی، جاشنی گیر، کمبخت سبھی دغا دے گئے۔ ہائے، کیسا دل دکھتا ہے، سارا بدن کیسا پھوڑے کی طرح دکھتا ہے۔ خیر میرے عزیز پوتے، آپ ان لوگوں کی خدمت کرنے کا ڈھونگ جاری رکھئے پر دل میں اپنے والد مرحوم کے وفادار بنے رہیے۔''

''میں یہی کر رہا ہوں، دادی جان!'' بہادر نے چپکے سے جواب دیا۔

پوتے کے جاتے ہی ملکہ بیدہ نے علالت کا ڈھونگ ترک اور درد سے کراہنے کا سلسلہ بند کر دیا۔ اسے فوراً کسی وفادار جاشنی گیر کی فکر لاحق ہوگئی جو پیسے لے کر یا پھر انتقامی جذبے کے تحت بابر کو مار دینے پر آمادہ ہو جائے۔ اس کے روبرو فاتحین سے نفرت کرنے والوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ بابر کے سپاہیوں کے ہاتھوں کسی کا بھائی مارا گیا تھا تو کسی کا باپ۔ بابر کے عہدے داروں نے کسی سے شاندار آمدنی والا منصب چھین لیا تھا تو کسی کو سرے سے کنگال ہی کر دیا تھا۔

بیدہ نے جلدی پتا لگا لیا کہ بابر نے جن چار جاشنی گیروں کو محل میں رکھا تھا ان میں سے ایک کا چہیتا چھوٹا بھائی پانی پت کی جنگ میں ہلاک کر دیا گیا تھا۔ لیکن بیدہ نے اس سے براہ راست بات کرنے کو پرخطر تصور کیا کیونکہ اس پر بھی بابر کے مخبر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ سلطان ابراہیم کے محل کے ان سابق جاشنی گیروں کے ساتھ کام کرنے والوں میں سب سے زیادہ وفادار وہی احمد ہی تھا جو آگرہ سے جا چکا تھا۔ بیدہ نے معلوم کر لیا کہ وہ اٹاوہ گیا ہوا ہے اور ایک آدمی بھیج کر اسے بلوایا۔

جاشنی گیر احمد بیدہ کے پاس آیا تو اس کا دل غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف شدید نفرت سے معمور تھا کیونکہ اسے آگرہ سے

کے کاموں کے لیے مدعو کیا جانا چاہیے۔ ملک داد صاحب، آپ آج ہی ہمارے اس حکم سے ان باتچیوں کے عہدیدار کو مطلع کر دیجیے۔"

"خادم آپ کا یہ حکم فوراً ہی پہنچا دے گا، عالی جاہ۔"

ملک داد اسی وقت شہر جانے لگا لیکن بابر نے اسے روک لیا

"ایک کام اور کیجیے..... شہر شہر، گاؤں گاؤں منادی کرا دیجیے کہ ہم ابراہیم لودھی کی ساری دولت جو ہمیں ملی ہے تعمیرات اور ملک کے حالات کو بہتر بنانے پر صرف کریں گے۔ سرعام اچھی طرح اعلان کرا دیجیے تاکہ سب کو معلوم ہو جائے اور فضل الدین صاحب، آپ کو جتنے معماروں کی ضرورت ہے اتنے موجود ہیں نا؟"

"جی ہاں، فی الحال کافی معمار موجود ہیں۔ بعض دشواریاں پیش آ رہی ہیں۔ عالی جاہ کا ارشاد ہے کہ مرمریں محل اور پتھروں کے بڑے حوض کی تعمیر سال بھر میں مکمل ہو جانی چاہیے۔ خاص کام پتھروں کو تراشنے اور ان پر نقاشی کرنے کا ہے جس کے لیے بہت زیادہ محنت اور وقت درکار ہیں۔"

"اگر ہم اس فن کے کچھ اور ماہرین کا انتظام کر دیں تو؟"

"دراصل شاہ عالی، میں خود بھی یہی درخواست کرنا چاہتا تھا۔ ہندوستان میں اینٹوں اور کاشیوں کے بجائے جس کا استعمال ہرات اور سمرقند میں کیا جاتا ہے، پتھروں اور مرمر کا استعمال بہتر رہے گا۔"

"یہ بتائیے کہ ہمارے یہاں عمارتوں کی تعمیر کے سلسلے میں کل کتنے سنگ تراش کام کر رہے ہیں؟"

"صرف آگرے ہی میں ان کی تعداد چھ سو اسی ہے۔ سیکری، دھول پور اور دوسری جگہوں پر کام کرنے والے سنگ تراشوں کو ملا کر مجموعی تعداد ایک ہزار چار سو نوے ہو جاتی ہے۔"

"بہت خوب" بابر مطمئن ہو کر مسکرایا۔ "امیر تیمور سمرقند میں عالی شان عمارات تعمیر کرا رہے تھے تب انھیں الگ الگ ملکوں کے تقریباً دو سو کاریگروں ہی کی خدمات حاصل تھیں۔ مشہور مورخ مولانا شرف الدین علی یزدی نے اس تعداد کو بھی بے مثال قرار دیا تھا۔ لیکن ہندوستان کاریگروں کے معاملے میں تماشا دار اور متمول ہے تو ہم سینکڑوں بلکہ ہزاروں سنگ تراشوں اور نقاشوں کو کام کرنے کے لیے مدعو کریں گے۔ جی ہاں، انھیں زبردستی، قیدیوں کی طرح کام پر نہیں لگائیں گے بلکہ مدعو کریں گے۔ ملک داد صاحب، ہماری سلطنت کے تمام شہروں میں منادی کرا دیجیے۔ سب کو معلوم ہو جانا چاہیے کہ جو معمار ہمارے یہاں کام کرنے آئیں گے انھیں اتنی زیادہ اجرت دی جائے گی جتنی ہندوستان میں اب تک بھی نہیں دی گئی۔ پروردگار کو خوش اور عظمت اسلام کو نمایاں کرنے کے لیے مسلمان اور ہندو کاریگروں کو یکساں مشاہرے دیے جائیں گے، انھیں یکساں حیثیت حاصل ہوگی۔

جتنے بھی معمار اور کاریگر ہمیں اپنے کاموں سے خوش کر دیں گے، ان سب کو ہماری سرپرستی حاصل ہوگی۔"

ملک داد کرانی شہر کو لوٹ گیا۔ ماہم بیگم، بابر اس مخصوص شاہی کشتی کو جو اس جگہ سے کچھ ہی دوری پر جمنا میں لہروں پر ہلکورے کھا رہی تھی، حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ بابر کو زیر تعمیر عمارت اور باغات کے معائنے کے بعد دریا میں سیر کرنے کے لیے اس کشتی پر جانا تھا۔ لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ بادشاہ کو وہاں پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔ وہ معمار عمارت سے پوچھنے لگا کہ حمام کا گنبد کیسا ہوگا، اس کی اندرونی آرائش کیسی ہوگی نیز یہ کہ محل اور دریا کی درمیانی جگہ میں کیا بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

حمام کی اندرونی دیواروں پر سارے سمرقند میں مشہور عظیم الغ بیگ کے حمام کی طرح رنگ برنگے سنگ مرمر کی ریوں لگائی جائیں گی۔" فضل الدین نے دھیرے دھیرے بتانا شروع کیا۔ "گنبد سمرقند کے اس حمام کے گنبد سے بڑا ہوگا۔ دیواریں مضبوط سخت پتھر کی بنائی جائیں گی جیسا کہ عالی جاہ بخوبی جانتے ہیں سنگ مرمر میں ایک عجیب صفت پیدا ہوتی ہے کہ اندر سے زیادہ گرمی کو باہر نکلنے دیتا ہے اور ٹھنڈی ہوا کو اندر داخل ہونے دیتا ہے۔ تب یہ حمام کی سنگ مرمر کی پٹیاں موسم گرما میں جبکہ ٹھنڈک کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے بڑی کارآمد ثابت ہوں گی۔"

"بہت خوب، بہت خوب۔ لیکن اس حمام کو ذرا جلد ہی مکمل کرائیے ورنہ یہ چلچلاتی دھوپ ہمیں جھلس کر خاک کر دے گی۔" گرمی سے نڈھال کلاں بیگ نے کہا۔

"بیگ صاحب، اگر آپ چاہتے ہوں کہ ہم اس حمام کو جلد از جلد تعمیر کر دیں تو گھوڑے سے اتر کر ہاتھ بٹانے کی زحمت فرمائیے۔" فضل الدین نے مذاق کیا۔

میر عمارت کے اس جواب سے خوش ہو کر بابر نے پوچھا

"لیکن یہ گرمی خود آپ کو پریشان نہیں کرتی کیا؟"

"کرتی کیوں نہیں، شادماں۔ لیکن میں سے جھلستا رہتا ہوں۔ دراصل آپ کا یہ خادم ایک شاندار عمارتیں تعمیر کرنے کے خواب دیکھا کرتا تھا پر وہ تو خواب ہی رہ گئے۔ میں امید کرتا تھا کہ ایسی عمارتیں سمرقند و ہرات میں تعمیر کر سکوں گا ان عمارات کے نقشوں پر تیس برس تک غبار کی تہیں جمتی رہیں، کاغذات دھرے پڑے رہ گئے۔ اب لگ رہا ہے میری زندگی کے یہ خواب میرے وطن سے بہت دور آگرے میں حقیقت بنتے جا رہے ہیں۔ قسمت میں یہی لکھا ہے تو گرمی کو بھی تحمل ہی لوں گا۔ ویسے اہل ہند اس گرمی کو کیوں برداشت کر لیتے ہیں؟ اس لیے کہ یہ لوگ موسم گرما میں گوشت برائے نام ہی کھاتے ہیں، پیاس بجھانے کے لیے شربت پیتے ہیں، پھلوں کا استعمال بہت زیادہ کرتے ہیں۔ میں بھی ہلکی غذاؤں کا عادی ہو چکا ہوں۔ علی الصباح بیدار ہو کے صبح کی ٹھنڈک میں کوئی چار گھنٹے کام کرتا ہوں۔ گرمی میں شدت پیدا ہو جاتی ہے تو سائے میں چار گھنٹے آرام کرتا ہوں اور دھوپ کی تمازت گھٹ جاتی ہے تو دوبارہ چار گھنٹے کام کر لیتا ہوں۔"

"یہ لیجیے!... اور ہم ہیں کہ صبح سے شام تک بس گوشت ہی گوشت کھاتے رہتے ہیں۔ کبھی قری تو کبھی طرح طرح کے کباب" بابر نے خواجہ کلاں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور ان سب کھانوں کو بھی تند و تیز شرابوں کے سہارے حلق سے نیچے اتارتے ہیں گویا کہ ماحول کی گرمی ہمارے لیے ناکافی ہو۔"

خواجہ کلاں بیگ کے لیے کاٹھی پر بیٹھے رہنا سخت دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے سے پسینے کی دھاریں سی داڑھی پر سے ڈھلکتی ہوئی قطرات کی شکل میں سینے پر ٹپک رہی تھیں۔ خود بابر کو بھی ایسا لگ رہا تھا جیسے سانس کے ساتھ ہوا کے بجائے آگ کی لپٹیں سینے میں داخل ہوتی جا رہی ہوں۔ اس جگہ سے جلد از جلد چل دینا ضروری تھا۔ اس نے فضل الدین کی خوشگوار باتوں کے لیے اس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد گھوڑے کا رخ دریا کی طرف موڑ دیا جہاں لہروں پر ڈولتی ہوئی شاندار کشتی سراب معلوم ہو رہی تھی۔ گھوڑا تیزی سے دوڑنے لگا، ہواؤں کے جھونکے چہرے کو تازگی بخشنے لگے اور سانس لینا آسان ہو گیا۔ دریا تھوڑی ہی دور رہ گیا تھا کہ اتنے میں خواجہ کلاں بیگ کے ایک سپاہی کے بدخشانی مشکی گھوڑے نے اچانک ٹھوکر کھائی اور سر ہاتا ہوا زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ سپاہی نے جو پھرتی سے نیچے کود گیا تھا، لگام کھینچ کھینچ کر گھوڑے کو کھڑا کرنے کی کوشش کی لیکن گھوڑا پہلو کے بل پڑے پڑے تڑپنے لگا اور اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔

ساتھ خوش بھی ہے کہ سپاہی اس ڈر سے کہ کہیں گھوڑے کے سم سے چوٹ نہ لگ جائے، تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔
"وہ واس گھوڑے کی جان بھی لے لیتی" کلاں بیگ نے گھبرا کر کہا۔ "ایسے شان دار گھوڑے روز روز کہاں ملتے ہیں۔"

"محض ایک گھوڑے کے زیاں سے ملال کا دل نہ بیٹھنا چاہئے بیگ صاحب۔ آپ کے سپاہی کو شاہی اصطبل سے کوئی تیز رفتار گھوڑا دے دیا جائے گا، یہ میرا حکم ہے۔"
"میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں، فرماں روا" خواجہ کلاں بیگ نے اداسی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن بات صرف گھوڑے کی ہی نہیں ہے۔ مجھے تو اس حادثے میں اپنے مستقبل کی جھلک بھی نظر آ رہی ہے۔"
بابر گھوڑے سے نیچے اترا کیونکہ وہ لوگ دریا کے کنارے پہنچ چکے تھے۔ اس نے شاہی کشتی "آسائش" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا
"اس وقت تو بیگ صاحب، آپ کا قریب ترین مستقبل یہ ہونا چاہئے، پر سکون آرام کے لمحات سے محظوظ ہوں۔"
سب لوگ چھوٹی چھوٹی کشتیوں کے ذریعے "آسائش" تک پہنچے اور اس پر سوار ہو گئے۔ بابر اور کلاں بیگ شاہی کشتی کے اگلے سایہ دار حصے میں جا بیٹھے۔ چپو حرکت میں آئے اور کشتی یکساں تیز رفتار سے آگے بڑھنے لگی۔ سامنے سے آتی ہوئی ہوائیں زندگی کو محض قابل برداشت ہی نہیں بلکہ خوشگوار بھی بناتی جا رہی تھیں۔
خدام نے سنگترے اور لیموں کے ٹھنڈے ٹھنڈے شربت لا کر پیش کئے۔ خواجہ کلاں بیگ نے سنگترے کے شربت کا بھرا ہوا پیالہ ایک ہی بار میں صاف کر دیا۔ "نہیں نہیں، ہندوستان میں بھی عیش و آرام کے ساتھ جینا ممکن ہے" اس نے سوچا اور معنی خیز نگاہوں سے بابر کی طرف دیکھنے لگا۔
"دوسرے میں تو عالی جاہ، آپ بہت دبلے ہو گئے، رنگت کالی پڑ گئی، چہرہ اتر گیا۔ یہ الگ بات کہ آپ پر جو کچھ بیت رہی ہے اسے ہم سے چھپاتے رہتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ دوسرے بیگ آپ کی مشکلات کو نہ بھانپ سکے ہوں لیکن میں نے بھانپ لیا ہے۔ مجھے سب معلوم ہے، سب کچھ محسوس کر رہا ہوں۔"
"ہاں بیگ ہماری آپ کی رفاقت کوئی تیس برسوں کی ہے۔ جانے کتنی ہی مشکلات اور تکالیف کو ہم ساتھ ساتھ جھیلتے رہے ہیں، ٹھیک ہے نا؟ ماضی کی مشکلات کے مقابلے میں یہ گرمی اور موجودہ تکالیف تو کچھ بھی نہیں ہیں نا؟ یہ بالکل معمولی سی تلخی ہیں نا؟"
خواجہ کلاں بیگ نے جیب سے ریشمی رومال نکال کر پیشانی سے مسلسل بہتے ہوئے پسینے کو جس سے آنکھیں ڈھکی جا رہی تھیں، پونچھ ڈالا۔
"اعلیٰ حضرت، مجھے تو لگتا ہے کہ زندگی کی آخری گھڑیاں آن پہنچیں۔ جوانی میں تو سردی کو خاطر میں لاتا تھا نہ گرمی کو لیکن اب جبکہ میری عمر پچاس سے تجاوز کر چکی ہے، میں محسوس کر رہا ہوں کہ ہندوستان میں گزرنے والا ہر ہفتہ میری عمر میں ایک سال کا اضافہ کر دیتا ہے، سن رسیدگی کی طرف کچھ اور آگے دھکیل دیتا ہے۔ آپ کے دیرینہ رفقاء میں بس ایک قاسم بیگ ہی مجھ سے عمر میں بڑے تھے سو وہ بھی کچھ دن ہوئے دنیا سے کوچ کر گئے۔ اللہ انھیں جنت نصیب کرے۔ کچھ دن اور رہیں تو میری باری بھی آنے ہی کو ہے۔ اب اور زیادہ نہ جی سکوں گا، واقعی نہ جی سکوں گا۔"

اس بات پہ تعجب نہ کیجیے بیگ صاحب۔ یہ سارا تو سب خدا کی مرضی پر منحصر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ بہت طویل عمر پائیں گے۔"

"میں تو تصور بھی نہیں کر سکتا کہ سرد علاقوں کا رہنے والا کوئی شخص ایک گرم اور دھوپ والے ماحول میں ساٹھ سال کی عمر تک بھی پہنچ سکتا ہے۔"

"کیوں نہیں پہنچ سکتا؟ آخر اس گرم ملک میں بھی تو لوگوں کی لمبی لمبی عمریں ہوتی ہیں۔ امیر خسرو دہلوی کی مثال کیوں بھول رہے ہیں؟"

خواجہ کلاں بیگ خسرو دہلوی کی شاعری کا بڑا مداح تھا۔ بابر دہلی میں اپنے مختصر قیام کے دوران حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار کی زیارت کے لیے گیا تھا تو اس کے ہم رکابوں میں کلاں بیگ بھی شامل تھا۔ وہاں یہ لوگ خسرو دہلوی کی قبر پر بھی گئے تھے جس کے سامنے خاموش کھڑے کھڑے کلاں بیگ کو خسرو کا یہ مشہور مصرعہ یاد آگیا تھا "خسرو پنہ دولت صاحب دلاں بے چیز نیست" اور اسے اپنے اوپر فخر محسوس ہوا تھا۔ یہ کیفیت کچھ لغوی لیکن بڑی متاثر کن معلوم ہوتی تھی۔ ویسے گرمی بھی ان دنوں اتنی وہاں جان لیوا نہ تھی۔

بابر نے اس وقت خسرو دہلوی کا ذکر یہ دیکھنے کے لیے کیا تھا کہ کلاں بیگ کو وہ مصرعہ اور اس سے طاری ہونے والی وہی کیفیت یاد آتی ہے کہ نہیں۔

کلاں بیگ کو سب یاد آگیا، اس پر سب کچھ واضح ہو گیا، اس نے گھبراہٹ میں کھنکار کے حلق بھی صاف کیا لیکن مصرعہ اس کے ہونٹوں پر نہ آسکا۔ اس نے تو خاصی انکساری کے ساتھ دوسری ہی بات کہی

"خسرو تو بہت ہی عظیم انسان تھے، عالی جاہ۔ میں تو کسی بھی معاملے میں ان کی ہمسری نہیں کر سکتا"

"بیگ صاحب، عظیم افراد کی ہمسری کی جسارت کرنا ہماری زندگی کا مقصد بھی نہیں۔ یاد ہے نا، آپ کہا کرتے تھے کہ آپ عظیم افراد کے کاموں کا سلسلہ آگے بڑھاتے رہنے کے متمنی ہیں۔ یہ ممکن بھی ہے اور لازمی بھی"

"بڑے بڑے کاموں کا آغاز تو آپ نے کابل میں بھی کیا تھا، حکمران۔ میں وہیں ان کاموں کے سلسلے کو جاری رکھنا چاہتا ہوں۔ آپ سے درخواست ہے کہ مجھے غزنی لوٹ جانے کی اجازت دے دیں۔"

پھر وہی غزنی! فراموش کر دیا کہ غزنی میں ہم پر کیا کیا گزری تھی؟ غزنی میں ہم نے محمود غزنوی کے شکستہ باندھ کی مرمت کرانی چاہی پر نہ کرا سکے۔ معمار مل گئے تو پیسوں کی کمی پڑ گئی۔ پیسوں کا انتظام ہو گیا تو کسی اور چیز کی قلت سے ہاتھ بندھ گئے اور یہاں تو ہمیں سب کچھ میسر ہے، کلاں بیگ، ہندوستان تو طاقت اور دولت کا بحر بے کراں ہے!"

"لیکن کہیں یہ بحر بے کراں اس ناچیز پردیسی ہی کو ہڑپ نہ کر جائے۔ میرا تو نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا"

خواجہ کلاں بیگ نے ویسے تو یہ بات اپنے متعلق ہی کہی لیکن بابر پر واضح ہو گیا کہ اس کی مراد ان تمام افراد سے ہے جو بابر کے ساتھ ہندوستان آئے تھے اور خود بادشاہ سے بھی۔ دوسرے بیگ بھی دبی زبان میں اکثر کہا کرتے تھے "اتنے وسیع و عریض ملک میں ہماری کوئی وقعت بھی ہے۔ بے شمار ہندوؤں کے اس بحر بے کراں میں ہم لوگ تو کسی قطرے کی طرح کھو کر رہ جائیں گے۔ بہتر ہو گا کہ حتی الامکان زیادہ سے زیادہ دولت بٹور کر اپنے وطن کو لوٹ چلیں"۔

"آپ اپنے پیچھے نام و نشان چھوڑ جانے کو مقصد حیات تصور کرتے ہیں؟" بابر نے دریافت کیا۔ "ہم سب لوگوں نے آج باغ زر افشاں دیکھا ہے۔ ہم زندہ رہے تو یہاں ایسے نئے اور شاندار محلات اور خوبصورت لہلہاتے ہوئے

باغات بھی دیکھے ہیں جن کے آگے سمرقند و ہرات کے محلوں اور باغوں کی شہرت ماند پڑ جانے لگی۔ وہاں کے حالات تو روز بروز ابتر ہی ہوتے جا رہے ہیں۔

جہالت بڑھتی ہی جا رہی ہے، میرے عزیز کلاں بیگ۔ لیکن یہاں، یہاں تو ان کاموں کو جو سمرقند و ہرات میں شروع کیے گئے تھے، جاری رکھنا ممکن بھی ہے اور ضروری بھی۔ یہ کارنامے ہندوستان جیسے برصغیر عظیم کا جزو بن کر یہاں سے باقی رہ سکتے ہیں! کیا آنے والی نسلیں انہیں یاد نہ رکھیں گی؟ کیا وہ ہمارے نام کو روشن نہ کریں گی؟''

''امیر تیمور نے تو کچھ اور ہی کیا تھا۔ اور محمود غزنوی نے بھی۔ امیر تیمور تو ہندوستان کو فتح کرنے کے بعد یہاں سے دولت اور جتنے بھی کام کے آدمی ملے انہیں زبردستی ساتھ لے کر وطن لوٹ گئے تھے۔''

''لیکن ان کی سلطنت کا حشر کیا ہوا؟ اور کیا مجھے اپنے لیے محمود غزنوی کو نمونہ تقلید بنانا چاہیے؟''

''نہیں عالی جاہ۔ آپ تو بالکل دوسری ہی طرح کے فرمانروا ہیں۔ آپ کے لیے تو نمونہ تقلید کی حیثیت سے، بیرونی اور خسرو دہلوی کہیں زیادہ باعث کشش ہیں۔ لیکن اعلیٰ حضرت، کیا ہم ہندوستان کو بزور شمشیر نہیں فتح کر رہے ہیں؟''

بابر خاموش ہو گیا۔ اس نے دریا کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے اپنے سر کو ہوا کے جھونکوں کے سامنے کر دیا اور دھیرے دھیرے کہنے لگا۔

''نہ ہم لوگ قزاق ہیں، اور نہ ہی اس ملک کی تمام دولت اور تمام اچھے معماروں کو یہاں سے لے جانا کسی کے بس کی بات ہے۔ میں تو اس کے برعکس خراسان، ماوراءالنہر اور ایران سے بھی عمارت سازی کے ماہرین اور صاحبان علوم و فنون کو یہاں بلوا رہا ہوں۔ آپ آج خود ہی اندجان کے میر عمارت فضل الدین کو دیکھ چکے ہیں۔ فوارے بنانے کے مہندس سلیمان رومی بھی انشاءاللہ جلد ہی تبریز سے یہاں آ جائیں گے۔ ہرات سے میں نے مورخ خواند میر کو بلوایا ہے۔ نہیں بیگ، ہم لوگ اب یہاں غیر نہیں رہے۔ ہم یہاں اجنبیوں کی طرح زندگی نہ بسر کریں گے۔ ہمیں اپنی ساری دانائی اور استعداد اس ملک کو خوشحال بنانے پر صرف کرنی ہوگی۔ تب ہی ہم اس خلیج کو پاٹ سکیں گے۔''

کلاں بیگ خاک بھی نہ سمجھ سکا کہ بادشاہ آخر یہ کیسی خلیج کی بات کر رہا ہے لیکن اس نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسی بحثوں میں تو بابر اپنے دلائل اور خوش بیانی کی بدولت ہمیشہ ہی مات دے دیتا ہے۔ کلاں بیگ نے اس بحث میں اعتراف شکست کا جھوٹا تاثر دیتے ہوئے چاپلوسی کا طریقہ اپنا لیا جو اس کے خیال میں سلاطین کے لیے ہمیشہ ہی باعث مسرت ہوتا تھا۔

''عالم پناہ، آپ زبردست قوت ارادی کے مالک ہیں اور عزم اور حوصلے کے معاملے میں آپ کا کوئی جواب نہیں۔ آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ ان آلام و مصائب کے عشر عشیر کو بھی نہیں جھیل سکتا تھا جن کو آپ برداشت کرتے رہے ہیں۔ یہی نہیں، آپ تو ان ساری مشکلات کے باوجود ایسے کارنامے انجام دینے کا بھی حوصلہ رکھتے ہیں جو شاید سکندر اعظم، جمشید یا رستم ہی کے بس کی بات ہو سکتے تھے۔ میری زندگی آپ کے سائے میں گزر رہی ہے اور میں آپ کی عظمتوں کا روز بروز زیادہ سے زیادہ قائل ہوتا جا رہا ہوں۔ میں خود کو ایک کوہ عظیم کے دامن میں کسی حقیر تنکے جیسا تصور کرتا ہوں۔ ہر شخص کا اپنا اپنا مقدر ہوتا ہے۔ جو کچھ آپ کو نصیب ہے وہ آپ کے اس خادم کو کبھی بھی نصیب نہیں ہو سکتا، شاہ عالی۔''

خواجہ کلاں بیگ جس کی آواز تقریباً واضح طور پر مرتعش تھی، خاموش ہو گیا۔ تب بابر نے امیر خسرو کے اس مصرعے کو

وہ دھیرے دھیرے سے پڑھا۔

''اصل کس بکس، باشد کو چو حضور تمام اند۔''

''پھر بھی پانچوں انگلیاں برابر تو نہیں ہوتیں جیسا کہ حضور آپ نے خود دیکھا ہے ایسا شخص بھی ہوتا ہے کہ میرے چھکے چھوٹ جائیں گے عقل بھی کیا آپ نے پسند فرمایا ہے میں عمر کے آخری سال میں ہوں اور میں لوں'' مجھے واپس جانے کی اجازت دے دیجیے۔ میں غزنی چلا جاؤں گا۔ وہاں کے قدیم مدرسے کی مرمت کروں گا۔ دیکھتا ہوں گلزاروں میں بدل کر آپ کا نام روشن کروں گا۔''

بابر سوچ میں ڈوب گیا اور کلاں بیگ نے فوراً ہی اندازہ لگا لیا کہ اب بادشاہ دل ہی دل میں یہ سوچ رہا ہے کہ وہ اپنی مراد حاصل کر سکتا ہے۔

''میری درخواست پر غور فرمایئے، اعلیٰ حضرت۔ میں اپنی زندگی کے آخری ایام میں جو حقیقی مولیٰ کی جانب سے دوران پروردگار سے آپ کے لیے دعا گو رہوں گا۔ میری دلی آرزو ہے کہ غزنی میں اپنے وطن سے دور یہیں دفن کیا جاؤں۔''

بابر نے دیکھا کہ کلاں بیگ کی آنکھیں نم ہوگئی ہیں۔ آخرکار اس نے پوچھا

''آپ کی دیکھا دیکھی دوسرے بیگ بھی اگر لوٹ گئے تو پھر میرے ساتھ کون رہ جائے گا؟''

''دوسرے بیگوں سے میں خود ہی بات کرلوں گا۔ قسم کھاتا ہوں کہ ان سے صرف یہی کہوں گا'' حکمراں مجھے بندہ کی خدمت کرانے کے لیے غزنی بھیج رہے ہیں''۔ یقین دیجیے، میں اس طرح جاؤں گا کہ میرے پیچھے پیچھے کوئی دوسرا بیگ نہ جائے گا۔''

بابر کو ابھی تک اس بات کا علم نہیں ہو سکا تھا کہ خواجہ کلاں بیگ نے ایک بار محفل بادہ میں بیگوں سے شرط لگائی تھی کہ وہ بادشاہ سے اجازت حاصل کر کے غزنی لوٹ جائے گا۔ اس نے شرط جیتنے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے چلائے تھے اور اپنی مذمت تک کی تھی۔ ویسے اسے یہ بات ناگوار بھی گزری تھی کہ جب وہ اپنی مذمت کر رہا تھا تو بابر نے تردید نہیں کی تھی، یہ یقین نہیں دلایا تھا کہ وہ شجاع اور باشعور بیگ ہے۔

''خیر ٹھیک ہے، جیسی آپ کی مرضی'' بابر راضی ہوگیا۔ ''لیکن آپ پہلے کابل جایئے گا اور میرا خط اور تحفے ماہم بیگم تک پہنچا دیجیے گا۔ میں نے ان صاحبان علوم و فنون کے سفر خرچ کے لیے جو میری دعوت پر ہرات، سمرقند، تبریز اور دوسرے شہروں سے یہاں آ رہے ہیں، رقم منظور کر دی ہے۔ اس رقم کا نصف حصہ بھی اپنے ساتھ لیتے جایئے گا کیونکہ وہاں ان لوگوں کو سفر خرچ دینا ہوگا جن کی یہاں ضرورت ہے۔ اس معاملے میں پیسوں کی کوئی پروا نہ کی جائے گی'' بابر نے کلاں بیگ کے چہرے پر اطمینان کے تاثرات دیکھ کر کہا۔ ''پیسوں کی آج ہمارے ہاں افراط ہے۔ ہم ہر قسم کی محنت کے لیے اچھی سے اچھی اجرت دے سکتے ہیں۔ آپ بھی ہماری طرف سے ان تمام افراد کو یہاں آنے کی دعوت دے دیجیے گا جو آل شیبانی کی جہالت اور قزلباشوں کے مظالم سے تنگ آچکے ہیں اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہتے ہیں۔ ان سب افراد کو یہاں آجانا چاہیے۔ سب کو روزگار فراہم کیا جائے گا۔''

''میں ان سب شاہی احکام کی خلوص دل سے تعمیل کروں گا۔ میرا طرز عمل یہ ہوگا کہ جاؤں گا تو تنہا ہی لیکن میرے بدلے میں دسیوں بلکہ سینکڑوں کام کے آدمی یہاں آجائیں گے۔''

بابر نے محسوس کیا کہ کلاں بیگ نے یہ ساری باتیں بڑے خلوص سے کہی ہیں۔ تاہم کلاں بیگ سے جدا ہو جانے کے تھوڑی ہی بعد اس کی آرام گاہ کی حویلی کی ایک دیوار پر یہ شعر لکھا ہوا نظر آیا جس سے بابر کے جذبات کے علاوہ اس عیار کا حقیقی رویہ بے نقاب ہو گیا

اگر بخیر و سلامت گزر ز سند کنم

سیاہ رو شوم گر ہوائے ہند کنم

دیوار پر جلی حروف سے لکھا ہوا یہ شعر ان بیگوں میں جلد ہی عام ہو گیا جو کلاں بیگ ہی کی طرح ہندوستان سے لوٹ جانے کے خواہاں تھے۔ کچھ ہی دنوں بعد ایک موقعے پر بابر کو ہندو بیگ سے کلاں بیگ کی اس شرط کا بھی علم ہو گیا جو اس نے محفل بادہ میں اپنے نقاب سے لگائی تھی۔

"فریبی، بدمعاش کہیں کا،" وہ غصے سے کہہ اٹھا۔ "شرط بھی جیت لی اور میری آنکھوں میں دھول بھی جھونک گیا۔ خیر دیکھا ہے کہ بالآخر جیت کس کی ہوتی ہے۔" اس کے بعد وہ بپھرا ہوا دیر تک ٹہلتا رہا۔

وہ سوچنے لگا کہ آخر کلاں بیگ کو کیا سزا دی جائے؟ کیا کوئی قاصد اس حکم کے ساتھ فوری طور پر روانہ کیا جانا چاہئے کہ کلاں بیگ کو غزنی کے صوبیدار کے عہدے سے ہٹایا جا رہا ہے اور اب وہ صوبیدار کی حیثیت سے حاصل مراعات سے محروم ہو کر باندھ کی مرمت کرانی چاہئے؟ پھر اس کے دل میں خیال آیا کہ ایسا کرنے کا مطلب تو یہ ہوگا کہ وہ اپنے ایک پرانے عیار اور کامیاب ہی کیوں نہ سکی۔ بیگ کی جسے وہ صحیح معنوں میں ایک اہم کام سپرد کر چکا ہے، خدمات سے پوری طرح ہاتھ دھو بیٹھے تو پھر کیا قدم اٹھایا جائے؟ خاموشی اختیار کر لی جائے؟ خاموش بیٹھ رہنے کی اجازت نہ آن بان دے رہی تھی اور نہ ہی عقل سلیم کیونکہ کلاں بیگ کا پسندیدہ سادہ سا شعر ہندوستان سے لوٹ جانے کے خواہاں بیگوں اور سپاہیوں کے لیے پہلے سے بھی زیادہ ترغیب دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ دوسری طرف کلاں بیگ کو کسی قسم کی سزا دینے سے بھی شعر کی مقبولیت میں اضافہ ہو سکتا تھا۔

"تو کیا وہ بیت اب بھی دیوار پر لکھی ہوئی ہے؟" بابر نے ہندو بیگ سے پوچھا۔

"جی نہیں۔ میں نے اسے مٹوا دیا تھا۔"

"افسوس۔ زبردستی مٹائی جانے والی چیزوں کی یادیں عوام کے دلوں پر اور بھی زیادہ مضبوطی کے ساتھ نقش ہو جاتی ہیں۔" اچانک بابر کے ذہن میں خیال آیا۔ "ارے خادم، ذرا میر منشی کو تو بلا دو۔ فوراً!"

کاغذ، قلم اور دوات سنبھالے ہوئے ایک نوجوان اندر آیا اور بادشاہ کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

"لکھو... آرام سے بیٹھ کے لکھو نا۔"

میر منشی پالتی مار کے بیٹھ گیا، تختی گھٹنوں پر رکھی اور کاغذ پر ہاتھ پھیر کر قلم کو درست کیا۔

ہزار شکر کہ بابر تجھے خدائے کریم

ہے خود ہی بخش چکا سندھ اور ہند عظیم

بابر نے سوچا نہیں، اس خیال کا واضح طور پر اظہار ضروری ہے کہ ہندوستان ہمارے لیے کوئی غیر سرزمین نہیں بلکہ ہمارا دوسرا وطن ہے۔

اور اس نے فوراً ہی پرعزم لہجے میں لکھانا شروع کیا

[illegible]

[illegible] اور [illegible]

وہ جائے خوفی [illegible]

یہاں کی گرمی میں تڑپ جو رہ سکے نہ مقیم

ہندو بیگ کا دل باغ باغ ہو گیا۔ خواجہ کلاں بیگ واقعی [illegible] پر [illegible] نے [illegible] تھی۔ [illegible] اسے چھوڑ کر بھی نہیں گئی تھی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ [illegible] سے [illegible] زیادہ [illegible] ہے۔

"تین نقلیں تیار کر دیجیے" بابر نے حکم دیا۔ "ایک خواجہ کلاں بیگ کو [illegible] ایک صاحب آپ سے لیجیے۔ [illegible] ان بیٹوں اور سپاہیوں کو پڑھنے کے لیے دیجیے کا خواجہ کلاں بیگ یہ [illegible] پڑھتے ہیں۔ دیکھتے ہیں۔ اس شعری مقابلے میں کون جیتتا ہے۔"

بابر نے ایک [illegible] کسی بیگ کو گرمی کا رونا روتے اور فوراً ہی ایک دوسرے بیگ کو جو بابر کے مشورہ دیتے کہ وہ جائے خوفی جو ہو سر، مہر اور کمزور۔ یہاں کی گرمی میں تڑپ جو رہ سکے نہ مقیم" سنا تو وہ سمجھ گیا کہ [illegible] نشانے پر لگا ہے۔

۳

پانی پت کی جنگ کے بعد طاہر تین مہینوں تک صاحب فراش رہا۔ بادشاہ نے علاج کے لیے جس طبیب کو مامور کیا تھا اس نے زخموں کا مداوا تو کر دیا لیکن چیخ جانے والی پسلیوں اور ہاتھوں کی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کے معاملے میں وہ بھی بے بس تھا۔ طاہر درد کی وجہ سے روز و شب پریشان رہتا تھا۔ وہ حتی الامکان کوشاں رہتا تھا کہ اس کی کراہیں آس پاس نہ جانے سکے اس چھوٹے سے گھر میں نہ گونجنے پائیں جس میں وہ اپنے وفادار سائیس کے ساتھ مقیم تھا۔ "اب تو شاید میری میت ہی اس گھر سے باہر نکل سکے گی" اس کے دل میں رہ رہ کے خیال آتا تھا۔

ان ہی دنوں میر عمارت فضل الدین کابل سے طاہر کے بیٹے سرکو جو مدرسے کی تعلیم مکمل کر کے معمار بن چکا تھا، ساتھ لے کر آگرہ آ گیا۔ ان دونوں نے جائے تعمیر پر کام کرتے ہوئے ہندوستانی معماروں کے مشورے سے ایک مشہور وید کا پتا لگایا اور اسے طاہر کو دکھانے کے لیے گھر بلا لائے۔ فضل الدین کو بتایا گیا تھا کہ یہ وید ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کے علاج میں بڑی مہارت رکھتا اور غریبوں سے بہت ہمدردی کے ساتھ پیش آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس شخص کا دماغ بھی اچھا تھا اور دل بھی۔

"بشن چند صاحب" فضل الدین نے وید سے کہا، میرا بھانجا خاندانی بیگ نہیں ہے۔ اس کا تعلق تو محنت مشقت کرنے والے کاشتکاروں سے ہے جو دل و جان سے اپنے وطن کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ فوج میں بھرتی ہو۔ کیوں طاہر جان، میں نے تم سے اوش میں یہی کہا تھا نا؟"

"صد افسوس، ماموں جان کہ میں نے اس وقت آپ کے کہے پر عمل نہیں کیا تھا" طاہر نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "بیگ بن جانے کے بعد میں اپنے آپ کو جانے کیا سمجھنے لگا تھا۔۔"

میر عمارت نے ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں جس کے زیادہ تر الفاظ فارسی کے تھے، آخر کار خاص بات بیان کی

بہرحال ... ٹھیک ہوں اور ... چاہتا ہوں ... نہیں ہر وقت ... اور ... کی ... رفاقت ... [illegible]
اگر ... چاہتے ہیں ... محبت ... کرتے ہیں ... اس ... کی ... اور ... خواہاں ہے۔ ... [illegible]
... کی ہے ... آپ کی ہے وید صاحب ... ... کرے ... ان کے قدموں ... [illegible]
میں ... ہو کہ آپ ... ملک میں جنگ کرنے کے لیے نہیں ... ہیں" ... چند نے "افضل ... ... [illegible]
میں آپ ... کرتا ہوں ... صاحب اور آپ کے ... کے لیے ... ہو ... ... [illegible]
گے۔"

وید نے ایک مہینے تک طاہر کا علاج کیا۔ اس نے اپنی حساس انگلیوں سے ان جگہوں کا حساب لگایا جہاں ہڈیاں ٹوٹی تھیں، پتا کا کر اپنی دوائیں اور پٹیاں وغیرہ بہت احتیاط و صبر کے ساتھ استعمال کیں اور علاج بے حد کامیاب رہا۔ علاج کے دوران طاہر ایک قطرہ خون بھی نہ بہا۔ وہ وید کی گیہواں ہتھیلیوں اور پتلی پتلی لمبی لمبی انگلیوں کا کچھ اس طرح عادی ہو گیا جیسے وہ اس کی اپنی ہتھیلیاں اور انگلیاں رہی ہوں۔

وید نے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ اس نے صحت یاب ہو جانے والے طاہر سے کہا

"آپ نے میرے ہاتھوں کو، ایک وید کے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگایا۔ اظہار ممنونیت کے لیے یہی بہت ہے۔"

"نہیں نہیں، میں تو زندگی کے آخری لمحے تک آپ کا احسان مند رہوں گا" طاہر کہہ اٹھا۔

"کون جانے، شاید میں نے اس طرح اپنے پچھلے جنم میں کئے جانے والے کسی کے احسان کا بدلہ چکا دیا ہو۔"

فضل الدین اور طاہر نے دیر تک وید سے اصرار کیا، یقین دلایا کہ اس کے منہ سے جو کچھ بھی سنیں گے اس کا کسی سے تذکرہ نہ کریں گے تب کہیں جا کر بشن چند نے انھیں اپنے مہاوت بھائی کا قصہ سنایا۔ ابراہیم لودھی کے عہد حکومت میں بھائی کو کہیں کام نہیں مل سکا تھا تو وہ آگرے سے پنجاب چلا گیا تھا۔ وہاں اس نے یہ سننے کے بعد کہ بابر نے اپنے بہت سے مخالفین کو قتل کرا دیا ہے، قسم کھائی تھی "میں ان غیر ملکیوں کو اپنے وطن میں نہ گھسنے دوں گا" اس نے دشمن کی فوج کو راستہ بتانے کی ملازمت اختیار کر لی تھی اور راستے سے جا کر دلدلی علاقوں اور گھنے جنگلوں میں پھنسا دیا تھا۔

"ذرا ٹھہر جایئے" طاہر کو اچانک لال چند یاد آ گیا۔ "اس وقت تو ان کے ہاتھی نے ہمارے دو سپاہیوں کو زخمی کر دیا تھا اور وہ خود بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ بہرحال میں ان کی دلیری سے بہت متاثر ہوا تھا۔ وہ تو پورے لشکر سے بھی خائف نہیں ہوئے تھے ہم لوگوں نے تو سوچا تھا کہ وہ خود بھی دلدل اور جنگلات سے زندہ بچ کر نہ نکل سکے ہوں گے۔ تو وہ بچ نکلے تھے؟ زندہ ہیں نا؟

"جی ہاں، زندہ ہیں لیکن مارے خوف کے آگرہ نہیں آ رہے ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ اس کے ہاتھوں آپ کے دو سپاہی معذور ہو گئے لیکن ان کے قصور کی اس بات سے کسی حد تک تلافی ہو گئی ہو گی کہ میں نے طاہر صاحب کو صحت یاب کر دیا؟

فضل الدین اور طاہر نے احتجاج کیا

"آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں، بشن چند صاحب! وطن کا دفاع کرنا اور وہ بھی اتنی دلیری کے ساتھ۔ یہ کوئی قصور نہیں بلکہ شجاعت کا کارنامہ ہے۔"

بر کا دایاں ہاتھ ٹھیک سے نہیں مڑ پاتا تھا۔ وہ اپنی گردن کو بھی ٹھیک گھما پاتا تھا جس کی وجہ سے دائیں بائیں
جانب دیکھنے کے لیے سارے جسم کو گھمانا پڑتا تھا۔

"صد افسوس کہ اب میں اعلیٰ حضرت کے محافظ کی حیثیت سے کام کرنے کے لائق نہیں رہ گیا۔"

"میں اس کی بات کب کر رہا ہوں۔ میں تو آپ کو اپنے درباریوں کے معتبر و مقرب بیگوں کے درمیان دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"جی نہیں۔ میں بیگ نہیں بن سکتا اور اب بیگ بننے کی خواہش بھی نہیں رہی۔"

"لیکن کیوں؟"

طاہر نے نشے اور نخوت کے زیر اثر اپنے دوست بابر پر بے رحمی سے ہاتھ اٹھانے اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات کی ساری تفصیلات من و عن بیان کر دیں جنھیں بابر توجہ کے ساتھ سنتا رہا۔

"میں زخموں کے باعث شدید درد میں مبتلا بستر پر پڑا ایڑیاں رگڑ رہا تھا لیکن میرے لیے اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ بھی خود میرے اپنے ضمیر کی پھٹکار تھی حکمران، مجھے بیگ بننا زیب نہیں دیتا میں کاشت کار ہوں، وہ سپاہی بھی لیکن اب تو معذور ہو چکا ہوں۔ اب تو آپ مجھے اسی باغ میں کام کرنے کی اجازت دے دیجیے جسے میرے ہم وطن تیار کر رہے ہیں۔ میں باغبان کی حیثیت سے پھولوں کے پودے لگایا کروں گا۔ قو میں کاشت کاری کے ساتھ ہی ساتھ میں باغبانی بھی بڑے شوق سے کیا کرتا تھا۔"

بابر یہ سب سن رہا تھا اور اس کی نظریں منقش مرمریں ستونوں سے بہت بلندی پر فضاؤں میں خرماں کالی گھٹاؤں کے نظارے میں محو تھیں۔ حسن نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہوا مسحور کن حسن ساں۔ نے طاہر کو نیک ارادوں سے بیگ بنایا تھا لیکن اب وہ دیکھ رہا تھا کہ طاہر اس منصب سے مسرور و مطمئن نہیں ہے۔ آخرکار اس نے کہا:

"خیر ٹھیک ہے، جیسے چاہتے ہیں ویسے ہی کیجیے۔ آپ میر جنگ جو بیگ اور رفیق ہیں لیکن آپ اس منصب کو چھوڑ کر باغبان بن جائیں گے۔ آپ کو تو بیگوں سے نجات مل جائے گی لیکن مجھے.. مجھے کیسے نجات مل سکے گی بیگوں سے؟"

طاہر بوکھلا گیا لیکن اس نے جوں توں جواب دیا

"آپ بادشاہ ہیں۔ کاشت کار اور بادشاہ میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ بیگ تو آپ کی ماتحتی میں رہتے ہیں۔"

"وہ ماتحتی ہی میں نہیں رہتے بلکہ مجھے بھی اپنے ماتحت رکھتے ہیں۔ ذرا بھی غفلت برتی جائے تو یہ لوگ ایسے غار میں دھکیل دیتے ہیں جس سے آدمی کسی بھی طرح باہر نہیں نکل سکتا۔ غرق کر دیں گے.... میں نے اسفرہ میں جو کچھ کہا تھا وہ یاد ہے؟"

"آپ کی اس بات کو شاہ عالی، میں زندگی بھر نہ فراموش کر سکوں گا۔"

"اور خود آپ نے کیا کہا تھا؟ کیا وعدہ کیا تھا؟ یاد ہے کہ آپ نے کہا تھا" میں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہوں گا"؟"

ان دنوں تو میں طاقتور، جوان تھا... اب مجھ میں کچھ سکت ہی باقی رہ گئی تو میں آپ کے کس کام کا، عالی جاہ؟"

"مجھے محل میں کسی ایسے شخص کی ضرورت ہے جو میری خلوت گاہ کا خلوص دل سے خیال رکھے۔"

بابر کی مراد اس جگہ سے تھی جہاں وہ تنہائی میں لکھتا پڑھتا تھا۔ طاہر جانتا تھا کہ بابر کی زندگی کے محبوب ترین اور

جہاں کی خوشگوار ساعتیں گزرتے ہیں لیکن اس سے ان سازشوں، افواہوں اور تیکھی نگاہوں کا تصور پیدا ہو جس سے اسے سابقہ پڑ سکتا تھا کیونکہ بادشاہ کے چہیتوں کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا تھا اور اس نے اپنے ماموں کے ساتھ باغ میں کام کرنے کی اجازت کی ایک بار پھر درخواست کرنے کا فیصلہ کیا

''اعلیٰ حضرت سے یہ غلام معافی کا خواستگار ہے۔ دل چاہتا ہے کہ باغ ہی میں کام کروں''

''اچھی بات ہے، ہم باغ میں اپنی خلوت گاہ کا انتظام کر رہے ہیں۔ تعمیر ہو جائے گا تو اس کی دیکھ بھال آپ ہی کیجیے گا۔ ٹھیک ہے نا؟''

اب انکار کرنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ ویسے طاہر بابر کی کسی بات کی مخالفت کرنے کا عادی بھی نہ تھا۔ آخر اس نے اپنے دائیں ہاتھ کو جسے ابھی وہ اپنی مرضی کے مطابق موڑ نہیں پاتا تھا، اطاعت اور رضامندی کے اظہار کے طور پر سینے کے بائیں حصے پر، دل پر رکھ لیا۔

آگرہ دو مہینوں سے بارش کی چپیٹ میں تھا۔ گرمی تو کم ہو گئی تھی لیکن ہر شے میں سرایت کر جانے والی نمی نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ بابر کے لکھنے کا کاغذ تک نم ہو گیا تھا۔ کپڑے کئی کئی دنوں تک سوکھ نہیں پاتے تھے۔

بابر کہیں اور نہیں گیا تھا، آگرے ہی میں مقیم تھا۔ وہ ہر روز شام کو وسیع و عریض باغ کے کافی اندر واقع اپنی خلوت گاہ میں چلا جاتا تھا جو ایک دوسرے سے ملے ہوئے چار کمروں پر مشتمل چھوٹی سی عمارت تھی۔ اس کی صفائی دو خادموں کے سپرد تھی۔ طاہر کو آفتابچی بنا دیا گیا تھا لیکن اس کا کام پانی اور شراب پیش کرنے سے کہیں زیادہ قلمی کتابوں، مسودوں، صاف کاغذ، قلم اور روشنائی وغیرہ کا خیال رکھنے سے متعلق تھا۔ سب سے زیادہ پرسکون اور آرام دہ کمرے میں ایک ہشت پہل میز رکھی ہوئی تھی جس کے پاس بیٹھ کر بابر لکھا کرتا تھا۔ پہلو والے کمرے میں دسترخوان پر صراحیوں میں عرق گلاب، لیموں اور سنگترے کے شربت، ایک طشتری میں پوست، ڈوڈی اور نشاط انگیز قوام رکھے رہتے تھے۔

طاہر نے ایک روز دسترخوان پر غزنی کی خوشبودار شراب کی صراحی رکھ دی لیکن بابر نے اسی شام کو اسے ٹوک دیا

''اسے یہاں سے ہٹا لیجیے۔ ضیافتوں میں جتنی شراب پی جاتی ہے، اتنی ہی بہت ہے۔''

اس کے بعد طاہر نے خلوت گاہ میں کبھی شراب نہ لانے کو اپنا اصول بنا لیا۔

کبھی بابر اندرونی کمرے میں تمام شب کام کرتا رہتا تو طاہر بھی صبح تک بیدار رہتا تھا۔ بابر کو علم ہوتا تھا کہ اس کا سابق بیگ ڈیوڑھی میں جاگ رہا ہے، اور وہ بعض اوقات طاہر کے پاس آ کر کچھ دریافت بھی کر لیتا تھا۔

ایک بار بابر نے پوچھا

''طاہر بیگ، آپ کو یاد ہے، ہم نے بدخشاں میں زردچہ کے جنگلات میں بے حد بھینی خوشبو والی ایک گھاس دیکھی تھی؟ یہ گھاس وہ کات میں بھی بہت پائی جاتی ہے اور آسمان پائے راؤ میں بھی۔ ہلکے نیلے سے رنگ کی ہوتی ہے۔ میں نے ایک بار اس کا نام کسی دفتر میں درج کیا تھا پر وہ مل نہیں رہا ہے.. شاید کابل میں رہ گیا۔''

''اس گھاس کو گھوڑے کھاتے ہیں؟''

''ہاں بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ زمین پر گچھوں کی شکل میں پھیلتی ہے۔''

''بہکتا تو نہیں؟''

"ہاں ہاں بیٹا، آفریں ابچکا بیٹا ہوتا کا زیادہ درست ہے ا پچھوں کی شکل میں آگئی ہے۔ جیسے شاخ۔
ٹہنیاں نکلتی ہیں۔ بتاق یعنی شاخ بنی۔ بدخشاں میں یہ گھاس ابچکا کہلاتی ہے۔"
کبھی کبھی بابر طاہر سے ایسے دقعات کے متعلق جوان دونوں کو پیش آئے تھے یا ان مقامات کے بارے میں
جہاں سے وہ کبھی گزرے تھے، ضروری تفصیلات بھی دریافت کر لیا کرتا تھا۔
ایک بار نصف شب بیت چکی تھی تو بابر نے طاہر کے پاس آ کر اپنے یہ اشعار بڑے مغموم لہجے میں سنائے

عرصے سے کوئی یار نہ میرا دیار ہے
پل بھر کو بھی نہیں مجھے حاصل قرار ہے
آنے کو اپنی مرضی سے آیا ہوں میں یہاں
جانے کا پر یہاں سے نہیں اختیار ہے

ان اشعار سے طاہر کے دل پر کچھ ایسی چوٹ پڑی کہ منہ سے آہ نکلتے نکلتے رہ گئی۔
دونوں خاموش ہو گئے، اپنی اپنی زندگی کے بارے میں، اپنی اپنی بیگمات کے بارے میں سوچنے لگے۔ بابر کو سب
سے زیادہ ماہم بیگم کی یاد ستانے لگی اور طاہر کو زہرہ کی۔
"آخر ان سے ہماری ملاقات کب ہو سکے گی، اعلیٰ حضرت؟ ہمیں آگرے میں تنہا رہتے ہوئے کتنے دن بیت چکے
ہیں؟"
"راستے اب بھی بہت ہی پرخطر ہیں، خاص طور سے خواتین کے لیے۔ اور طاہر بیگ، گھریلو زندگی کی راحتوں کی فکر
کرنے کا یہ وقت بھی نہیں۔ رانا سنگرام سنگھ جنگ کی تیاریاں کر رہا ہے۔"
"لیکن اس نے تو ابراہیم لودھی کے خلاف آپ سے اسی وقت معاہدہ کر لیا تھا جب ہم لوگ کابل میں تھے۔"
"اس رجپوت کا اصل مقصد یہ تھا کہ ہماری مدد سے دہلی و آگرے پر قابض ہو جائے۔ اس کی شجاعت پر ذرا بھی
شک نہیں کیا جا سکتا لیکن وہ چالاک بھی ہے اور اس کا خیال تھا کہ ابراہیم لودھی سے جنگ کے بعد ہم لوگ واپس لوٹ
جائیں گے۔ اب وہ دیکھ رہا ہے کہ ہم تو یہاں ٹھہر گئے ہیں، عمارت تعمیر کر رہے ہیں اسی لیے ہم سے ٹکر لینے پر آمادہ ہو گیا
ہے۔ اپنی طاقت بڑھا رہا ہے۔ اس نے اپنے چتوڑ سے نکل کر بہت سے علاقوں پر قبضہ بھی کر لیا ہے۔ وہ تو ہمیں مغل کہتا
ہے حالانکہ اسے معلوم ہے کہ ہم ترک ہیں۔ رانا سنگرام سنگھ ان سبھوں کو اپنے اردگرد اکٹھا کر رہا ہے جو ہم سے
خار کھاتے ہیں، ناخوش ہیں۔"
"بجا فرمایا اعلیٰ حضرت نے۔ ویسے ناخوش لوگوں کی یہاں بھی کوئی کمی نہیں۔ اور ان کی ناراضگی کے اسباب بھی
ہیں۔"

طاہر کی اس بات کا مقصد بابر کو اس واقعے کی یاد دلانا تھا جو چند دن قبل قلعہ آگرہ میں پیش آیا تھا۔
محل کے عقبی حصے میں قلعے کی فصیل تک کافی لمبی چوڑی زمین خالی پڑی ہوئی تھی۔ بابر نے حکم دیا کہ اس کے وسط
میں ایک باؤلی کھودی جائے۔ تبریز سے آگرہ آ جانے والے سلیمان رومی کے منصوبے کے بموجب یہ باؤلی بہت گہری
کھودی جانی تھی اور اس میں مختلف سطحوں پر تین بڑے بڑے حوض بنائے جانے تھے۔ باؤلی کی تہہ میں بننے والے بہت
بڑے حوض تک پہنچنے کے لیے اوپر سے بالکل سطح آب تک سیڑھیاں بھی بنائی جانی تھیں مختصر یہ کہ بہت زیادہ کام انجام دیا

۵

کسی ڈھنگ سے اب کرہلاک ہو جانے والے مزدوروں کی لاشوں کو چاشنی گیر بہلول نے بھی جو شاہی مطبخ میں بادشاہ کے لیے کھانے تیار کر رہا تھا، دیکھا تھا۔ اس کے سینے میں پانی پت کی جنگ کے دوران دشمنوں کے ہاتھوں اپنے بیس سالہ بھائی کے ہلاک کر دیے جانے کا، حادثے میں مزدوروں کی موت کا، ملکہ بیدو کی توہین کا اور ان ساری باتوں کا انتقام لینے کی آگ بھڑک اٹھی تھی جو تعمیر کی وجہ سے ہو رہی تھیں۔

اس چاشنی گیر کے پاس حال ہی میں ملکہ بیدو کی ایک کنیز کے ذریعے زہر پہنچا دیا تھا۔ ایک دوسری کنیز نے جو کسی نہ کسی طرح شاہی محل میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی، بہلول کو ملکہ کی اس ہدایت سے بھی مطلع کر دیا تھا کہ اسے عجلت سے کام لینا چاہیے ورنہ موسم باراں کے ختم ہوتے ہی بابر رانا سنگرام سنگھ کے خلاف مہم پر روانہ ہو جائے گا۔

زہر بہت ہی کم، صرف دو چٹکی زہر چار تہہ کیے ہوئے سفید کاغذ کی پڑیا میں چھپا ہوا تھا۔ یہی وہ خطرناک ہتھیار تھا جس کے ذریعے بہلول نہ صرف یہ کہ اپنے بھائی کی موت کا انتقام لینا چاہتا تھا بلکہ اپنے وطن سے بیرونی فاتحین کو بھی بھگا دینے کا خواہاں تھا۔ دراصل احمد اس چاشنی گیر کو یقین دلا چکا تھا کہ بابر کا کام تمام کر دیا گیا تو باقی سب فاتحین ہندوستان سے واپس چلے جائیں گے اور ابراہیم لودھی کا بیٹا تخت نشین ہو جائے گا۔

بابر کے اپنے چاشنی گیر بھی تھے جن کی ذمے داری یہ تھی کہ تمام کھانوں کے شاہی دسترخوان پر لگائے جانے سے قبل دیگچیوں ہی میں چکھ کر جانچ کر لیا کریں۔ لیکن مطبخ میں جو چند چاشنی گیر کام کر رہے تھے وہ اس وقت کچھ کھانوں کو لے کر شاہی دسترخوان پر لگانے کے لیے جا چکے تھے۔ بہلول نے چپ چاپ اپنی بغلی جیب سے زہر کی پڑیا نکالی اور احتیاطاً چاروں طرف نظریں دوڑانے کے بعد تھوڑا سا زہر ایک چپاتی پر چھڑک کر اسے چینی کی رکابی پر رکھ دیا۔ دراصل اسے ملکہ بیدو نے ہدایت ہی یہی کی تھی کہ زہر کے سفوف کو دیگچیوں کے بجائے جن کے کھانے پہلے ہی چکھے جاتے ہیں، بابر کے کھانے کی رکابی یا پیالے میں ڈالنا۔

اتنے میں ہوا کے تیز جھونکوں سے باہری دروازہ کھڑ سے بند ہوا اور بہلول نے گھبرا کر باقی زہر کو چولہے میں پھینک دیا۔ اس نے ایک بار پھر چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور اس کی گھبراہٹ جاتی رہی۔ اب اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ چپاتی پر گوشت کی بوٹیاں رکھ کر اوپر سے کچھ گھی بھی ڈال دیا۔

ذرا سی دیر بعد ایک خدمت گار آکر چینی کی اس رکابی کو محل کے اس حصے میں لے گیا جہاں بابر کھانے پر بیٹھا تھا۔ وہ اپنے ساتھ بادیان، ریت کی ورق لگی ہوئی گاجروں کی طشتری بھی اٹھا لے گیا۔

احمد نے اس چاشنی گیر کو یقین دلا دیا تھا کہ زہر سے کھانوں کے ذائقے پر کوئی اثر نہ پڑے گا اور کھاتے وقت ذرا بھی شک نہ ہوگا کہ کھانے میں زہر ملا ہوا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ زہر بہت دھیرے دھیرے اثر دکھائے گا۔ بہلول کو یقین تھا کہ وہ محل میں شور مچنے سے پہلے ہی قلعے کے پھاٹک سے باہر نکل کر غائب ہو جائے گا لیکن اس اثنا میں ایک نہایت ہی غیر متوقع واقعہ پیش آگیا۔ ایک چاشنی گیر اس کا راستہ روک کر دروازے میں آن کھڑا ہوا۔

"خرگوش کا گوشت ہمارے لیے بھی بچا رکھا ہے کہ نہیں؟" اس نے پوچھا۔

"صاحب! آپ لوگوں کے لیے تو قلیہ رکھا۔"

نہیں، نہیں تو خرگوش کا گوشت پکا ہے۔

وہ تو تھوڑا سا ہی تھا حضور۔ سب کا سب شاہی دسترخوان کے لیے بھیج دیا۔

نہیں، نہیں جو تم سوچ رہے ہو، بہت تھا۔ تم کہاں گئے ... " ... چاشنی گیر نے ...

"میں نے سارا گوشت نہیں دیا تھا حضور۔"

... چولہے کے پاس گیا اور گھبراہٹ کے عالم میں کام کرنے لگا۔ اس نے دوبارہ گھی گرم کیا اور خرگوش کے گوشت کی بوٹیاں کڑاہی میں ڈال دیں۔

تھوڑی دیر بعد ہی ... رات نے محل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تیز ہواؤں کے ساتھ موسلا دھار بارش جو شام کو شروع ہوئی تھی اب بھی جاری تھی۔

اتنے میں اچانک پہریدار سپاہی ادھر ادھر دوڑنے بھاگنے لگے۔ کسی نے زور سے پکارا، "حکیم! حکیم صاحب کو بلاؤ۔" چاشنی گیر جو کچھ نہیں سمجھ سکے تھے، ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے لپکے۔ شور لمحہ بہ لمحہ بڑھتا گیا اور بادشاہ کے کھانے کے کمرے کے دروازے کے سامنے بھیڑ سی جمع ہو گئی۔ طاہر باغ میں واقع خلوت گاہ سے نہایت تیزی کے ساتھ دوڑتا ہوا کھانے کے کمرے میں پہنچ گیا۔

بابر کو ابکائیاں آ رہی تھیں، قے ہو رہی تھی۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ وہ ہانپتا ہوا اضطرابی کیفیت کے ساتھ باہر نکلنے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا لیکن دو قدم بھی نہ چل سکا، پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ طاہر نے لپک کر اسے سہارا دیا۔

حکیم یوسفی دوڑا آ گیا۔

"برآمدے میں بستر بچھا دو" اس نے خادموں سے کہا۔

"نہیں، احاطے میں" بابر نے خرخراتی ہوئی آواز سے کہا اور ابکائیوں کا دوبارہ دورہ پڑنے سے دوہرا ہو گیا۔

"عالی جاہ احاطے میں تو بارش ہو رہی ہے۔ برآمدے میں بہتر رہے گا۔"

بابر کو سہارا دے کر برآمدے میں لایا اور بستر پر لٹا دیا گیا۔ حکیم نے سب سے پہلے اسے دل کو مضبوط کرنے والی دوا سونگھنے کو دی۔

"میں نے شراب نہیں پی تھی ... کھانے میں کچھ ملا تھا" اس کے بعد وہ "باورچی کو حراست میں لے لو" بمشکل کہہ پایا تھا کہ اٹھ کر دوبارہ چینی کی چلمچی پر جھک گیا۔ دوسرے دو افراد نے بھی اس کھانے کا کچھ حصہ کھایا تھا۔ انہیں بھی قے ہوئی لیکن بابر سے کچھ کم۔

بہلول کو سپاہیوں نے نہیں بلکہ خود چاشنی گیروں ہی نے پکڑ لیا اور جلادوں نے اس سے پوچھ گچھ کی تو اس نے جلد ہی سب کچھ اگل دیا۔ احمد، ملکہ بیدہ اور اس کی دونوں کنیز داسیوں کی گرفتاری کے لیے فوراً ہی سپاہی روانہ کر دیے گئے۔

بابر کی حالت تمام شب خراب رہی۔ جب بھی قے ہونے لگتی تھی یا تیز بخار کے باعث جسم کا درد بڑھ جاتا تھا تو اس کے مقربین پریشان و متفکر ہو جاتے تھے کہ شاید آخری گھڑی آن پہنچی۔ حکیم یوسفی برابر بابر کے پیٹ کی دھلائی کرتا رہا، یکے بعد دیگرے دوائیں دیتا اور یقین دلاتا رہا:

"انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا اعلیٰ حضرت۔ ہم آپ کو صحت یاب کر دیں گے۔"

بابر کو لگ رہا تھا جیسے دنیا ٹوٹ کے عجیب دھندلے سے ٹکڑوں میں تقسیم ہوئی جا رہی ہے۔ دوران کے ساتھ ہی

ساکھا اس کا دل، پھیپھڑے اور معدہ باہر نکلے پڑ رہے ہیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے عجیب رنگ بدلنے لگے۔ ایسے رقصاں تھے جن کے درمیان کبھی ہمایوں، کبھی بیدہ اور کبھی مسکین ماہم بیگم کی جھلک نظر آ جاتی تھی۔

بابر کراہ رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں مدد مانگ رہا تھا (حالانکہ اسے لگ رہا تھا جیسے اونچی آواز سے کہہ رہا ہو) "آخر میں نے مرزا ہمایوں کو کابل کیوں بھیج دیا؟ وہاں سے بدخشاں جاتا ہے کیونکہ ہماری شمالی سرحدوں کے حالات ایک بار پھر ابتر ہو گئے ہیں۔ بہر حال جب جاتے..." بابر پر بے ہوشی کی طاری ہو گئی اور اس کے سامنے امیر تیمور آن کھڑا ہوا جس کی سرخ و سپید دستار میں کوہ نور ہیرا چمک رہا تھا۔ پھر سے ہوش آ گیا اور وہ سوچنے لگا "یہ بلا سر سے ٹلی تو آخری نجات ملی۔ میرے جگر گوشے میرے پاس ہوں گا۔ میری شریک زندگی ماہم بیگم۔ قاصدوں کے ان تک پہنچنے اور ان دونوں کے آگرہ آنے میں کم از کم تین مہینے تو لگ ہی جائیں گے۔ اور میرا انتقال تو ہفتے بھر میں ہو سکتا ہے۔ نہیں، کل، آج، ابھی!"

حوصلے بلند رکھئے عالی جاہ۔ ہمت نہ ہاریئے" طاہر نے منت بھرے لہجے میں کہا۔ "آپ کے ساتھ تو ہم لوگ جانے کتنی ہی بار موت پر فتح حاصل کر چکے ہیں"

"لیکن ہم پر... ایسی تو کبھی بھی... نہیں گزری تھی... ہے نا طاہر جان؟ ذرا قریب آ جاؤ، طاہر بیگ" بابر نے رک رک کر سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

جب بھی بابر "آخر یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟" سوچتا اور سیاہ و سرخ لقمے تھوکتا ہوا چلمچی پر جھکتا، طاہر اسے سہارا دیتا اور اس کے پسینے میں لت پت چہرے اور جسم کو پونچھنے لگتا تھا۔ ناقابل برداشت اندرونی درد سے بار بار بابر کی سانس رکنے سی لگتی تھی، آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ طاہر یہ سب دیکھ دیکھ کر اس خیال سے مغموم ہو رہا تھا کہ اس کے لیے بابر کی ان تکالیف کا کچھ حصہ خود جھیل لینا کسی بھی طرح ممکن نہیں ہے۔ اسے بابر سے اتنی زیادہ ہمدردی محسوس ہو رہی تھی کہ کسی کسی وقت اسے لگتا جیسے خود بھی زہر کھا لیا ہو۔

قے ہونے کے دوروں کے مختصر درمیانی وقفوں میں سے ایک میں جبکہ بابر آنکھیں بند کیے بے جان سا بیٹھا ہوا تھا، اس عہدے دار کو قریب آنے کی اجازت دے دی گئی جس نے گرفتار کیے جانے والوں سے پوچھ گچھ کی تھی۔

"مختصراً معاملے کا لب لباب بیان کر دیجیے، صرف لب لباب" یوسفی نے اسے چپکے چپکے آگاہی دی۔

خاص بات جو بابر کو معلوم ہونی چاہیے تھی، وہ تھی بیدہ کا اعتراف جرم۔ ملکہ نے تسلیم کر لیا تھا کہ بیرونی بادشاہ کو زہر دینے کا منصوبہ اسی نے بنایا تھا، اسی نے اس معاملے میں ضروری افراد کا انتظام کیا تھا نیز یہ کہ اس طرح اس نے اپنے بیٹے کی موت کا انتقام لیا ہے۔ تفتیش کرنے والے نے اس سے یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کی کہ کیا سازشیوں کا کوئی تعلق رانا سنگرام سنگھ سے بھی تھا مگر بیدہ نے جواب دینے سے انکار کر دیا۔ عہدے دار بابر کی اجازت کے بغیر ملکہ کو کچھ اگلوانے کے لیے اذیت دینے کی جرأت نہ کر سکا۔

"مجھ اب تو اسے ایسا ہی ہونا تھا" بابر نے مرتعش آواز سے کہا کیونکہ پھر مروڑ اٹھنے لگی تھی۔ "اور وہ حرام زادہ باورچی! کمبخت کو ملازم رکھا! اس پر اعتبار کیا! اس کے پکائے ہوئے کھانے کھاتا رہا اور اس نے غداری کی!... بابر کے ٹھنڈا پسینہ پھوٹ نکلا اور حکیم یوسفی نے عہدے دار کو وہاں سے چلے جانے کا اشارہ کیا۔

"اعلیٰ حضرت، ان بدمعاشوں کو تڑپا تڑپا کر ہلاک کیا جانا چاہیے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔"

"ان تینوں کو رواج کے مطابق سزائے موت۔ بیدہ کو بعد میں۔"

"جو حکم۔"

حکیم یوسفی بابر کی جان بچانے کے لیے دو دنوں اور دو راتوں تک جدوجہد کرتا رہا۔ اس کے بعد اس نے اطمینان کی سانس لی۔ "خدا کا ہزار ہزار شکر کہ اس نے ہمارے فرماں روا کو حیات دوبارہ عطا کر دی۔ اب آپ دودھ پیا کریں اور زیادہ سے زیادہ سونے کی کوشش کرتے رہیں۔"

بابر سونے کی کوشش کرتا تھا لیکن نیند اسے نام ہی کو آتی تھی۔ بس آنکھیں بند کیے لیٹا رہتا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے وہ واقعہ وغار اب بھی منڈلاتا رہتا تھا جس کے دہانے پر وہ دو دنوں تک کھڑا رہا تھا، عین دہانے پر! ان بھیانک دنوں کے بعد اس کے دل میں جس نہایت ہی طاقتور جذبے نے جنم لیا تھا اسے نئی زندگی پانے کا جذبہ ہی کہا جا سکتا تھا۔ اب اس کے لیے زندگی کا مختصر سے مختصر لمحہ بھی تمام سلطنتوں، تمام خزانوں، ساری شہرت و ناموری اور دنیا کے سارے تختوں اور تاجوں سے بھی زیادہ عزیز ہو گیا تھا۔ اس کی اذیت سے ہلکان اور نڈھال روح اور نحیف جسم کے اندر جیسے کچھ جل کر خاکستر ہو گیا تھا اور اب وہ دنیا کو ایک بالکل نئی نگاہ سے دیکھنے لگا تھا۔ وہ سوچتا کہ زندگی انسان کو ایک بار محض ایک ہی بار ملتی ہے تو پھر اس شخص کی بدبختی کا کیسے اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو خود اس کی عمر تک بھی پہنچنے سے قبل ہی اپنی زندگی سے محروم ہو گیا ہو؟ مثال کے طور پر اس کا دشمن ابراہیم لودھی اس سے چار سال چھوٹا تھا۔ کیا ملکہ بیدہ، آن بان والی وہ خاتون جس نے یہ جرم کیا تھا، اپنے بیٹے کی موت کو فراموش کر سکتی تھی، بابر کو صرف اس بنا پر معاف کر سکتی تھی کہ بابر نے سب کے سامنے اسے اپنی ماں بنا لیا تھا؟ وہ سوچتا کہ فتح بے پایاں مسرتوں سے ہمکنار کر دیتی ہے لیکن خطرناک بھی ہوتی ہے۔ فتح کے نشے میں فاتح، اپنی طاقت، اپنی ذات، اور لوگوں پر اپنے اثرات کا بہت بڑھا چڑھا کر اندازہ لگانے لگتا ہے۔ یہ بات نہ ہوتی تو بھلا وہ ایسے باورچی پر کب اعتبار کر سکتا تھا جو اتنے برسوں تک وفاداری کے ساتھ بیدہ کی خدمات انجام دے چکا تھا۔ اس کا یہ اقدام خود کو بہت کچھ سمجھ بیٹھنے ہی کا تو نتیجہ تھا۔ اگر وہ اس خوش فہمی میں نہ مبتلا ہو گیا ہوتا کہ لوگوں کے، اس ملک کے لوگوں کے دلی جذبات کو سمجھنے پر قدرت رکھتا ہے تو کیا اسے اپنے خلاف بیدہ کی آنکھوں میں چھپی ہوئی نفرت نظر نہ آ جاتی۔ بیدہ کی آنکھوں کی وہ بجلی کے کوندے جیسی چمک تو اسے اب کہیں جا کر یاد آ رہی تھی۔ اس، ہم چشم کی یہ بات بھی یاد آ رہی تھی کہ بیرونی حملہ آور کی تلوار کے زخم صدیوں تک نہیں بھرتے۔ اس بات پر کان نہ دھرنا، اس بات کی سچائی کو تسلیم نہ کرنا کتنی بڑی خود فریبی تھی! اسی وجہ سے تو وہ بیدہ کے فریب کا بھی شکار ہو گیا تھا اور خود اپنے فریب کا بھی۔ لیکن اگر اس طرح کے زخم صدیوں تک نہیں بھرتے تھے تو کیا اس کی زندگی بیتے اور اس ملک کے لوگوں کے درمیان حائل خلیج کو دور کرنے کے لیے کافی ہو سکتی تھی؟ یا پھر یہ آرزو بھی محض خود فریبی ہی تھی، محض سراب ہی؟ کہیں یہ اس بات کی سزا تو نہیں تھی کہ اس کی مہموں کے دوران بے گناہوں کا، جنتوں کا خون بہایا گیا تھا؟

اس قسم کے خیالات اور فکروں سے بابر کی حالت دوبارہ بگڑنے لگی۔ اسے مستقبل پہلے سے بھی زیادہ تاریک نظر آنے لگا۔

---

* اس زمانے میں حکمراں کی جان لینے کی کوشش کو سنگین ترین جرم تصور کیا جاتا تھا اور مجرمین کو شدید جسمانی اذیتوں کے ذریعے ہلاک کیے جانے کی سزا دی جاتی تھی۔ بھوں کی جیتے جی کھال کھینچ دی گئی تھی، احمد کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کروا دیے گئے تھے اور محل میں زہر پہنچانے والی کنیز کو بپھرے ہوئے ہاتھی کے پیروں سے روندوا دیا گیا تھا۔

اس سب کے باوجود زندگی کی قوتیں زیادہ موثر ثابت ہوئیں۔ تاریکی میں جھلملاتی ہوئی روشنی دھیرے دھیرے بڑھتی اور تیز ہوتی گئی۔

حملوں کا سلسلہ بند ہو گیا۔ رات کو وہ سکون کے ساتھ سونے بھی لگا، مگر صبح کو بستر سے اٹھنے کی کوشش کرتا تھا تو چکر آنے لگتا تھا۔

"یہ نقاہت جاتی رہے گی،" حکیم نے اسے یقین دلایا۔ "اعلیٰ حضرت، بس آپ بیٹھے ہی رہا کریں۔ ذرا جسم میں طاقت آنے دیجیے۔ کتنے دن؟ ایک ہفتہ اور۔ میں آپ کا تھوڑا سا خون نکال لیتا ہوں۔ خون میں بچے کھچے زہر کو نکل جانا چاہیے۔"

"میں ویسے ہی بالکل بے جان ہو رہا ہوں" بابر نے مخالفت کی۔ "خون نہ نکالیے۔ مجھے جلد از جلد مختلف لوگوں سے، بیگوں سے ملاقاتوں کا سلسلہ دوبارہ جاری کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ لوگوں میں سرگوشیاں شروع ہو گئی ہوں گی کہ میں بہت کمزور ہو گیا ہوں۔ ہمیں ایک طاقت ور دشمن سے ٹکر لینی ہے۔ وہ بغلیں بجا رہا ہوگا۔ باغی سر اٹھانے لگیں گے۔"

صحت یاب ہو جانے کے کچھ دنوں بعد بابر نے ایک خط کابل روانہ کیا جس میں اس نے اس واقعے کی تفصیلات اتنی سچائی کے ساتھ، ایسے پرسکون انداز میں درج کیں کہ بعد میں پورے خط کو اپنی تزک میں شامل کر لیا۔ لیکن پرسکون لہجے کے اس خط میں بھی اس دہشت کی پرچھائیاں نمودار ہو گئیں جو سر پر منڈلاتی ہوئی موت کے احساس سے اس کے دل پر طاری ہو گئی تھی۔ "میں نے اس سے قبل کبھی بھی زندگی کی شیرینی کو اتنی شدت کے ساتھ نہیں محسوس کیا تھا۔ میرا ایک شعر ہے

جو دہلیز تک موت کی جا چکا ہے
وہی قیمت زندگی جانتا ہے

اس واقعے کا جب بھی خیال آتا ہے، بری طرح مضطرب ہو جاتا ہوں۔"

بابر کے خطرے سے باہر ہو جانے کے بعد تیسرے دن اس کے حکم پر بیگ، اعلیٰ عہدے دار اور سلطنت کے تمام علاقوں کے حاکم دربار میں جمع ہوئے۔ بابر عقبی دروازے سے اندر داخل ہوا اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا شہ نشیں پر پہنچ کر تخت پر بیٹھ گیا۔ درباریوں نے اپنے اپنے عہدہ و منصب کے اعتبار سے اپنی جگہیں سنبھال لیں تو ملکہ بیدہ کے اندر لائے جانے کا اشارہ کیا گیا۔ وہ اندر آئی۔ دو سپاہی اس کے دائیں اور بائیں طرف کھڑے ہو گئے۔

وہ سفید لباس میں ملبوس اپنے سفید بالوں والے سر کو بڑے فخر سے اٹھائے ہوئے اندر آئی تھی پھر بھی اس نے تخت کی طرف رخ کر کے تعظیماً سر کو کچھ خم کر دیا۔ اس نے ایک ہی نظر میں شہ نشیں کی سیڑھیوں، تخت پر بیٹھے ہوئے بابر کے زرد زرد چہرے، حلقوں میں دھنسی ہوئی اس کی آنکھوں اور شاندار دستار میں ٹنکے ہوئے ہیروں کی چمک دمک کا جائزہ لے لیا۔ اس کا حوصلہ بڑھ گیا اور فوراً ہی بڑی آن بان سے تن کر کھڑی ہو گئی۔

سماعت شروع ہو گئی۔ بیدہ کو لانے والے عہدے دار نے دریافت کیا کہ شہنشاہ کی جان لینے کی سازش میں سزائے موت پانے والے افراد کے علاوہ اور کون کون ملوث تھا۔

"یہ سازش نہیں، میر، انتقام تھا!" بیدہ نے کہا۔ "انتقام اس خون کا جو آپ کے بادشاہ نے بہایا ہے۔ میری مدد ببول، احمد اور دو کنیزوں نے کی تھی۔ انھیں انتقام لینے والے شہیدوں کا درجہ نصیب ہوا، بہادروں کی موت ملی۔ اب

میری باری ہے۔ میں موت سے ذرا بھی خائف نہیں۔ میں اپنے لخت جگر کے غم میں گل کر خاک ہو چکی ہوں۔ قتل کرا دیجئے مجھے، اڑا دیجئے میری خاک کو ہواؤں میں'

اس نے یہ سب فارسی میں کہا جسے سب نے سمجھا۔ سب خاموش رہے۔ بابر پر واضح ہو گیا کہ نڈر بیوہ سر سے کفن باندھ کے آئی ہے اسی لیے زہر میں بجھے ہوئے الفاظ استعمال کر رہی ہے تا کہ بادشاہ چراغ پا ہو کر فوراً ہی جلاد کو طلب کرے، حکم دے کہ نحیف ماں کو سخت سے سخت اذیتیں دی جائیں۔ بابر نے سوچا کہ ایسا کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ جیت بیوہ کی ہوئی۔ اس کی بے خوفی اور بے باکی کے متعلق طرح طرح کے قصے چاروں طرف مشہور ہو جائیں گے اور اسے شہرت دوام حاصل ہو جائے گی۔ بیوہ چاہتی ہے کہ بعد میں اسے احترام کے ساتھ یاد کیا جائے۔

بابر نے اپنے غصے کو دبا دیا۔ اسے تو بیوہ پر ویسے ہی صبر وتحمل اور عزم کے ساتھ فتح حاصل کرنی تھی۔ جیسے بیوہ کے دیے ہوئے زہر کے اثر پر حاصل کی تھی۔ اچانک اس کے جسم میں پیدا ہونے والے تشنج نے زہر دیے جانے کے واقعے کی یاد تازہ کر دی لیکن اس تشنج کی طرف درباریوں کا دھیان نہ گیا۔

بابر خاموش رہا۔ اتنے میں ملک داد کرانی بول پڑا

''سلطان ابراہیم کی والدہ صاحبہ، خود کو انتقام لینے والی جانباز خاتون بنا کر پیش کرنے کی کوشش نہ کیجئے۔ آپ نے شاہ عالی کو فریب دے کر بڑی کمینی حرکت کی ہے! ''

''خاموش ہو جا، غدار! مجھے تو اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے یہ کرنا ہی تھا۔''

''آپ نے تو ماں کے مقدس نام کو بھی داغدار کر دیا۔ عالی جاہ نے جب آپ کو اپنی منہ بولی والدہ کہہ کر آپ کی توقیر بڑھائی تھی تو شدت جذبات سے سب لوگوں کے سامنے ہی آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔''

''آنسو! وہ نفرت کے آنسو تھے! ہونہہ، بھلا میں خود کو اس شخص کی ماں تصور کر سکتی تھی جس کے ہاتھوں میرے ابراہیم دنیا سے اٹھ گئے! کبھی نہیں!''

بابر اب بھی خاموش رہا۔ کرانی نے بلند آواز سے کہا

''لیکن آپ کے بیٹے کے پاس تو شاہ بابر کی فوج سے دس گنا بڑا لشکر موجود تھا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ کے بیٹے کو اگر فتح حاصل ہو جاتی تو وہ اپنے دشمنوں میں سے ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑتا۔ جنگ بہر حال جنگ ہی ہوتی ہے۔ آپ کے دل میں ذرا بھی انصاف ہوتا تو آپ کبھی بھی اتنی مکاری کے ساتھ زہر کا سہارا نہ لیتیں۔ شاہ بابر تو ایمانداری سے برسر پیکار ہوئے تھے، میدان جنگ میں، تلوار کے مقابلے میں تلوار اٹھا کر۔''

''میں عورت ہوں، تلوار اٹھا کے نہیں لڑ سکتی۔ میری تلوار تو وہی زہر تھا۔ بیرونی حملہ آوروں نے پانی پت کے میدان میں ہمارے ہزاروں سپاہیوں کو ہلاک کر دیا، سارے ہندوستان کو اپنے قہر وغضب کا نشانہ بنا لیا۔ مجھ جیسی کتنی ہی مائیں آج سوگوار ہیں۔ جانے کتنی ہی بیویاں آہ وبکا کرتی ہوئی اپنے شوہروں کے ساتھ ستی ہو چکی ہیں۔ میں نے جو زہر دیا وہ ان ہی بیرونی حملہ آوروں کے کیے کی سزا تھا۔ اس زہر میں بیواؤں اور یتیموں کے آنسو شامل تھے!''

یہ سب سن کر بیگ چیخ اٹھے۔ ایک لمبی داڑھی والے بیگ نے بابر کے سامنے سر جھکا کر تجویز پیش کی

''اعلیٰ حضرت، بہت سن چکے ہم اس خبطی بڑھیا کی بکواس! جلاد کو حکم دیجئے کہ اس کی زبان کھینچ لے۔''

''ہاں ہاں، میری کنیز کی طرح مجھے بھی بپھرے ہوئے ہاتھی کے سامنے پھنکوا دو، روندوا ڈالو!'' بیوہ غصے سے چیخ

تھی۔ میں ذرا بھی خائف نہیں ہوں زرا بھی!''

کیا اس بختی ماں کو کسی شہید کی سی موت مرنے دیا جانا چاہیے؟ بابر سوچ میں پڑ گیا۔ اف، کتنی عجیب تک بات ہوگی یہ! خود اس کے بچوں کی دنیا میں آ کر اسے کس نظر سے دیکھیں گی "ماہم بیگم کیا کہیں گی؟" ابھی کچھ ہی دنوں قبل اس نے تزک میں ہرات سے متعلق باب مکمل کیا تھا، خدیجہ بیگم کی موت کے متعلق لکھ چکا تھا۔ خدیجہ بھی مکاری اور دغابازی میں بیدو سے کم نہ تھی لیکن جب اسے شیبانی خان کے اشارے پر اس خبطی شہوت پرست بیگ منصور بخشی نے ہاتھوں شہید کی موت حاصل ہوگئی تھی تو وہ عوام کی یادوں کا تابندہ جزو بن گئی تھی۔ خدیجہ کی موت دل بنا پر بہت سے لوگ بے حس شیبانی خان سے نفرت کیے جا رہے تھے۔ وہ خود بھی اپنے حقیقت نگاری کے عہد کے باوجود جبر و تشدد کا شکار ہو جانے والی خدیجہ بیگم کی موت کا قصہ لکھتے وقت اس نوعیت کے جذبات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

وہ سوچنے لگا کہ اسے کیا طرز عمل اپنانا چاہیے کہ اس کے خلاف لوگوں کے دلوں میں نفرت کے جذبات نہ گھر کر جائیں۔

بیگ چیخ چیخ کر مطالبہ کر رہے تھے کہ بیدو کو سزائے موت دی جائے۔

''اس پگلی کو بپھرے ہوئے ہاتھی کے پیروں سے روندوا دیا جائے!''

''بورے میں بند کر کے بلند مینار سے نیچے پھینک دیا جائے!'' بابر نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بیگوں نے اپنی چیخ پکار بند کر دی۔

''لگتا ہے کہ ان محترمہ کے لیے'' بابر نے پرسکون لہجے میں کہنا شروع کیا، ''صرف ایک ہی سزا ہو سکتی ہے موت سے بھی مہیب تر سزا۔ آپ لوگ سن چکے ہیں، ان کی باتوں سے تو ایسا ظاہر ہوتا ہے گویا کہ ان کا دل ساری دنیا، بیواؤں اور یتیموں کے حال پر آہ و بکا کر رہا ہے نیز یہ کہ انھوں نے اپنے زہر کو بھی گویا کہ ان معصوموں کے آنسوؤں ہی سے تیار کیا تھا۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ خود ان کا بیٹا ابراہیم پنجاب، بنگال، گوالیار اور دوسرے علاقوں کے حکمرانوں سے مسلسل جنگ کرتا رہتا تھا۔ اس خانہ جنگی میں ہر برس کتنے افراد قتل ہو جاتے تھے؟ ذرا بتائیے تو ملک داد حبیب۔''

''گزشتہ تین برسوں میں ہی ہمارے ساٹھ ہزار سے زائد لشکری کام آ گئے تھے'' کرائی نے فوراً ہی جواب دیا۔

''سن لیا نا آپ لوگوں نے۔ ان محترمہ کے بیٹے نے اس تخت پر سے'' اور بابر نے تخت کے ہتھے پر ہاتھ مار دیا، ''دس برسوں تک حکمرانی کی۔ ہندوستان کی آبادی بہت ہے..... جنگوں کے لیے، ایک دوسرے کو تباہ کرنے کے لیے یہاں آدمیوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ سلطان ابراہیم کے پاس مال و زر کی بھی کوئی کمی نہیں تھی اس لیے وہ بھاڑے کے سپاہی بھرتی کرتا رہتا تھا۔ وہ سونا جمع کرتا رہتا تھا۔ اسے تعمیرات پر صرف نہیں کرتا تھا، محض سپاہیوں ہی کو بھرتی کرتا رہتا تھا تا کہ وہ سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں اس کی خاطر اپنی جانیں قربان کرتے رہیں۔ اور سپاہی اپنی جانیں گنواتے رہے۔ جس کا سبب، اکثر یہ ہوتا تھا کہ سلطان ابراہیم اچھا سپہ سالار نہ تھا۔ کسی سپہ سالار کی لیاقت و مہارت کا اندازہ محض اس کی فتوحات ہی سے نہیں بلکہ اس کے نقصانات سے بھی لگایا جاتا ہے۔ پانی پت کے میدان میں ہمارے دو ہزار لشکری کام آئے لیکن سلطان ابراہیم نے فن حرب میں اتنے زیادہ اناڑی پن کا ثبوت دیا کہ اس کے تیس ہزار سپاہی ہلاک ہو گئے۔ وہ بھی صرف ہماری تلواروں اور توپوں ہی کی وجہ سے نہیں بلکہ خود اس کے ہاتھیوں کی وجہ سے بھی۔ شاید سلطان ابراہیم بھی اپنے ہی ہاتھی کا شکار ہو گیا ہو، میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اور اسے ابراہیم کی والدہ'' بابر نے بلند تھکی ہوئی آواز سے کہا۔ ''اگر

ملکہ بیدہ اتنی ہی زیادہ انصاف پسند ہیں، اگر ہلاک ہو جانے والے سپاہیوں کی بیواؤں اور یتیموں کے لیے ان کے دل میں اتنا ہی زیادہ درد ہے تو آخر انھوں نے واہیات خانہ جنگیوں میں ہزاروں افراد کو ہلاک ہی کیوں ہونے دیا؟ اپنے بیٹے کو روکا کیوں نہیں؟ اسے آخر بلاوجہ خون کیوں بہانے دیا؟"

"میں تو صرف ماں ہوں، بادشاہ کو حکم دینا میرے بس کی بات نہ تھی" بیدہ نے الزام لگانے کے بجائے اب اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

"اور ہم یہاں خانہ جنگیوں کا خاتمہ کرنے کے لیے آئے ہیں۔ ہم اس عظیم ملک کو متحد کر کے ایک عظیم الشان اور طاقتور سلطنت قائم کر رہے ہیں۔ ہم یہاں نئی تعمیرات کریں گے۔ ملک کو خوشحال بنائیں گے۔ جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اسے مکمل کر کے رہیں گے۔ امید ہے ملکہ کے لیے سب سے بھیانک سزا یہی ہوگی کہ ان کے نہ چاہنے کے باوجود ان کے زہر اور غصے کے باوجود ہم یہیں رہیں گے اور ان سب کاموں کو انجام دیں گے جنھیں انجام دینے کی اہلیت نہ خود ان میں تھی اور نہ ہی ان کے بیٹے ابراہیم میں۔"

"آفریں!" ملک داد کرانی اطمینان کی سانس لے کر کہہ اٹھا۔

لوگوں نے محسوس کر لیا کہ دلائل کے اس مقابلے میں بھی بابر کو فتح حاصل ہو گئی ہے۔

"اگر سازشی خاتون کے دل میں بیواؤں اور یتیموں کا اتنا ہی زیادہ درد ہے جتنا کہ یہ کہہ رہی ہیں تو ہم حکم دیتے ہیں..... عبدالکریم بیگ!"

بائیں جانب کی قطار سے ایک فربہ اندام بیگ اٹھ کھڑا ہوا

"خادم ہمہ تن گوش ہے!"

"ہم یہ کام آپ کے سپرد کر رہے ہیں..... بیدہ خانم کو ان کی ساری دولت سے محروم کر دیا جائے۔ اس دولت سے جمنا کے کنارے ایک خیرات خانہ تعمیر کیا جائے۔ ملکہ کے خدام اور کنیزیں وہاں کام کریں اور ملکہ کے خزانے سے یتیموں اور بیواؤں میں اس وقت تک خیرات تقسیم کی جاتی رہے جب تک یہ خزانہ ختم نہ ہو جائے۔"

"اعلیٰ حضرت کا حکم سر آنکھوں پر!"

"اور ان کی، سن رسیدہ بیدہ خانم کی محترم بیگ، زندگی کے آخری ایام تک حفاظت کیجیے۔"

"کیا فرمایا عالی جاہ نے؟" عبدالکریم ہکا بکا رہ گیا۔ "سزائے موت نہ دی جائے گی کیا؟"

"مجھے جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکا۔"

سزائے موت نہ ملے گی؟ متوقع، مطلوب لیکن بہرحال مہیب موت کے سرد لمس کو نہ جھیلنا پڑے گا؟ بیدہ کے دل میں یہ خیال تیزی سے آیا اور اچانک اس نے زندگی کی گرم گرم سانسوں کے مس کو محسوس کیا، اس کی روح لرز اٹھی، نرم پڑ گئی، ایسا لگا جیسے اس کے اندر کوئی تار ٹوٹ گیا ہو۔

ملکہ بیدہ نے چہرے کو ہاتھوں سے ڈھک لیا اور رو پڑی۔

فتح پور سیکری

ا

مورخ خواند میر، شاعر شہاب معمائی، اور مدرس ابراہیم قانونی جنھیں بابر نے مدعو کیا تھا ہرات سے آگرے کے لیے روانہ ہوئے اور تقریباً تین مہینوں تک سفر کرتے رہے۔

ان لوگوں نے درہ خیبر کو پار کیا جس کی رفعتوں نے ان کے دلوں میں خوف اور ناامیدی کے جذبات بیدار کیے اور ان کے اس خیال کو تقویت پہنچائی کہ پروردگار کی تخلیق کردہ قدرت کی عظمتوں اور وسعتوں کے مقابلے میں انسان محض ایک ذرہ خاک کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے دریائے سندھ اور گھنے جنگلات کو پار کیا اور خواند میر کو غالباً پہلی بار احساس ہوا کہ دنیا کتنی وسیع و عریض، کتنی بے کراں ہے۔ یہ علاقے جنھیں کوئی گھڑسوار ایک ہفتے میں تو کیا ایک مہینے میں بھی پار نہیں کر سکتا تھا، درحقیقت بے کراں تھے اور اب ایک ہی سلطنت کا جزو بن چکے تھے۔ مسافروں کو بمشکل ہی یقین ہو رہا تھا کہ وہ ایک ہی سلطنت کے اندر محوِ سفر ہیں جس میں بلخ سے کابل تک، کابل سے لاہور اور لاہور سے دہلی تک سارے علاقے میں بابر کے احکام و فرامین کی بے چون و چرا تعمیل کی جاتی تھی۔

بابر کے مدعو کیے ہوئے ان افراد نے اس حقیقت کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ ان کے اور ماوراءالنہر اور خراسان سے دہلی کا سفر کرتے ہوئے صاحبانِ فنون کے ساتھ مختلف علاقوں کے صوبے داروں، سرحدی گشتی دستوں اور مال گزاری، ڈاک اور مہمان خانوں کے ذمے داروں نے بہت ہی مہذب برتاؤ کیا۔ "لگتا تھا جیسے ہم لوگ سفیر ہوں" شاعر شہاب معمائی نے بعد میں کہا تھا اور واقعی صورتِ حال کچھ ایسی ہی تھی۔ جب یہ لوگ کسی ایسے شہر یا گاؤں سے گزرنے لگتے جہاں لٹیروں کی وجہ سے ذرا بھی خطرے کا امکان ہوتا تو خواند میر اور اس کے ہم سفروں کی حفاظت کے لیے دو سو سپاہیوں تک کے دستے بھیج دیے جاتے تھے۔

کارواں سراؤں میں بھی ان "شاہی مہمانوں" کے لیے بہترین کمروں میں مفت قیام و طعام کا انتظام ہوتا تھا اور وہاں سے روانگی کے وقت راستے کے لیے کافی مقدار میں چاول، گوشت اور گھی وغیرہ ساتھ کر دیے جاتے تھے۔ چھوٹے موٹے مصارف کے لیے انھیں کچھ نقد رقم بھی دے دی جاتی تھی۔ ان لوگوں کو کہیں گھوڑے بدلنے کی ضرورت ہوتی تھی تو راستے کے نگراں اور ڈاک کے ذمے دار ان سب سے پہلے ان کے لیے گھوڑوں کا انتظام کر دیتے تھے۔

خواند میر کو راستے میں بابر کے پاس آتے ہوئے اجنبی سفیر اور ہندوستان آتے ہوئے تاجروں کے قافلے اکثر نظر آتے تھے۔ آگرے کے مغرب میں واقع قصبے سیکری میں بابر کو ایک اور جنگ میں جو پانی پت کی جنگ سے بھی کہیں زیادہ اہمیت رکھتی تھی، رانا سنگرام سنگھ کے لشکر پر فتح حاصل ہو جانے کے بعد ان حکمرانوں کی تعداد تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی جو بابر کے پاس اپنے سفیر بھیج رہے تھے۔ کوئی اسے مبارک باد بھیج رہا تھا، کوئی اس کی اطاعت قبول کر رہا تھا اور کوئی اس کے ساتھ مل جل کر پرامن طور پر رہنے کی تجویز پیش کر رہا تھا۔ لاہور میں خواند میر کی ملاقات ایران کے سفیر سے ہوئی جو تبریز سے شاہ اسماعیل کے بعد تخت نشیں ہونے والے اس کے بیٹے شاہ طہماسپ کی طرف سے دیگر شاندار تحائف کے علاوہ

بابر کے حرم کے لیے جو کسی قوم کی دوشیزائیں بھی ساتھ لے جا رہا تھا۔ یہ لڑکیاں سفید و سیاہ محمل میں حسن پرستوں کے بھینٹ چڑھنے سفر کر رہی تھیں۔

لاہور کے مشرق میں مورخ خواندمیر کی ملاقات ایک بڑے وفد سمرقند اور تاشقند کے سفیروں سے بھی ہوئی۔ اب بابر کی ہندوستان کی سلطنت کو اس کے کٹر دشمنوں یعنی شیبانی خاندان کے حکمرانوں نے بھی تسلیم کر لیا تھا۔ خود بابر بھی ماضی کے تلخ واقعات کو فراموش کر دینے کی خواہش ظاہر کر چکا تھا اور اس کے سفیر ہندوستان سے قیمتی تحائف کے ساتھ سمرقند اور تاشقند کا دورہ کر چکے تھے۔ سمرقند سے کوچ کنجی خان نے بابر کے لیے سات اونٹوں پر ساتھ قیمتی قسم کی چیزیں کشمش، کاغذی بادام قسم کی انتہائی شیریں خشک خوبانیاں، بخارا کی تیز اور خوشبودار شراب اور دوسری کئی اقسام کی مشہور اور بے نظیر چیزیں بھیجی تھیں اور ان اشیا کے ساتھ ہی ساتھ دو سو اصیل گھوڑے بھی۔ بابر نے سمرقند کے سفیر سے "ہشت بہشت" باغ کے اندر جمنا کے کنارے تعمیر کیے جانے والے محل میں پورے شاہی آداب و مراسم کے بموجب ملاقات کی تھی۔ "ہمیں بادشاہوں کی جیسی عزت بخشی گئی" خان کے سفیر نے جو اپنے وطن کو واپس جا رہا تھا، خواندمیر سے اپنی ملاقات کے دوران فخریہ بیان کیا۔

"خواندمیر صاحب، میں نے ہندوستان میں اتنا سونا دیکھا جتنا شاید کسی نے بھی، کہیں بھی، کبھی بھی نہ دیکھا ہوگا۔ شاہ بابر سونے کے تخت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ تخت کے سامنے بہت لمبا چوڑا قالین بچھا ہوا تھا۔ صوبے دار بادشاہ کو سالانہ نذر جو سونا دیتے ہیں وہ براہ راست لا کر اسی قالین پر ڈھیر کیا جا رہا تھا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ڈھیر سے ڈھیر قالین سونے سے پوری طرح ڈھک گیا، صرف ڈھکا ہی نہیں بلکہ اس کے اوپر سونے کا اونچا سا ڈھیر بھی لگ گیا۔"

خواندمیر سمجھ گیا کہ بابر نے آل شیبانی کی سونے کی حرص و ہوس سے واقفیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ تماشا جان بوجھ کر دکھایا ہوگا۔ اس نے دل ہی دل میں ہنستے ہوئے دریافت کیا:

"اور عالی نسب سفیر کو بھی "سفیر کا حصہ" ملا؟"

"شاہ بابر نے جو بیش بہا خلعت پہنایا اس میں ہیرے موتی جڑے ہوئے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ لباس بھی آپ کا اور ہیرے موتی بھی آپ کے۔ پھر انھوں نے قالین پر سے ڈھیروں سونا اٹھا کر میرے حکمران کوچ کنجی خان کے لیے بطور تحفہ مجھے دیا۔ ان اشرفیوں کو شمار تک نہیں کیا گیا....."

"کوئی معاہدہ بھی ہوا؟"

"جی ہاں، اب ہم لوگ ایک دوسرے کے ہاں آزادی کے ساتھ آ جا سکیں گے، تجارت کر سکیں گے۔ ہم لوگ ہندوستان سے ریشم، مسالے اور طرح طرح کی عجیب و غریب چیزیں خریدیں گے اور ان لوگوں کے ہاتھ خشک میوہ جات اور گھوڑے وغیرہ فروخت کریں گے... سفر تو یقیناً طویل ہے پھر بھی ہمیں امید ہے کہ اب کاروانوں کی تعداد میں اضافہ ہو جائے گا خاص طور سے اس لیے اور بھی کہ شاہ بابر نے اپنی ساری سلطنت میں تاجروں کو زیادہ محصولوں کی ادائیگی سے مستثنا کر دیا ہے۔ ازبک، تاجیک، ہندوستانی، ایرانی اور عرب تاجروں کی آمدنی میں بہت اضافہ ہو جائے گا۔ تاجر اور دستکار اس بادشاہ سے بہت خوش ہیں۔ ہم بھی بہت خوش ہیں۔ شاہ بابر کا ایک نیا قانون البتہ ہمیں پسند نہیں آیا۔"

"کون سا قانون؟"

"پتا چلا ہے کہ ساری سلطنت میں مے نوشی کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ خود بابر نے بھی توبہ کر لی ہے، مگر

عام قسم کا نائی ہے کہ اب کسی نہ ہیں گے۔ سارے جام و سبو توڑ ڈالے گئے۔ غزنی سے تین سو اونٹوں کا بیش قیمت قافلہ
شاہ بابر کے لیے عمدہ قسم کی شرابیں لے کر دو مہینے کے سفر کے بعد آگرے پہنچا تو شاہوں نے شرابوں میں نمک ڈال دینے کا
حکم دے دیا۔ آپ خود ہی سوچئے کہ شراب کی فروخت اور اس کی درآمد پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ اب ضیافتوں میں
شراب نہیں پی جاتی ... کیا خاک لطف رہ گیا؟''

یہ خبر جس نے کوچ کنجی خان کے سفیر کو اتنا مضطرب کر دیا تھا، خواندمیر کو پہلے ہی سے معلوم تھی۔ وہ راستے میں بابر کے اس فرمان کو جو اس کی سلطنت کے تمام علاقوں کو بھیجا گیا تھا، پڑھ چکا تھا۔ خواندمیر کو یاد تھا کہ فرمان میں کہا گیا تھا۔ اسلام کے فروغ اور اس کی فتح سے متعلق جدوجہد کا آغاز خود اپنی عادات قبیحہ کے خلاف جدوجہد سے کیا جانا چاہئے۔ فرمان میں بڑے دلکش اور موثر انداز سے کہا گیا تھا ''میں نے، میرے فاتح خدام نے اسلام کا بول بالا کرنے کے جوش میں آکر سونے چاندی کی تمام صراحیوں اور جاموں کو جو اپنی تعداد اور تابانی سے میری محفلوں کی شان اسی طرح بڑھاتے تھے جس طرح کوکب آسمان کی بڑھاتے ہیں، زمین پر پھینک دیا اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے غریبوں میں تقسیم کر دیا۔
انشاء اللہ جلد ہی ہم اسی طرح اپنے دشمنوں کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے...''

بابر کی یہ خواہش پوری ہوئی تھی اور اس نے رانا سنگرام سنگھ کو شکست فاش دے دی تھی۔ جہاں تک شراب پر پابندی لگائے جانے کا تعلق تھا تو اس سے خواندمیر کو کوئی افسوس نہ ہوا بلکہ خوشی ہی ہوئی۔ یہ مورخ جانتا تھا کہ شراب تو اب بھی پی جائے گی لیکن یہ فرمان شرابیوں کو قابو میں رکھنے میں بہرحال معاون ثابت ہوگا۔ خواندمیر کو حسین بیقرا اور اس کے بیٹوں کا افسوسناک قصہ یاد تھا۔ نو سال قبل جب بابر دوسری بار ہرات گیا تھا تو خواندمیر تیموری خاندان کے اس حکمران کی بلانوشی دیکھ کر سہم گیا تھا اور اس کے دل میں خیال آیا تھا ''کیا ایسی نادر صلاحیتوں والا شخص بھی اپنی صلاحیتوں کو غرق شراب کر دے گا؟''

یہی سبب تھا کہ سفیر کی بیان کی ہوئی اس بات کو سن کر ''شاہی مہمان'' کو اتنی زیادہ مسرت حاصل ہوئی تھی۔

خواندمیر کی عمر پچاس سے تجاوز کر چکی تھی اور اس کی صحت بھی زیادہ اچھی نہیں رہتی تھی۔

وہ بابر کی دعوت منظور کرنے سے قبل اتنے طویل اور ہلکان کر دینے والے سفر پر روانگی کے معاملے میں بہت زیادہ کشمکش و پیچ میں مبتلا رہا تھا۔ اسے ہندوستان کی گرمی سے ڈر لگتا تھا اور اس بات سے سخت الجھن محسوس ہوتی تھی کہ بادشاہوں کی زندگیاں مسلسل متغیر اور طرح طرح کے عروج و زوال سے معمور رہتی ہیں لیکن خواندمیر ہرات میں گزشتہ چند برسوں سے اتنی تلخ اور ناخوشگوار مدت گزار رہا تھا کہ اسے بابر کی یاد ستانے لگی تھی اور آخرکار اس نے روانگی کا فیصلہ کر ہی لیا تھا۔ اس نے اپنی ساری امیدیں بابر ہی سے وابستہ کر دی تھیں اور بابر کی نئی سلطنت میں سفر کے دوران جب بھی اسے بابر کے نیک کاموں اور منصوبوں کا کوئی ثبوت ملتا تھا تو اس کے دل پر نامعلوم مستقبل کے اندیشوں سے چھایا ہوا کہرا چھٹ جاتا تھا.....

خواندمیر آگرے میں داخل ہوا تو اسے خوبصورت اور سنگ مرمر سے آراستہ نئی عمارات، نئے نئے باغات، باغات میں شاداب بیلوں سے ڈھکی ہوئی سنہری بارہ دریاں اور رنگ برنگے پھولوں کے چمن نظر آنے لگے۔

اس نے یہ سب دیکھا اور بابر کو اس سے کہیں زیادہ عظیم تصور کرنے لگا جتنا کہ اس سے قبل کرتا رہا تھا۔

بابر اپنی علالت کے باعث بہت دبلا ہو گیا تھا، جسم میں ذرا بھی طاقت نہیں باقی رہ گئی تھی۔ خواندمیر کو بابر کی نقاہت کا

بابر کی آنکھیں شب بیداری کے باعث سرخ ہو رہی تھیں اور ہوا کے ہلکے سے جھونکے سے بھی ان میں پانی آ جاتا تھا۔

"کہیں یہ شراب سے احتراز کے لیے خود پر جبر کرنے کا نتیجہ تو نہیں ہے؟" خواند میر نے سوچا کیونکہ دیوان میں یہ اشعار بھی شامل تھے

ترک کی مے نوشی، میں نے توبہ کر لی، کیا کروں
کیسے ہو جیا، میں مانوں بات کس کی کیا کروں
کچھ پشیماں ہو کے کھاتے ہیں نہ پینے کی قسم
میں پشیماں ہوں کہ توبہ میں نے کی تھی، کیا کروں

"عالی جاہ! میں نے سنا ہے کہ کچھ حکیموں کو بے خوابی کا علاج کرنا آتا ہے۔"

"ہرات کے حکیم یوسفی میرے معالج ہیں۔ انھوں نے سب تدبیریں کر دیکھیں پر خاک بھی فائدہ نہ ہوا۔ وہ کہتے ہیں

"آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ امورِ سلطنت کی فکریں چھوڑ دیجیے، رات بھر فکرِ سخن نہ کیا کیجیے۔" "یہ سب ممکن ہے! بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی ملک کا بادشاہ اس ملک کا خیال ہی نہ کرے؟ میں سلطنت کی فکروں کو بس شعر کہتے وقت ہی فراموش کرتا ہوں یا پھر اس وقت جب اپنی کتاب میں کچھ لکھنے بیٹھتا ہوں۔ لیکن آگرے میں تو مجھے لکھنے کے لیے وقت ہی نہیں میسر ہوتا۔ یہ صورتِ حال میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے اس لیے سیکری کی سیر کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ یہاں ذرا سکون مل جاتا ہے اور لکھتا بھی کچھ بہتر ہی ہوں۔ کئی مثنویاں لکھ لی ہیں۔ رات آنکھوں میں کاٹنے اور لکھتے رہنے کا اب تو عادی ہو چکا ہوں۔"

"علیل ہونے کے باوجود مسلسل کام کر کے خود کو ہلکان کرتے رہتے ہیں" خواند میر نے سوچا۔ "دماغ کو آرام کا موقع نہیں ملتا اسی وجہ سے نیند نہیں آتی۔" لیکن یہ کہہ کر حکیم یوسفی کی رائے کو مکمل کرتا تائید کرنا بابر کے سلسلے میں احترام کے جذبات کے مدنظر نامناسب ہوتا۔ یہ بات اس لیے بھی نامناسب ہوتی کہ بابر کبھی کسی معاملے میں بھی خود پر رحم نہیں کرتا تھا، ہر کام میں اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو ان کی آخری حد تک استعمال کرتا تھا اور اسی نوعیت کے ہیجان سے اسے اطمینان بھی حاصل ہوتا تھا۔ بابر کو اس اطمینانِ قلب سے محروم کرنا نامناسب اور بے رحمانہ اقدام ہوتا۔

"خدا آپ کو طاقت اور حوصلہ عطا فرمائے" خواند میر نے اپنی دلی آرزو کا اظہار کیا۔

بابر اپنے متعلق مزید گفتگو نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے اس نے موضوع بدل دیا

"یہ بتائیے خواند میر صاحب کہ آپ کو اپنی کتاب "حبیب السیر" لکھتے ہوئے کتنے سال ہو چکے ہیں؟"

"گیارہ سال، عالی جاہ! میں نہیں سمجھتا کہ یہ مکمل ہو چکی ہے... دراصل میں ہرات میں کچھ لکھ ہی نہیں پا رہا تھا۔ گزشتہ چند برسوں میں ہرات پر کیا کیا نہیں گزری۔ کبھی ایک دشمن نے قصد کیا، کبھی دوسرے نے اس سے چھین لیا، کبھی نذرِ آتش کیا گیا تو کبھی موسمِ سرما میں ٹھٹھرنے پر مجبور ہو گیا۔"

"یاد ہے جب ہم اس مینار کی اوپری منزل پر کھڑے باتیں کر رہے تھے تو آپ نے گھبرا کر پوچھا تھا "ہرات کی قسمت کا ستارہ ڈوب رہا ہے کیا؟" آپ کا اندیشہ درست ثابت ہوا۔"

"ہرات کو برے دن دیکھنے پڑے اور سمرقند نے بھی ہمارے بیچ کشش دکھانے سے انکار کر دیا۔ ماوراالنہر اور ایران کے باہمی تعلقات میں عداوت کی دیواریں حائل ہو گئیں۔ یہ تعلقات ہماری کئی گذشتہ نسلوں کے لیے کتنے مفید ثابت ہوئے تھے۔ ان ہی تعلقات کی بدولت کتنے ہی صاحبان صلاحیت اوج کمال پر پہنچے تھے! جو سلطانوں نے ماوراالنہر کو کمزور اور تنگ نظر شیوخ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔ سمرقند کے ایک عالم نے تقریباً اشکبار ہو کر بتایا تھا کہ الغ بیگ کی رصدگاہ کھنڈر میں تبدیل ہو چکی ہے اور شہر کے حکمرانوں کو ان سب باتوں سے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ لوگ رصدگاہ کی دیواروں کو گرا کر ان کی اینٹوں کو اپنے گھروں اور باڑوں کی مرمت میں استعمال کر رہے ہیں۔"

"ہم یہاں ایک اجنبی ملک میں محلات و مدارس تعمیر کرا رہے ہیں جبکہ وہاں کے لوگ اپنی عمارتوں کو مسمار کر رہے ہیں۔ کیسا کھیل ہے تقدیر کا، سچ ہے نا؟ میں اپنے پرانے وطن کو چھوڑ کر چلا آیا اور اب اپنی تمام قوتیں اپنے نئے وطن ہندوستان کے لیے وقف کر رکھی ہیں تاہم ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب محسوس ہوتا ہے کہ نالائق فرزند ہوں، بدقسمت آدمی ہوں۔"

سب کچھ اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ انسان قسمت کے لکھے کو مٹا نہیں سکتا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے۔ لیکن میں تو آپ کے نقش قدم پر چلتا ہوا ہندوستان آیا ہوں۔ اپنی مرضی سے۔ میں تاریخ کے واقعات کو بدلنے اور ان واقعات کی الجھی ہوئی گتھی کو سلجھانے کی طاقت نہیں رکھتا اس لیے اس گتھی کو اپنے خیالوں میں سلجھانا چاہتا ہوں، اپنی دلچسپی اور پیشے کے موضوع یعنی تاریخ کے اہم ترین دھاگے کو تلاش کرنا اور سمجھنا چاہتا ہوں۔"

بابر کو خواندمیر کی یہ بات اچھی لگی۔ وہ اپنے گھوڑے کو خواندمیر کے گھوڑے کے قریب لے آیا اور دونوں کے گھوڑے پہلو بہ پہلو چلنے لگے۔

بجا فرمایا آپ نے۔ واقعات کی گتھی میں ہماری خواہشات اور تمنائیں بھی الجھی ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ اس گتھی میں اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ تاریخ بے پایاں ہوتی ہے، ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ اسے گردش فلک کہتے ہیں اور اس گردش فلک کی قوت محرکہ ہی وہ اہم ترین دھاگا ہے۔ ٹھیک ہے نا؟"

خواندمیر بابر کے دلائل کو بیچ میں بولے بغیر غور سے سنتا رہا۔ بابر نے اپنی بات جاری رکھی

"لیکن ہماری جگہ کہاں ہے؟ یا یہ کہ کسی ستارے کی جگہ کہاں ہے؟ نہیں، میں اس مسئلے کو دوسری طرح سمجھتا ہوں۔ ۔۔ہم کسی پہاڑ پر کھڑے ہیں۔ اگر پہاڑ کا وہ حصہ جس پر کھڑے ہیں، نیچے کی طرف پھسلنے لگے تو ہم ٹھہرے رہنے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کریں بہر صورت اسی پہاڑ کے ساتھ پستیوں کی جانب لڑھکتے چلے جائیں گے۔ ماوراالنہر میں اسی طرح کا پیچھے کھسکتا ہوا ایک پہاڑ اپنے ساتھ ہی ساتھ مجھے بھی نیچے لے آیا تھا۔ لیکن اگر تاریخ کا پہاڑ ۔ جی نہیں، اگر ہمارے پیروں تلے کا پہاڑ بلند ہونے لگے، اس کی طاقت اندر سے بڑھنے لگے تو ہم اس رفتار سے کہیں زیادہ تیز رفتار کے ساتھ بلندیوں پر پہنچ جائیں گے جس سے خود چڑھنے پر پہنچ پاتے۔ ہمیں عقل، دوراندیشی اور ہمت سے کام لینا چاہیے، ایسے ہی کسی بلند ہوتے ہوئے پہاڑ کو تلاش کر کے اس کے اوپر کھڑے ہو جانا چاہیے۔ خواندمیر صاحب دراصل اس وقت ہندوستان مجھے ایسا ہی پہاڑ معلوم ہو رہا ہے۔۔۔ یہی سبب ہے کہ میں یہاں وہ سب کچھ حاصل کر لینے کی امید رکھتا ہوں جو سمرقند اور ہرات میں نہیں حاصل کر سکا تھا۔"

"جی ہاں، عالی جاہ۔ تاریخ کا پہیہ اپنی رفتار بدلتا رہتا ہے۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب ماوراالنہر اور خراسان میں علوم و

قبل پورے عروج پر تھے اس کی شان بلند ہوتے ہوئے کو بسا وہ بڑی تھی۔ خوارزم میں بیرونی، بخارا میں ابوعلی ابن سینا، طوس میں فردوسی، بدخشاں میں محمود کا شعر اور یوسف خاص حاجب۔ ایسی ایسی عظیم ہستیاں موجود تھیں ' اہم اور آپ تسلیم کرتے ہیں کہ ان سب کے کارناموں میں ہی تاریخ کے معانی ومفہوم مضمر ہیں۔ اس کے بعد چنگیز خاں کے لشکر نے تاریخ کے پہیے کی حرکت کو ''پہاڑ'' کے بلند تر ہونے کے عمل وسازوسامان کے لیے روک دیا۔ سمرقند میں الغ بیگ کی اور ہرات میں جامی اور نوائی کی سرگرمیوں سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا اور بے شمار ذہانت وصلاحیت رکھنے والے نئے لوگ منظر عام پر آئے۔ گردش فلک کی بات آپ نے بالکل بجا فرمائی ہے عالی جاہ۔'' خواند میر کو اچانک ہوش آ گیا کہ وہ کس سے مخاطب ہے۔ ''فلک پیر نے سوچا کہ عظیم لوگوں کی تعداد بہت بڑھ چکی ہے اور اس نے ہماری مخالفت کے لیے شیبانی جیسے بدبختوں کو بھیج دیا۔ علوم وفنون، تعمیرات سب کے سب زوال کا شکار ہو گئے...... آخر کار صاحبان علوم وفنون نے آپ کے پیچھے پیچھے ہندوستان کا رخ کیا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ نئے دور کا آغاز یہیں ہوگا۔ اجنبی ملک میں زندگی گزارنا یقیناً تکلیف دہ ہوتا ہے لیکن یہ دیکھ کر کہ فنکار ومسائل سے بھری ہوئی اس بے کراں دنیا میں ایک ملک ہندوستان بھی ہے جہاں دانش وحکمت کی علم وفن کی عزت کی جاتی ہے، کتنی خوشی ہوتی ہے، کتنی توانائی مل جاتی ہے جسم کو۔'' پھر خواند میر نے اچانک مسکراتے ہوئے کہا ''اب مجھے امید ہے کہ آپ کی عنایات اور سرپرستی کی بدولت اپنی کتاب ''حبیب السیر'' مکمل کروں گا۔''

''مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی اور میں ہر طرح سے آپ کی مدد کرنے کو تیار ہوں۔''

''آپ کا یہ ناچیز خادم ہرات میں کئی برسوں تک میر علی شیر نوائی کے کتب خانے میں کام کر چکا ہے، حسین بیقرا کے کتب خانے میں نادر قلمی نسخوں کے مطالعے پر بھی بہت وقت صرف کیا کرتا تھا۔ لیکن وہ کتب خانے تو اب یہاں سے بہت دور ہیں، بہت دور۔''

خواند میر جانتا تھا کہ بابر نے ایک بہت بڑا کتب خانہ قائم کر رکھا ہے جہاں پچاس افراد کام کرتے ہیں اور ایسے نادر قلمی نسخوں کا ذخیرہ موجود ہے جیسے ہرات میں بھی نہیں پائے جاتے۔ اور قلمی نسخوں کے بغیر، کسی ماخذ کے بغیر مورخ کیسے کام چلا سکتا تھا؟ شاہی کتب خانے تک ہر ایک کی رسائی کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ خواند میر موقع شناسی کے ساتھ خاموش رہا لیکن بابر خود ہی بول پڑا۔

''آپ ہماری وجہ سے اتنا طویل سفر کر کے یہاں آئے ہیں تو کیا ہم آپ کو کام کرنے کی تمام آسانیاں بھی نہ فراہم کریں گے؟ میں اپنے کتب خانے کے مہتمم عبداللہ کو ہدایت کر چکا ہوں کہ وہ آپ کی مدد کریں۔ کتب خانے میں بہت سی ہندوستانی کتابیں موجود ہیں۔ عبداللہ کی ماتحتی میں سنسکرت جاننے والے علما مترجم کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو اپنے کام میں شامل کر لیجیے......''

''خادم اس احسان عظیم کا شکریہ الفاظ میں ادا کرنے سے قاصر ہے، عالی جاہ۔ لیکن اعلیٰ حضرت میری گستاخی معاف فرمائیں تو ایک اور درخواست بھی ہے۔''

''ضرور فرمایئے نا خواند میر صاحب، اور کیا چاہیے؟''

''شاید آپ کو یاد ہو کہ ہرات میں آپ نے اپنی سوانح عمری کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ عرصے سے قلم بند کرتے رہے ہیں۔ اس حصے کو سننے کے بعد مجھے اس کتاب سے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اگر اس کا کوئی

حصہ مکمل ہو چکا ہو اور مجھے مطالعے کا موقع نصیب ہو سکے تو یہ میرے لیے معلومات اور عقل و دانش کا سرچشمہ ثابت ہوگا۔"

بابر نے کچھ دیر تک جواب نہ دیا، گھوڑے کے سر کی طرف جس نے کنوتیاں کھڑی کر لی تھیں، خاموشی سے دیکھتا رہا۔ خوندمیر کی یہ خواہش پوری کرنے کو اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ گزشتہ دو برسوں سے ترکی بابر نامے کو مکمل ہی نہیں بلکہ درست بھی کر رہا تھا۔ اس کے دو اسباب تھے۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ ایک بار اس کے چند حصے ہندوستان میں اچانک شروع ہونے والی موسلا دھار بارش سے متاثر ہو گئے تھے۔ تیز ہواؤں سے خیمہ الٹ گیا تھا، کچھ اوراق ہمیشہ کے لیے ضائع ہو گئے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ کتاب کی ہیئت کو زیادہ موثر اور مواد کو زیادہ مبنی بر حقیقت بنانا چاہتا تھا۔

"میں اس بارے میں سوچوں گا، خواندمیر صاحب" بابر نے روکھے پن سے کہا۔

پہاڑی کی گود میں چھپے ہوئے باغ کے اندر ٹھنڈے پانی کا ایک چشمہ بھی تھا۔ بابر کا اس کے پانی سے پیاس بجھانے کو جی چاہا۔ ویسے اس کے قریب بیٹھ کر سستانا بھی بہت خوشگوار ثابت ہوتا تھا۔ میل کے چلنے سے ہلکی ہلکی آواز کے ساتھ پھوٹتی ہوئی پانی کی دھار میں ریت کے صاف ذرات بھی ملے ہوئے تھے جو پانی پر پڑتی ہوئی دھوپ میں مشکل سے نظر آ رہے تھے۔

"چاروں طرف کیسی خاموشی چھائی ہوئی ہے، ماحول کتنا پرسکون ہے" خواندمیر نے کہا۔ "تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ دو سال قبل ہی یہاں اتنا خونیں معرکہ ہوا تھا۔"

"جی ہاں، وہ رانا سنگرام سنگھ سے ہونے والی جنگ شاید میری سب سے بھیانک، سب سے خون خرابے والی جنگ تھی... ہاں، یاد آ گیا، جنگ سے قبل تک کے تمام واقعات اور جنگ کی تفصیلات میں "بابر نامے" میں لکھ چکا ہوں۔ شام کو میں اس کے کچھ نقل شدہ ورق آپ کو دے دوں گا۔ مطالعے کے بعد اپنی رائے مجھے بتا دیجیے گا۔ دراصل میں نے آپ کو یہاں مدعو ہی اس لیے کیا تھا، خواندمیر صاحب کہ آپ جیسا زبان داں دانشمند مشیر کی حیثیت سے میرے قریب رہے۔"

"جہاں پناہ نے اس ناچیز کو جتنی عزت بخشی، اتنی زندگی میں کبھی بھی نہیں نصیب ہوئی تھی۔"

"ہم دونوں ہی عظیم میر علی شیر کے ادنیٰ شاگرد ہیں"

۲

خواندمیر کو سیکری پہاڑی کے شمالی حصے میں گھرے باغ کے اندر بنا ہوا ایک مکان دے دیا گیا جس میں تین کمرے تھے اور نقش و نگار سے آراستہ ایک برآمدہ۔ برآمدے سے صاف و شفاف پانی کی جھیل کا نظارہ بہت خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔

خواندمیر نے بابر کی قلمی کتاب کا مطالعہ شام کو کھانے کے بعد شروع کیا۔ اسے فوراً ہی یاد آ گیا کہ بابر نے اس کے کچھ حصے ہرات میں سنائے تھے تو اس پر کیا ردعمل ہوا تھا۔ اسے بابر کے سیدھے سادے اسلوب نگارش پر حیرت ہوئی تھی اور کچھ برا بھی لگا تھا۔

قلمی نسخے میں طرز تحریر کی اس سادگی کا اور بھی زیادہ احساس ہو رہا تھا۔

"ہندوستان میں طرح طرح کے پھول پائے جاتے ہیں" بابر نے لکھا تھا۔ "ایک ہوتا ہے گڑھل۔ اس کا گلاب

کے پیڑ سے اونچا ہوتا ہے۔ اس کا پھول انار کے پھول سے زیادہ شوخ رنگ کا اور سرخ گلاب کے برابر ہوتا ہے۔ لیکن گلاب کی کلی سے صرف ایک ہی پھول نکلتا ہے جبکہ گڑھل کی کلی کے کھلنے پر اس کے بیچ سے اس کی شکل کی ایک چیز نکلتی ہے اور اس کی پتیاں بھی کھل کر پھول بن جاتی ہیں۔ اس طرح یہ اپنی نوعیت کا جڑواں پھول بن جاتا ہے۔ گڑھل کا پھول بے حد خوبصورت ہوتا ہے لیکن یہ دن بھر میں ہی مرجھا جاتا ہے۔''

''میں نے اپنے لشکریوں کے اطمینان اور لشکر گاہ کی حفاظت کے خیال سے حکم دیا کہ جن جگہوں پر داب نہیں کھڑے کیے جا سکتے وہاں خاص قسم کی اونچی چوبی تپائیاں ایک دوسرے سے سات آٹھ گز کے فاصلے پر رکھ کر انھیں کچے چمڑے سے ایک دوسرے سے باندھ دیا جائے۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، میرے لشکریوں پر حالیہ واقعات* اور بے بنیاد افواہوں کے باعث گھبراہٹ اور خوف طاری تھے۔ دوسری طرف بدخو منجم محمد شریف اس جنگ کے سلسلے میں مجھ کو تو کوئی سلیقے کی بات نہیں بتاتا تھا لیکن لشکریوں کو یہ کہہ کہہ کر خوف زدہ کرتا پھرتا تھا کہ جنگ کا ستارہ مغرب میں ہے اور مغرب کی سمت سے جنگ شروع کرنے والا ہار جائے گا۔ اور ہمارا لشکر مغرب ہی میں تھا۔'' خراب بدمعاش بد قول سے یہ سب دریافت کس نے کیا تھا؟ اس کمبخت نے میرے سپاہیوں کے حوصلے اور بھی زیادہ پست کر دیے۔

اسی طرح بابر نے جو کچھ دیکھا تھا اور جو اس پر گزری تھی اس کی سیدھی سادی زبان میں تصویر کھینچ دی تھی۔ بعض عبارتیں یقیناً دلکش تھیں لیکن یہ تشبیہات اور استعارات سے آراستہ وہ ''مرصع'' زبان نہ تھی جس کا خواندمیر بچپن ہی سے عادی تھا۔ اسے مطالعے کے دوران احساس ہوا کہ بابر بتا ایک مخصوص انداز نگارش رکھتا ہے۔

لیکن کیا یہ سب مناسب بھی تھا؟ کسی بادشاہ کی سرگزشت کے لیے یہ طرز تحریر موزوں بھی تھا؟

خواندمیر کی پرورش و تعلیم اس کے والد کے ہاتھوں ہوئی تھی جو خود بھی مشہور مورخ تھا۔ وہ اپنے بیٹے سے کہا کرتا تھا کہ تاریخی کتابیں انتہائی معزز و ممتاز افراد کے لیے لکھی جاتی ہیں جو اپنی زندگیوں میں بہت سے تلخ و تکلیف دہ حقائق سے واقف ہو جانے کی بنا پر کتابوں میں خوشگوار اور مسرور کن حقائق ہی کے متلاشی رہتے ہیں۔ وہ کہتا تھا کہ حکمرانوں کے دلوں کو خوش کرنے کے لیے واقعات کو شاعرانہ تشبیہات اور شاندار القاب پر مشتمل مرصع نثر میں بیان کیا جانا چاہیے۔

خواندمیر کو مطالعے کے دوران بابر کا اسلوب دلکش بھی معلوم ہو رہا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے حیران و ششدر بھی کیے دے رہا تھا۔

مثال کے طور پر وہی حصہ جہاں بابر نے ہمایوں کے خط کے جواب میں لکھا ہوا اپنا خط پیش کیا تھا جس میں بیٹے کو تلقین کی گئی تھی: ''انداز تحریر میں سادگی کو ملحوظ رکھا کیجیے۔ آپ بے حد نفاست کے ساتھ لکھنے کی کوشش کرتے ہیں جس کی وجہ سے بعض جگہیں عجیب بے تکی اور نا قابل فہم سی معلوم ہوتی ہیں۔ واضح اور عام فہم زبان استعمال کیا کیجیے۔ عبارت کو جان بوجھ کر خوبصورت بنانے کی کوشش نہ کیا کیجیے۔ اس طرح آپ کو بھی آسانی ہوگی اور پڑھنے والے کو بھی۔''

اس کا مطلب تو یہ تھا کہ خوش بیانی سے جس کا کبھی وہ خود بہت ہی پرجوش حامی رہ چکا تھا، بابر سوچ سمجھ کر جان بوجھ کر احتراز کر رہا تھا۔ مورخ کو بابر کا یہ فیصلہ پہلے کی طرح اس وقت بھی اچھا نہ لگا۔

---

* ''جنگ سے قبل رانا سنگرام سنگھ کو بابر کے بعض فوجی سالاروں اور حاکموں کے خلاف حاصل ہونے والی کامیابیوں کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن میں نے اس کی ایک بھی نہ سنی اور جنگ کی تمام ضروری تیاریاں جاری رکھیں۔''

اس نے کتاب رکھ دی، کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گیا، ہوا کے رات کے وقت کے پر سکون، حول پر نظر دوڑائی اور پھر جھیل کو، جس کی سطح پر چاندنی چادر کی مانند پھیلی ہوئی تھی، دیکھنے لگا۔ اس کے تصور میں بابر مسلسل منڈلاتے جا رہا تھا۔

خواند میر تقریباً گیارہ برسوں سے اپنی زندگی کی اہم ترین تصنیف "حبیب السیر" کو مکمل کرنے میں مصروف تھا۔ وہ مروجہ اسلوب میں اپنے "ناچیز میں" کو پوری طرح کھو کر، اسی انداز سے لکھ رہا تھا جسے اپنانا اپنا فرض تصور کرتا تھا۔ وہ اس طرز نگارش کی پابندی کرنے، اس کے بموجب خود کو ڈھال لینے کا عادی ہو چکا تھا۔ ادبی تحریروں میں "میں" پر زور دینا معیوب خیال کیا جاتا تھا۔

لیکن بابر تو بار بار اپنا تذکرہ کرنے، "میں" لکھنے سے ذرا بھی نہیں شرماتے، خواند میر نے سوچا۔ یہی نہیں، وہ تو اپنی ناکامیوں کے بارے میں بھی، خدا انھیں معاف کرے، انسان کی ذلیل حرکتوں کے بارے میں بھی لکھتے ہیں۔ ان کی کتاب کے اس قسم کے جملے اور فقرے تو سمجھ میں آنے والے ہیں "مجاہدین اسلام، باغ شجاعت کے اشجار، دیو در کی مانند صف آرا ہو گئے"، "ان کی صفیں شرع محمدی کی طرح مستقیم و مستحکم تھیں" "پیدل سپاہیوں کے نام جو دشت شجاعت کے شیر ہیں، میدان جنگ کے دلیروں میں سب سے زیادہ دلیر ہیں"۔ لیکن یہ تو بابر کے الفاظ نہیں ہیں، یہ تو جنگ کے بعد شیخ زین کے لکھے ہوئے فتح نامہ کے اجزا ہیں جسے بابر نے اپنی کتاب میں محض اس لیے شامل کر لیا تھا کہ خود انھیں لشکریوں کی تعداد اور دونوں افواج کی حالت کی تفصیلات نہ لکھنی پڑیں اور بابر کو، ہر دینے کی جو کوشش کی گئی تھی اس کے سلسلے میں بابر تسلیم کرتے ہیں، اپنی آپ بیتی میں لکھ بھی دیتے ہیں کہ انھیں "زوردار قے پاخانے میں ہوئی"۔..

"کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے، پروردگار" مورخ نے سوچا۔

"یہ طرز تحریر بھونڈا ہے پر بڑی کشش رکھتا ہے۔ عالم و فاضل بادشاہ ظہیر الدین بابر نے جس بے باکی کے ساتھ حقیقت نگاری کی ہے وہ یقیناً بڑی دلکش ہے۔ رہا میں تو میرا اسلوب ویسا ہی ہے جیسا کہ اوروں کا، میری تحریروں میں تکرار بھی پائی جاتی ہے اور یکسانیت بھی۔ بابر کا ایک مخصوص طرز نگارش ہے، مخصوص اور بے مثال۔ وہ خود بھی یکتا و یگانہ ہیں!"

خواند میر کمرے میں لوٹ آیا۔ اس نے قلمی نسخے کا دوبارہ مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ تاریخ کی ایسی ایک بھی کتاب اس کی نظروں سے نہیں گزری جس میں واقعات کو اور "واقعات کی تہہ" کو بھی اتنی درستی اور حقیقت پسندی کے ساتھ بیان کیا گیا ہو۔ بابر نے جس بے باکی کے ساتھ اپنا تجزیہ کیا تھا، جس طرح اپنے مصائب اور غلطیوں کے متعلق صاف صاف لکھا تھا وہ سب، سب خواند میر کو خاص طور سے بہت دلچسپ معلوم ہوا اور اس نے اپنے اعتماد اور خلوص کی کشش سے مورخ کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔

خواند میر نے ایک بار پھر ان سطروں کو تلاش کیا جنھوں نے اسے متحیر کر دیا تھا "میں نے اس سے قبل کبھی بھی زندگی کی شیرینی کو اتنی شدت کے ساتھ نہیں محسوس کیا تھا" بابر نے اسی جگہ پر اس خیال کا اظہار ایک شعر میں بھی کیا تھا:

جو دلیر تک موت کی جا چکا ہے

وہی قیمت زندگی جانتا ہے

بابر نامے کا مطالعہ کرتے وقت خواند میر کو ایک عام فانی انسان نظر آنے لگا جو اس کے لیے دھیرے دھیرے زیادہ واضح اس کے دل سے زیادہ قریب ہوتا جا رہا تھا۔

لیکن بہت سے تاج دار اس بات کو کتنا ناپسند کرتے تھے کہ وہ عام لوگوں جیسے نظر آئیں! شروع میں خواند میر نے بابر کے عجیب و غریب اسلوب کا بھی کچھ مطلب نکالنا چاہا۔ اس نے سوچا کہ آخر بابر کو مرصع زبان لکھنے پر اپنا وقت ضائع کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ وہ تو بادشاہ ہیں اس لیے سادگی کو اپنانے کی مروجہ ادبی اقدار کو ٹھکرا دینے کی جرأت کر سکتے ہیں۔

خواند میر نے اپنے اس جواب کی بنا پر بابر کے تکلیف دہ حد تک غیر معمولی طرز بیان سے ایک طرح کی مصالحت سی کر لی۔ اس کے بعد اس نے اسلوب کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا کیونکہ وہ ان واقعات سے مسحور ہونے لگا جنھیں بابر نے حیرت انگیز تفصیل اور بے نظیر صاف گوئی کے ساتھ بیان کیا تھا۔

وہ بابر کی تصنیف کا تمام رات اور اگلے روز صبح سے شام تک مطالعہ کرتا رہا۔

بابر کو کسی وجہ سے عجلت میں آگرہ لوٹ جانا پڑا۔ دو دنوں کے بعد وہ صبح کے وقت ہی سیکری آن پہنچا کیونکہ دن کی گرمی کے باعث رات کے وقت گھڑ سواری کو بہتر تصور کرتا تھا۔

وہ اس وقت اس سے بھی زیادہ درماندہ سا نظر آ رہا تھا جتنا خواند میر کو تین روز قبل لگا تھا۔ تاہم اس نے خود کو ہشاش بشاش دکھانے کی کوشش کرتے ہوئے چشمے کے ہلکے ہلکے شور میں خواند میر سے دریافت کیا:

"میری عدم موجودگی میں یہاں آپ کا جی تو نہیں اوبنے لگا تھا؟"

"نہیں، جہاں پناہ۔ میں تو اس دوران برابر آپ ہی سے گفتگو کرتا رہا۔"

"ابھی تک پوری کتاب نہیں پڑھ سکے؟"

"پہلی ہی رات کو ایک ہی نشست میں پڑھ لی تھی۔ بعد میں کئی بار پڑھ چکا ہوں۔ میں تو اس کے سوا کسی اور چیز کے بارے میں سوچ ہی نہیں پا رہا ہوں۔"

"تکلف برتنے کی کوئی ضرورت نہیں، خواند میر صاحب۔ حقیقت کا اظہار کیجیے۔"

"حقیقت کا؟ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ نے مجھے قتل کر دیا۔"

خواند میر نے یہ بات سنجیدگی سے کہی اور اس کی آنکھوں سے اداسی جھلکنے لگی۔

وہ کیسے؟... میں اور آپ کو قتل کر ڈالوں؟"

"قتل کیا اپنی سادگی سے! آپ نے اپنے طرز تحریر کی سادگی اور وضاحت کے ذریعے ثابت کر دیا کہ ہمارا عام طرز نگارش، مغلق اور تشبیہات و استعارات سے آراستہ طرز نگارش کتنا لغو ہے۔"

بابر نے اطمینان کی سانس لی اور مسکرانے لگا۔

"اچھا، تو یہ تھا آپ کا مطلب... لیکن میری مجبوری یوں کہ بھی تحو طارکھتے تھا۔ مرصع عبارت لکھنے کا میرے پاس وقت ہی نہیں تھا۔ ویسے یہ فن مجھے آتا بھی نہیں۔"

"اچھا ہی ہوا کہ فضول باتوں کے لیے آپ کو وقت نہ مل سکا۔" خواند میر نے بابر کے مذاق کو اہمیت نہ دی یا پھر سمجھ ہی نہ سکا۔ "خادم کی دلی مبارک باد قبول فرمائیے، اعلیٰ حضرت۔ ترکی میں اتنی شاندار کتاب پہلے کبھی بھی نہیں لکھی گئی تھی!"

"لیکن ابھی تو اسے مکمل کرنا ہے۔ کچھ ابواب لکھو بھی گئے ہیں۔"

"مجھے پورا یقین ہے کہ انھیں آپ دوبارہ لکھ لیں گے... نئے ابواب کا بھی اضافہ کریں گے... میں اسی شان دار

تصنیف کے بارے میں سوچتا رہا ہوں، ایسی کتاب تو اب تک شاعری میں لکھی گئی ہو یا تاریخ میں۔ میں نے اس بارے میں بہت غور و خوض کیا ہے، عالی جاہ۔ جس طرح میر علی شیر کا فارسی شاعری کا اہم ترین شاہکار ہے اسی طرح مجھ جیسے مورخ کے نزدیک بابر نامہ ترکی نثر کا اہم ترین شاہکار ہے۔ میرے دل میں ان دونوں شاہکاروں نے پہلو بہ پہلو جگہ بنائی ہے۔“

”آپ میری محنت کی اہمیت کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کر رہے ہیں، خواند میر صاحب، میں آپ کی عنایت کے لیے شکر گزار ہوں“ بابر نے مسکراتے ہوئے کہا ”لیکن مجھے اس کتاب کو، اس بابر نامے کو ابھی تو مکمل کرنا ہے۔ بڑی عنایت ہوگی اگر اس کی خامیوں کو بھی صاف صاف بیان کریں۔“

خواند میر سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے ان بڑی اور چھوٹی باتوں میں سے کسی کو بھی نہ چھپانے کا فیصلہ کیا جن سے وہ متفق نہ تھا۔

”میں صرف چند صفحات کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں، اعلیٰ حضرت۔ آپ نے ہرات کے متعلق، حسین بیقرا اور ان کے امرا اور روسا کے متعلق بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ اس حصے میں تاریخوں اور ناموں کی بعض غلطیاں رہ گئی ہیں۔“

”اس معاملے میں مجھے آپ کی مدد درکار ہوگی۔“

”ناچیز نے پہلے ہی ایک الگ کاغذ پر لکھ لی ہے۔ آپ کا قلمی نسخہ واپس کرتے وقت اسے بھی آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔“

”میں آپ کا شکر گزار رہوں گا۔“

”عالی جاہ کی اجازت ہو تو میں ایک اور بات بھی عرض کرنا چاہتا ہوں۔“

”ضرور فرمائیے۔“

”ہم مورخین اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں“ خواند میر نے کہنا شروع کیا، ”کہ آج تک کوئی بھی سلطنت، خاص طور سے کوئی بڑی سلطنت درد و کرب کے بغیر، خون خرابے کے بغیر وجود میں نہیں آئی۔ انسان بھی، اولاد آدم بھی اسی طرح پیدا ہوتی ہے۔۔۔ آپ نے ایک بڑی سلطنت، ہندوستان کے دوسرے علاقوں کو سر کیا۔ جنگیں ہوتی ہیں تو بہر حال خون بہتا ہی ہے۔ جو قبائل آپ کی عداوت پر کمر بستہ تھے ان کے لوگوں کو آپ نے سبق سکھانے کے لیے سزائے موت کے احکام صادر کیے تھے۔ ان احکام کا تذکرہ بھی آپ نے بابر نامے میں کر دیا ہے۔ اس واقعے کو بھی قلم بند کر دیا ہے کہ شمالی ہند کے باجور قلعے میں آپ کے سپاہیوں نے تین ہزار افراد کو قتل کر دیا تھا۔ پانی پت کی جنگ کے واقعے پر قید کر لیے جانے والے کئی سو سپاہیوں کو آپ کے تیر اندازوں نے جس طرح ہلاک کر دیا تھا اس کا تذکرہ بھی آپ نے کر دیا ہے۔۔۔ حقیقت نگاری ایک عظیم مقصد ہے، یہ بات مجھ پر واضح ہو گئی لیکن اس نوعیت کی تفصیلات آپ کی کتاب کو پڑھنے والی آئندہ نسلوں کے دلوں پر کیا اپنی گہری چھاپ نہ ڈالیں گی؟ عالی جاہ کو اپنی نیک نامی کا خیال نہ رکھنا چاہیے کیا؟ یہ تفصیلات کتاب سے نکال دی جائیں تو کیسا رہے؟“

بابر کو اچانک محسوس ہوا کہ اس کا حلق سوکھ گیا ہے، اس میں جلن ہونے لگی ہے۔ اس نے فوراً ہی کوئی جواب نہ دیا، چشمے کے کنارے بیٹھ کر اس کے شفاف پانی کو چلو میں بھر لیا۔ صاف اور ٹھنڈے پانی کا لمس اسے بہت خوشگوار معلوم ہوا۔

”میں سمجھتا ہوں، خواند میر صاحب کہ آپ نے یہ بات میرے سچے خیر خواہ کی حیثیت سے کہی ہے۔ ان سارے

واقعات کو قلم بند کرتے ہوئے ظاہر ہے کہ مجھے کافی دشواری پیش آئی تھی ... میں نے ایک بار تیمور صاحب قراں کو خواب میں دیکھا تھا۔ انھوں نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا کہ جنگیں خون خرابے کے بغیر نہیں ہوا کرتیں ... حقیقت بھی یہی ہے ... لیکن آجکل تو بے خوابی کے باعث رات رات بھر پریشان رہتا ہوں ... یہ ساری تفصیلات کاغذ پر منتقل کر دی ہیں تاکہ دل کو کچھ سکون میسر ہو سکے۔ آئندہ نسلوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ سب کیسے پیش آیا تھا۔ انھیں ان سارے آلام و مصائب کا علم ہونا چاہیے جو ہم پر کیے جانے والے مظالم اور ہمارے ہاتھوں دوسروں پر کیے جانے والے مظالم دونوں کا نتیجہ تھے۔"

خوندمیر کو بابر کے کچھ اشعار یاد تھے جن میں دونوں طرح کے آلام و مصائب کی ترجمانی کی گئی تھی۔ اس نے یک حافظے سے خود ہی دیکھ لیا کہ بابر صرف مفادات سلطنت ہی کی فکروں سے نہیں بلکہ اس جدوجہد سے بھی پریشان رہتا تھا جو اس کے دل میں بادشاہ اور شاعر فن کار کے درمیان مسلسل جاری رہتی تھی۔ بابر ایک ایسے حکمران کی حیثیت سے جو زندگی بھر ایک طاقتور اور متحد سلطنت کے قیام کا کوشاں رہا تھا، وہ سب کچھ کرنے کے لیے مجبور تھا جسے شاعر بابر کے لیے یاد کرنا، اس کے بارے میں اپنا نقطہ نظر ظاہر کرنا اور لکھنا اتنا زیادہ اذیت دہ ثابت ہو رہا تھا۔ شاہ حسین بیقرا اور شاعر علی شیر نوائی کے درمیان اختلافات کا طوفان اختیار رہتا تھا وہ بابر کے وجود کے اندر، ایک ہی شخص اور ایک ہی دل کے اندر قیامت ڈھا رہا تھا۔

"جہاں پناہ، آپ کے الفاظ میرے خیالات کی بہ نسبت کہیں زیادہ قائل کرنے والے ہیں۔ دراصل تجربات زندگی کے تلخ اثرات دوسروں کے لیے باعث عبرت ہو سکتے ہیں۔ تاہم ہمیں اپنے اخذ کردہ اہم نتیجے کو فراموش نہ کرنا چاہیے۔ آپ کو یاد ہے کہ آپ نے اپنے آخری دورہ ہرات کے موقعے پر اپنی زندگی کو کاہے سے تشبیہ دی تھی؟ یہ چشمہ آپ کو کسی بات کی یاد نہیں دلا رہا ہے کیا؟

"جی ہاں۔ مجھے یاد ہے۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ میری زندگی اس چشمے کی مانند ہے جو کوہستانی چٹانوں کے ٹوٹ کر گرنے سے دب کر رہ گیا ہو۔'

"درست فرمایا آپ نے۔ تو کیا اب آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ ماوراءالنہر میں جو چشمہ چٹان کے نیچے دب گیا تھا وہ ہندوستان میں دوبارہ پھوٹ نکلا ہے؟"

"آپ نے یہ بات بڑی خوبصورتی سے کہہ دی۔ میرے اندر اگر کوئی چشمہ ہے تو وہ ہے میری شاعری، میری تخلیقات... آپ مجھ پر معترض نہ ہوں، میں تو عرصے سے محسوس کر رہا ہوں کہ تخت و تاج کسی شخص کو انحطاط اور گمنامی سے نہیں بچا سکتے۔ اپنے وطن لوٹنا میری قسمت میں نہیں لکھا ہے۔ کاش میری شاعری اور ترکی میں لکھی ہوئی کتابیں ہی وہاں تک پہنچ جائیں۔ کاش آپ کو معلوم ہوتا کہ مجھے اندجان، سمرقند اور تاشقند کی یاد کتنی زیادہ ستاتی رہتی ہے۔ وہیں تو میں بڑا ہوا تھا، آدمی بنا تھا۔"

اچانک بابر کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور اس نے جلدی سے نظریں جھکا لیں۔

"اعلاحضرت، آپ تو خود ہی فرماتے رہتے ہیں کہ ہندوستان آپ کا دوسرا وطن بن چکا ہے۔ آپ کی کتابوں سے اس کی شہرت کو بھی چار چاند لگ جائیں گے۔"

"یہ تو درست ہے کہ میں نے اپنی زندگی کے آخری برسوں کو ہندوستان کے لیے وقف کر دیا ہے لیکن بادشاہ کی بے

وقت تیزی سے دوڑ رہا ہے اور پورا کرنا میرے لیے روز بروز دشوار ہوتا جارہا ہے۔"

"عالی جاہ، اس وقت تو آپ کے دل پر شاعری حکمرانی ہے۔ لیکن اگر آپ نے بادشاہ کی زندگی نہ بسر کی ہوتی تو شاید آپ بابرنامہ نہیں لکھ سکتے تھے۔ اور پھر کیا آپ یہاں بادشاہ یا سپہ سالار ہی کی حیثیت سے نہیں آئے تھے؟"

خواند میر کی دلی خواہش تھی کہ بابر کے دل میں ایک دوسرے سے جد و جہد کرتے ہوئے بادشاہ اور شاعر کے درمیان صلح ہو جائے۔

"چلیے، میں اپنا قلمی نسخہ لے لوں" بابر نے سب کچھ سمجھتے ہوئے تھکی تھکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "جنگ جو بابر کے چشمے پر کوئی اور چٹان گرے اس سے قبل شاعر بابر اور مورخ بابر اپنی کتاب کو مکمل کر لینا چاہتا ہے۔"

ایک بار پھر آگرہ

۱

ناقابل برداشت گرمیاں ایک بار پھر شروع ہو گئیں۔ بابر زیادہ وقت خلوت گاہ میں گزارتا اور بابرنامے کو لکھتا رہتا تھا۔ تیز پیاس اسے ہر وقت پریشان رکھتی تھی۔ پھلوں کے ٹھنڈے ٹھنڈے عرق پیتا رہتا تھا لیکن پیاس تھی کہ کسی طرح بجھنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔

ایک روز طاہر طلائی قاب میں تازے انگوروں کے گچھے رکھ کر دیا تو بابر حیرت میں پڑ گیا

یہ کہاں سے آئے؟

ہشت، ہشت باغ سے، جہاں پناہ۔ آپ نے سمرقند سے انگور کی قلمیں منگوا کر لگوائی تھیں، یاد ہے نا؟

دھلے ہوئے انگوروں پر پانی کے قطرے چمک رہے تھے۔ "بالکل شبنم جیسے لگتے ہیں"، بابر نے سوچا، ایک گچھے کو اٹھا کر منہ کے پاس لے گیا اور اسی میں سے انگور کھانے لگا۔ اسے ایسا لگا جیسے یہ اس کے بچپن کا زمانہ ہو، جیسے وہ سر دریا کے کناروں پر، سمرقند اور اندجان کے باغوں میں پہنچ گیا ہو۔ "شکر ہے، پروردگار۔ پیاس جس نے پریشان کر رکھا تھا، جاتی رہی، جسم میں تازگی بھی محسوس ہونے لگی۔"

حیرت ہوتی ہے" بابر نے خوش ہو کے کہا۔ "جمنا کے کنارے انگور پکنے لگے! سفید سمرقندی بے دانہ کشمش! انھیں تو ماہم بیگم کو دکھانا چاہئے۔ طاہر جان، قاب لے کے ان کے پاس چلتے ہیں۔"

ماہم بیگم گذشتہ سال موسم خزاں کے آخری ایام میں کابل سے آگرہ آگئی تھی۔ وہ باغ زرافشاں میں بنے ہوئے محل ہی میں رہتی تھی جہاں بادشاہ کو تنہائی میں وقت گزارنا بہت پسند تھا۔ بابر طاہر کے ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا محل کی طرف چل پڑا۔ بارش ذرا دیر قبل تھم گئی لیکن آسمان پر کالے کالے بادل اب بھی چھائے ہوئے تھے۔ بابر بار بار طاہر کے ہاتھ کی قاب کو دیکھتا جا رہا تھا جس میں رکھے ہوئے انگور سونے کی طرح چمک رہے تھے، لگتا تھا جیسے سنہری شعاعیں براہ راست سمرقند سے ان کالے کالے بادلوں کو چیرتی ہوئی نیچے اتر رہی ہوں۔

ماہم بیگم محل کے برآمدے میں چوکی کے پاس بیٹھی ہوئی ہمایوں کو خط لکھ رہی تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی اٹھ

کمزوریش ہو رہی ہاں۔

"دیکھیے ذرا ان انگوروں کو تو چکھیے، ماہم بیگم۔ سمرقند کے انگوروں جیسے لگتے ہیں نا؟"

لیکن اس وقت ماہم بیگم کا کچھ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے طاہر سے قاب لے کر چوکی کے اوپر رکھ دی۔

طاہر بادشاہ اور ملکہ کو تنہا چھوڑ کر چلا گیا۔

ماہم بیگم کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اس سے بات ہی نہیں کی جا رہی تھی۔ بابر مضطرب ہو گیا

"کیا ہوا، ماہم بیگم؟ آپ کی آنکھوں میں یہ آنسو کیوں؟"

"سانس لینے میں ذرا دقت ہو رہی ہے۔"

ماہم بیگم کی عمر چالیس سے تجاوز کر چکی تھی۔ مٹاپے کے مارے جسم تھلتھلا نے لگا تھا اور پھولے پھولے سے چہرے میں ذرا بھی کشش نہیں باقی رہ گئی تھی۔ اسے کابل کی خشک کوہستانی ہوا کی عادی ہونے کی بنا پر جمنا کے کنارے کی گھٹن بھری نمی میں خاصی دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے ہندوستان کی ڈھال کر دینے والی گرمی کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا اور کسی حد تک اسی باعث آگرہ آجانے کو تین برسوں تک ٹالتی رہی تھی۔ لیکن گزشتہ چند دنوں سے بابر کا اصرار بڑھ گیا تھا اس لیے بادل ناخواستہ چلی آئی تھی۔

"بارش ہوئے تھی ہے تو مجھے بھی دقت محسوس ہوتی ہے" بابر نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ گھبرایے نہیں، جلد ہی عادی ہو جائیں گی... لیجیے ذرا ان انگوروں کو تو چکھیے۔"

ماہم بیگم کا جی تو نہیں چاہ رہا تھا پھر بھی اس نے ایک گچھے سے دو انگور توڑ کر منہ میں رکھ لیے اور بابر کو خوش کرنے کے لیے کہا

"خوب پک گئے ہیں۔ بہت لذیذ ہیں۔"

"آپ خط لکھ رہی تھیں؟"

"جی ہاں، مرزا ہمایوں کو۔ لیکن عالی جاہ، مجھے سانس لینے میں دقت بارش کی وجہ سے نہیں بلکہ ذہنی کرب کے باعث محسوس ہوتی ہے۔"

اچانک جیسے دھارا سا پھوٹ نکلا۔ ماہم بیگم سسکیاں بھر بھر کے تیزی کے ساتھ کہنے لگی۔

"میں مرزا ہمایوں کی یاد میں تڑپتی رہتی ہوں۔ آپ تو لگتا ہے کہ جان بوجھ کر میرے لخت جگر کو ہمیشہ ہی مجھ سے دور بھیجتے رہتے ہیں۔ میں کابل میں تھی تو مرزا ہمایوں جمنا اور گنگا کے کناروں پر جنگ لڑ رہے تھے۔ میں یہاں آگئی ہوں تو وہ بدخشاں چلے گئے۔ انھوں نے بدخشاں کے حالات درست کیے اور چند دنوں کے لیے آگرہ آئے تو آپ نے انھیں صوبے دار بنا کر سنبھل روانہ کر دیا۔ جہاں خطرہ ہوتا ہے وہاں ان کا پہنچنا ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ کسی دور دراز علاقے میں ذرا بھی گڑبڑ ہوتی ہے تو آپ فوراً ہی مرزا ہمایوں کو وہاں روانہ کر دیتے ہیں! اور میں ہر وقت اپنے جگر گوشے کی فکروں میں گھلتی رہتی ہوں۔ میرا تو کلیجا پاش پاش ہوا جا رہا ہے!"

"لیکن آپ اتنی متفکر کیوں ہوتی ہیں، ماہم بیگم؟... مرزا ہمایوں بڑے شجاع ہیں، انھوں نے تو خود ہی کہا تھا کہ انھیں سنبھل بھیج دیا جائے..."

"آپ متفکر نہیں ہوتے کیوں کہ آپ کے ماشاءاللہ کئی بچے ہیں۔ میرے تو بس ایک مرزا ہمایوں ہی ہیں۔ تین بچوں

کو پیدا کر چکی ہوں، تمہیں کیا تصور، بیٹے نا کردہ کی ماں پر کیا بیت رہی ہوگی! مرزا ہمایوں ہی تو میرے لیے سب کچھ ہیں، میرے اکلوتے فرزند ہیں۔"

اور ماہم بیگم پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

ان آنسوؤں میں بابر کو صرف ماں کے غموں اور فکروں ہی کی نہیں بلکہ برسوں قبل جو اس نے ماہم بیگم کی جو توہین کی تھی اس کی جھلک بھی نظر آنے لگی۔ صرف ماہم بیگم ہی بابر سے بے لوث محبت کرتی تھی لیکن ان کے علاوہ بابر کے دو بیگمات اور بھی تھیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے گل بدن جس نے ہلکا پھول دار لباس پہن رکھا تھا دوڑی دوڑی وہاں آئی اور اپنے والد سے لپٹ کر اچھلنے کودنے لگی۔ لیکن جب اس نے ماہم بیگم کو اشک بار دیکھا تو فکرمند ہوکے بے حس و حرکت کھڑی ہو گئی۔

بابر ماہم بیگم کو یاد دلا سکتا تھا کہ آخر ہندال اور گل بدن بھی تو اسی کے بچے ہیں لیکن خاموش رہ گیا۔ ماہم بیگم نے اپنی شکایات کا سلسلہ جاری رکھا

"آخر مرزا کامران بھی تو اسی طرح آپ کے فرزند ہیں جیسے کہ مرزا ہمایوں۔ لیکن وہ تو اپنی والدہ کے ساتھ مزے سے لاہور میں زندگی گزار رہے ہیں۔ بھلا میرے مرزا ہمایوں ہی تمام مصائب میں آپ کے بیٹے کیوں بنتے رہیں؟"

بابر جھلا اٹھا

"اس لیے کہ وہ ولی عہد ہیں، اس لیے کہ میرے بعد وہی تخت نشیں ہوں گے، ماہم انھیں مشکلات کا عادی ہونے دیجیے۔ میں ان کی عمر کا تھا تو اس سے کہیں زیادہ بلاؤں کو جھیل چکا تھا۔"

"لیکن میں ماں ہوں! ان کی یاد میں، ان کی فکروں میں میری تو جان نکلی جا رہی ہے۔ مگر آپ کو میرا خیال کرنے کی کیا پڑی ہے۔ آپ کے تو اور بھی بیگمات ہیں، مجھ سے زیادہ جوان۔"

گل بدن دیوان خانے کے وسط میں بت بنی کھڑی ہوئی تھی اس نے اس قسم کی گفتگو پہلی بار سنی تھی۔ باپ جھلایا ہوا، ان لوگوں کی طرف سے منہ موڑے ہوئے کھڑا تھا۔ ماں اشک بار تھی۔ گل بدن سوچ رہی تھی کہ پہلے اس کے والدین ایک دوسرے سے کتنی زیادہ محبت کرتے تھے۔ کابل سے آگرے تک سارے سفر میں وہ دیکھتی رہی تھی کہ اس کی ماں کتنی بے چین ہے شوہر سے ملاقات کے تصور سے کتنی شاداں و فرحاں ہے۔ کتنی خوشی ہوتی تھی اس کے والد کو ماہم بیگم کی آمد پر! اس نے جلالی جھیل کے کنارے ان لوگوں کا خیر مقدم کیا تھا اور ماہم بیگم کے گھوڑے کی لگام تھام کر ان کے ساتھ ساتھ دور تک پیدل چلتا رہا تھا۔ بعد میں گل بدن نے جو کم سنی کی بنا پر بڑی متجسس تھی، لوگوں کو یہ کہتے سنا تھا کہ بابر کے علاوہ اور کسی بھی مسلمان بادشاہ نے اپنی بیگم کے سلسلے میں اتنے زیادہ اعزاز و احترام کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

اس وقت گل بدن کسی طرح سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی کہ آخر اس کے والدین کو کیا ہو گیا ہے۔ بہرحال اس پر یہ ضرور واضح تھا کہ کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی ہے۔

بابر نے بیٹی کو شش و پنج میں مبتلا دیکھا تو جلدی سے چوکی کے پاس گیا اور قاب سے انگور کے ایک گچھے کو اٹھا کر گل بدن کی طرف بڑھایا

"لیجیے صاحب زادی، کھائیے۔ پھر جا کر باغ کی سیر کیجیے۔"

گل بدن جس کا پیارا پیارا چہرہ متفکر نظر آنے لگا تھا، باہر چلی گئی۔ بابر چوکی کے قریب لوٹ آیا اور دھیرے سے

گدے پر بیٹھ گیا۔

"ہاں، ماہم بیگم، میں قصوروار ہوں۔ ظاہر ہے کہ کسی مسلمان کے لیے تین بیویاں رکھنا ضروری نہیں ہے لیکن مجھے تو کسی ایک جگہ پر آرام و سکون کے ساتھ بیٹھنا نصیب ہی نہ ہوا، زندگی کا نصف سے زائد حصہ تو مہموں اور جنگوں کی نذر ہو گیا۔ میرا تین شادیاں کرنا ایک ایسی غلطی تھی جو ناقابلِ معافی ہے۔ میری ایک بھی بیگم خوش نہ رہ سکی حالانکہ میری دلی آرزو تھی کہ آپ تینوں مسرور و مطمئن رہیں۔ آج آپ کی حالت کو دیکھ کر مجھے بیگمات کی باہمی رنجشوں اور سوتنوں کی اولاد کے درمیان پنپتی ہوئی عداوتوں کا خاص طور سے احساس ہو... مجھے امید تھی کہ اس نوعیت کی پریشانیاں جو ہمیں اپنے آباواجداد سے ورثے میں ملی ہیں، ہماری زندگیوں میں زہر نہ گھول سکیں گی لیکن افسوس کہ ان ہی پریشانیوں کے باعث آپ تک کو جو میری محبوب ترین بیگم ہیں، پھوٹ پھوٹ کر رونا پڑ رہا ہے آپ کو اس اذیت میں مبتلا دیکھ کر میرا دل بیمار ٹکڑے ٹکڑے ہو جا رہا ہے۔"

ماہم بیگم نے بابر کے زرد پڑ جانے والے چہرے کی طرف دیکھا اور اسے لگا جیسے یہ زردی اسے پہلی بار نظر آ رہی ہو۔ اس نے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے۔

"شاہ عالی، آپ مجھ سے ناراض نہ ہوں۔ میں کمزور عورت ہوں اور آپ بادشاہ۔ اپنے درد و غم کا اظہار آپ سے نہ کروں تو اور کس سے کروں؟ آپ کی ہمدردی سے مجھے سکون مل جاتا ہے۔"

"سارے مصائب کی جڑ یہی تو ہے کہ میں بادشاہ ہوں۔ مجھ سے جو غلطیاں اور گناہ سرزد ہوئے ان کی وجہ بھی یہی ہے، وہ بھی تخت و تاج حاصل کرنے اور ان سے چمٹے رہنے ہی کی خواہش کا نتیجہ تھے۔ میں نوجوانی میں وہ کات کے کوہساروں پر بیدل منڈلایا کرتا تھا، زنجیروں سے آزاد ہونے کا کوشاں رہتا تھا لیکن مجھے کوئی ایسی نجات دہندہ ہی نہ مل سکا جو مجھے اقتدار اور حکمرانی کے بار سے نجات دلا سکتا۔ اب تو یہ بار میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو چکا ہے۔ اب تو یہی امید رکھتا ہوں کہ اس بار کو مرزا ہمایوں سنبھال لیں گے۔"

اچانک ماہم بیگم پر واضح ہو گیا کہ بابر کے دل میں کیا ہے لیکن اسے اپنے اس قیاس پر یقین نہ آیا۔

"ماہم بیگم، آپ اپنا خط مکمل کیجیے اور میری طرف سے لکھ دیجیے کہ مرزا ہمایوں جلد از جلد آگرہ واپس آ جائیں۔ وہ میرے سامنے، میری زندگی ہی میں تخت نشین ہو جائیں۔ لکھیے، لکھیے نا، میں دستخط کر دوں گا۔"

"جہاں پناہ بخوبی جانتے ہیں کہ مرزا ہمایوں تخت و تاج کی ہوس نہیں رکھتے۔ میرا بیٹا چیز تو بس اتنا ہی چاہتی ہے کہ وہ یہاں آ جائیں اور میری نگاہوں کے سامنے رہیں۔"

"لکھیے کہ وہ واپس آ جائیں۔ تخت نشین ہونے کے لیے! صرف اسی مقصد کے تحت آئیں... لیکن فی الحال میرے اس فیصلے کی آپ کے علاوہ کسی اور کو بھنک بھی نہ لگنی چاہیے۔"

آخرکار جب ماہم بیگم کو بابر کے فیصلے کی سنجیدگی کا یقین ہو گیا تو اس نے پوچھا

"لیکن آپ؟ آپ کابل واپس تشریف لے جانا چاہتے ہیں کیا؟"

"میں؟ مجھے تو محسوس ہو رہا ہے کہ سفرِ آخرت کی گھڑی قریب آن پہنچی ہے۔ میری آنکھیں بند ہو جائیں تو میت کو کابل لے جا کر سپردِ خاک کرا دیجیے گا... ویسے زندگی میں جو تھوڑے سے دن باقی رہ گئے ہیں انھیں آگرے میں ہی گزاروں گا۔ زیادہ عرصے تک جینے سے رہا۔ لکھنے کو، بہت کچھ لکھنے کو جی تڑپتا رہتا ہے۔ امورِ سلطنت میں مجھے

رہنے والے آدمی کو ظاہر ہے کہ اس کے لیے وقت نہیں ملتا۔ بہر حال اب لکھوں گا ... سے مجھے تخت و تاج کل ... پڑھ بھی نہ چاہیے میرے لیے اکیلا ظاہر ہے آپ کا ہی کافی ہوگا ... مہربانی کر کے مرزا ہمایوں کو میرے ... فیصلے کے بارے میں صاف صاف لکھ دیجیے۔"

ماہم بیگم کف افسوس ملنے لگی کہ خاوند کو بیکاری پریشانی میں ڈال دیا۔

"مجھے معاف کر دیجیے جہاں پناہ۔ اس قسم کی کوئی بات تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی ... یہ تو ناقابل یقین ہے، ناممکن ہے! میں مرزا ہمایوں کو یہ کیسے لکھ سکتی ہوں کہ عالی جاہ محسن کا وہ دستار، وہ احترام کرتے ہیں تخت سے دست بردار ہو رہے ہیں۔"

بابر کھڑا ہو گیا، اس نے بڑے عزم کے ساتھ کہا

"آپ نہیں لکھ سکتیں تو میں خود لکھ دوں گا۔"

وہ دیوان خانے سے نکل کر باغ میں آیا تو اسے گل بدن نظر آئی جو بڑی بے کسی کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے کہ بھانپ گئی ہو کہ اس کے والد کو کس وقت کتنے دشواریات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ بابر نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ ہلا دیا۔

۲

بابر کا خط سنبھل پہنچا تو ہمایوں علیل تھا لیکن خط سے بابر کے خفیہ فیصلے کا علم ہوتے ہی اس نے اپنے مقربین سے کہا

"مجھے جلد از جلد آگرہ پہنچا دیجیے!"

دہلی پہنچنے پر ہمایوں کا بخار بڑھ کر خطرناک صورت اختیار کر گیا۔ ہندو بیگ نے ہمایوں کی علالت سے شاہی خاندان کو مطلع کرنے کے لیے فوراً ہی ایک قاصد کو آگرہ روانہ کیا اور دہلی کے نامور حکیموں کو بلوایا کیونکہ وہیں علاج ضروری ہو گیا تھا۔

لیکن کسی بھی دوا سے افاقہ نہ ہوا۔ حکیم اصل مرض کی تشخیص تک نہ کر سکے۔ جانے کیسا بخار تھا جس سے ہمایوں کا جسم روز و شب جلتا رہتا تھا اور اس کی رنگت سیاہ پڑ گئی تھی۔ ماہم بیگم آگرے سے اچھی تیز گھوڑوں کی گاڑی پر دہلی پہنچ گئی۔

اس نے سوچا کہ دریائی راستے سے سفر مریض کے لیے آسان ثابت ہوگا اس لیے ہمایوں کو کشتی کے ذریعے آگرہ لایا گیا۔ آٹھ سپاہی ڈھکی ہوئی پالکی میں اسے زرافشاں باغ میں لائے۔ بابر نے بے ہوش بیٹے کو دیکھا تو اسے لگا جیسے اس کے دل کا کوئی تار ٹوٹ گیا ہو۔ اسے وہ پالکی بھی تابوت جیسی معلوم ہوئی۔

ہمایوں غشی کے عالم میں رہ رہ کے بڑبڑانے لگتا تھا۔ ایک روز اس نے بمشکل بھاری رات گزارنے کے بعد صبح ہی صبح آنکھیں کچھ کچھ کھول دیں اور سرہانے چپ چاپ کھڑے ہوئے اپنے والد کو پہچان لیا۔ وہ اٹھ بیٹھنے کی کوشش میں پلنگ پر کسمسایا لیکن اس کا سر فوراً ہی پیچھے کی طرف لڑھک گیا۔

"ہم آپ کی خدمت میں ... آپ کے بغیر ... نہیں نہیں ..." ہمایوں نے کہا، اسے ایک بار پھر ڈراؤنے خواب دکھائی دینے لگے اور وہ چیخ اٹھا۔ "آگے بڑھو، قلب پر حملہ کرو ... مارو انہیں! چلا گیا.... ٹھہر جاؤ! ...."

ہمایوں کا دم گھٹنے سا لگا۔ وہ بستر پر تڑپنے لگا اور پھر کروٹ بدل کر دوبارہ بے ہوش ہو گیا۔

مرض پر شاہی حکیموں کا بھی کچھ بس نہ چل سکا۔ ماہم بیگم کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی رہتی تھی، بابر ناقابل بیان رنج و غم میں مبتلا رہتا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ ہمایوں کی جان کو آئے دن جوکھم میں ڈال کر اسے زمانے کی سختیاں جھیلنے پر مجبور کر کر کے خود ہی اس کی اس سنگین علالت کا باعث بنا ہے۔ لوگ دشوار حالات میں بابر پر بھروسا کرنے کے عادی ہو چکے تھے، ہر ایک امید رکھتا تھا کہ بابر اس کی حفاظت کرے گا لیکن اس بار تو بابر خود ہی لاچار اور بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔

اسے خود ہی دلاسے اور سہارے کی ضرورت تھی۔

یہ دلاسا اور سہارا بالکل غیر متوقع طور پر بزرگ شیخ الاسلام نے دیا۔

"اعلیٰ حضرت، امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیے۔ پروردگار مرزا ہمایوں کو صحت یاب کر دے گا۔ لیکن جب بہترین حکما بھی ناکام رہیں" شیخ الاسلام نے کہا، "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا آپ سے کوئی قربانی چاہتا ہے۔ آپ اپنی کوئی بیش بہا شے اللہ کے نام پر بطور صدقہ دے دیجیے۔"

"بیش بہا شے؟" بابر حیرت میں پڑ گیا۔ ماہم بیگم کتنی ہی بھیڑوں کی قربانی کر کے ان کا گوشت غریبوں میں تقسیم کر چکی تھی۔ غریبوں کی مدد کرنے کا یہ اقدام رضائے الٰہی کے عین مطابق تھا۔ آخر شیخ الاسلام کی مراد کون سی بیش بہا شے سے تھی؟

"اعلیٰ حضرت، اسی بڑے ہیرے کو صدقے میں دے دیا جانا چاہیے۔"

"کون سے بڑے ہیرے کو؟ کوہ نور کو؟"

شیخ الاسلام نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

شیخ صاحب، یہ ہیرا زیادہ قیمتی ہے یا میری زندگی؟"

یہ کیا فرما رہے ہیں آپ، عالی جاہ! ایسے ایسے ہزاروں ہیرے تو آپ کی چھنگلیا کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتے!"

"مال دنیا کی کیا وقعت ہے جو مرزا ہمایوں کی جان کا بدل ہو سکے" بابر نے بلند آواز سے کہا تاکہ تمام حاضرین سن لیں، "میں ہیرے سے کہیں زیادہ قیمتی شے کی قربانی پیش کروں گا۔ میں مرزا ہمایوں پر اپنی جان فدا کر دوں گا! خدا شرف قبولیت بخشے!"

حاضرین سہم گئے، حیران و ششدر ہو کر بابر کی طرف دیکھنے لگے۔ بابر دھیرے دھیرے چلتا ہوا بے ہوش لیٹے ہوئے ہمایوں کے سرہانے جا کھڑا ہوا۔

"میرے لخت جگر، میرے فرزند ارجمند ہمایوں میں پروردگار سے دعا کرتا ہوں" بابر نے دعا مانگنے کے انداز میں کہا، "کہ وہ آپ کو صحت یاب کر دے اور آپ کی یہ خطرناک بیماری مجھے لگ جائے!"

مریض کے کمرے میں موجود حکیم، پیر، شیخ اور بیگ سب کے سب مفلوج سے ہو کر رہ گئے۔ بابر نے ہمایوں کے پلنگ کے تین چکر لگائے اور برابر دعا مانگتا رہا:

"پروردگار، میں، بادشاہ ظہیر الدین بابر اپنی زندگی اپنے بیٹے کو دے رہا ہوں۔ میری اس قربانی کو شرف قبولیت عطا کر رب العالمین۔ عزرائیل میری جان نکال لے اور ہمایوں صحت یاب ہو جائیں، پروردگار!"

قریب ہی پردے کے پیچھے موجود ماہم بیگم نے رونا بند کر دیا اور باہر دوڑی آئی، پر توقع نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ من رسیدہ شیخ الاسلام بھی بت بن کر رہ گیا، بابر کو تو ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے ہمایوں واقعی ابھی بستر علالت سے اٹھ کھڑا ہوگا اور بابر بے جان ہو کر اس کے بستر پر ڈھیر ہو جائے گا۔

لیکن معجزہ نہ رونما ہوا۔ بے ہوش ہمایوں چپکے چپکے بڑبڑایا اور ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔

بابر سر جھکا کر خواب گاہ سے باہر نکل آیا۔

۳

نوجوان ہمایوں کے قوی دل نے آخر کار مرض پر غلبہ حاصل کر لیا اور ایک ہفتے کے بعد ہی وہ بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اگلے روز شام کو وہ اپنے والد سے ملاقات کرنے کے لیے اس کی خلوت گاہ میں گیا۔

ہمایوں نے دیکھا کہ اس کے والد کا چہرا پژمردہ ہو گیا ہے، گہری گہری شکنیں نمودار ہو گئی ہیں اور شانے قبل از وقت ہی خمیدہ ہو گئے ہیں۔

''بے حوالی سے جان عقرب میں،'' بابر نے بیٹے سے نظریں ملاتے ہوئے کہا۔ ''خیر، آپ بتائیے، اب طبیعت کیسی ہے؟''

''میری جان تو آپ نے بچالی، عالی جاہ۔ مجھے جب سے ہوش آیا ہے تب سے پروردگار سے یہی دعا مانگتا رہتا ہوں کہ آپ نے مجھ پر اپنی جان قربان کرنے کے سلسلے میں جو دعا مانگی تھی وہ قبول نہ ہو۔''

''فرزند عزیز، آپ متفکر نہ ہوں۔ میں ایسا نہ کرتا تو میرے ضمیر کو کبھی بھی سکون نہ میسر ہوتا۔ اس کے علاوہ آپ کی والدہ کے سلسلے میں مجھ سے جو گناہ سرزد ہو گیا تھا اس کا کفارہ بھی ادا کرنا چاہتا تھا۔''

''لوگ کہہ رہے ہیں کہ موت جو میری تاک میں تھی، اب آپ کو اٹھا لے جائے گی۔''

''کیا آپ کو واقعی اس بات کا یقین آگیا؟ ہم سب ہی فانی ہیں۔ موت کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے جس کے آتے ہی ہمیں دنیا سے اٹھ جانا ہے۔ آپ میری نہیں بلکہ سلطنت کی فکر کیجیے۔''

''لیکن اعلیٰ حضرت تو مجھ سے یہ بات کچھ اس طرح فرما رہے ہیں گویا کہ تخت مجھے سونپ چکے ہوں جیسا کہ اپنے خط میں لکھا تھا۔ یقین مانیے، میرے لیے یہی بہت ہے کہ میں سنبھل میں آپ کا صوبے دار رہوں، آپ کا وفادار خادم۔ سنا ہے کہ وہاں پھر کچھ گڑبڑ ہو رہی ہے۔ آپ اجازت دیں تو دو روز بعد میں سنبھل لوٹ جاؤں۔''

بابر اس خیال سے چند لمحات تک خاموش رہا کہ جو بات وہ کہنے والا ہے، اسے ہمایوں خاص طور پر توجہ کے ساتھ سنے۔

میری بات کو ٹھیک سے سمجھئے مرزا ہمایوں۔ میرا مقصد کسی قسم کی چال نہیں ہے۔ آپ کو جلد از جلد عنان حکومت سنبھال لینی چاہیئے۔ میں دو برسوں سے، اسی لمحے سے جب بیوہ کی سازش سے مجھے زہر دیا گیا تھا، علیل ہوں۔ اب میں اپنی بچی کھچی قوت امور سلطنت پر نہیں بلکہ کچھ دوسرے کاموں پر صرف کرنا چاہتا ہوں ... آپ سنبھل چلے جائیے لیکن وہاں اپنے کاموں کو نپٹانے اور ہندو بیگ کو صوبے دار مقرر کرنے کے بعد فوراً ہی واپس آ جائیے گا۔''

ہمایوں پر واضح ہو گیا کہ اسے باپ کی اس خواہش کو بے چوں و چرا پورا کرنا چاہیے۔

برسات ختم ہو چکی تھی۔ اب آسمان پر بادل نہیں منڈلاتے رہتے تھے اور بابر راتوں کو بے خوابی سے پریشان ہو کر باغ میں نکل آتا اور ستاروں کو دیکھنے لگتا تھا۔ اب وہ اکثر بخار میں مبتلا رہتا تھا، خاص طور سے رات کے وقت۔ اس حالت میں وہ آسمان پر نظریں دوڑاتا تو اسے لگتا تھا کہ سارا آسمان مرتعش ہے اور ستارے کسی بہت بڑے گرداب میں چکر کاٹ رہے ہیں۔

دن میں ملاقاتوں کے لیے متعین وقت پر وہ بیگوں اور عہدے داروں سے پہلے ہی کی طرح اب بھی ملاقات کرتا تھا۔ اس کی ملاقاتیں شیخ الاسلام سے بھی ہوتی تھیں لیکن پہلے کی بہ نسبت کچھ کم ہی۔ یہ سارے کے سارے لوگ اب بابر سے بہت زیادہ خوش اخلاقی اور توجہ و التفات کے ساتھ پیش آتے تھے جس کا سبب بابر پر واضح تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ وہی طرز عمل ہے جو ایسے مریض کے ساتھ اپنایا جاتا ہے جس کے بچنے کی کوئی امید نہ رہ گئی ہو۔ یہ سب لوگ معجزوں میں یقین رکھتے تھے اور انھیں ذرا بھی شک نہیں تھا کہ بابر نے بیٹے کی جان کے عوض اپنی جان قربان کرنے کے سلسلے میں جو دعا مانگی تھی اسے پروردگار نے قبول کر لیا ہے۔ ہمایوں صحت یاب ہو چکا تھا اور اب موت کی غیر مرئی تلوار باپ کے سر پر ہراراہی تھی، کسی بھی لمحے پنا کام کر سکتی تھی۔

بابر کے لیے ایسے افراد کی نہایت ہی شائستہ مسکراہٹیں اور نہایت ہی ادب کے ساتھ بجا لائی جانے والی کورنشات بعد خوشگوار کیسے ثابت ہو سکتی تھیں جو اس کی موت کے منتظر تھے۔ چنانچہ بابر اب پنا زیادہ تر وقت یا تو ماہم بیگم کے ساتھ گزارتا تھا یا اپنی خلوت گاہ میں۔

ماہ میزان شروع ہوا تو بابر کی طبیعت کچھ اور بھی زیادہ بگڑ گئی جسم پر نہ کہیں کوئی پھوڑا تھا نہ ہی کہیں ورم معلوم ہوتا تھا لیکن سینے کے اندر ہر وقت آگ سی لگی رہتی تھی۔

حکما حیرت سے شانے چکاتے اور آپس میں مسلسل صلاح مشورہ کرتے رہتے تھے۔ آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ بادشاہ کے خون میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے جو شاید زہر کے اثر کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ دواؤں کے علاوہ انار کے عرق کا زیادہ مقدار میں استعمال ضروری ہے۔

لیکن کوئی دوا اثر ہی نہیں کر رہی تھی۔ بدن سوکھ کے کانٹا ہو گیا تھا اور طاقت تیزی سے ختم ہو رہی تھی۔

ہمایوں سنبھل سے واپس لوٹا تو اس نے اپنے والد کو کشادہ دیوان خانے کے وسط میں اونچی جگہ پر بچھے ہوئے پلنگ کے سفید بستر پر لیٹے پایا۔ جو لوگ بابر کو تواناو تندرست اور ہشاش بشاش دیکھتے رہے تھے وہ اب اس کے چہرے پر چھائی ہوئی مردنی اور جسم کو جس میں ہڈیوں کے سوا کچھ بھی تو نہیں بچا تھا، دیکھ کر مغلوج سے ہو جاتے تھے۔

ہمایوں نے پلنگ کے قریب گھٹنوں پر بیٹھ کے اپنے والد کے بے جان ہاتھ کا بوسہ لیا۔

بابر کے سرہانے خان زادہ بیگم بیٹھی اس کے چہرے پر مورچھل جھل رہی تھی اور پائینتی میں ماہم بیگم بت بنی بیٹھی ہوئی تھی۔

"یہ آپ کو کیا ہو گیا، عالی جاہ؟" ہمایوں نے بدحواس ہو کے پوچھا۔ "آپ نے مجھ پر اپنی جان فدا کرنے کی جو دعا مانگی تھی ... یہ اس کا نتیجہ ہے۔"

ماہم بیگم جس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل پا رہا تھا، سسکیاں بھرنے لگی۔

بابر نے بیٹھنے پر قدرے ... آہستہ آہستہ دھیرے دھیرے بولنا شروع کیا لیکن اس کے الفاظ واضح اور قابل فہم تھے

''فرزند عزیز! اس میں آپ کا کیا قصور ... علالت تو میرے خون میں سرایت کر چکی ہے۔''

مجھے معاف کیجیے! حضور ... یہ خادم آپ کو صحت یاب دیکھنے کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہے۔''

''میری صحت کا پوری طرح بحال ہونا تو اب ... شاید ممکن نہیں ہے۔ آپ میرے درد کو کچھ کم ضرور کر سکتے ہیں۔''

''ارشاد فرمایئے'' ... ''ہمایوں کہہ اٹھا۔

''وزیر اعظم کو بلوا بھیجیے ... اور دوسرے ضروری عہدے داروں کو بھی۔ میں سب کے سامنے عنان حکومت آپ کو سونپ دوں۔''

''لیکن یقین کیجیے کہ میرے لیے آپ کی زندگی کا ایک لمحہ بھی کہیں زیادہ قیمتی ہے بہ نسبت ''

''یہ بہت ضروری ہے'' بابر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز سے کہا۔

خان زادہ بیگم نے بھائی کے بستر کو درست کر دیا۔ بابر نے کہا کہ اس کے سر کے نیچے ایک اور تکیہ رکھ دیا جائے کیونکہ نیم دراز حالت میں ہو جانے سے اسے بات کرنے میں آسانی ہوگی۔

اور وہ امرا اور وزرا سے گفتگو کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔*

بادشاہ ہمایوں، ماہم بیگم اور خان زادہ بیگم نے اگلا سارا دن بھی بابر کے بستر کے قریب ہی کاٹ دیا۔

''مرزا ہمایوں محسوس کرتے ہیں کہ وہ آپ کے اس احسان عظیم کا بدلہ کبھی بھی نہ چکا سکیں گے'' ماہم بیگم نے یہ دیکھ کر کہا کہ بابر کی حالت قدرے بہتر ہے اور وہ اپنے قریبی عزیزوں سے بات چیت کرنے کا خواہاں معلوم ہو رہا ہے۔

''انھیں چاہیے کہ اس احسان کا بدلہ ... اپنے ... بچوں کو ... چکا دیں'' بابر نے رک رک کر کہا۔ ''ہم میں سے ... امیر تیموری ... آل اولاد ... میں سے ... زیادہ تر لوگ ... باہمی عداوتوں میں ... کام آئے ... پسر نے پدر کو قتل کرا دیا ... برادر نے برادر کی جان لے لی ... سب کے سب ... غداری اور کمینگی کا شکار ہوئے ... ہم میں سے کچھ جو بہتر تھے، اپنی شرافت کا شکار ہو گئے ... مثلاً خان زادہ بیگم ... انھوں نے میری جان بچانے کی خاطر ... عمر بھر کی اسیری قبول کر لی۔ میری ہمشیرہ نے مجھے ایثار سکھایا تھا۔ مرزا ہمایوں ... آپ کو بھی ... اپنے بھائیوں اور بچوں کو ایثار اور شرافت کا پیکر بنانا چاہیے۔''

بابر نے سر گھما کر پلنگ کے دوسری طرف تنے ہوئے سفید ریشمی پردے پر نظریں جما دیں۔ ہمایوں نے اب کہیں جا کر دیکھا کہ پردے کے پیچھے کوئی آدمی بیٹھا ہوا ہے۔

''طاہر بیگ'' بابر نے کہا، ''میری کتاب تو اٹھا لایئے۔''

طاہر پردے کے پیچھے سے نکل کر دیوار کے طاق پر سے چمڑی جزدان اٹھا لایا، جس میں نئی جلد والی کتاب رکھی ہوئی تھی۔

''آپ کو یاد ہے نا فرزند عزیز، کابل کے قریب کوہستانی علاقے میں آپ نے مجھ سے میری کتاب زندگی مانگی تھی۔ یہ لیجیے ... اب آپ اسے مکمل تصور کر سکتے ہیں، جیسی مجھ سے ممکن تھی ویسی لکھ دی ہے۔''

---

* بابر نے ہمایوں کو تحت و تاج سونپتے وقت امرا اور بیگوں سے جو کچھ کہا تھا اسے گل بدن بیگم نے اپنی تصنیف ''ہمایوں نامہ'' میں تفصیل کے ساتھ قلم بند کر دیا تھا۔ اس نے اس بات کا خاص طور سے تذکرہ کیا تھا کہ بابر نے ہمایوں کو اپنی سلطنت کی باگ ڈور سونپ دینے کا فیصلہ بہت پہلے ہی کر لیا تھا اور وہ اپنی زندگی کے باقی ایام باغ زرافشاں میں گزارنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مصنف۔

اب مجھے اعلیٰ حضرت کہنے کی ضرورت نہیں۔ تخت تو میں مرزا بابریوں کو سونپ چکا ہوں۔۔۔"

"لیکن تخت شعر و سخن پر تو آپ اب بھی جلوہ فروز ہیں، عالی جاہ۔ ہرات میں ہم لوگ علی شیر نوائی کو حضرت نوائی کہا کرتے تھے۔ آپ نے اصلاحیت لوگوں کو یکجا کرنے کے معاملے میں بھی اور ترکی زبان میں اپنی ادبی تخلیقات کے ذریعے بھی نوائی کی شاندار روایات کو آگے بڑھایا ہے۔ آپ نے ہماری زبان کو فارسی اور عربی کے جیسے بلند مقام پر پہنچا دیا ہے اور یہی وہ مقصد تھا جس کے حصول کے خواب میر علی شیر ساری زندگی دیکھتے رہے تھے۔"

"آپ کے ان نیک الفاظ کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں، میر عمارت صاحب اور آپ نے آگرے اور سیکری میں عالی شان محل تعمیر کیے ہیں۔ ایسے باغات کی بنیاد رکھی ہے جو رشک جنت ہیں۔ اگر پروردگار نے مجھے زندگی کے کچھ دن اور عطا کر دیے۔۔۔ تو میری دلی آرزو ہے کہ آپ کی نگرانی میں۔۔۔ ایک مدرسہ۔۔۔ تعمیر کرواؤں۔۔۔ سمرقند میں بی بی خانم مدرسے کی عمارت کتنی شاندار اور عجیب و غریب ہے۔ میری ہمشیرہ بھی اس قابل ہیں۔۔۔ کہ ہم اس کے نام کو شہرت جاوداں عطا کریں۔"

فضل الدین یہ دیکھ کر کہ بابر اپنی بچی کھچی قوت استعمال کر کے باتیں کر رہا ہے خود بڑی گرمجوشی کے ساتھ، جان بوجھ کر جلدی جلدی اور تفصیل کے ساتھ باتیں کرنے لگا

"دراصل خوبصورت عمارتوں کو خواتین کا نام دے کر ان کی شان دوبالا کرنے کا ہمارے ہاں زمانہ قدیم سے ہی رواج رہا ہے۔ سمرقند کا مدرسہ بی بی خانم اور مقبرہ تومان آقا ان دونوں کے دلوں کی پاکیزگی اور فرشتہ خوئی کو شہرت عطا کر رہے ہیں۔ ہندوؤں میں بھی عورتوں کو بہت عزت دی جاتی ہے اور وہ جن کی عبادت کرتے ہیں ان میں دیوتاؤں کے علاوہ لکشمی، پاروتی اور درگا جیسی دیویاں بھی شامل ہیں۔ وشنو بھگوان کی بیوی کے نام ہیں لکشمی، شری اور کمل حسن کے معنی ہیں کہ وہ خوش بختی عطا کرتی ہیں۔"

"میر عمارت صاحب، میری ہمشیرہ خانزادہ بیگم۔۔۔ آپ جانتے ہیں۔۔۔ بے رحم زمانے نے۔۔۔ آپ دونوں کو خوش قسمت نہیں ہونے دیا۔" بابر دوبارہ گفتگو کے اصل موضوع پر لوٹ آیا، "وہ بہت ہی غیر معمولی خاتون ہیں۔۔۔۔ اگر وہ مدرسہ جس کا آپ خواب دیکھتے رہے ہیں۔۔۔ تعمیر کیا جائے۔۔۔ تو اس کا نام۔۔۔ خانزادہ بیگم مدرسہ۔۔۔ رکھیے گا۔"

"آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی۔۔۔ یہ تو میرا سب سے اہم اور مقدس خواب ہے،" فضل الدین نے سادگی سے کہا۔ "اگر اس خواب کی تکمیل کے لیے میری زندگی ناکافی ثابت ہوئی تو میں دنیا کو الوداع کہتے وقت یہ کام اپنے بیٹے کے سپرد کر جاؤں گا۔ وہ ہندوستانی معماروں کے ساتھ مل کر اس یادگار عمارت کو تعمیر کرے گا جسے ہماری دونوں قوموں کی طرف سے فلک نسواں کی عظمت کو ایک حقیر خراج تحسین کی حیثیت حاصل ہوگی۔"

بابر پسینے پسینے ہو چکا تھا۔ سفید ریشمی لباس جسم سے چپک گیا تھا۔

"ماموں جان،" طاہر نے گھبرا کر کہا۔ "حکیم صاحب نے سخت تاکید کی تھی کہ عالی جاہ کو تھکایا اور پریشان نہ کیا جائے۔۔۔" فضل الدین نے اتفاق رائے کے طور پر سر ہلایا اور جھک کر بابر کے ہاتھ کا بوسہ لے لیا۔ بابر نے انگلیوں کے اشارے سے فضل الدین کو کچھ اور قریب بلا کر چپکے سے کہا

"آپ سے۔۔۔ ایک اور بھی درخواست ہے۔۔۔۔ کابل میں پہاڑی چوٹی پر۔۔۔ ایک باغ ہے۔۔۔ آپ کا لگایا ہوا

..... میری ابدی آرام گاہ ..... وہیں بنائی جائے ..... وہ شان و شوکت ..... کی جگہ نہیں ..... لیکن ..... وہاں سے ..... وادی کا نظارہ ..... بے حد خوبصورت لگتا ہے۔"

آنسوؤں سے افضل الدین کا دم گھٹنے گھٹنے بچا۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا اور اثبات میں سر ہلا کر تقریباً بھاگتا ہوا خواب گاہ سے باہر نکل گیا۔

طاہر نے بابر کے کپڑے تبدیل کر دیے ..... وہ تیمار دار کے فرائض بڑے سکون کے ساتھ انجام دے رہا تھا۔ دوائیں دیتا تھا، پیاس لگنے پر پانی پلاتا تھا، سانس لینے میں آسانی ہونے کے لیے پنکھا جھلتا تھا۔ سارے کام وہی انجام دے رہا تھا، کسی اور کو پلنگ کے پاس ہی نہیں آنے دیتا تھا۔

اس رات بابر کے کمرے میں بڑی گھٹن تھی، فضا عجب بوجھل سی ہو رہی تھی۔ طاہر نے خدمت گاروں کو بلایا جنھوں نے اس پلنگ کو جس پر بابر لیٹا ہوا تھا، برآمدے میں پہنچا دیا۔

ہواؤں میں اندجان کے موسم بہار کی جیسی ہلکی ہلکی سردی کا احساس ہو رہا تھا۔ آسمان کی تاریک وسعتوں میں ستارے تابندگی بکھیر رہے تھے۔ یہ ستارے کسی گرداب مسلسل میں چکر کاٹ رہے تھے، ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔

کتنا مہیب تھا یہ نظارہ! بابر نے آنکھیں بند کر کے طاہر کو آواز دی:

"جسم سن ہوا جا رہا ہے ....."

طاہر نے دھیرے دھیرے بابر کے شانوں اور ہاتھوں پیروں کی مالش کی۔ بابر کو قدرے آرام ملا گیا اور اس نے ہمت کر کے ایک بار پھر آسمان کی طرف دیکھا۔

ستارے اب اپنی اپنی جگہوں پر ٹھہرے ہوئے تھے، آسمان کی سیاہ بلندیوں میں بڑے سکون کے ساتھ نور بکھیر رہے تھے۔ بابر کی نگاہوں نے دب اکبر، قطب تارے اور کہکشاں کو تلاش کر لیا۔

طاہر بھی ان تاروں کی طرف دیکھنے لگا:

ذرا اس طرف تو دیکھیے، ہمارے قوا میں بھی کہکشاں ایسی ہی نظر آتی ہے۔"

بابر کے تصور نے اسے اندجان میں، بچپن کے بھولے بسرے ایام میں پہنچا دیا۔

کبھی کمسن ظہیر الدین نے سنا تھا کہ کہکشاں دراصل ہیرے کا کوئی پتنگ ہے جو آسمانی ہواؤں میں اپنی ہیرے کی دم کو مزے سے لہراتا ہوا بلند، کچھ اور بلند ہوتا جاتا تھا لیکن کسی غیر مرئی ڈور کے ذریعے قطب تارے سے بندھے ہونے کے باعث زیادہ دور تک نہیں جا سکتا تھا۔ بچوں کا یہ قصہ ایک بار پھر بابر کے کانوں میں گونجنے لگا۔ لیکن یہ بات کہ آگرے میں آسمان اور ستارے بالکل اسی حالت میں تھے جیسے کہ اس کے زندگی میں قدم رکھتے وقت اندجان میں تھے، اس کے لیے آخری تسکین وہ بات ثابت ہوئی۔ بابر نے بچپن کی دنیا میں اپنی واپسی کے لمحۂ شیریں کو تھام لینے کی کوشش کی لیکن اچانک تشنج نے اس کے بے جان جسم کو جھنجھوڑ ڈالا۔ تاروں بھرا آسمان ایک بار پھر گرداب میں تبدیل ہو گیا۔ یہ گرداب اس کے اوپر ڈھے پڑا اور اسے اپنے ساتھ دور، بہت دور تاریک خلاؤں میں بہا لے گیا .....

اختتامیہ

میر عمارت فضل الدین نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اس مقبرے کی تعمیر تو مکمل کرلی جس کے متعلق بابر نے اپنے انتقال سے قبل اس سے کہا تھا لیکن وہ خان زادہ بیگم کے اعزاز میں مدرسہ نہ تعمیر کر سکا.... اس غیر معمولی خاتون کی یاد کو پتھروں کی عمارت کی شکل میں جاوداں کر دینے سے متعلق فضل الدین کے خواب کو تقریباً سو برسوں کے بعد عظیم ہندوستانی معماروں نے آگرے میں ایک دوسری خاتون ممتاز محل کی یاد میں مشہور و معروف تاج محل کی تعمیر کے ذریعے شاید حقیقت میں بدل دیا....

طاہر اپنے ماموں کو کابل میں سپرد خاک کرنے کے بعد ہمایوں کے حکم کے بموجب بابر نامے کی نقلیں لے کر سمرقند، تاشقند اور اندجان گیا جہاں انھیں اہل علم کو سونپ دیا۔ طاہر اور رابعہ نے اپنی زندگی کے آخری ایام کابل میں گزارے۔ ان کا بیٹا سفر میر عمارت کے بیٹے کے ساتھ آگرے ہی میں رہ گیا تھا۔ ان دونوں نے ہندوستان ہی میں شادیاں کیں اور ان کے ورثا مقامی لوگوں میں گھل مل گئے۔

بابر کے انتقال کے دس برسوں کے بعد ہمایوں نے ایک حسین وجمیل خاتون حمیدہ بیگم سے شادی کی اور اس کے بطن سے پیدا ہونے والے بیٹے کا نام جلال الدین اکبر رکھا۔ ماہم بیگم اس سے قبل ہی ہیضے میں مبتلا ہو کر دنیا سے اٹھ چکی تھیں۔ خان زادہ بیگم البتہ زندہ تھی اور اکبر دو سال کا ہو گیا تو اس کی پرورش خان زادہ بیگم ہی کی نگرانی میں ہونے لگی۔ وہ بچے کو پیار کرتے وقت اکثر کہا کرتی تھی: ''ارے شہزادے، آپ تو اپنے دادا جان مرحوم کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ میرے بھائی بابر جان دو سال کی عمر میں بالکل آپ ہی جیسے لگتے تھے۔ آپ کا ناک نقشہ ہی نہیں بلکہ ہاتھ پاؤں تک بالکل انھیں کے جیسے ہیں!''

اکبر اپنے دادا سے محض شکل وصورت کے اعتبار ہی سے مشابہ نہ تھا بلکہ اسے دادا سے جو اپنے عہد کا ایک ممتاز مدبر تھا، اعلا و ارفع انسانی صفات اور ہمہ پہلو صلاحیتیں بھی ورثے میں ملی تھیں۔

اکبر، اس کی چہیتی بیگم جودھا بائی اور اس عہد کے دیگر ممتاز افراد کی زندگیوں اور مقدروں کی مصنف نے اپنی اگلی تصنیف میں عکاسی کرنے کی کوشش کی ہے جو ازبیک زبان میں شائع ہو رہی ہے۔

یہاں مصنف بابر کے انتقال کے بعد اس کے متعلق قائم کر لیے جانے والے طرح طرح کے تصورات کے بارے میں مختصراً اپنے خیالات کے اظہار کی اجازت چاہتا ہے۔

نام نہاد ''عظیم مغل'' کا تصور جو گزشتہ دو صدیوں سے تاریخ میں عام ہے، دراصل حقائق کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔ وہ اس لیے کہ بابر کی سلطنت کو اس کی خود نوشت سرگزشت میں، اس کے خاندان کے حکمرانوں کی سرکاری دستاویزات میں اور اس عہد کے مورخین کی تصانیف میں کہیں بھی مغل سلطنت نہیں کہا گیا۔ بابر اور اس کے اخلاف خود کو ترک اور آل تیمور کہتے تھے کیونکہ ان کے تمام آبا و اجداد ترکی بولنے والے برلاس قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جس کے

۳۰۰۰۰ نفوس آج بھی وسط ایشیا میں آباد ہیں۔

یہ محض اتفاقی بات نہ تھی کہ بابر کی ترکی شاعری اور خاص طور سے اس کی آپ بیتی نے ادبی ازبیک زبان کی تشکیل میں بہت ہی نمایاں کردار ادا کیا۔ بابر کی آپ بیتی کی زبان نہ صرف یہ کہ بول چال کی ازبیک زبان سے بہت قریب تھی بلکہ سادہ وقابل فہم ہونے کی بنا پر اپنے عہد سے اتنی زیادہ آگے بھی تھی کہ موجودہ ازبیکستان میں ساتویں درجے کے اسکولی بچے تک اپنے نصاب میں شامل بابر نامے کے حصوں کو خاص دشواری کے بغیر ہی سمجھ لیتے ہیں۔

ایران اور افغانستان جیسے ہمسایہ ممالک میں بابر کی تخلیقات سے نسبتاً زیادہ واقفیت ہونے کی بنا پر بابر کو کبھی مغل نہیں کہا گیا۔ لیکن ان مغربی ممالک میں جہاں بابر کے ادبی ورثے سے لوگ

عرصے تک ناواقف رہے، اسے غلطی سے "عظیم مغل" کہا جانے لگا۔ ہندوستان میں انگریزوں کی نوآبادیاتی حکومت کے دوران جس کے راستے میں بابر اور اکبر کی قائم کردہ طاقتور اور اقتدار اعلا کی حامل سلطنت کی ماضی کی شہرت حائل ہو رہی تھی (خاص طور سے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد) اس نام نے اور بھی زیادہ مضبوطی کے ساتھ جڑیں پکڑ لیں۔

اہمیت ظاہر ہے کہ نام کی نہیں بلکہ اس حقیقت کی ہے کہ یہ سلطنت تین صدیوں تک قائم رہی اور صرف ہندوستان ہی کی نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ پر ایسے تہذیبی اور تمدنی نقوش چھوڑ گئی جو لافانی ہیں۔

بابر کی نسل دنیا میں باقی نہ رہ سکی۔ اس کی آخری نشانیوں میں معمر بہادر شاہ کے دو بیٹوں اور ایک ننھے پوتے کو ۱۸۵۷ء میں انگریز افسر ہڈسن نے بے رحمی کے ساتھ قتل کرا دیا تھا۔

لیکن زندگی کے اضطراب سے معمور بابر کی لافانی غزلیں آج بھی ازبکستان میں شادی جیسی پر مسرت تقاریب میں گائی جاتی ہیں۔ تاشقند کی روش شعر اپر بابر کا مجسمہ بھی لگا ہوا ہے۔

اکبر کے عہد میں بابر نامے کا ترکی سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ بعد میں اس کے ترجمے اردو، انگریزی، جرمن، فرانسیسی اور دیگر زبانوں میں ہوئے اور دنیا کے بہت سے ممالک میں علما اور ناقدین نے اس کی قدر و قیمت کا تعین کیا۔

بابر کی تخلیقات کو اس سرزمین میں جہاں وہ پیدا ہوا اور پروان چڑھا تھا، بالکل فطری طور پر خصوصیت سے مقبولیت حاصل ہے۔ یہاں کئی سکولوں اور شاہراہوں کے نام بابر کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ بابر کی تخلیقات جنھوں نے ازبیک ادبی زبان کی تشکیل میں نہایت ہی اہم کردار ادا کیا تھا، ازبیک ادبیات عالیہ میں شمار کی جاتی ہیں اور انسٹی ٹیوٹوں کے نصاب میں شامل ہیں۔

بابر کے ادبی ورثے کو ہندوستان میں بھی تہذیبی دولت تصور کیا جاتا ہے۔ ہندوستانی عوام کے عظیم فرزند جواہر لال نہرو نے بابر کی آپ بیتی کے مطالعے کے بعد کہا تھا کہ بابر ایک دلکش شخصیت کا مالک اور نشاۃ الثانیہ کے دور کا ایک ممتاز نمائندہ تھا۔ مشہور ہندوستانی ادیب ملک راج آنند نے بابر نامے کے متعلق یہ رائے ظاہر کی تھی: "یہ دنیا کی دلکش ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ اسے مصوروں نے چھوٹی چھوٹی تصاویر سے یوں ہی تھوڑی آراستہ کیا تھا۔ یہ تو ہم سب کی دولت ہے"۔

نادر صلاحیتوں اور غیر معمولی مقدر کا حامل یہ شخص جسے دنیا سے اٹھے چار سو پچاس سال سے زائد مدت گزر چکی ہے، اپنی تخلیقات کی بدولت ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔

(۱۹۶۹ء۔۱۹۸۳ء)

ظہیر الدین بابر مغل بادشاہت کے بانی اور عظیم شہنشاہ تھے جنہیں بے مثال کارناموں کے باعث تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی۔ انہوں نے نہ صرف اپنے وسائل سے کئی گنا بڑی فوج کو شکست سے دوچار کیا بلکہ ہندوستان کو ایک مضبوط وحدت میں بھی منتقل کیا۔ ظہیر الدین بابر عادل بادشاہ تھا، وہ بھیس بدل کر عوام میں گھومتا اور ان کے مسائل سے آگاہی حاصل کرتا۔ وہ دلکش شخصیت، لطیف مزاج اور نفیس طبیعت کا آدمی تھا۔ اس نے لوٹ مار اور مظالم سے ستائی ہوئی قوم کو امن و امان کی زندگی سے سرفراز کیا اور اپنی رعایا میں تمیز آقا و بندہ ختم کی۔ اس کے حسن سلوک کو نہ صرف اپنوں بلکہ غیروں نے بھی سراہا۔ وہ علوم وفنون کا دل دادہ اور خود ایک بلند پایہ مصنف تھا۔ ''تزک بابری'' جو اس کی خود نوشت ہے، ایسی اعلیٰ پایہ کتاب ہے جس کے کئی زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں اور جو آج بھی ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہے۔

اس عظیم بادشاہ کی سوانح کو پر یمغل قدروف نے ناول کے اسلوب میں پیش کیا ہے جو اپنے عمدہ اور خوبصورت انداز بیان کے سبب قارئین میں مقبولیت کا باعث ہے۔

ظہیر الدّین بابر

ایک اہم اور دلچسپ تاریخی ناول

Price: Rs.280/-